بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقالات

مذاکرۂ ملّی ۔ تعلیماتِ نبویؐ

(چوتھی ہمدرد سیرت کانفرنس)

۳ر دسمبر ۱۹۸۴ء تا ۷ر دسمبر ۱۹۸۴ء   ۹ر ربیع الاول تا ۱۳ر ربیع الاول ۱۴۰۵ ہجری

نظریہ و فلسفۂ تعلیمِ اسلامی

مرتّبہ :-

حکیم محمد سعید

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقالات

مُذاکرۂ ملّی ۔ تعلیماتِ نبوی

(چوتھی ہمدرد سیرت کانفرنس)

۳ر دسمبر ۱۹۸۴ء تا ۷ر دسمبر ۱۹۸۴ء   ۹ر ربیع الاوّل تا ۱۳ر ربیع الاوّل ۱۴۰۵ ہجری

نظریہ و فلسفۂ تعلیم اِسلامی

جلد اوّل

مرتّبہ :۔
حکیم محمد سعید

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس

مرتب * حکیم محمد سعید

ناشر * ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ہمدرد سنٹر، ناظم آباد، کراچی - ۱۸

طابع * ماس پرنٹرس، کراچی

سال اشاعت * ۱۹۸۴ء

پہلا ایڈیشن * گیارہ سو

قیمت * -/۹۰ (نوے) رُپے

ترتیب

مفکرین تعلیم ـ نظریات

تعلیمی تحریکات اور ادارے

پاکستان کا موجودہ نظام اور نصاب تعلیم

حرف اوّل

حکیم محمد سعید

ترقی کے لیے خواہ وہ انفرادی سطح پر ہو یا اجتماعی سطح پر حکما ، مدبّرین اور دانش وروں کی متفقہ رائے یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً محاسبہ ،جائزہ ، شوریٰ اور اصلاح کا عمل جاری رہنا چاہیے۔ اسلامی ریاست پاکستان کی ترقی کے لیے کہ جو کروڑوں مسلمانوں کی دینی ، ثقافتی اور علمی روایات کا گہوارہ ہے ، اس عمل کی اور بھی اہمیت ہے ،کیونکہ جس نصب العین کے حصول کے لیے بےشمار قربانیاں دی گئی تھیں ، وہ ابھی تک پوری طرح حاصل نہیں ہوا۔

چناں چہ انہی مقاصد کے پیش نظر ہمدرد فاؤنڈیشن نے ۱۴۰۲ ہجری سے مذاکرۂ ملّی تعلیمات نبویؐ کا سلسلہ شروع کیا۔پہلی ہمدرد سیرت کانفرنس کراچی میں " اخلاقیات نبویؐ " پر منعقد ہوئی ۔ دوسری کانفرنس لاہور میں ۱۴۰۳ ہجری میں منعقد ہوئی ۔اس کا موضوع فکر "خودی" تھا۔تیسری کانفرنس ۱۴۰۴ ہجری میں کراچی میں منعقد ہوئی جس میں "تصور ریاست اسلامی " پر ملک کے علمائے کرام ،ماہرین قانون ، ماہرین تعلیم اور اہل فکر و قلم نے فکر افروز مقالے پیش کیے ۔

چوتھی کانفرنس (۱۴۰۵ ہجری) جس کے مقالات آپ کے پیش نظر ہیں ، کا نقطۂ فکر " نظریہ و فلسفۂ تعلیم اسلامی " ہے ۔ تعلیم ،نظام زندگی کا نہ صرف جزو لاینفک ہے بلکہ اس کی بنیاد بھی ہے۔کسی نظام کی کامیابی کا تمام تر انحصار تعلیمی نظام کی صحت اور معیاری کارکردگی پر ہوتا ہے۔ یہی وہ نظام ہے جو افراد کو ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے ، ایسا سانچا جو ہماری آرزوؤں اور امنگوں سے ہم آہنگ ہوتا ہے ۔یہی نظام وہ اقدار پیدا کرتا ہے کہ جو زندگی کو صحیح خطوط پر استوار کرتی ہیں اور اسے صحیح سمت میں چلاتی ہیں ، یہی زندگی کو ثبات ،استحکام اور تحریک فراہم کرتا ہے۔

ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان اس سال بھی بروقت موصول ہو جانے والے

مقالات کا مجموعہ عین کانفرنس کے افتتاح کے دن شائع کررہا ہے ،الحمد للّٰہ ۔ جو مقالات وقت پر موصول نہیں ہو سکے انہیں دوسری جلد کی صورت میں بہت جلد شائع کر دیا جائے گا ۔

ہمدرد کے شعبۂ تصنیف و تالیف کی لگن اور ان تھک کوششوں کا نتیجہ ہے کہ یہ مجموعۂ مقالات وقت پر شائع ہو سکا ۔

اس کتاب کی تشکیل میں رفیق عزیز جناب مسعود احمد برکاتی نے اپنا دن رات ایک کر کے بہ حسن و خوبی اسے پائے تکمیل تک پہنچایا ۔ شعبۂ تصنیف و تالیف کے دیگر ارکان جناب احمد خاں خلیل ،جناب رفیق الدین احمد اور جناب رشید الدین احمد نے بھی اس کو تکمیل کے مراحل تک پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ۔ میں ان سب کا شکر گزار ہوں ۔

رفیق محترم حکیم نعیم الدین زبیری بھی میرے شکریے کے مستحق ہیں جنھوں نے مقالات کے مطالعے میں ہاتھ بٹایا ۔ جناب علی حسن ، جناب متین الحسن موہانی اور جناب مسعود علی،اس کی حسن طباعت کے لیے شکریے کے مستحق ہیں ۔جناب تصویر حسین حمیدی نے مقالات حاصل کرنے اور مراسلت میں ہاتھ بٹایا ۔ اسی طرح سید محمد قمرالحق اور وقار بن سعید نے بھی شب و روز محنت کر کے اس کتاب کو وقت پر کمپوز کر دیا ۔ میں ان کی دلچسپی اور محنت کو بہ نظر استحسان دیکھتا ہوں ۔

مجھے امید ہے کہ بنیادی اہمیت کے اس موضوع پر پاکستان کے ممتاز اہلِ فکر و نظر کے مقالات کا یہ مجموعہ ترقیِ ملک و ملّت کی راہیں استوار کرنے میں مفید ثابت ہوگا ۔

خطبۂ آغاز و استقبال

حکیم محمد سعید

عزیزانِ ملّت!

ورود ماہ ربیع الاوّل عالم انسانیت کے لیے عموماً اور امت مسلمہ اور ہمارے لیے خصوصاً مسرت و ابتہاج کا ایک پیغام ہے، کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ آج سے چودہ سو سال پہلے اس ماہ مبارک میں اللہ سبحانہ تعالیٰ کی رحمت عامّہ کا دنیا میں ظہور ہوا تھا۔ اسلام کے داعیِ برحق کی ولادت گویا اس بات کا اعلان تھی کہ اب سے دنیا کی تمام تاریکیاں اور دائمی مایوسیاں اور سرگشتگیاں ختم ہونے والی ہیں - رسول اکرم ؐ کا ورود مسعود اور اس صورت میں خالق کائنات کی رحمت عامّہ کا یہ ظہور ان حالات میں ہوا کہ یہ دنیا دکھ اور درد اور آلام کی گرفت میں تھی اور اسے اپنی زندگی کے لیے ایک نسخۂ شفا کی ضرورت تھی۔ یہ دنیا تاریک تھی اور نور کے لیے اسے ایک آفتاب کی ضرورت تھی۔ وسیع ترمعنٰی میں اگر فکر و غور کیا جائے تو واقعۂ ولادت نبویؐ " محض ریگستان حجاز کی بادشاہت کا پہلا دن نہ تھا، یہ صرف عرب کی ترقی و عروج کے بانی کی پیدائش نہ تھی، یہ محض قوموں کے غلبہ و طاقت کا اعلان نہ تھا، یہ صرف نسلوں اور برادریوں کی برتری کی دعوت نہ تھی، جیسا کہ ہمیشہ ہوا ہے، بلکہ اللہ وحدہ لا شریک کی عالم گیر بادشاہت کے عرشِ جلال و جبروت کی آخری و دائمی نمود تھی"۔

قرآن حکیم نے آفتاب کو " سراج " کہا ہے:

وجعلنا سراجاً وّھاجاً (النبا: ۱۳) اور ہم ہی نے (آسمان پر) روشن چراغ بنایا۔

بالکل اسی طرح اس ذات اقدس کو بھی " سراج " کہا ہے جس کی ہدایت و رحمت کی روشنی تمام کرۂ ارض کی ظلمتوں کے لیے پیام رحیل اور صبح درخشاں کی نوید جاں فزا تھی۔

انّا ارسلنک شاہدًا وّ مبشرا وّ نذیرًا ۰ وّداعیًا الی اللہ باذنہ وسراجًا منیرًا ۰
(الاحزاب : ۴۵-۴۶)

یعنی اے نبی ! ہم نے تمہیں بھیجا ہے گواہ بنا کر ، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بناکر ، اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے والا بنا کر ، اور روشن چراغ بنا کر -

عزیزان من !

- ماہ ربیع الاوّل کا ورود ہمارے لیے جشن و مسرت کا پیغام عام ہوتا ہے -
- یہ موسم بہار آتا ہے تو ہمارے قلوب مسرتوں اور ولولوں سے معمور ہو جاتے ہیں اور ہمارے اندر اللہ تعالٰی کے رسول برحق ؐ کی محبت اور شیفتگی ایک بےخودانہ جوش اور محویت پیدا کردیتی ہے -
- ہم ذکر و فکر کی مجالس برپا کرتے ہیں اور ان کی آرائش و زیبائش میں اپنی محنت کی کمائی بے دریغ صرف کرتے ہیں -
- ہم محفلیں منعقد کرتے ہیں ، گل دستے سجاتے ہیں ، عطر و گلاب کی مہک اور اگربتیوں کے بخور سے محافل کو معطر کرتے ہیں -
- ہم ہوائی میدانوں سے تابہ دیوار ایوان شوریٰ جلوس نکالتے ہیں -
- ہم کتب ہائے سیرت پاک کی نمائشوں کا اہتمام بھی کرتے ہیں -
- ہم سب کچھ وہ کرتے ہیں جو ہمیں کرنا چاہیے اور ہم سب کچھ وہ بھی کرتے ہیں کہ جو ہمیں نہیں کرنا چاہیے -

ہمارے نزدیک محبت نبوی ؐ اور عشق مصطفوی ؐ کے یہ پاک اور ولولہ انگیز مظاہر اور یہ والہانہ ذوق و شوق ، انسان کے لیے متاع گراں مایہ ہے ، اور یہ شیفتگی انسانی سعادت اور راست بازی کا سرچشمہ ہے - بہ ایں ہمہ ہمیں اپنے قلب کی گہرائیوں میں ضرور جانا چاہیے اور وہاں پہنچ کر اپنے ضمیر کو آواز دینی چاہیے اور ان سوالوں کے جواب کی آرزو کرنی چاہیے کہ

- کیا ہم اس حقیقت پر بھی غور کرتے ہیں کہ یہ کون ذات اقدس ہے جس کی یاد کے لیے ہم اہتمام جشن کرتے ہیں ؟
- وہ کون تھا کہ جس کی ولادت کے تذکرۂ مبارکہ میں ہم نے احساس مسرت و ابتہاج کے اظہار کا عزم کیا ہے ؟

اگر ضمیر کی آواز ہمیں اپنے احتساب فکر و عمل کی دعوت دے تو ہمیں یہ غور کرنا چاہیے کہ ہم آج کہاں ہیں ؟

ربیع الاوّل وہ ماہ مبارک ہے کہ جس کو اپنے آخری نبی اور رسولؐ کے ورود باسعود کا شرف بخشنے والے نے ہم کو سب کچھ دیا تھا مگر ہم نے یہ سب کچھ کھو دیا ہے -

اس باب میں میرا انداز فکر آزادانہ ہے- میں یہ کہتا ہوں کہ اگر یہ اہتمام، ماہ ربیع الاول میں تشریف لانے والے کی یاد ہمارے قلوب میں تازہ کرتا ہے تو لازماً اور یقیناً سب کچھ پا کر کھو دینے کے زخم بھی تازہ ہو جانے چاہییں - ہمیں پھولوں کے گل دستے سجا دینے کے ساتھ اس پر بھی ضرور غور کرنا چاہیے کہ ہمارے اعمال حسنہ کے پھول کیوں مرجھا گئے ہیں ؟ قندیلیں روشن کرتے وقت یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ قلوب کی ظلمتیں دور کرنے کا سامان اور سینوں کے اندھیروں کو اجالوں میں بدلنے والا چراغ جو قدرت نے ہمیں عطا کیا تھا ہم نے اس سے کسب فیض کرنا کیوں ترک کر دیا ہے - ہمیں یہ بھی محسوس کرنا چاہیے کہ ہماری حیات ملی کا ہر خندۂ عیش و طرب آہ و فغان اور مایۂ حسرت بن چکا ہے- ہمارا حال یہ ہے کہ ہمارے سامنے نہ تو ماضی کی عظمتوں اور رفعتوں میں سے کوئی منظر رہا ہے نہ حال کے افکار و حوادث میں ہمارے لیے کوئی پیغام رہا ہے اور نہ مستقبل کی تاریکیوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے کسی شعاع زندگی کو ہم نے باقی رہنے دیا ہے -

عزیزان گرامی !

مذاکرۂ ملّی تعلیمات نبویؐ کے انعقاد کا انداز فکر دراصل حالات حاضرہ کے دردمندانہ مطالعے کا ایک لازمی تقاضا ہے اور اس لیے پاکستان میں محافل و مجالس ربیع الاوّل سے ہم نے اسے یکسر مختلف رکھا ہے- ہم نے یہ محسوس کیا کہ ہمارے اعمال حسنہ کے پھول مرجھا گئے ہیں تو ہم نے اخلاق نبویؐ کو اپنے فکر و نظر کا موضوع قرار دیا - پھر ہم نے یہ دیکھا کہ انسانی شر و فساد اور ظلم و طغیان کی تاریکی معاذاللہ، نور حق پر غالب ہونے کے لیے اپنے پنجۂ خونیں بڑھا رہی ہے تو ہم نے ساکنان پاکستان کی خودی کو للکارا اور خود شناسی اور خدا شناسی کے لیے راہ و منزل کی نشان دہی کی پرخلوص سعی کی- اور جب ہم نے یہ دیکھا کہ ہم اپنی شقاوت و حرماں نصیبی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہو رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کا جڑا ہوا رشتہ، فساد و عصیان کی تاریکیوں میں گم ہو رہا ہے تو ہم نے تصور ریاست اسلامی کا

ملک گیر سامان کیا - اور اب ہماری آنکھیں یہ دیکھتی ہیں کہ کلمۂ حق و عدالت کی حکمرانی کی جگہ سامانِ طغیان و ضلالت لے رہا ہے تو ہم نے نظریہ و فلسفۂ تعلیم اسلامی کو اپنا موضوعِ فکر بنایا ہے - اور یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم امۃ مسلمہ کو یاد دلائیں کہ :

قد جاءکم من اللّٰہ نور و کتب مبین ٥ یھدی بہ اللّٰہ من اتبع رضوانہ سبل السّلٰم ٥ (المائدہ : ١٥ - ١٦)

یعنی اللّٰہ کی طرف سے تمہاری جانب ایک نور ہدایت اور کتاب مبین آئی - اللّٰہ اس کے ذریعہ سے اپنی رضا چاہنے والوں کو (زندگی اور) سلامتی کے طریقے بتاتا ہے -

میں اس مذاکرہ میں حضرات گرامی ، آپ کے خیر مقدم کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کرتا ہوں ، اور اس کے بعد میں آپ کے ساتھ مل کر اس مذاکرۂ ملّی کے مندوبین کرام اور مبصرین عظام کا احترام و اکرام کے ساتھ استقبال کرتا ہوں کہ جو پاکستان بھر سے یہاں اس نیک مقصد کے ساتھ جمع ہوئے ہیں کہ پاکستان کے تناظر میں ملّت اسلامیہ اور امۃ مسلمہ کے لیے نظام و نصاب تعلیم کے میدان میں صراط مستقیم کی تلاش کریں - بلاشبہ یہ ایک مقدس فریضہ اور عظیم سعادت ہے - اور یہ فریضہ ہم تعلیم اور مقاصد تعلیم کو قرآن حکیم و سنت اور تعلیمات نبوی ؐ کی روشنی میں انجام دینے کا عزم رکھتے ہیں -

مقاصد تعلیم ، قرآن و سنت کی روشنی میں

اسلامی تہذیب و تمدن کے مزاج و شعار کا اظہار اگر ایک لفظ میں کرنا ہو تو اس کے لیے علم سے زیادہ جامع اور محیط کوئی دوسرا لفظ نہیں ہو سکتا - قرآن کریم کے بہ غور مطالعے سے اس حقیقت کی تائید ہو سکے گی کہ اس مکمل ہدایت ربانی کو اللّٰہ تعالٰی نے بھی علم ہی سے تعبیر فرمایا :

ولقد جئنٰھم بکتٰب فصلنٰہ علی علمٍ ھدًی و رحمۃً لقوم یومنون ٥ (الاعراف : ٥٢)

یعنی "ہم ان لوگوں کے پاس ایک ایسی کتاب لے آئے ہیں جس کو ہم نے علم کی بنا پر فضیلت عطا کی ہے اور جو ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے" -

یعنی جو حقائق اور تفصیلات اس میں بیان کی گئی ہیں ان کی اساس علم، ادراک اور تعقل پر ہے جب کہ اقوام عالم کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ماضی کا طویل عہد، علم اور عقل کے بجائے جذبات اور اوہام کا پرستار رہا ہے اور انسان کی زندگی جہل کی تاریکیوں میں گھری رہی ہے۔

تعلیم اور مقاصدِ تعلیم پر گفتگو کرتے ہوئے مندرجہ بالا آیت کی روشنی میں یہ حقیقت ہمیشہ اپنے ذہن میں رکھنی ہوگی کہ قرآن "علم" کو اندھی جذباتیت اور اوہام و خرافات کے مقابلے میں تخلیقی مفہوم و معنی میں استعمال کرتا ہے۔ یہ ایک اصولی بات ہے کہ جب گرد و پیش کے اندھیرے میں کہیں کوئی قندیل فروزاں ہوتی ہے تو روشنی ہی اس ماحول کا شعار بنتی ہے۔ اسلام جس تہذیب و ثقافت کا داعی ہے وہ عالمگیر تاریکی اور حقائق سے نا آگہی کی فضا میں اپنے علم، ادراک اور عقل و خرد کے صحیح استعمال کی بنا پر مزاج و خاصیت کے اعتبار سے سراپا نور اور روشنی ہے۔ اس لیے نزول قرآن کے ساتھ ہی اہل ایمان کی زندگی علوم وفنون کی ایسی رفعتوں سے ہم کنار ہوئی کہ اس سے پہلے عالم انسانی کے لیے وہاں تک پہنچنے کا تصور بھی محال تھا۔ چوں کہ علم کو اسلامی تہذیب اور اسلام کے قائم کردہ معاشرے میں شعار کی حیثیت حاصل ہے اس لیے قدرتی طور پر نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ معاشرۂ مسلم میں علم اور علما امتیازی اوصاف کے حامل ہوں گے اور ان کا مقام اعلا اور ارفع ہوگا۔

یرفع اللّٰہ الّذین آمنوا منکم والّذین اوتوا العلم درجٰت (المجادلہ: ۱۱)	یعنی "تم میں سے جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں اور جن کو علم بخشا گیا ہے اللہ ان کو بلند درجے عطا فرمائے گا"۔

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا گیا:

شھد اللّٰہ انّہ لا الہ الّا ھو والملئکۃ و اولوا العلم قائماً بالقسط ط (آل عمران: ۱۸)	اللہ نے خود شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی اللہ نہیں ہے اور (یہی شہادت) فرشتوں اور سب اہل علم نے بھی دی ہے۔

قرآن کی یہ آیت بھی علم و علما کے فضل و شرف کی نشان دہی کرتی ہے۔

قل ھل یستوی الّذین یعلمون والذین لایعلمون (الزمر: ۹)

یعنی "ان سے پوچھو کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں کبھی یکساں ہو سکتے ہیں"۔

یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ حقائق اشیا اور مآل اشیا کے ادراک کی صفت سے علما ہی متصف ہوتے ہیں:

وتلک الامثال نضربھا للنّاس وما یعقلھا الّا العٰلمون ۰ (العنکبوت: ۴۳)

یعنی "یہ مثالیں ہم لوگوں کی فہمائش کے لیے دیتے ہیں، مگر ان کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں"۔

علم اور اہل علم کے فضائل میں یہ اور اس طرح کی متعدد آیات ہیں، لیکن عنوان گفتگو علم کی فضیلت نہیں بلکہ مقصد تعلیم ہے اور قرآنی آیات کی روشنی میں یہ معلوم کرنا ہے کہ آخر اسلام علم اور اس کے حصول پر اتنا زور کیوں دیتا ہے کہ قرآن پاک کی سب سے پہلی آیت میں ہی پڑھنے کا حکم صادر فرمایا گیا ہے۔ پھر ایک نگاہ بخاری شریف کی کتاب العلم پر ڈالیے۔ بخاری کے تمام شارحین اس بات پر متفق ہیں کہ امام بخاریؒ کی تبویب نہایت معنیٰ خیز ہوتی ہے۔ اپنے مجموعۂ احادیث میں باب العلم کو یہ مقام دے کر وہ اسلامی زندگی کی رفیع الشان عمارت کی تکمیل کے مراحل اور مناہج کی طرف ہماری رہ نمائی کر رہے ہیں۔

تحصیل علم کے لیے تاکید اس حقیقت کا عنوان ہے کہ تاریخ عالم کے تناظر میں اسلام اس کو اپنا شعار قرار دیتا ہے۔ دوسرا اہم نکتہ جس پر ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے یہ ہے کہ اسلام علم کس کو کہتا ہے، کیوں کہ جب تک علم کی حقیقت متعین نہ ہو اس وقت تک تعلیم کے مقاصد کی وضاحت کا حق بھی ادا نہیں کیا جا سکے گا۔ اصحاب لغت کی یہ بات تو بہت مشہور ہے کہ العلم بہ معنیٰ دانستن یعنی علم کے معنیٰ جاننے کے ہیں، اور تعلیم دانائی سکھانے کو کہتے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک دلائل کے ساتھ کسی چیز کی حقیقت کے جاننے

کا نام علم ہے اور یہیں سے تعلیم کا مفہوم بھی متعین ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر تعلیم و تعلم کا مقصد صرف دلائل تک رسائی ہو تو اس سے علم کے لیے اسلامی زندگی کا شعار بننے کا کافی اور شافی جواز نہیں پیدا ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں خود قرآن کریم کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں ہمیں متعدد آیات ایسی ملتی ہیں جن سے مقاصد تعلیم کی نشان دہی ہوتی ہے۔ پہلی آیت جس میں اللہ کے نام سے پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اس میں اس کی صفت خلق و ایجاد کا ذکر صراحت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پڑھنے اور پڑھانے کا اوّلین مقصد خالق کا عرفان ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی بے حد اہم ہے کہ اللہ تعالٰی نے اپنی متعدد صفات میں سب سے پہلے اپنی صفت خلق ہی کی طرف توجہ دلائی تاکہ پڑھنے والے کو صرف اللہ تعالٰی کے خالق ہونے ہی کا احساس نہ ہو بلکہ اس سے جویائے علم کو اپنا رشتہ بھی معلوم ہو سکے یعنی یہ کہ اللہ پاک خالق ہے اور پڑھنے والا مخلوق ہے۔ اس طرح یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کی یہ آیت اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ تعلیم کا اہم مقصد خود شناسی اور خداشناسی ہے، اور قرآنی اصطلاح میں اسی کو علم کہتے ہیں اور انسان میں انہی دونوں جبلی اور فطری صلاحیتوں کو جلا بخشنے کی کوشش اور عمل کا نام تعلیم ہے۔ مقاصد کے سلسلے میں متعدد آیات پیش کی جا سکتی ہیں، ایک آیت تو یہ ہے کہ

انّما یخشی اللہ من عبادہ العلماءُ (الفاطر : ۲۸)	"اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں"۔

یعنی خود شناسی اور خدا شناسی بنیادی طور پر ہمارے کردار کو خوف اور خشیت الٰہی سے آشنا کرتی ہے، اور خود شناسی کی وجہ سے ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ احساس ذمہ داری اور خشیت الٰہی پر عمل اور کردار کی پاکیزگی کا انحصار ہے، اور حقائق اشیا کا علم اس بات کا متقاضی ہے کہ انسان صرف اپنی صلاحیتوں یا پوشیدہ جوہر کو ابھارنے ہی پر اکتفا نہ کرے بلکہ علم کو اپنے اخلاق و کردار کی پاکیزگی اور حسن تک پہنچانے کا ذریعہ قرار دے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن نے حکمت سے تعبیر کیا ہے اور معلم انسانیت جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بیان فرمایا کہ :

يتلوا عليهم آيته و يزكيهم و يعلمهم الكتب والحكمة (الجمعة : ٢)

"انہیں (رسول) اللہ کی آیات سناتا ہے ، ان کی زندگی سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے"۔

قرآن حکیم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بتاتا ہے کہ اسلام کے نزدیک علم و تعلیم مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ وہ کسی چیز کا وسیلہ اور ذریعہ ہے اور تعلیم کا اصل مقصد خالق کا عرفان اور انسان کا اچھے اخلاق سے اپنے آپ کو آراستہ کرنا اور دوسروں کو آراستہ کرنا نیز اپنے علم کی روشنی سے جہل اور نادانی کے اندھیروں کو دور کرنا اور نہ جاننے والے کو سکھانا ، بھولے بھٹکوں کو راہ حق دکھانا ، حق کو پھیلانا اور باطل کو مٹانا ہے۔ اور یہ ساری چیزیں بے مقصد تعلیم سے حاصل نہیں ہو سکتیں۔ تعلیم کا مقصد شخصیت کی تکمیل ہے اور یہ بات اس تعلیم سے ہوتی ہے جس کے مقاصد میں عرفان الٰہی اور پاکیزگی کردار کو بنیادی حیثیت حاصل ہو۔

ان الذين آمنوا و عملوا الصٰلحٰت اولئك هم خيرالبريه (البينه : ٧)

"جو لوگ ایمان لے آئے اور جنہوں نے نیک عمل کیے وہ یقیناً بہترین خلائق ہیں"۔

ایسے ہی عظیم الشان مقاصد کے حامل نظام تعلیم کے بارے میں احادیث سے روشنی ملتی ہے ۔حضرت معاذؓ کو یمن بھیجتے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

" کیا ہی عمدہ عطیہ اور عمدہ ہدیہ ہے حکمت کا وہ کلمہ جسے تم نے سنا اور محفوظ رکھا ، پھر اسے اپنے بھائی تک پہنچایا "۔

ابو داؤد کی حدیث ہے ، حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :

" علم سکھاؤ اس لیے کہ علم کا سکھانا نیکی ہےاور
اس کا طلب کرنا عبادت ہے - مذاکرۂ علم تسبیح ہے
اور اس پر بحث کرنا جہاد ہے ، اس کا خرچ کرنا تقرب
الٰہی کا ذریعہ اور نہ جاننے والوں کو بتانا صدقۂ
جاریہ ہے۔"

علم کے جو بنیادی مقاصد بیان کیے گئے یعنی عرفان حق اور حسن عمل، اس کی مزید وضاحت امام شافعی کے ایک قول سے ہو سکتی ہے کہ" اگر باعمل علماء اللّٰہ کے اولیا نہیں تو پھر اللّٰہ کا کوئی ولی نہیں"۔ مقصد یہ ہے کہ تعلیم کا مقصد تقرب الٰہی اور عرفان حق ہے ، اپنی شخصیت کی تکمیل اور اپنی تخلیقی قوتوں کا صحیح استعمال ہے ، یہاں علم برائے علم کا کوئی تصور نہیں -

اس مطالعے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عرفان الٰہی کے ساتھ خود شناسی بھی مقاصد تعلیم میں ہے -اس ضمن میں قرآنی آیات کی روشنی میں صرف اتنا اشارہ کر دینا کافی ہے کہ جو تعلیم نیابت الٰہی کا شعور نہ پیدا کر سکے وہ بے ثمر ہے اور قرآنی نقطۂ نظر سے اس تعلیم کی کوئی اہمیت نہیں ہے - یہیں سے یہ نکتہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ ازروئے قرآن تعلیم میں دین و دنیا کی کوئی تفریق نہیں - تفریق دراصل مقاصد کے اعتبار سے ہے -اگر رضائے الٰہی اور عرفان حق مقصود نہ ہو تو علم لادینی ہے ورنہ سارے علوم دینی ہیں- اگر ہم گہرائی اور گیرائی کے ساتھ غور کریں تو ہم لازماً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ دینی اور لادینی علوم کی تفریق نے موجودہ نظام تعلیم کو شخصیت کے انتشار کا سبب بنا دیا ہے -قرآن حکیم میں مختلف علوم کی طرف اشارات کی موجودگی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ہمیں سارے علوم سیکھنے چاہییں ، مثلاً کتاب اللّٰہ میں تاریخ بھی ہے ، ان علوم کا بھی ذکر ہے جنہیں ہم آج سائنس کہتے ہیں ، علم نباتات ، علم ہئیت اور ٹکنالوجی کی طرف بھی اشارات موجود ہیں - اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جانا چاہیے کہ سارے علوم خواہ فزکس ہوں ، کیمسٹری ، بیالوجی ، فلکیات اور ریاضیات ہوں ، یا انجینیرنگ اور ٹکنالوجی ، سیکھے جا سکتے ہیں بشرطیکہ تعلیم کے وہ مقاصد سامنے رہیں جن کی وضاحت کی گئی - غزالی نے تو تمام ان علوم کو جن کو آج لوگ دنیوی کہتے ہیں مثلاً ٹکنالوجی

اور طبی علوم ، ان کو فرض کفایہ قرار دیا ہے ، اور جملہ محدثین ، احادیث کی روشنی میں علمِ طب کی تحصیل کے فرض کفایہ ہونے کے قائل ہیں -

ابن خلدون کے نزدیک تعلیم کا مقصد معاشرے کو منظم اور متمدن بنانا بھی ہے ، اور صالح تمدن اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے کہ جب معاشرے کی ساری ضروریات کا علم رکھنے والے موجود ہوں اور یک جہتی اور ہم آہنگی سے اپنے اپنے کام انجام دے رہے ہوں - مقصد کا پاس و لحاظ سب کو ہونا چاہیے - اگر یہ بات موجود ہو تو کوئی علم غیر شرعی نہیں - ہمیں ایک اور نکتہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ تعلیم اگر اپنے صحیح نتائج نہ پیدا کر سکے اور اس کا دائرہ صرف الفاظ اور معلومات کی بازی گری ہو تو وہ بے مقصد ہے - اسلام نے علم کی ترغیب ہمیں دی ہے مگر مقصدِ تعلیم کی طرف بھی ہمیں توجہ دلائی ہے اور وہ مقصد پاکیزگیٔ اخلاق و کردار ہے ، جس پر تمدن و ثقافت کی بنا استوار ہوتی ہے - سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مقاصدِ تعلیم کی وضاحت بہ طریقِ احسن کرتا ہے کہ

ادبنی ربی فاحسن تادیبی و امرنی بمکارم الاخلاق (الحدیث)

" میرے پروردگار نے مجھے ادب و سلیقہ سکھایا تو مجھے نہایت بہتر طریق پر سکھایا ، اور مجھے اس نے فضائل اخلاق کا حکم دیا " -

بس یہی مقصد تعلیم ہے اور یہ انسان کی جبلت اور فطرت میں ہے - علم اسی جوہر ادب و اخلاق کو ابھارتا ہے اور اللہ کا عرفان اور خوف الٰہی پیدا کر کے صالح اور مہذب معاشرہ تیار کرتا ہے - مذاکرہ ملی تعلیمات نبوی ص - نظریہ و فلسفہ تعلیم اسلامی کے ذریعہ سے ہمیں اپنے نظام تعلیم کا جائزہ انہی مقاصد کی روشنی میں لینا ہے اور تعلیم کے اثرات کا مطالعہ اور مشاہدہ اپنے عمل و کردار میں کرنا ہے -

عزیزانِ ملّت !

علم اور تعلیم و تعلم کے میدان میں میرے مطالعے نے مجھے جس نتیجے پر پہنچایا ہے میں نے اس کا اظہار اور ابلاغ کرنے کی سعی کی ہے - درحقیقت اس مذاکرۂ ملی کی فکری منہاج ہی یہ ہے کہ ہم پاکستان

کے نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کو قرآن و حدیث کی روشنی میں دیکھیں اور اس روشنی کو اپنا رہنما بنائیں کہ ہم ایک مسلمان فرد کی حیثیت سے اور پاکستان ایک ریاست اسلامی کی حیثیت سے فکری اور شرعی طور پر خود کو اس آفاقی روشنی میں رکھنے کا پابند ہے - مجھے اس مذاکرۂ ملّی کے لیے جو فکر انگیز اور معنیٰ خیز اور حقیقت افروز مقالات ملے ہیں مجھے انہیں حرف بہ حرف پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے- پاکستان کے ماہرینِ تعلیم نے اور صاحبان علم و فضل نے پاکستان میں مسئلہ تعلیم کا جائزہ جس محنت و صداقت اور دیانت و امانت سے لیا ہے وہ لایق تعریف اور سزا وار تحسین ہے - مجھے یقین ہے کہ جس فکر و انداز کے ساتھ مسئلۂ تعلیم پر یہ مذاکرۂ ملّی حالات کا جائزہ لے رہا ہے اس سے قبل اس میدان میں کی گئی کوششوں کا یہ انداز و مقصود نہیں رہا ہے- اب یہ توقعات قائم ہو سکتی ہیں کہ یہ مذاکرۂ ملّی پانچ روز میں اپنا کام پورا کر کے یہاں ہی ختم نہیں ہو جائے گا بلکہ اس مقام سے اب ایک پُرمقصد تحریک جنم لےگی کہ جو گزشتہ ۳۷ سال کی فروگزاشتوں کو سامنے رکھ کر اور نظام و نصاب تعلیم میں فکری و اسلامی انقلاب برپا نہ ہو جانے کے بدیہی اسباب کے احاطۂ کامل کے بعد پاکستان میں انقلاب تعلیم کا 'انشاءاللہ تعالیٰ' عنوان ہوگی - تعلیم کے میدان میں ہم نے یہ جد وجہد، یہ سعی بلیغ ، یہ کاوش ، یہ مسلسل محنت اس لیے مہیا نہیں کی ہے کہ ہم سب مندوبین اور ہم سب مبصرین مقالات پیش کر کے ، تبادل خیال کر کے ، اور حاصل مذاکرہ تجاویز مرتب کر کے ہئیت حاکمہ کے لیے خوان سجادیں گے - اب ایسا نہیں ہونا چاہیے اور یقیناً اب ایسا نہیں ہوگا- گزشتہ پورے ۳۷ سال میں اس قسم کی ہر جد وجہد کی ناکامیوں پر ہماری پوری گرفت و نگاہ ہے - ہم ان نامسعود و نامبارک طاقتوں کو اب جانتے ہیں کہ جو پاکستان کے نظام تعلیم میں ایک انقلاب اسلامی برپا نہ ہونے دینے کی ذمہ دار ہیں- قرار داد مقاصد سے لے کر نفاذ شریعت اسلامی تک پاکستان کے نظام تعلیم میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کی سفارشات کے ساتھ بے عملی کی صورت میں جو استہزا ہوا ہے اسے ہم چیلنج کی صورت میں قبول کرنے کے لیے خود کو تیار کر چکے ہیں - ہم نے اس حقیقت کا بخوبی ادراک کر لیا ہے کہ نظام و نصاب تعلیم اور آزادیِ فکر اور حریتِ اجتماعی میں گہرا تعلق ہے- ہم اب اپنی تاریخ کی اس منزل پر آ چکے ہیں کہ حریتِ فکر کے ساتھ میدانِ عمل میں آئیں اور اس کے ساتھ کسی کو کھیل کھیلنے کی اجازت نہ دیں - ہم اس حقیقت سے بھی خوب آگاہ ہیں کہ مثبت اور صحت مند میدان تعلیم کے لیے قومی استحکام ایک ناگزیر ضرورت ہے-

حضرات گرامی!

اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جانا چاہیے کہ دنیا میں ہر جگہ اور معاشرے میں ہمیشہ تعلیمی تحریکیں اسی وقت جنم لیا کرتی ہیں کہ جب تعلیمی نظام معاشرے کی ضروریات کو پورا نہیں کرتا اور سوسائٹی ایک مثبت نظام و نصاب تعلیم سے محروم رکھی جاتی ہے۔ یہ محرومی فکری ناہمواریوں کا مظہر بھی ہوتی ہے اور سیاسی سوئے مزاج بھی اس کا عنوان ہوتا ہے اور کبھی یہ صورت حال بیرونی سازشوں کی آئینہ دار بھی ہے ۔ان تین صورتوں کے علاوہ میری رائے میں مثبت تعلیم سے محرومی کا چوتھا عنوان کوئی نہیں ہو سکتا ۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں، اور ہمیں بہ بانگ دہل یہ کہنا چاہیے کہ ہمارے ماضی میں ایسی فکری اور باغی طاقتیں پوری طرح آزاد تھیں کہ پاکستان میں میدان تعلیم میں انقلاب اسلامی برپا نہ ہونے دیں، اور ہم نے ایسی رپورٹوں اور تجاویز کو بھی قبول کیا ہے کہ جو نظریۂ حیات ملّی سے متغائر اور نظریۂ اسلامی سے متضاد تھیں ۔مگر ہمارے اس حال کے بارے میں کیا کہا جائے گا کہ جس کا آئینہ دار اسلامی ریاست پاکستان کے وزیر تعلیم کا یہ بیان ہے کہ

"پاکستان بحیثیت قوم خطرے میں ہے اور مکمل تعلیمی انتشار اور تباہی کے کنارے ہے"۔

بدیہی طور پر یہ صورت حال سازش کا عنوان قرار نہیں دی جاسکتی۔ مگر اس فکر و خیال کی کون تردید کرے گا کہ نفاذ شریعت اسلامی کی پرجوش اور ہمہ جہت کوشش کے باوجود پاکستان کے نظام و نصاب تعلیم میں اسلامی انقلاب اس لیے برپا نہیں ہو سکا ہے کہ ہم نے ایک ریاست اسلامی کے لیے مقاصد تعلیم کا ادراک نہیں کیا ہے اور اس وجہ سے ہم نے ہنوز اپنے منصوبہ ہائے ملّی میں تعلیم کو اولیت کا قرار واقعی مقام نہیں دیا ہے۔ ہم اس حقیقت کو کیسے جھٹلائیں گے کہ پاکستان کی مجلس شوریٰ نے اپنی پوری مدت میں ایک بار بھی ملّت کے اس درد کو محسوس نہیں کیا ہے۔ ہم اس سے کیسے انکار کریں گے کہ ہمارے ارباب بست و کشاد کے پاس تعلیم کی اولیت اور اس کی افادیت و ضرورت پر غور کرنے کے لیے کماحقہ وقت نہیں ہے ۔ ہماری حالیہ تاریخ اس پر گواہ ہے کہ ہمارے اصحاب اقتدار کو صحیح تعلیم سے محرومی کا ایک بار بھی احساس کامل نہیں ہوا ہے۔

گزشتہ سالہا سال سے ہمارے تمام ذرائع ابلاغ قرآن وحدیث کا درس دے رہے ہیں - ہم نے بات بات کو قرآن و حدیث کے تابع رکھنے کے عزم بالجزم کا اظہار کیا ہے- ہم نے آوازۂ اسلام کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا ڈالا ہے - مگر ملّت پاکستان یہ سوال کرتی ہے کہ قرآن و حدیث کا غلبہ آج تک ہمارے نظام تعلیم میں اور ہمارے نصاب تعلیم میں کیوں نہیں ہوا ہے ؟ ہمارا میدانِ تعلیم روشنیِ قرآن وحدیث سے ہنوز کیوں منوّرنہیں ہے؟ نظام تعلیم میں مقصدیت نے عشق کی منہاج کیوں حاصل نہیں کی ہے ؟ اور ہم کب تک اس ملّت مسلمہ مرحومہ کو لادینی تعلیم کی بے یقینی اور بے اعتمادی سے دو چار رکھیں گے ؟ ہم موجود ہ اور فرسود ہ نظام تعلیم پر نظرثانی کر کے روح و مادہ اور دین و دنیا کے امتزاج کی مثبت اور حقیقت افروز کوشش کا آغاز کب کریں گے ؟ ہم کب تک مشاہدۂ کائنات اور تسخیر کائنات جیسے علوم کو خارج از نصاب رکھیں گے اور دین و سائنس کو کب تک جدا رکھیں گے ؟ ہم اس حقیقت کا ادراک کب کریں گے کہ تعلیم ایک نسل سے دوسری نسل تک تہذیبی اقدار منتقل کرنے کا عنوان ہے اور تعلیم کی تہذیبی و ثقافتی قدر و قیمت کو ناہمواریِ فکر پر قربان کر کے آنے والی نسل کی تباہی کا سامان کرنا گناہِ کبیرہ ہے!

سامعینِ کرام!

یہ اور اس قسم کے سوالات تنہا میرے نہیں ہیں ، یہ اس مذاکرۂ ملّی کے سوالات ہیں اور ہم ان کا جائزہ لینے کی دلی خواہش رکھتے ہیں-

نظریہ و فلسفۂ تعلیم کو سمجھنے کے لیے ہر دور میں تعلیم کی مختلف تعریفیں قائم ہوتی رہی ہیں جو تہذیب و تمدن اور ثقافت و روایت کی آئینہ دار ہیں ، مگر کیا علم و تعلیم کی اس سے زیادہ جامع تعریف کوئی کی جا سکتی ہے کہ جو قرآن وحدیث کی روشنی میں ہمیں ملتی ہے ؟ حواس خمسہ کے محسوسات اور مدرکات جب نہاں خانۂ فکر و ذہن میں پخت و پز پاتے ہیں تو ان سے حسِ سادس جنم لیتی ہے اور جب اس حسِ سادس کی تحریکات حواس خمسہ کو برسرعمل کرتی ہیں تو علم کا ظہور ہوا کرتا ہے جو تعلیم کا عنوان بنتا ہے - اس پخت و پز میں روحانیت کے علی الرغم انسانی دماغ کے کم از کم پچیس ۲۵ ارب نیوٹرون حصہ لیتے ہیں -اس دماغی نظام کار کے سامنے ہماری دنیا کا تمام ٹیلی فونی نظام بھی بے انتہا چھوٹا ہے اور بے حقیقت ٹھہرتا ہے ! ہمیں لازماً قدرت کاملہ کی طرف لوٹنا ہوگا اور تعلیم و تعلم کے نظام و نصاب کے لیے قرآن و حدیث سے اس انداز سے اکتسابِ فیض و نور کرنا ہوگا کہ ہمارے نظام تعلیم کا عنوان اولین

تعلیم قرآن و حدیث ہو - ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ تعلیم کا موضوع محض تعلیم کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق بقائے ملّی سے ہے -

نظامِ تعلیم اور نصاب تعلیم دونوں ہماری اولین توجہ چاہتے ہیں اور مجھے یہ کہنے میں ذرہ برابر بھی تامل محسوس نہیں ہوتا اور نہ باک ہے کہ ہماری قومی آمدنی میں تعلیم کا بجٹ ہر شعبے سے زیادہ ہونا چاہیے ، حتّٰی کہ دفاع سے بھی زیادہ بجٹ تعلیم کا ہونا چاہیے - میں جب یہ مطالبہ کرتا ہوں تو میں کسی طرح بھی دفاع پاکستان کی تخفیف نہیں کرتا ہوں مگر یہ بتانا چاہتا ہوں کہ دفاع پاکستان کے لیے سب سے زیادہ مضبوط اور قابل اعتماد اسلحہ تعلیم یافتہ افراد ہی ہو سکتے ہیں - ایسی ملّت کہ جس کا ہر فرد مثبت تعلیم سے آراستہ ہو ، خود شناس ہو اور خدا شناس ، ایسی ملّت کہ جس کا ہر فرد تعلیم اسلامی سے مزین ہو اور جہاں خواندگی سو فیصد ہو ، وہ ملّت اور اس ملّت کا ہر فرد ایف[۱۲] سے زیادہ طاقت ور ہو - ہم اپنے دل میں درد پیدا کریں اور پوری دیانت و صداقت کے ساتھ سیاسی بازی گریوں سے بلند ہوکر اور ذاتی مفادات اور حب اقتدار سے بالا ہوکر ذرا تو غور کریں کہ آج اس ملّت عظیم میں فکر کا انتشار کیوں ہے ؟ اور اس کا رخ کعبے کی طرف کیوں نہیں ہے ؟ عظمتِ قرآن کے مکمل احساس و ادراک سے یہ محرومی کیوں ہے ؟

انسان آج بھی فکر و نظر کے میدان میں عالمیت کا تصور رکھتا ہے - انسانیت کے تقاضے ہمیشہ اسے عالم گیر اندازِ فکر اختیار کرنے کی دعوت دیتے رہے ہیں - وہ آج تعلیم کے میدان میں بھی عالمیت کا مزاج رکھتا ہے - پاکستان کا مسلمان جسے بہر صورت عالمیت کا ہمہ گیر مزاج اختیار کرنا چاہیے تھا وہ اپنی اس آفاقی صفت سے محروم ہو کر آج تعلیم کو عالمی اور عالم گیر مزاج دینے سے قاصر ہے - پاکستان کا مسلمان جسے اقوام و امم عالم کے لیے ایک تعلیمی نظام پیش کرنا چاہیے تھا اس کا یہ عالم ہے کہ خود اس کے اپنے وطن میں فرقہ بندیوں نے تعلیم کو کئی خانوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا ہے اور یہاں عقائد نے مختلف نظام ہائے تعلیم کو جنم دیدیا ہے - اس سے زیادہ کیا قیامت برپا ہوگی کہ تعلیم کے اظہار سے ہم آج مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں - ایک گروہ جدید تعلیم کا ہے - ایک گروہ دینی تعلیم کا ہے - ایک گروہ ہے کہ جو تعلیم سے یکسر محروم ہے - پھر اس میں بھی گروہ در گروہ ہیں - انگریزی میڈیم اور اردو میڈیم ، اور پھر امتیازِ امیر و غریب - یہ الم ناک اور اذیت ناک گروہ بندی تعلیم کو ملّی منصوبہ ہائے تعمیر میں مقام اولیت

نہ دینے کی وجہ سے عالم وجود میں آئی ہے اور تعلیم کے میدان میں ہماری بے فکریاں سالمیت پاکستان کے حق میں مفید نہیں رہی ہیں ۔ ہم آج تک اس فیصلے پر بھی پوری طرح عمل نہیں کر سکے ہیں کہ ہمارے نصاب تعلیم کا عنوان ملّی وحدت ہونا چاہیے ، اور علاقائی روایات اور ثقافت اور تہذیب و تمدن کے نقوش کو ملّی نقوش کا آئینہ دار ہونا چاہیے اور قومی زبان کو تمام علاقوں کی مشترک زبان کا مقام حاصل ہونا چاہیے۔

رفیقان گرامی!

میری ان گزارشات سے یہ تاثر پیدا نہیں ہونا چاہیے کہ تعلیم کے نقائص کا ذمہ دار کوئی ایک طبقہ ، کوئی ایک محکمہ یا چند ادارے ہیں۔ حقیقت پسندانہ بات یہ ہوگی کہ اجتماعی نظام اور اس کے تمام شعبوں کے خوب و زشت کی ذمہ داری کسی نہ کسی حد تک معاشرے کے تمام افراد پر ہوتی ہے ۔ تعلیم کے معیاری ، بامقصد ، نتیجہ خیز اور مثبت نہ ہونے میں صرف حکومت اور اس کا محکمۂ تعلیم ہی شریک نہیں ہے بلکہ درس گاہیں، اساتذہ ، والدین اور خود طلبہ بھی اس بگاڑ کے حصے دار ہیں ۔ میں نے دیکھا ہے کہ ہر ترقی یافتہ ملک میں کوئی ایک فرد یا ادارہ نہیں بلکہ پورا معاشرہ تعلیم دیتا ہے ، یعنی استاد کی حیثیت پوری قوم کو حاصل ہوتی ہے ، کیوں کہ اگر معاشرے کے مختلف حصوں میں کسی معاملے میں ٹکراؤ ہو اور ہم آہنگی نہ ہو تو وہ معاملہ کبھی نہیں سلجھتا ، تعلیم بھی ایک وسیع سماجی عمل ہے اور اس میں پورے سماج کی ہم خیالی اور یک عملی ضروری ہے ۔ افسوس کہ ہمارے ہاں یہ ہم خیالی اور یک عملی مفقود ہے ۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم کا جتنا کچھ بجٹ ہوتا ہے وہ بھی صحیح مقاصد پر خرچ نہیں ہوتا۔ خواندگی کا تناسب جتنا کچھ بڑھا ہے وہ بھی حسب توقع نتائج نہیں دے رہا ہے ، ذہنی اصلاح اور اخلاقی تربیت کے لیے جو نصاب بھی بنایا جاتا ہے وہ بے ثمر رہتا ہے ۔ آج جتنا کچھ قرآن و حدیث کا مطالعہ بھی شامل نصاب ہے وہ ہمارے بچوں کے کردار سے منعکس نہیں ہو رہا ہے ۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ہی نہیں تعلیم شروع کرتے وقت ہی بچّے کے ذہن میں یہ بات جڑ پکڑ لیتی ہے کہ صرف تعلیم وہ اچھی ہے جو بڑی تنخواہ کی نوکری دلائے۔ صرف وہ ڈگری بہترین ہے جو اونچی آمدنی کا ذریعہ ہو اور ان مقاصد کے نقوش بچّے کی روح میں پیوست ہو جاتے ہیں ۔ چناں چہ وہ علم و معلومات حاصل کرنے ، ذہن کو روشن اور کشادہ کرنے ، نقطۂ نظر کو وسعت دینے ، اور اپنے پوشیدہ جوہروں کو اجاگر کرنے کے بجائے

صرف اور صرف امتحان اعلا سے اعلا نمبروں کے ساتھ پاس کرنے پر اپنی ساری توانائیاں صرف کرتا ہے - پھر اسی پر بس نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر قیامت یہ ہے کہ امتحان میں اچھے نمبر حاصل کرنے کے لیے وہ جائز اور صحیح ذریعوں اور طریقوں کے بجائے ناجائز ، غیر قانونی، غیر اخلاقی اور ناشائستہ طریقے اختیار کرنے سے نہیں چوکتا - مختلف طالب علموں میں جو فرق ہے وہ صرف ہمت و جرات کا فرق ہے -
کیا ہم ایمان داری سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ ہم اپنے بچوں کی ان حرکات میں شریک نہیں ہیں - ہماری شرکت مثبت ہو یا منفی ، کم درجے کی ہو یا اعلا درجے کی ، مستعدانہ ہو یا مجہول نوعیت کی ، ہم بحیثیت ماں باپ ، بحیثیت استاد ، بحیثیت افسر تعلیم اور بحیثیت منتظم بہرحال اپنے بچوں کے شریک کار ہیں -

اس صورت حال کی جڑ نقطۂ نظر کے اجتماعی اور قومی و ملّی نہ ہونے میں پوشیدہ ہے - اور اسی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ طلبہ وقتی سیاست کی خارزار میں بھی الجھ جاتے ہیں - سیاست شجر ممنوعہ نہیں ہے بلکہ آزادی کے بعد تو اجتماعی نظام کا اہم ترین شعبہ ہے اور دوسرے شعبوں کی طرح اس شعبے کے لیے بھی بچوں کو تیار کرنا تعلیم کے وظائف سے باہر نہیں ہے ، لیکن اس کا مقصد قومی و ملی خدمت اور فلاح ہونا چاہیے نہ کہ محدود جماعتی ، گروہی اور علاقائی مفادات۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ بچوں کو یقیناً آگے چل کر قیادت کا منصب سنبھالنا ہے اور اس کے لیے علم و معلومات اور ذہنی افق کی وسعت ضروری ہے ، جس کے بغیر ملک و ملّت کا شیرازہ منتشر ہونے سے نہیں بچ سکتا ، مگر آج جو صورت حال ہے وہ ہم میں سے ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ طلبہ کو محدود گروہی مفادات کے لیے استعمال کرنے کی کوشش میں ہم کل جو کچھ ہونے والا ہے اس کو بھول گئے ہیں - ہم اپنے بچوں کو قومی سیاست کے بجائے محدود سیاست کے لیے تیار کر رہے ہیں - بلاشبہ جماعتی سیاست بھی سیاسی عمل کا ایک ضروری حصہ ہوتی ہے ، لیکن اس کے لیے وسیع النظری اور کشادہ قلبی پہلی لازمی شرط ہے ، جس کے بغیر ہم مستقبل کے لیے عظیم و شریف مدبّر اور منتظم پیدا نہیں کر سکتے -

موجودہ صورت میں جو بچّے معالج ، انجینئر ، پروفیسر، صحافی اور تاجر بننا چاہتے ہیں وہ بھی سیاسی اتار چڑھاؤ کی نظر ہو سکتے ہیں اور ان کی یکسوئی ، ان کا اعتماد ، ان کی امنگیں مجروح ہو سکتی ہیں اور ہو رہی ہیں- نتائج ہمارے سامنے ہیں کہ اہلیت اور قابلیت کے

بجائے دوسرے عوامل معیار ترقی و فلاح سمجھے جانے لگے ہیں -

ایک اور وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے - قرآن و حدیث کی اہمیت پر زور دینے اور دینی تعلیمات کی ضرورت پر بہ شدت متوجہ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اپنے عہد سے آنکھیں بند کر لی جائیں- ہم جس عہد میں سانس لے رہے ہیں اس کو نظر انداز کرنا کسی لحاظ سے مفید نہیں ہو سکتا - ہمارا نظام ایسا ہونا چاہیے کہ ہم بہت اچھے انسان ، بہت مخلص مسلمان اور بہت سچے پاکستانی پیدا کر سکیں ، جو ایک طرف اپنی تہذیب اور روایات کے امین ہوں تو دوسری طرف عہد جدید کے تقاضوں کو سمجھ کر پورا کر سکیں تاکہ ترقی کی دوڑ میں پاکستان پیچھے نہ رہ جائے - ترقی اور تغیر ایک ناگزیر عمل ہے-حالات کی تبدیلی کے ساتھ ضروریات اور تقاضے بھی بدل جاتے ہیں - علم میں بھی اضافے ہوئے ہیں اور سائنس نے بھی بہت ترقی کی ہے ، صنعت کی ترقی نے بھی بہت سے نئے مسائل پیدا کیے ہیں - معاشی عوامل بھی معاشرتی اقدار پر اثر انداز ہو رہے ہیں - ایک زندہ قوم کی حیثیت سے ہمیں وقت کے چیلنج کا مقابلہ کرنا ہے اور پاکستان کو علم و حکمت کی دولت سے مالا مال کرنا ہے - دوسری قوموں کے دوش بدوش آگے بڑھنے کے لیے تغیر و تبدیلی کو قبول کرنا پڑتا ہے، اور ہم اس تغیر اور پیش رفت کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں ، لیکن ہم اپنی تہذیب کو برقرار رکھتے ہوئے اور اپنی روایات کو آگے بڑھاتے ہوئے نئے تقاضوں کی تکمیل کریں گے - ہم جدید چیزوں کے خلاف نہیں ہیں اور ان سے استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے ، بلکہ ہم اچھی بات کو اپنی میراث سمجھتے ہیں ، کیوں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ حکمت کو مومن اپنی گم شدہ میراث سمجھتا ہے - وہ جہاں بھی اس کو پاتا ہے حاصل کر لیتا ہے:

الحکمۃ ضالّۃ المومن اخذھا حیث وجدھا

لیکن ہر نئی چیز حکمت نہیں ہوتی اور اس قابل نہیں ہوتی کہ اس کو بلا تامل اپنا لیا جائے ، اس لیے نظام تعلیم کی خوبی یہ ہے کہ طالب علم اپنے ثقافتی ورثہ سے پوری طرح باخبر ہونے کے ساتھ ذہنی صلاحیتوں اور فنی مہارتوں سے بھی اچھی طرح لیس ہوں - بانیِ پاکستان قائد اعظم نے تعلیم کے سلسلہ میں ایک بار فرمایا تھا :

" اگر ہمیں حقیقی اور تیز رفتار ترقی کرنی ہے تو ہمیں تعلیم کے مسئلہ پر خاص توجہ دینی چاہیے - اپنی

تعلیمی پالیسی اور پروگرام کو ایسے خطوط پر چلانا چاہیے جو ہماری قوم کے مزاج کے مطابق ہوں، جو ہماری تاریخ اور ثقافت سے ہم آہنگ ہوں، جو دنیا بھر میں ہونے والی وسیع ترقیوں اور جدید تقاضوں کے مطابق ہوں"۔

عزیزان ملت!

مجھے یقین ہے کہ آپ ان خیالات کو میرے افکار پریشاں کا عنوان نہیں دیں گے۔ میں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ مذاکرۂ ملی تعلیمات نبوی ؐ ـــ نظریہ و فلسفہ تعلیم اسلامی کے سامنے اس قدر وسیع و عمیق کام ہے جس سے مندوبین کرام اور مبصرین ذی احترام آئندہ پانچ روز میں عہدہ برا ہوں گے۔ ہمیں میدان تعلیم میں پاکستان کی ان مخلص و درد مند شخصیات کی خدمت میں ہدیۂ تشکر و امتنان پیش کرنا چاہیے کہ وہ ملت اسلامیہ کے عظیم تر مفاد میں یہاں جمع ہوئے ہیں اور یہ عزم رکھتے ہیں کہ اس مذاکرۂ ملی میں تبادل خیال کے بعد جو نتائج اخذ ہوں گے اور خاکۂ نصاب اور منصوبۂ عمل تیار ہوگا، اسے ایک تحریک تعلیم ملی کا عنوان دے کر اس میدان میں برسر عمل ہوں گے۔ دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ملت پاکستانیہ کی اس عظیم خدمت کی توفیق عطا فرمائیں اور اس جدوجہد کے نتیجے میں ریاست اسلامی پاکستان کا نظام و نصاب تعلیم ہماری ملی امنگوں کا آئینہ دار ہو اور آفاقیت کا عنوان۔

عہدِ حاضر میں تعلیم اسلامی کی اہمیت

جناب پروفیسر اشفاق علی خاں

جب ہم اسلامی تعلیم اور اسلامی نظریے اور فلسفے کا ذکر کرتے ہیں تو پہلی ضرورت ، جس کا معمر اہل مکتب کو احساس ہوتا ہے ، اس اعتراض سے عہدہ برآ ہونا ہے جو آج سے بیس تیس سال پہلے اکثر موضوع بحث ہوتا تھا اور آج تک سننے میں آتا ہے ۔ اس اعتراض کی بنیاد یہ تھی کہ حقیقت ایسی وحدت ہے جس کی مختلف انواع و اقسام کا تصور ہی غیر منطقی ہے ۔ اس اعتراض کی وضاحت کے لیے درسگاہوں میں نوجوان جویانِ علم اپنے ڈھب کی مثالیں دیا کرتے تھے ۔ ایک ایسی مثال جو راقم الحروف نے اتفاقاً نوجوان طلبہ کی گفتگو میں سنی وہ کشش ثقل سے متعلق تھی اور ایک ذہین نوجوان کہہ رہا تھا کہ کشش ثقل محض کشش ثقل ہے اور اس میں اسلامی کشش ثقل کی تخصیص تلاش کرنا معنویت اور منطق سے خالی ہے ۔ اس پر ایک صاحب بولے کہ آرٹ یا جمالیات کو آپ اسلامی یا غیر اسلامی نہیں کہہ سکتے ، لیکن مسلم آرٹ ایک بیّن حقیقت ہے یعنی وہ آرٹ یا جمالیاتی تخلیقات جو مسلمانوں نے عہد ماضی میں پیدا کیں ایک خاص نہج اور وضع کی حامل ہیں ۔

اس گفتگو کی مزید تفصیل بیان کرنا بے فائدہ ہوگا ، لیکن اس کا ذکر اس لیے لازم ہوا کہ ہمارے باشعور طبقے میں ایسے افراد بھی ہیں جو اسلام کے کچھ مظاہر سے اتفاقیہ واقفیت رکھتے ہیں ، لیکن دینِ کامل کی آفاق گیر معنویت سے آگاہ نہیں ہیں ۔ ان میں کچھ اس عصبیت کو راہ دیتے ہیں کہ تعلیم و تعلّم میں اسلامی اور غیر اسلامی کی تفریق ناروا ہے ۔ گویا ترکِ مذہب بھی ایک مذہب ہے !

یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے کہ وہ علوم جو مادّے کی ساخت اور تغیر کی دریافت اور بیان سے متعلق ہیں ان پر اسلامی اور غیر اسلامی تفریق کا اطلاق نہیں ہوتا ۔ لیکن وہ علوم جو تعلقات انسانی پر مبنی ہیں انکی نہج اسلامی یا غیر اسلامی ہوسکتی ہے ، کیونکہ تعلقاتِ انسانی کی اساس وہ عقائد ہیں جنہیں ذہن انسانی نے قبول کیا ہے ۔ مثلاً تجارت ، لین دین اور دیگر اقتصادی امور کے بنیادی مفروضات کے علاوہ حقوق العباد کا تصور بھی مختلف گروہوں میں تاریخ کے مختلف ادوار میں ایک سا نہیں رہا ۔ حکومت اور شہریت کے مسائل اس امر کے متقاضی رہے

ہیں کہ انسان سے انسان کے سلوک کے معمولات پر گروہی اتفاق ہو۔ چنانچہ ہر خطّے اور ہر دور میں عملاً اس امر کی ضرورت رہی ہے کہ نووارداں حیات یعنی نئی نسل کو افراد کے باہمی تعلقات کی رسوم سے آگاہ کیا جائے اور ان کے اذہان پر وہ ضابطہ ثبت کیا جائے جو اس گروہ یا اجتماعیت نے قبول کر رکھا ہے، تاکہ ان کی حیوانی جبلّتیں جو انفرادی خواہشات کی صورت میں نمودار ہوتی ہیں دوسرے افراد سے تصادم کے مواقع پیدا نہ کریں اور قبیلے کے ایسے انتشار کا باعث نہ بنیں جس سے ہر فرد کی بقا خطرے میں پڑجائے۔

تعلیم اسلامی

جب ہم اسلامی تعلیم کے موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں تو معاشرے کی ایک ایسی بنیادی ضرورت کا تذکرہ ہوتا ہے جو موجودہ ایٹمی دور میں فقید المثال اہمیت کی حامل ہوچکی ہے اور جس کا دائرہ کسی ایک گروہ پر نہیں بلکہ تمام اولاد آدم پر محیط ہے۔

علم کی جستجو پر کوئی قید عائد نہیں کی جاسکتی، لیکن علم کی یافت کا استعمال مفید بھی ہوسکتا ہے اور مضر بھی۔ اسلام اس ضمن میں مثبت اور منفی کی تفریق کرتا ہے اور ان اقدار کی پرورش کی دعوت دیتا ہے جو انسان کی فلاح و بہبود کی افزودگی کے لیے ناگزیر ہیں۔ اس کا دوسرا پہلو جس کے بغیر اسلامی اقدار کے بیان کی تکمیل ناممکن ہے ان منفی اقدار کی تردید ہے جو انسان کو انسان کا معاون اور مددگار نہیں بلکہ مخالف اور متشدد استحصال کار بناتی ہیں اور جن سے انسانیت کی توانائیاں مجتمع ہونے کے بجائے اندرونی خلفشار اور تصادم کے باعث ضائع ہوجاتی ہیں۔

دور حاضر میں حصول علم کی تمام کوششیں اسلام کے احکام کے مطابق ہیں۔ لیکن اسلامی تعلیم وہ ہے جو اسلامی عقائد، فرائض اور نواہی سے فرد کو آگاہ کرے۔ نیز ماضی کے ان واقعات سے مطلع کرے جو اسلام کے اطلاق سے مختلف جماعتوں کو پیش آئے۔ یعنی یہ کہ مختلف حالات میں اسلام کے پیروکار اسلامی ضابطے سے کیسے عہدہ برآ ہوئے۔ مروجہ علم التاریخ مار دھاڑ اور طاقت کی بالادستی کی داستان ہے۔ اگر یہ انسانیت کی مساوات اور عدل کی طرف مراجعت کی کہانی ہوتی تو اسلامی تاریخ کہلا سکتی تھی اور اس نسبت سے اسلامی فلسفہ تاریخ کی تعریف کی جاسکتی ہے۔

اسلام چونکہ سلامتی کا دین ہے اسلیے نوع آدم کی بہبود اور فلاح

ہمیشہ اسلامی حاکموں کے پیش نظر رہی ۔ محمد بن قاسم جب پاکستان کے جنوب میں اسلام کے نفاذ کے لیے وارد ہوئے تو اسلام کی بنیادی قدر یعنی نوع انسان کی سلامتی اور فلاح کے پیش نظر انہوں نے بدھ مت کے ماننے والوں اور برہمن مذہب کے پیروؤں کو اہل کتاب قرار دیا جس کے معنی یہ تھے کہ اسلامی حکومت کی رو سے یہ غیر مسلم وہ لوگ تھے جنہیں ہدایت ملی تھی ۔ دوسرے لفظوں میں جنوبی پاکستان کے باشندے ایک خاص تمدن کے ضابطے میں تھے جسے یک قلم موقوف کردینا اور ان کے عقائد کو پامال کرنا انہیں تکالیف اور مصائب میں مبتلا کرنے کا باعث بن سکتا تھا ۔ چنانچہ مسلمان حکام پر لازم آیا کہ جب تک وہ اسلامی تعلیمات کی افادیت کو سمجھ کر اسلام قبول نہ کرلیں اس وقت تک اسلامی حکومت مطشرتی امن و امان اور غیر مسلم عوام کے انسانی حقوق کے پیش نظر ان کے عقائد اور رسوم و رواج کا لحاظ رکھے ۔ البتہ اسلامی روح ایسی رسوم کی اجازت نہیں دے سکتی تھی جن سے اولاد آدم کے فطری حقوق کی ظالمانہ نفی ہو مثلاً بیوہ عورتوں کو زندہ جلانا اور کسی دیوی یا دیوتا کی خوشنودی کے لیے نیچ ذات کے افراد کو بھینٹ چڑھانے اور ان کی جان لینے رکی ممانعت تھی۔ چنانچہ جوں جوں اسلام کی روشنی پھیلتی گئی یہاں کے باشندے فرداً فرداً اور اپنے سربراہوں کے اتباع میں اجتماعاً ، امت مسلمہ میں داخل ہوتے چلے گئے اور اسلامی حکومت کی طاقت میں اضافہ ہوتا رہا ۔

اسلامی تعلیم دراصل تبلیغ دین کا ایک مسلسل عمل ہے اور اس مقصد کے لیے کسی نئی دریافت کی ضرورت نہیں ۔ البتہ مغربی تہذیب کے عروج کے دور کا مسلسل پراپیگنڈا کہ اسلام کو بزور شمشیر پھیلایا گیا کی تصحیح کی ضرورت ہے ۔ جو لوگ مغرب کی ذہنی غلامی سے قدرے آزاد ہوچکے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس دور میں جب ذرائع آمد و رفت محدود اور مشقت طلب تھے ،صرف نصف صدی کے لگ بھگ کے عرصے میں اسلام کا بحراوقیانوس سے لے کر بحرالکاہل تک پھیل جانا اس امر کی دلیل تھی کہ اسلام پرانی دنیا میں اس طرح نازل ہوا جیسے سوکھی زمین پر باران رحمت کا نزول ہوتا ہے ، اور ایک دکھیا اور تمدنی انجماد میں پھنسی ہوئی انسانیت نے اسے سینے سے لگایا اور وہ سرعت سے اس شمع کو لیکر آگے بڑھے

اسلام کی بالادستی کی طویل تاریخ میں فلسفۂ تعلیم و تعلّم ، تحقیق و تصنیف ایسی منازل طے کرچکا ہے جن کی رفعت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ڈاکٹر پرویز امیر علی ہود بھائی نے لاہور ایجوکیشن سوسائٹی کے ایک اجلاس میں معروف سائنسی رسالے "نیچر" کے 24 مارچ 1983 کے شمارے سے مندرجہ ذیل اقتباس پڑھا ۔

"آج سے ہزار سال قبل اپنے عروج کی انتہا پر عالم اسلام نے سائنس میں اور خصوصاً ریاضی اور طب کے میدان میں نمایاں کارنامے سرانجام دیے - اپنے دور عروج میں بغداد اور جنوبی اسپین میں یونیورسٹیاں قائم کیں - جہاں تحصیل علم کے لئے ہزاروں افراد جوق در جوق آتے تھے - حاکموں کے گرد سائنسدانوں اور فنکاروں کا مجمع ہوتا - آزاد خیالی کی فضا میں یہودی عیسائی اور مسلمان باہم مل کر کام کرسکتے تھے - آج یہ سب بس ایک یاد رفتہ ہے"

(ڈاکٹر ہود بھائی کے خطاب کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ اسلامی ریاست کی ترقی رواداری اور روشن خیالی کا نتیجہ تھی نیز اس یقین کا کہ حکومت اور حکمت ایک ہی وحدت کے دو رخ ہیں - موجودہ بد حالی کے دور میں ہم ان سادہ حقائق کو سمجھنے سے قاصر ہیں اور ہمارے اذہان پر غلامی کے دور کے زخم اب تک مندمل نہیں ہوئے - چنانچہ یہ جاننے کے لیے کہ ہم بھوکے پیاسے ہیں یا نہیں ہم کہتے ہیں پاکستان سے باہر جاؤ یا باہر سے کسی کو بلاؤ کہ وہ ہمیں بتائے تاکہ ہمیں یقین آئے ۔

اسلام کی تاریخ میں اسلامی تعلیم کے پس منظر میں تمام اولاد آدم کی سلامتی اور فلاح کی اقدار کارفرما نظر آتی ہیں - ان اقدار کا سب سے بڑا منبع قرآن حکیم ہے - نیز چونکہ پیغمبر اسلامؐ کو رحمتہ للعالمین کے طور پر بھیجا گیا تھا اس لیے سیرت نبوی اور حدیث، اسلامی تعلیمات کا اہم جزو ہیں - فقہی تنوع اس اہم حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ اسلام انسان کو بنیادی اقدار کی روشنی اور ضابطے میں اپنے ماحول کے مطابق عمل کا حکم فرماتا ہے۔

اسلام کا ورود تاریخ انسانی کا اہم ترین واقعہ ہے کیونکہ اسلام کے بنیادی عقیدے یعنی ایک واحد اور لاشریک خالق ، تمام انسانیت کا ایک جد امجد جسے خالق کل نے روئے زمین پر اپنا نائب مقرر فرمایا اور اولاد آدم کے لیے ایک مکمل قانون اپنے رسول آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے عطا کیا ، اس عقیدے نے نوع انسانی کے تمدنی جبلّت کو متاثر کیا - تاریخ کے اس دور میں جب مسلمان اس روئے زمین کی سب سے بڑی طاقت تھی ، اسلام کی بنیادی تعلیمات کی خبر تمام تمدنی گروہوں تک پہنچ گئی اور دین فطرت میں تعقل ، تدبر اور تفکر کے فریضے کا فلسفہ تمام عالم میں توہمات ، استحصال اورمنقولات کی کورانہ تقلید کی جڑوں

کو ھلانے لگا - چنانچہ ھندوستان اور یورپ کی منجمد تہذیبوں میں ایک مثبت انقلاب کا بیج بویا گیا ، اور ان خطوں میں بھی جہاں علامتی اسلام سیاسی وجوہ کے باعث نہیں اپنایا گیا ، حقیقی اسلامی اقدار تیزی سے پھیلنا شروع ہوئیں - اور اولاد آدم کے ان گروھوں نے رحمت للعٰلمین کے طفیل ترقی کی منازل طے کرنی شروع کردیں -

اسلام چودہ سو سال قبل روئے زمین میں طلوع ھوا اور اسکے پیروکاروں نے اسی وقت کی دریافت شدہ تمام دنیا کو اپنا پیغام پہنچایا - بلکہ یہ کہنا زیادہ قرین حقیقت ھوگا کہ آٹھویں صدی عیسوی میں پرانی تہذیبوں کو اسلام کی اقدار کے صاف اور غیر مبہم بیان کی اتنی شدید ضرورت تھی کہ انہوں نے خبر ملتے ھی دین فطرت کو اپنالیا اور انکی وہ بیڑیاں کٹ گئیں جن کی وجہ سے ان کی مادی اور اخلاقی پیش رفت صدیوں سے ساکت اور منجمد ھوگئی تھی - اھل پاکستان کے لیے اس عمل کی قریب ترین مثال محمد بن قاسم کا دریائے سندھ کے ڈیلٹا میں بطور حملہ آور وارد ھونا ھے - یہاں کے لوگوں میں جنگ اور فاتح و مفتوح پر انکے نتائج کا ایک خاص تصور تھا - انہیں ایسے عساکر کا تجربہ نہ تھا جو اپنے گھوڑوں کا چارہ قیمتاً خریدتے تھے - مقامی آبادی میں عورتوں ، بوڑھوں اور بچوں کی تحریم کرتے تھے ، گفتگو میں لاف زنی سے اجتناب کرتے تھے - چنانچہ یہ محض اتفاق یا مقامی رقابت ھی نہ تھی کہ چار ھزار جاٹ لشکر اسلامی میں شامل ھوکر خود اپنے حکمرانوں کے خلاف لڑے - محمد بن قاسم کی مختصر فوج میں بتدریج اضافہ ھوتا رھا اور مسلمانوں کی فتوحات دریائے سندھ اور اسکے مطون دریائے ستلج کے ساتھ ساتھ پھیلتی چلی گئیں -

مسلمانوں کے زوال کی تاریخ کو اسلام کے زوال کی تاریخ کہا گیا ، مگر یہ صحیح نہیں ھے - اسلام ایک فلسفہ حیات ھے اور طریق زندگی ھے اور اس پر کسی گروہ کی اجارہ داری ثبت کرنا نہ صرف فہم صالح اور واضح منطق کے مطابق نہیں ھے بلکہ خود اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا - اگر کوئی فرد یا اجتماعیت اپنے اسلاف کی اقدار سے پہلو تہی کرتی ھے اور مختلف سمتوں میں بھٹک جاتی ھے تو وہ بنیادی اقدار غلط ثابت نہیں ھوتیں گو کہ گروھی کشمکش میں قوانین فطرت کی اسمیّت میں اختلاف پیدا ھونا بالکل متوقع ھے - البتہ حقیقت کا بدل جانا یا محو ھوجانا اور اسمیت کے باقی رھنے سے زوال پذیر گروھوں کی اسمیت پر بھی مخالف حملے ھونے لگتے ھیں - مسلمانوں کے زوال کی کہانی دھرانے اور اس کی توضیحات پیش کرنے کا یہ موقع نہیں ھے - مختصراً یہ کہا جاسکتا ھے کہ رب المشرقین و المغربین کے احکام کی خلاف ورزی مسلمانوں کے زوال کا

باعث بنی - جب کہ دین فطرت کے انہی احکام کی مطابقت سے دوسرے گروہ ان گروہوں پر غالب آئے جو حقیقتاً راستے سے بھٹک گئے،لیکن روایتی اسمیت کی بنا پر اسلام کے دعویدار بنے رہے - حکیم الامت کا شعر :-
کافروں کی مسلم آئینی کا بھی نظارہ کر- اور اپنے مسلموں کی مسلم آزاری بھی دیکھ
اس ضمن میں انتہائی بامعنی ہے - بلکہ وہ نظم جس کا یہ شعر ہے مسلمانوں کے زوال کا اجمالی جائزہ ہے -

حقوق العباد ، عدل اور احسان کی اقدار کے متوازی جدید فلسفے کو ہیومنزم (HUMANISM) کہا جاتا ہے - یہ کہنے کی ضرورت نہ ہونا چاہیے کہ ہیومنزم کی جڑیں اسلام میں ہیں - اسلام اور ہیومنزم میں ایک اہم فرق یہ ہے کہ عبادات اور فرائض کے عدم تعین کے باعث ہیومنزم میں وہ توانائی نہیں جو انسان کی ہلاکت خیزی اور مہلک استحصال کو روک سکے جب کہ اسلام میں انسانی ذمہ داری پر عمل درآمد اور اسکے لیے تمام تر تیاری کے لیے واضح فرائض عائد کیے گئے ہیں اور عبادات کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے کہ کشا کشِ ایام میں ذہنِ انسانی ان فرائض کو یاد رکھے اور ان کی ادائیگی میں سینہ سپر ہوجائے -

دور حاضر میں ذرائع ابلاغ میں فقید المثال پھیلاؤ سے یہ تقریباً ناممکن ہوچکا ہے کہ کسی ملک یا خطے میں تعلقاتِ انسانی کی بہتری یا مثبت ارتقا کی کوئی مضبوط تحریک ہو اور اس کا عالمی رد عمل نہ ہو - ہمارے دور میں خاصی مادی ترقی ہوئی اور تسخیر کائنات کی بہت سی منزلیں طے ہوئیں حتی کہ مشیت ایزدی نے خلوت کے کچھ ایسے راز بھی اہل تحقیق و جستجو پر افشا کردیے کہ اولاد آدم جس کے ذمے نیابت الہی سپرد ہوئی تھی ایک کٹھن امتحان اور آزمائش سے دوچار ہوگئی -
آج کیفیت یہ ہے کہ بنی نوع انسان اپنے لیے آلات خودکشی تیار کرچکا ہے ، لیکن ان مہلک آلات کے استعمال میں آجانے کے امکان سے ایک ایسا مہیب خوف ہر قوم اور ہر خطے کے باشندوں پر طاری ہوچکا ہے کہ عالمی ابلاغ جو مشینی افزونی اور ترقی کی وجہ سے کرۂ ارض پر جاری ہے • زیادہ تر اپنی توجہ ان امور کی طرف دے رہا ہے جو اس جنگ کے امکانات پر اثر انداز ہوسکتے ہیں جو بقول ماہرین موجودہ انسانی تہذیب کا خاتمہ کردیگی - روس اور امریکہ کے پاس مہلک ایٹمی ہتیاروں کے سب سے بڑے ذخیرے ہیں اور ان دو طاقتوں کے حلقہ ہائے اثر میں کروڑوں افراد کی قلبی اور روحانی کیفیت اس فرد کی سی ہے کہ جسے ہر ممکن جسمانی آسائش میسر ہو اور لذّات کام و دہن کے جملہ لوازمات اسے دیدیے جائیں،لیکن جسے خود پر ایک خوفناک موت کا خطرہ منڈلاتا دکھائی دے -

ان حالات میں تحریک احیائے اسلام نہ صرف اسلامی ممالک میں زور پکڑ گئی ہے بلکہ ان ممالک میں بھی جہاں اسلام کی تبلیغ کسی موثر شکل میں نہیں پہنچی ، سوچ سمجھ رکھنے والے کروڑہا افراد میں ان اخلاقی ، روحانی اور انسانی اقدار کی تلاش کے ظاہر آثار نظر آتے ہیں جو بنی نوع انسان کو خود اپنے بہائمی ، سفلی اور خود غرضانہ بے انصافی سے پیدا ہونے والے جذبات کو قابو میں رکھنے اور ان پر ایک اخلاقی ضابطہ عائد کرنے کا باعث بن سکیں ۔ یہ تمام قیل و قال ، فلسفہ طرازی اور بعض حالات میں نامعلوم کائناتی قوتوں کی طرف وہم پرستانہ مراجعت طلبی امن کے لیے کی جارہی ہے جبکہ دیار مغرب میں ایک بڑا طبقہ جسے سرے سے کسی دین کی تعلیم کا موقع ہی نہیں ملا ایک گہری یاسیت اور ناامیدی کا شکار ہے اور ذہنی فرار کے لیے کہیں خطرناک بازی گری جیسے موٹروں کی دوڑیں اور کہیں خود سے بیخود کردینے والی نشہ آور دواؤں پر انحصار کرنے لگا ہے ۔ 20 اکتوبر کے روزنامہ نوائے وقت میں انٹرنیشنل ڈیسک کے حوالے سے یہ خبر معنی خیز ہے کہ امریکہ میں ایک یونیورسٹی میں رائے شماری سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ یونیورسٹی میں سایانائڈ زہر کے ذخیرے رکھے جائیں تاکہ ایٹمی جنگ کی صورت میں زخموں سے سسکنے کے بجائے طلبہ اپنی زندگی کا خود خاتمہ کرلیں ۔

نوع انسان کی موجودہ بحرانی کیفیت مغربی علوم کے محاورے میں بیان کرنے کی کوششوں کا کوئی ٹھکانا نہیں ۔ ہزارہا مفکرین، اجتماعی نفسیات، معاشیات، شماریات، عسکری توازن ، وغیرہ وغیرہ کے بے شمار پہلوؤں پر خیال آرائی کررہے ہیں،لیکن ربط اور تسلسل مفقود ہے اور دور حاضر کی روحانی پریشانی اور بے یقینی کسی ڈھب سے کم نہیں ہوتی ۔

موجودہ ابلاغی پھیلاؤ کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اسلام کے لغظی معنی جو امن ، آشتی، عافیت اور تشفی سے عبارت ہیں ، ایک وسیع تر آبادی کے علم میں آچکے ہیں اور زیادہ لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ اسلام کسی گروہ کا سیاسی یا اجتماعی لیبل نہیں بلکہ ایک طریق زندگی کا نام ہے جو فطرت کی ساخت اور نہج سے مطابقت رکھتا ہے۔یہاں یہ عرض کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس کرتا ہوں کہ اسلام کی اس سادہ مختصر اوریقیناً ناکافی تعریف بھی کروڑوں انسانوں تک نہیں پہنچی جس کی بنیادی وجہ اہل اسلام کی تبلیغی استطاعت کی کمی ہے ۔ اجتماعی طور پرمسلمانوں کےبڑے ایشیائی اور افریقی ممالک غریب ہیں،لیکن ان میں بعض ممالک جو بہ لحاظ آبادی یا رقبے کے بڑے نہیں ہیں ، تیل کی دولت سے مالا مال ہیں ۔ ان دولت مند ممالک نےاسلام کا پیغام ایک نسبتاً بے خبر دنیا تک

پہنچانے میں جو سعی کی ہے اس میں کئی گنا اضافے کی ضرورت ہے۔

اسلام کی تبلیغ تمام دیگر ادیان کی تبلیغ سے آسان تر ہے بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ اسلام تشکیل کائنات کے قوانین کی اس درجہ تائید کرتا ہے کہ وہ گروہ جو فلاح پاتے ہیں، لیکن مسلمان نہیں کہلاتے دراصل اسلامی اقدار کی اہمیت کو اس لٹریچر میں دریافت کرتے ہیں جس کا قدیم منبع تالیفات اسلامی میں ہے اور ان پر عمل کرتے ہیں۔

اسلام نے علم کو شرط نیابت الٰہی قرار دیا ہے اور فطرت کے قوانین کی دریافت ایک اہم اسلامی فریضہ ہے۔ چنانچہ تعلیمات اسلامی میں سب علوم کا حصول اور اس میں تحقیق ایک لازمی عمل ہے۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ انسانی عمل اور انس کے ماحول میں قوانین، ضابطوں اور اصولوں کی تلاش میں روایتی اسلامی تعلیم میں گرامر اور ریاضی پر زور دیا جاتا تھا اور اس تعلیم سے وہ اذہان تیار کیے جاتے تھے جو توہمات کو رد کریں اور ہئیت، فلکیات، کیمیا وغیرہ میں پیش رفت کریں۔ چنانچہ آج جبکہ مغربی علما اور محقیقن میں اسلام کے بارے میں عصبیت کم ہو رہی ہے وہ اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ جدید سائنس کی بنیادیں مسلمان مفکرین اور علما نے رکھیں۔ اسلام کے دین فطرت ہونے کی وجہ سے فطرت کے عوامل کی نہج اور تخلیق کائنات کے معمولات کی دریافت حق کی تلاش کا ایک اہم جزو تھا چنانچہ تعلیمات اسلامی میں سائنس کا بڑا حصہ ہے۔

جن علوم میں تعلقات انسانی کا دخل ہے ان میں اسلامی تعلیم کا نہج حالیہ رائج رخ سے اپنے نتائج میں مختلف ہے۔ اس کی سب سے واضح مثالیں علم اقتصاد میں نظر آتی ہیں۔ جدید اقتصاد کے اخلاقیات اور حقوق العباد سے خالی ہونے کی وجہ سے بنی نوع انسان کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ حالیہ تجارت میں انتہائی بے رحمانہ بلکہ قاتلانہ استحصال کا عنصر غالب نہ ہوتا تو یورپ میں تجارتی مواقع کے حصول کے لیے اتنی شدید جنگیں نہ ہوتیں جن کی وجہ سے برٹرینڈ رسل نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یورپی اقوام تمام مخلوق سے زیادہ جنگ پسند اور خون آشام واقع ہوئی ہیں۔ موجودہ مغربی اقتصاد کا مقابلہ اگر اسلامی دور کی فتوحات کے نتائج سے کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اسلام میں عسکری بالادستی کو استحصالی منفعت اندوزی کا ذریعہ بنانا اصولاً ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ جدید دور کے دانشوروں کی تمام خیال آرائیوں اور تجزیاتی کوششوں کے باوجود بقائے انسانی خطرے میں ہے اور تہذیب حاضر ایک بے بس اور بے طاقت کشتی کی طرح ایٹمی جنگ کے دہانے کی طرف بہتی جا رہی ہے، کیونکہ ایمان اور ایقان کے بغیر محض علم سے ذوقِ عمل پیدا نہیں ہوتا اور اگر

کوئی کلیّہ خواہ وہ کتنا ہی صحیح کیوں نہ ہو بوجوہ ناقابل عمل ہو تو اس میں اور واہمہ میں کیا فرق رہ جاتا ہے -

تیسری دنیا کے استحصال اور اس سے پیدا ہونے والے افلاس، محرومیت اور درد و کرب کا وہ عالم ہے کہ اگر اس کا اجتماعی جائزہ لیا جائے تو گمان پیدا ہوتا ہے کہ انسان تعقل، تدبر اور تفکر سے عاری ہوچکا ہے - کون نہیں جانتا کہ اگر تیسری دنیا کا پیدا کیا ہوا غلہ، شکر، خوردنی تیل، چائے، چمڑا، کپاس، مسالے اور سینکڑوں زرعی اشیا صرف ایک ہفتے کے لیئے امیر ممالک سے لے لیے جائیں تو مغربی تہذیب کی عمارت یوں زمین بوس ہوجائے جیسا کہ اس پر ایٹم بم پڑا ہو اور کروڑوں افراد لقمہ اجل بن جائیں - دونوں بڑی جنگوں میں جرمن آبدوزوں نے برطانیہ کے بارے میں خصوصاً یہ ثابت کردیا تھا کہ زرعی کچے مال کی رسد میں خلل واقع ہوجائے تو صنعتی ممالک زندہ نہیں رہ سکتے - اب آئیے دیکھتے ہیں کہ یہ جانتے ہوئے مغربی امیر ممالک نے تیسری دنیا بشمول پاکستان کے ساتھ کیا کیا -

ابھی 1949 کا واقعہ ہے کہ اس سال میں پاکستان کی فی کس سالانہ آمدنی اکاون (51) ڈالر تھی جبکہ جاپان کی ایک سو، جرمنی کی تین سو بیس (320) فرانس کی تین سو اڑتالیس (348) اور چین کی صرف ستائیس ڈالر تھی - یعنی پاکستانی شہری کے ایک رپے کے مقابلے میں جاپانی دو، جرمن چھ اور فرانسیی سات رپے کماتا تھا - آج پینتیس سال کی امداد اور ترقی کے غوغا اور ہاؤہو کے بعد پاکستان کی فی کس سالانہ آمدنی تین سو پچاس (350) ڈالر کے لگ بھگ ہے جبکہ جاپان کی دس ہزار ڈالر سے زیادہ، جرمنی کی تیرہ ہزار ڈالر سے زیادہ اور فرانس کی فی کس سالانہ آمدنی بارہ ہزار ڈالر سے زیادہ ہے - یہی تناسب دوسرے امیر ممالک کا ہے - یعنی موٹے لفظوں میں پاکستانی شہری کے ایک رپے کے مقابلے میں امیر ممالک کا فرد تیس سے چالیس رپے تک کماتا ہے - ایک سمٹتی ہوئی دنیا میں یہ اعداد و شمار کیسی اندوہناک محرومی افلاس اور بے چارگی کی نشاندہی کرتے ہیں - یہ کیوں نہیں ہوتا کہ چالیس رپے کمانے والا اس زرعی جنس جس پر اس کی زندگی کا انحصار ہے کی قیمت صرف ایک رپیہ بڑھا دے تاکہ ایک رپیہ کمانے والے کے دو ہوجائیں اور غریب ممالک کی آمدنی سو فیصد بڑھ جائے اور ان کے بچوں کی شرح اموات کم ہوجائے - لیکن یہاں قومی آمدنی یا دوسرے لفظوں میں فی کس سالانہ آمدنی میں اضافے کو پانچ سے سات فیصد تک پہنچانے کی باتیں ہورہی ہیں یعنی ایک رپے کا دو فیصد -

آج جب کہ افغانستان کے بحران کے سینکڑوں تجزیئے ہورہے ہیں یہ

حقیقت کیوں سامنے نہیں آتی کہ 1978 کی ورلڈ بنک کی رپورٹ کے مطابق افغانستان میں ہر ایک ہزار پیدا ہونے والے بچوں میں سے (269) دوسو انہتر مرجاتے تھے جب کہ ڈنمارک میں یہ شرح اموات صرف دس تھی - افغانستان میں بچوں کی یہ شرح اموات غالباً تاریخ کا سب سے بڑا ریکارڈ ہے۔ کیا رب المشرقین والمغربین پرچمیوں ، خلقیوں ، کمیونسٹوں ، ہندووں اور یہودیوں کا خالق اور پالنہار نہیں ہے؟ (حاضرین کرام نوٹ فرمالیں کہ عالمی بنک سال بسال اپنی سالانہ رپورٹ میں رقبے ، آبادی ، آمدنی ، قرضوں وغیرہ کے اعداد و شمار شائع کرتا تھا - اس سال سے یہ اعداد و شمار حذف کردیے گئے ہیں اور یہ آمدنی کا تجزیہ 1983 کی رپورٹ پر مبنی ہے جس میں یہ اشاریے (INDICATORS) آخری مرتبہ چھپے -)

موجودہ صورت حال میں غیر اسلامی علم اقتصاد کی عمل داری ہے اور اس میں اسلامی حق شناسی ، اولاد آدم میں بنیادی مساوات پر یقین اور داور محشر کے سامنے جوابدہی کے تصور اور حمیت اور جرات کی اسلامی اقدار کا فقدان ہے - ظاہر ہے کہ جب تک اقتصاد کے شعبے میں علم ، تعلم اور تعلیم میں اسلامی اقدار کی پاسداری اور قرآن حکیم کے بتائے ہوئے حقوق العباد کا تحفظ شامل نہیں ہوتا ، تہذیب حاضر کی جنونی کیفیت زیادہ المناک ہوتی چلی جائیگی -

قرآن حکیم ہمیں واضح حکم فرماتا ہے کہ لاتقنطوا من رحمۃ اللہ - اس کی عقلی شہادت ہمیں حالیہ تحریک احیائے اسلام میں ملتی ہے - عبادات اور اخلاق حسنہ کی پاسداری انسانی بہتری کی ضروری تمہید ہے اور وقت کا تقاضا ہے کہ ہم اسلامی اقدار کی روشنی میں ان علوم حاضرہ کی جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے نئے سرے سے تالیف کریں

اسلام کا فلسفۂ تعلیم
قرآن مجید اور تعلیمات نبوی کی روشنی میں

جناب ڈاکٹر وقار احمد رضوی

اسلام کا فلسفۂ تعلیم یہ ہے کہ وہ انسانی معاشرے کو ایک ایسا ضابطۂ حیات دے جو اللہ اور اس کے رسول ص پر ایمان و کامل اعتقاد سے ہم آہنگ ہو۔ اگر اسلامی تاریخ کی ورق گردانی کی جائے اور اس قلیل التعداد اور بے سرو سامان جماعت کے کردار پر نظر ڈالی جائے جس نے قیصر و کسریٰ جیسی باجبروت سلطنتوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالا تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کامیابی کا راز اللہ پر کامل یقین اور اس کے رسول ص کی رہنمائی پر مضبوطی سے قائم رہنے میں پنہاں تھا۔ اس لیے اگر کوئی بہتر نظام تعلیم ہے تو وہ وہی ہے جس کو اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی نظام تعلیم، انسانی معاشرے کو عدل اور انصاف، حق شناسی اور پاکیزگی کے اعتبار سے بلند و بالا بنانے کا خواہش مند ہے۔

اسلام کا نظام تعلیم، ضابطۂ اخلاق کو استوار کرتا ہے، اور لادینی عناصر کے مقابلے میں اچھی عادتوں اور عمدہ سیرت و کردار کی تعمیر پر زور دیتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ لادینیت یا مادیت پرستی قوم کے لیے ذہنی، قلبی، اور روحانی سکون فراہم نہیں کرتی۔ لیکن اسلام میں تعلیم کا رشتہ، دین و اخلاق اور تہذیب و شائستگی سے جڑا ہوا ہے، اسی لیے مسلمانوں کو خیرالامم کہا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ آل عمران میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ "اے مسلمانو! جتنی قومیں دنیا میں پیدا ہوئیں۔ تم ان سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو"۔

اسلامی فلسفۂ تعلیم یہی ہے کہ وہ نوجوانوں کی ذہنی، علمی اور دماغی صلاحیتوں کو اعلا اقدار انسانی پر استوار کرتا ہے۔ اسلام کا فلسفۂ تعلیم ایک بلند نصب العین رکھتا ہے اور وہ بلند نصب العین یہ ہے کہ وہ معاشرے میں نیکی کے چلن کو رائج کرنا چاہتا ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ سوسائٹی میں عدل و انصاف کا دور دورہ ہو۔ کسی کی حق تلفی نہ کی جائے۔ ایک دوسرے کا احترام کیا جائے۔ کسی کی دل آزادی نہ کی جائے۔ خالق کی رضا اور نجات آخرت کو پیش نظر رکھا جائے۔ انفرادی اور اجتماعی

ذمہ داریوں کو تن دھی سے ادا کیا جائے۔ دراصل تعلیم ایک معاشرتی عمل ہے۔ لفظ تعلیم کے معنی ھیں سکھانا یا رہنمائی کرنا۔ چونکہ تعلیم کے ذریعہ بچے کی مخفی اور فطری صلاحیتوں کو ابھار کر ان سے کام لیا جاتا ہے، اس لیے اس کو تعلیم کہا جاتا ہے۔ گویا تعلیم میں بچے کی تربیت اور تادیب کا پہلو بھی شامل ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ ادّبنی ربی فاحسن تادیبی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری تہذیب و تربیت بہتر ترقی پر کی ہے۔ ہر قوم ہر معاشرہ اپنی ضروریات، مقصد حیات، نظریات و عقائد کے مطابق اپنے بچوں یا افراد کو تعلیم دیتا ہے۔ ہم بہ حیثیت ایک مسلمان تعلیم کے مفہوم کے قرآن مجید اور احادیث نبوی ؐ کو بہتر ماخذ تصور کرتے ہیں جس کے مطابق معرفت الٰہی حاصل کرنا، اپنے آپ کو پہچاننا، کائنات کی حقیقت کو معلوم کرنے کے لیے جستجو کرنا یعنی سائنسؔ اصل علم ہے۔ اس طرح اسلامی فلسفۂ تعلیم، دین و دنیا فرد اور اجتماع دونوں کی فلاح و بہبود کو مد نظر رکھتا ہے۔

سقراط نے صرف حقیقت کی تلاش کو تعلیم کہا، افلاطون نے معاشرے کی متوازن تنظیم کو تعلیم سے تعبیر کیا۔ ارسطو نے تعلیم کو جسمانی اور عقلی تربیت کا وسیلہ بنایا۔ لیکن اسلام جسم اور روح دونوں کی تربیت کو مقاصد تعلیم قرار دیتا ہے تاکہ ذات اور معاشرے کو پاکیزہ سے پاکیزہ بنایا جاسکے۔ اسلام میں تعلیم ایک بامقصد عمل ہے۔ اس سے فرد اور معاشرے کی اصلاح کا کام لیا جا سکتا ہے۔ تعلیم کا مقصد صرف انسان کے فطری ادراک کی تربیت کرنا ہی نہیں بلکہ معرفت کردگار کا حصول بھی ہے۔ غرض اسلام میں تعلیم کا مفہوم وہ عمل ہے کہ جو دین کے ساتھ رشتہ قائم رکھتے ہوئے اس کی طبعی قوتوں کے نشو و نما کے فرائض انجام دے۔ دراصل تعلیم ایک حرکی عمل ہے جس کی ضروریات اور مسائل برابر بدلتے اور ابھرتے رہتے ہیں۔ معاشرے اور افراد کے نشو و نما، بدلتے ہوئے تقاضوں اور تمناؤں سے باہم مربوط ہونے کا نام ہی تعلیم ہے۔ اسلامی نظام تعلیم، فرد اور اجتماع کے ذہنی، جسمانی، جذباتی، سماجی تقاضوں کو پورا کرنے کی بھر پور صلاحیت رکھتا ہے۔

ہر ملک و قوم کا نظام تعلیم اس کے مخصوص نظریہ حیات سے مطابقت رکھتا ہے۔ چنانچہ موجودہ دور میں سوشلسٹ روس مین مخصوص نظریے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق تدریسی طریقوں کی تربیت کے پانچ سالہ نصاب کی تکمیل کے دوران تقریباً پانچ سو گھنٹے طلبہ کو اشتراکی تصورات کی تعلیم پر صرف کرنا پڑتے ہیں۔ اس حقیقت کی روشنی مین اگر پاکستان میں قرآن و حدیث یا اسلامی تعلیمات سے مسلمان بچوں

کو آگاہ کیا جائے تو یہ کوئی بے جا بات نہیں ہے۔اس سلسلے میں جو اہم بات ہے وہ یہ ہے کہ کسی بھی نظام تعلیم کے مقاصد کا واضح تعین ضروری ہوتا ہے۔پاکستان چونکہ ایک اسلامی مملکت ہے اس لیے پاکستان میں نظام تعلیم کا مقصد یورپی ممالک کے علی الرغم اسلامی نظریات یا اسلامی اقدار کا تشخص ہونا چاہیے ۔ مقصد کا تعین نہ ہونے کی صورت میں ایک بے یقینی کی کیفیت طاری رہتی ہے ، اور پھر منتشر راستے جس جانب بھی لے جائیں طلبہ ، اساتذہ اور والدین اسی جانب چلتے رہتے ہیں ۔ اس سے وقت ، دولت اور عمر سب کا ضیاع ہوتا ہے ۔ مقصد کے تعین کے بغیر تدریس کا عمل بے معنی رہتا ہے ۔ اساتذہ اور طلبہ دونوں کے لیے تدریس غیر موثر ہوتی ہے ۔ دوسری بات یہ کہ مقصد کے تعین کے بغیر مخصوص طریقہ کار اختیار نہیں کیا جا سکتا ۔ مقصد کے تعین سے اساتذہ کے لیے بھی سہولت ہوتی ہے اور منزل تک پہنچنے میں رکاوٹ دور ہوجاتی ہے ۔ درحقیقت تعلیم ، بچوں کے مکمل اور متوازن نشو و نما کا نام ہے ۔ اس میں کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ پہلے منزل اور اس کی راہ کا تعین کیا جائے ۔ اگر راہ کا تعین درست نہ ہو تو پھر بچوں کی رسمی تعلیم و تربیت سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا ۔

اسلامی فلسفۂ تعلیم کا مقصد صرف انفرادی اصلاح نہیں بلکہ فرد و اجتماع دونوں کی فلاح و بہبود ہے ۔ مقاصد تعلیم کے تعین کے سلسلے میں نہ تو اجتماع کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اجتماعی مفاد کی خاطر فرد کو قربان کیا جا سکتا ہے ۔ معاشرے کی ترقی و خوشحالی کا انحصار مقاصد تعلیم کے تعین پر ہے ۔ پاکستان میں تعلیم کا مقصد ، اسلامی نظریہ حیات کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے طلبہ کو تیار کرنا ہے تاکہ پاکستان ایک اسلامی مملکت کی حیثیت سے قائم اور باقی رہ سکے اور اس کا بنیادی نظریہ کمزور نہ پڑنے پائے ۔ آج کے مشینی دور میں تعلیم کا ایک مقصد پیشہ ورانہ تربیت بھی ہے۔اسلامی فلسفۂ تعلیم اس سے انحراف نہیں کرتا ۔ ابن سینا اور امام غزالی رح نے گیارھویں صدی عیسوی میں پیشوں کی تعلیم کو اہمیت دی ہے ۔ اسلامی فلسفۂ تعلیم کی رو سے تعلیم کے اہم مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی ہے کہ فرد کو ایک کامیاب شہری بنایا جائے کیونکہ بچے کو تعلیم مکمل کرنے کے بعد آخر کار ایک شہری کی زندگی گزارنی پڑتی ہے ۔ اس سلسلے میں بچوں میں اخلاق و کردار کی بلندی کے ساتھ ساتھ ، صحت و صفائی ، محنت ، ضبط نفس اور دیانت کی خوبیاں اجاگر کی جائیں ۔ باہمی تعاون اور جذبۂ خدمت پیدا کیا جائے ۔ کیونکہ شہریت کی تربیت کا مقصد بڑی حد تک سماجی تربیت سے مطابقت رکھتا ہے۔ جہاں تک قرآن مجید اور احادیث نبوی کا تعلق ہے تو رسول اللہ صلّی

اللہ علیہ وسلم پر جو پہلی وحی سورۂ " اقرأ " نازل ہوئی ، اس میں خواندگی کی تلقین کی گئی ہے ، اور قلم کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے کی فضیلت کا اعلان کیا گیا ہے ۔ اس پہلی وحی کو اسلامی نظام تعلیم کا سنگ بنیاد قرار دیا جاسکتا ہے ۔ جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے تو قرآن مجید نے سورۂ بقرہ میں حضرت آدمؑ کی فرشتوں پر جو برتری کا سبب بتایا ہے تو وہ یہی تعلیم ہے چنانچہ قرآن مجید کا ارشاد ہے علّم الآدم اسماء کلّھا ۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو تمام چیزوں کے نام سکھائے یعنی علوم سکھائے اس آیت کریمہ سے علم و دانش کی فضیلت ثابت ہوتی ہے ۔ اس کے علاوہ قرآن پاک میں اہل تعلیم کی برتری کے سلسلے میں مختلف آیات ملتی ہیں ۔ چنانچہ سورۂ الزمر میں ارشاد ہے :

قل ھل یستوی الّذین یعلمون والّذین لا یعلمون
(الزمر : 9)

اے پیغمبر ! کہہ دیجیے کہ کیا اہل تعلیم اور جاہل لوگ برابر ہوسکتے ہیں ۔

ایک اور موقع پر سورۂ مجادلہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے :

یرفع اللہ الّذین اٰمنوا منکم والّذین اوتوا العلم درجٰت
(المجادلہ : 11)

اللہ تعالیٰ تم میں سے ایمان والوں کے اور ان لوگوں کے جن کو تعلیم عطا ہوئی ہے ، درجات بلند کرے گا ۔

اس طرح سورۂ توبہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے :

فلولا نفر من کل فرقۃٍ منّھم طآئفۃ لّیتفقّھوا فی الدّین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلّھم یحذرون 0
(التوبہ : 122)

ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت جایا کرے تاکہ وہ دین کی تعلیم حاصل کرتے رہیں اور جب وہ تعلیم حاصل کرکے واپس آئیں تو اپنی قوم کو تعلیم دے اللہ تعالیٰ سے ڈرائیں ۔ تاکہ وہ آگاہ ہوجائیں اور بری باتوں سے پرہیز کریں ۔

اس آیت کریمہ میں دین اور دنیا دونوں کو فلسفہ تعلیم میں شامل کیا گیا ہے ۔ اس طرح سورۂ نحل میں ارشاد باری تعالیٰ ہے ۔

فسئلوا اھل الذّکر ان کنتم لا تعلمون
(النحل : 43)

اگر تم کو علم نہ ہو تو اہل تعلیم سے سے پوچھ لیا کرو ۔

انما یخشی اللّٰہ من عبادہ العلمٰٓوا   بلا شبہ اللّٰہ سے اس کے بندوں میں سے علما ہی ڈرتے ہیں -
(فاطر : 28)

آنحضرت صلّی اللّٰہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے تعلیم کے اضافے کے لیے اس دعا کی تلقین کی گئی:

قل رب زدنی علما 0   اے پیغمبر کہہ دیجیے کہ اے پروردگار تو میری تعلیم میں اضافہ کر -
(طٰہٰ : 114)

مذکورہ بالا آیات میں تعلیم اور اہل تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے - قرآن مجید کے علاوہ احادیث نبوی سے بھی اسلامی نظریہ تعلیم کی وضاحت ملتی ہے - جو اس طرح ہے :

1- تعلیم حاصل کرنا ہر مسلمان کا فریضہ ہے-
(حوالہ معجم طبرانی کبیر)

2- علم و حکمت مومن کی گم شدہ دولت ہے-جہاں سے مل جائے اسے حاصل کرنا چاہیے - کیونکہ مومن اس کا زیادہ حقدار ہے -
(ترمذی عن ابی ہریرہ)

3- زمین پر عالم کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان پر ستاروں کی ہے جو بحر و بر کی تاریکیوں کو روشن کرتے ہیں - اگر ستارے ماند پڑجائیں تو رہنما بھی بھٹکتے پھریں -
(مسند امام احمد)

4- العلما وارثۃ الأنبیاء   علماء پیغمبروں کے وارث ہوتے ہیں-

5- اللّٰہ تعالٰی جس کسی کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے تو اس کو دین کا علم حاصل کرنے کی توفیق عطا کرتا ہے -
(صحیح بخاری عن ابن عباس)

6- تم مہد سے لحد تک تعلیم حاصل کرتے رہو خواہ اس کے لیے چین جانا پڑے -

قرآن مجید اور احادیث نبوی کے علاوہ اگر اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام تعلیم کا آغاز مدینہ منورہ سے ہوا - اور وہ اس طور پر کہ آنحضرت صلّی اللّٰہ علیہ وسلم نے حضرت معصب بن عمیرؓ کو قرآن کریم کی تعلیم دینے کے لیے مدینہ بھیجا تھا - جب آنحضرت صلّی اللّٰہ علیہ وسلم ہجرت کرکے مدینہ تشریف لائے تو آپ نے یہاں تعلیم کا اسلامی

نظام قائم کیا ۔ اس نظام تعلیم میں سب سے مقدم اور اہم قرآن کی تعلیم تھی
آپ نے اس نظام تعلیم کا آغاز اس طرح کیا کہ مسجد نبوی کے ایک حصے
میں چبوترہ (صفہ) بنوایا ۔ یہ مسلمانوں کی پہلی اقامتی جامعہ تھی ۔
یہاں آنحضرت صلّی اللّٰہ علیہ وسلم خود بھی درس دیتے تھے ، اور دیگر
اساتذہ بھی مقرر کئے گئے تھے ، جو اصحاب صفّہ کو لکھنا پڑھنا سکھاتے
تھے اور قرآن کی تعلیم دیتے تھے ۔ یہی اصحاب صفّہ بعد میں مسلمانوں
کے معلّم بنے اور انہوں نے قرآن و حدیث کی تعلیمات کو دنیا میں پھیلایا ۔
ان میں نمایاں نام حضرت ابوھریرہ رض کا ھے ، جو احادیث نبوی کے سب
سے بڑے راوی اور عالم بنے ۔ حضرت زید بن ثابت رض ان صحابہ میں تھے
جو نہ صرف عبرانی اور سریانی زبانیں جانتے تھے بلکہ فارسی ، رومی ، قبطی
حبشی زبانیں بھی انھوں نے سیکھی تھیں۔ حضرت زید بن ثابت رض مختلف
زبانیں جاننے کی وجہ سے آنحضرت صلّی اللّٰہ علیہ وسلم کی غیر زبانوں میں
خط و کتابت کے فرائض انجام دیتے تھے ۔ اسی طرح حضرت عبداللّٰہ بن
زبیر رض کے بارے میں یہ بیان کیا جاتا ھے کہ وہ بھی بہت سی زبانیں
جانتے تھے ۔ اور غیر ملکیوں سے انھیں کی زبان میں گفتگو میں کرتے تھے ۔

قرآن کریم اور احادیث نبوی میں علم دین کی تعلیم کو خواتین کے لیے
بھی اسی طرح ضروری قرار دیا گیا ھے جس طرح مردوں کے لیے چنانچہ
خواتین کی کثیر تعداد آنحضرت صلّی اللّٰہ علیہ وسلم کی مجالس وعظ و
تلقین میں حاضر ھوتی تھی ، اور آپ کی تعلیمات سے مستفید ھوتی تھی ۔
ھفتہ میں ایک دن صرف خواتین کی تعلیم کے لیے مخصوص تھا ۔ حضرت
عائشہ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہا حدیث ، فقہ ، تفسیر اور شعر و ادب میں
بڑا درک رکھتی تھیں ۔

غرض اسلام نے جو نظام تعلیم برپا کیا اس کے انقلابی نتائج برآمد ھوئے
کیونکہ اس کے ذریعہ سے نہ صرف مسلمانوں کی خواندگی کا معیار بڑھا
بلکہ انہوں نے تہذیب و تمدن کے اچھے اصول سیکھے ۔ مسلمان اس
نظام تعلیم کے ذریعہ سے نہ صرف اخلاقی اور ذھنی حیثیت سے اعلا کردار کے
مالک بنے بلکہ انھوں نے اقوام عالم کو تعلیم دی اور ان پر غلبہ حاصل کیا ۔
یہ ھے اسلام کا وہ فلسفۂ تعلیم جس کی ایک جھلک میں نے آپ کے
سامنے پیش کی ۔

اسلام کا نظام تعلیم صرف حدیث و تفسیر تک محدود نہیں بلکہ اس میں
سائنس ، سیاسیات ، معاشیات ، عمرانیات ، جغرافیہ ، طبیعیات ، فلکیات ،
ارضیات ، نباتات ، حیوانات اور تاریخ سب شامل ھیں ۔ مسلمانوں نے ان
علوم میں کارھائے نمایاں انجام دیے ھیں ۔

اسلام میں نظریۂ تعلیم کی اساس

جناب ڈاکٹر عاشق محمد خاں دُرّانی

انسان دنیا میں اللہ تعالیٰ کا نائب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ قرآن پاک میں آیا ہے افلا تتفکرون ، افلا تبصرون ، افلاتعقلون ۔(کیا تم غور و فکر نہیں کرتے ؟ کیا تم نہیں دیکھتے ؟ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے ؟)چنانچہ رب العزت نے اپنے بندے کو حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعہ سے خود تعلیم دی ۔

اقرا باسم ربّک الّذی خلق 0 خلق الانسان من علق 0 اقرا و ربک الاکرم 0 الّذی علّم بالقلم 0 علّم الانسان مالم یعلم 0 (العلق:۱تا۵)

پڑھ اللہ کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ پیدا کیا انسان کو خون کے لوتھڑے سے۔ پڑھ اور آپ کا پروردگار بہت کریم ہے جس نے تعلیم دی قلم کے ذریعہ سے ، تعلیم دی انسان کو ان باتوں کی جو وہ نہ جانتا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا منشا ہی نہیں بلکہ حکم ہے کہ انسان کو پڑھا لکھا ہونا چاہیے۔ چنانچہ مسلمان کے لیے تعلیم یافتہ ہونا لازمی ہے۔ مسلمان جاہل شخص نہیں ہو سکتا ۔ انسانیت کی معراج کے لیے تعلیم لازمی ہے ۔ جس طرح جسم کے نشوونما کے لیے خوراک لازمی ہے اسی طرح روح کے نشو ونما اور بالیدگی کے لیے تعلیم اشد ضروری ہے ۔ حضرت محمدؐ نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا درس دیا اور اسلامی تعلیمات پر زور دیا ۔ اسلامی تعلیمات کا سرچشمہ قرآن مجید ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کلام پڑھنے اور سمجھنے سے انسان دین و دنیا کے رموز سے واقفیت حاصل کر لیتا ہے ۔ یہ اسلامی تعلیم ہی ہے جو احترام انسانیت کا درس دیتی ہے ۔ اسلامی تعلیم کے مطابق فضیلت کا معیار پیدائش کے بجائے تقوٰی ہے ۔ اللہ تعالیٰ رموز زندگی کو سمجھنے کے لیے تعلیم پر زور دیتے ہیں ۔ چنانچہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے قلم کی قسم اس لیے کھائی ہے کہ اپنے پیارے نبیؐ کی امت کی توجہ تعلیم کی طرف ہو ۔

ن و القلم وما یسطرون 0 (نون اور قسم ہے قلم کی اور جو کچھ وہ لکھتے ہیں)۔" علامہ ابن خلدون تعلیم کو ایک صنعت قرار دیتے ہیں - جس طرح کسی صنعت میں مہارت حاصل کرنے کے لیے بھی کسی ماہر استاد کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح تعلیم و تعلم کی صنعت میں مہارت حاصل کرنے کے لیے بھی کسی ماہر استاد کی ضرورت ہوتی ہے - ابن خلدون کے نزدیک تعلیم کا مقصد حقائق سے واقف ہونا ہے"[۱]

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو خود تعلیم دی۔اس طرح اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے استاد قرار پائے۔ قرآن پاک میں رب العزت فرماتے ہیں کہ الم تران اللہ سخرلکم مافی الارض (اے انسان کیا تو دیکھتا نہیں جو کچھ زمین میں ہے اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے مسخر کر دیا ہے)۔ حضرت محمد ص کی حدیث ہے کہ " گود سے لے کر گور تک علم حاصل کرو "[۲]

اسلام میں علم اور دین اس طرح وابستہ ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا ۔چنانچہ اللہ تعالیٰ سورہ نساء میں فرماتے ہیں کہ "اور تم کو وہ باتیں سکھا دی ہیں جو تم کو پہلے معلوم نہ تھیں "۔اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضور ص کو مخاطب فرما کر سورہ طٰہٰ ، میں فرمایا کہ" آپ دعا کیجیے کہ پروردگار میرا علم اور زیادہ کر"۔ حضرت محمد ص نے حصول علم کی تاکید فرمائی ہے ۔آپ کا فرمان ہے کہ " جو حصول علم کے لیے سعی کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے "[۳]

آپ کا فرمان ہے کہ " علم ہی کے ذریعہ سے انسان نیکی کے اعلا مدارج تک پہنچتا ہے "،" ایک عالم کی سیاہی شہید کے خون سے زیادہ قیمتی ہے"[۴]

اسلام میں تعلیم کا اولین سلسلہ خود حضور ص نے حضرت ارقم مخزومی کے گھر سے شروع کیا ۔یہاں پر انسانیت کا درس دیا جاتا تھا ۔ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی جاتی تھی ۔یہاں کی تعلیم کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی ذات کو پہچاننے اور اس پر ایمان لے آنے پر تھی ۔انسانوں کے درمیان تعصبات اور امتیازات کے خاتمہ کا سبق ملتا تھا ۔ اللہ کی وحدانیت کا درس دیا جاتا تھا ۔ معلم انسانیت تعلیم دیتے کہ رب العزت ہی اس کائنات کا مالک ہے اور حقیقی خالق ہے ۔ہر چیز کا نفع و نقصان اسی کے اختیار میں ہے ۔رزق میں تنگی اور کشادگی بھی اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے ۔ہجرت کے بعد اسلام کا سب سے پہلا دارالعلوم مسجد نبوی قرار پایا ۔اس زمانے کی مساجد یقیناً عبادت گاہوں کے ساتھ ساتھ درس گاہیں ، انصاف کی آماج گاہیں اور سیاست کی مراکز بھی تھیں ۔

مسلمان کے لیے زندگی کے ہر شعبے سے متعلق رہنمائی قرآن مجید

اور احادیث نبوی سے حاصل کرنا لازمی ہے ۔اسلام میں تعلیم کی اہمیت کا اظہار قرآن پاک میں بار بار آیا ہے۔ اور مزید یہ کہ غزوۂ بدر کے اسیروں کے متعلق حضرت محمدؐ کا فرمان تھا کہ۔" قیدیوں کو اس شرط پر رہائی دی جائے گی کہ وہ بطور فدیہ مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں گے"[5]

اس لیے مسلمانوں کے لیے نصاب کی بنیاد ہی قرآن مجید ہے۔چنانچہ حضورؐ کے زمانے سے ہی قرآن پاک کا پڑھنا سمجھنا اور اس پر عمل کرنا لازمی ہے ۔ اسلام میں نظریۂ تعلیم کی بنیاد قرآن مجید اور احادیث نبوی ہے ۔ اسلامی تعلیم زندگی میں اعتدال کا درس دیتی ہے ۔ اسلامی تعلیم ہمیں بہترین معاشی نظام سے متعارف کرواتی ہے ۔ ایک ایسے نظام سے جس کی بنیاد عدل پر ہے جو سرمایہ داری اور اشتراکیت کی خرابیوں سے پاک ہے مگر اس میں دونوں کی خوبیاں موجود ہیں ۔اسی طرح اسلامی تعلیم ہمیں بہترین سیاسی نظام سے متعارف کرواتی ہے جس کی بنیاد برابری کے اصول پر ہے۔اس ذریعۂ تعلیم سے انسانوں کے حقوق کا تعین ہو جاتا ہے۔ ابن خلدون کے مطابق " نصاب تعلیم کی بنیاد قرآن پاک کی تعلیم قرار پائی۔ لڑکیوں کو سورہ نور خاص طور پر پڑھائی جاتی"[6]

ہشام بن عبد الملک کے متعلق روایت ہے کہ اس نے اپنے لڑکے کے اتالیق سے کہا کہ " پہلے اسے قرآن مجید پڑھائیے ، بعد ازاں نظم اور خطبات عالیہ ، نیکی بدی کا فرق مشہور لڑائیوں کے حالات اور آخر میں فن مکالمہ"[7]

اسی طرح ہارون الرشید نے امین الرشید کے اتالیق احمر کو بلا کر کہا کہ " امین کو قرآن مجید ، احادیث ، نظم پڑھاؤ اور خطابت و فصاحت کی قدر شناسی سکھاؤ "[8]

مختصر یہ کہ اسلام میں نظریۂ تعلیم کی بنیاد قرآن مجید اور احادیث ہے۔قرآن پاک کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے عربی زبان پر عبور لازمی ہے۔ چنانچہ عربی کی اہمیت حضورؐ نے خود بیان فرما دی جس کی تقلید دوسرے علما و فضلا نے بھی کی ۔حضرت محمدؐ زبان کے معاملے میں ہمیشہ احتیاط برتنے کا حکم دیتے ۔ایک مرتبہ کسی عرب نے محاورہ کے استعمال میں کوئی غلطی کی تو آپ نے لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا ، " اپنے اس بھائی کی اصلاح کرو۔ وہ بھٹک گیا ہے"[9]

اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت حسین بن الحر کو ہدایت کی کہ تمہارے کاتب نے خط میں ایک غلطی کی ہے ۔ کاتب کو ایک درہ لگاؤ "[10]

مسلمہ بن عبد الملک کے متعلق روایت ہے کہ وہ کہا کرتا تھا کہ " بات چیت کے دوران غلطیاں کرنا چہرہ پر چیچک کے داغوں سے بھی زیادہ

بد نما ہے۔"[11]

حضرت الحسن کو معلوم ہوا کہ " ایک ماتحت سردار زبان کی غلطیاں کرنے کا عادی ہے۔ آپ نے اس کے برخواست کرنے کا حکم صادر فرمایا"۔[12] اس سے ظاہر ہوا کہ اسلام میں زبان کی اہمیت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اسلام میں اس بات کی اجازت ہے کہ تعلیم کی بنیاد اپنی قومی زبان پر ہو تاکہ گرد و پیش کی تہذیبی موانست بھی خبر و آگہی کے سفر میں شریک رہے۔ اسلام میں تعلیم کا بنیادی تصور قرآن مجید سے شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ کتاب اللہ کے بعد دیگر متعلقہ کتب کا مہیا کیا جانا بنیادی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں کتب خانوں کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

ایک عمدہ نظام تعلیم میں عمدہ کتب کا مہیا کیا جانا مفید ہوتا ہے۔ "کتاب ایک ایسا پھلوں کا باغ ہے جسے آستین میں رکھا جا سکتا ہے۔ کتاب مُردوں کی زبان ہے اور زندوں کی آواز ہے"۔[13]

الجاحظ لکھتا ہے کہ "کتاب کا حاصل کرنا آسان اور ارزاں ہے"۔[14]

علم حاصل کرنے کے لیے کتب کے ساتھ ساتھ عالم اساتذہ کا ہونا ایک بنیادی ضرورت ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ پہلے ہر طالب علم کے لیے لازمی ہوتا تھا کہ وہ کسی استاد کی خدمت میں رہ کو علم حاصل کرے۔ بغیر استاد کے عموماً یہ تصور ہوا کرتا تھا کہ " بے استاد طالب علم بے دین ہے جس نے شیطان کو اپنا رہنما بنا لیا ہے"۔[15]

حضرت امام شافعی فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص کتابوں سے علم حاصل کرتا ہے اسے وہ امتیاز حاصل نہ ہوگا جس کی اسے ضرورت ہے"۔[16]

گویا استاد کا وجود ، اس کی سیرت ، اس کے فضائل اور عمومی رویے، شاگرد کی تربیت اور تہذیب نفسی میں مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم حضورؐ کی مثال دیتے ہیں جو اپنی امت کے رہبر بھی تھے اور پیغمبر تھے۔ استاد بھی اپنے شاگردوں کے لیے ایک رہبر کی حیثیت رکھتا ہے۔ حضورؐ کا حکم ہے کہ "مسلمان کو تمام عمر حصول علم میں صرف کرنی چاہیے"۔[17]

اسلام میں تعلیم کے ساتھ ساتھ مناسب ورزش کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ تاکہ طلبہ دماغی کاوش کے بعد تازہ دم ہو جائیں۔ العبدری بھی نہایت پر زور الفاظ میں کھیل اور تفریح کے اوقات مقرر کرنے پر زور دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ " اگر طالب علم کو کھیل سے روکا جائے اور مسلسل مطالعے کے لیے مجبور کیا جائے تو اس کا حوصلہ پست ہو جائے گا۔ اس کی قوت فکر اور دل کی تازگی برباد ہو جائے گی اور مطالعہ اس کے لیے بیماری بن جائے

گا۔ اور اس کی زندگی پر فکر و پریشانی کے بادل چھا جائیں گے اور وہ ہر ممکن کوشش کرے گا کہ سبق سے جان بچائے"۔[18]

حضرت عمرفاروق نے ہدایت بھیجی تھی کہ" بچوں کو تیرنا ، نیزہ بازی اور شہ سواری سکھائی جائے۔دوڑیں بھی طلبہ کے ورزشی کھیلوں میں شامل کی جائیں"۔[19] اسلام میں طالب علم کے لیے لازمی قرار دیا گیا ہے کہ اس کا اخلاق عمدہ ہو ۔ حضرت امام غزالی اور العبدری کو یقین ہے کہ " جس طالب علم کے طور طریقے خراب ہوں گے وہ کبھی علم سے مستفیض نہیں ہوتا"۔[20]

شاگرد کو اپنے استاد کی تعظیم و تکریم کرنی چاہیے اور اس کی نصیحت پر اسی طرح عمل کرنا چاہیے جس طرح ایک بیمار اپنے طبیب کے مشورے پر عمل کرتا ہے۔ ایک حدیث شریف ہے کہ "جو تحصیل علم کے لیے سفر کرتا ہے تو جب تک واپس نہ آئے گویا اللّٰہ کی راہ میں سفر کرتا ہے اور اس سفر میں جاں بحق ہو جائے تو وہ شہید ہوتا ہے"۔

ابن خلدون لکھتا ہے کہ " علم میں وسعت اور عمق حاصل کرنے کے لیے طالب علم کے لیے سفر لازمی ہے اور دوران سفر جس قدر مشہور علما سے ملاقات ہو سکے ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے"۔[21]

کسی ملک کا نظام تعلیم اس کی تہذیب و ثقافت کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اس نظام کے تحت تعلیم حاصل کرنے والے اپنے قومی تشخص کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں ۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیا کے مختلف شعبوں میں " مقابلہ انسان کے لیے قدرتی ہے ۔ مقابلے سے بچہ ساتھیوں سے فرمانبرداری،چستی،نیکی، محنت ، قابلیت وغیرہ میں آگے بڑھنا چاہتا ہے ۔ مقابلہ بہترین کام کرنے والوں سے برابری کرنے کی خواہش پیدا کرتا ہے اور بچہ ہر طرح اپنی تکمیل کرتا ہے۔تعلیم میں جس چیز کی احتیاط کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اس میں خرابی نہ آ جائے مثلاً حسد کا جذبہ نہ پیدا ہونے پائے کیونکہ حسد دوسروں کی کامیابی کی بداندیشی ہے"۔[22]

اسلام بھی اسی نظریے کا حامل ہے۔اسلام میں تعلیم کے بنیادی اصول یہی ہیں کہ انسان ایک دوسرے سے حسد نہ کرے اور اللّٰہ کی وحدانیت پر یقین رکھے ۔اسلام میں نظریہ تعلیم کا بنیادی تصور یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے زندگی بسر ہو ۔اللّٰہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے جینا اور مرنا ہو ۔ علامہ محمد اقبال لکھتے ہیں کہ جب انسان اپنے رب کو پہچان لیتا ہے ، خدا کی وحدانیت کو سمجھ لیتا ہے تو پھر اس کے دل سے تمام خوف نکل جاتے ہیں۔ اس کا ہر عمل رضائے الٰہی کا تابع ہو جاتا ہے۔

اس لیے علامہ مرحوم نے جدید علوم حاصل کرنے سے پہلے مذہبی تعلیم کو لازمی اور ضروری قرار دیا ہے ۔آپ نے اپنے ایک لیکچر میں فرمایا کہ " آج کے نوجوان نے مغربی لٹریچر کے نشے میں ہر وقت سر شار رہ کر اپنی قومی زندگی کے ستون کو اسلامی مرکز ثقل سے بہت پرے ہٹا دیا ہے۔ عقلی و ادراکی لحاظ سے وہ مغربی دنیا کا غلام ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی روح اس صحیح القوام خود داری کے عنصر سے خالی ہو چکی ہے جو اپنی قومی تاریخ اور قومی لٹریچر کے مطالعے سے پیدا ہوتی ہے "۔[۲۳]

تعلیم کا مقصد حقائق اشیا کا علم حاصل کرنا اور مظاہر فطرت کی تسخیر ہے مگر زندگی کو عقل بے مہار اور فکر بے لگام نہیں کر لینا چاہیے۔انسان کو تاریخ کے مطالعہ سے سبق حاصل کرنا چاہیے ۔تاریخ کا مطالعہ نہایت ضروری ہے ۔ گزشتہ واقعات کے نتائج سے مستقبل کو سنوارنا چاہیے۔اجتماعی زندگی کے سفر میں قابل اعتماد رفیق اور رہنما تاریخی شعور ہوتا ہے۔ علامہ محمد اقبال فرماتے ہیں کہ " تعلیم کا مقصد ومنتہا اس ذہنی ورزش کا انتظام ہے کہ اس طرح انسان کی تمام پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر اور ان سب طاقتوں کو بیدار کیا جائے جو قدرت نے اس کے اندر ودیعت کر رکھی ہیں "۔[۲۴] چنانچہ سائنس اور ٹیکنالوجی سے واقفیت اور نئے علوم و فنون سے واقفیت کے لیے دروازہ کھلا رکھا جانا چاہیے۔حضورؐ کی حدیث ہے کہ " علم حاصل کرو، خواہ تمہیں چین ہی جانا پڑے"۔ علامہ محمد اقبال نے خودی پر بحث کرتے ہوئے بہت کچھ کہا ہے ۔ ان کے خیال میں خودی کا نشوونما بہت ضروری ہے ۔ان کا نظریہ یہ ہے کہ " خالق کائنات نے انسان کے اندر لامحدود صلاحیتیں ، بے پایاں اور پر اسرار کیفیتیں پیدا کر رکھی ہیں ۔ان صلاحیتوں، طاقتوں اور کیفیتوں کو باہم ایک دوسرے سے پیوستہ رکھنے والی چیز ہے خودی"۔

دوسرے الفاظ میں خودی دراصل انسانی " شعور کا مرکزہ (NUCLEUS) ہے اور یہ مرکزہ فطرت کی طرف سے ودیعت کردہ انسانی صلاحیتوں، طاقتوں اور کیفیتوں کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے اور ان کو منتشر و پراگندہ ہونے سے بچاتا ہے "۔[۲۵] اسی لیے علامہ اقبال نظریۂ تعلیم بیان کرتے ہوئے بنیادی اصولوں میں خودی کی پرورش، تربیت و بیداری اور تعمیر و استحکام کا ذکر کرتے ہیں"۔[۲۶] چنانچہ تعلیم کا نظام ایسا ہونا چاہیے کہ مسلمان کی خودی متحرک ہو جائے ۔سرپرسی نن (SIR PERCY NUN) مشہور انگریز ماہر تعلیم لکھتے ہیں کہ " تعلیم کا مقصد انسان کی انفرادیت کی مکمل نشوونما ہے"۔

علامہ محمد اقبال کا فلسفۂ خودی کم و بیش یہی انفرادیت ہے۔ آپ کے خیال میں " کامل طریقۂ تعلیم کا منشا یہ ہے کہ نفس ناطقہ کی پوشیدہ قوتیں کمال پذیر ہوں "۔[۲۷] اسلام میں نظریۂ تعلیم کا تصور اس کے ماضی

پر منحصر ہے۔قرآن مجید کے بیان کردہ واقعات اور حضرت محمد ؐ کے عہد کے واقعات ایک روشن مینار کی حیثیت رکھتے ہیں ۔قوم کے نشوونما میں ان اجتماعی احساسات، تجربات و روایات کا بنیادی حصہ ہے۔چنانچہ تاریخ پڑھنا اور اس سے سبق سیکھنا تعلیم کی بنیادی ضرورت ہے۔ اسلام ایک خالص تعلیمی تحریک ہے ۔ چنانچہ اس میں جدید علوم کے حاصل کرنے پر کوئی پابندی نہیں اور نہ ہی یہ جدید علوم مذہب کے خلاف ہیں۔مختصر یہ کہ اسلام علم حاصل کرنے پر کوئی پابندی عائد نہیں کرتا۔علم حاصل کرنا تمدن اسلامی کے دوبارہ زندہ کرنے میں جہاد کی حیثیت رکھتا ہے۔

حوالے

۱ ۔ شفیق الرحمن ہاشمی۔تعلیم اور تعلیمی نظریات ۔لاہور ۔ ص۔ ۲۱
۲ ۔ ایضاً ۔ ص ۔ ۳۸
۳ ۔ ڈاکٹر احمد شبلی (مترجم محمد حسین خان زبیری)تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ اور ثقافت اسلامیہ پاکستان ۔لاہور ۱۹۶۳ء (مقدمہ) ۔ص۔ھ
۴ ۔ ایضاً ۔ ص ۔ و ۔ (مقدمہ)
۵ ۔ المبرد ۔ الکامل ۔ جلد اوّل ۔ ص ۔۱۷۱
۶ ۔ الجاحظ ۔ البیان والتبیین ۔قاہرہ ۔ ۱۳۳۲ھ ۔جلد دوئم۔ص۔ ۹۲
۷ ۔ حسین الاصفہانی۔محاضرات الادبا ۔قاہرہ ۱۲۸۷ھ ۔جلد اوّل ۔ ص۔۲۹
۸۔ ابن خلدون المقدمہ ۔ص۔ ۳۹۹
۹۔ احمد امین۔ضحی الاسلام قاہرہ ۔ ۱۹۳۲ ۔ جلد دوم۔ص۔ ۲۵۲
۱۰ ۔ الجاحظ ۔البیان ۔جلد دوم ۔ص ۔ ۲
۱۱۔ ابن قتیبہ ۔عیون الاخباد ۔ قاہرہ ۔ ۱۹۲۸ء
۱۲۔ ڈاکٹر احمد شبلی ۔ ص۔۲۳
۱۳ ۔ ایضاً ۔ص ۔ ۷۵
۱۴ ۔ ایضاً ۔ ص ۔ ۷۲
۱۵ ۔ ایضاً ۔ ص ۔ ۹۵
۱۶ ۔ ابن جماعہ ۔تذکرہ السامع والمتکلم۔ص۔حیدر آباد ۱۳۵۳ھ
۱۷ ۔ ابن خلکان ۔وفیات الاعیان ۔قاہرہ ۔ ۱۲۸۲ھ ۔ص۔۵۵۱
۱۸ ۔ ڈاکٹر احمد شبلی ۔ ص ۔۱۲۱
۱۹ ۔ ایضاً ۔ ص ۔ ۱۲۲
۲۰ ۔ ایضاً ۔ ص ۔ ۱۲۲
۲۱ ۔ ابن خلدون ۔المقدمہ ۔ص۔ ۳۹۹

۲۲۔ Ado Ferrier, Dr., L., Ecole Active, Paris
(ترجمہ شیخ غلام حسین)
تعلیم کی نئی بنیادیں۔ لاہور ۔ ۱۹۵۸ ۔ص۔ ۱۲۹
۲۳۔ احمد خان محمد۔ اقبال اور مسئلہ تعلیم لاہور ۔ ۱۹۷۸ء ۔ص۔ ۸۲۔۸۳
۲۴۔ ایضاً ۔ ص ۔ ۹۵
۲۵۔ ایضاً ۔ ص ۔ ۹۸
۲۶۔ ایضاً ۔ ص ۔ ۹۸
۲۷۔ عبدالواحد ۔سید ۔ مقالات اقبال ۔ لاہور۔ ۱۹۶۳ء ۔ص۔ ۱۳

کتابیات

۱ ۔ قرآن مجید
۲۔ ابوالاعلیٰ مودودی سید ۔خلافت و ملوکیت ۔ لاہور ۔ ۱۹۷۹ء
۳ ۔ احمد خان ۔ محمد ۔ اقبال اور مسئلہ تعلیم ۔ لاہور ۔ ۱۹۷۸ء
۴۔ احمد امین ۔ ڈاکٹر ۔ضحی الاسلام ۔ قاہرہ ۔ ۱۹۳۲ء
۵۔ احمد شبلی ۔ ڈاکٹر (ترجمہ محمد حسین خان زبیری)
تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ ۔ لاہور ۔ ۱۹۶۳ء
۶۔ الجاحظ ۔ البیان و التبیین ۔ قاہرہ ۔ ۱۳۳۲ھ
۷ ۔ ابن جماعہ ۔ تذکرہ السامع والمتکلم ۔حیدرآباد ۱۳۵۳ھ
۸۔ حسین الاصفہانی ۔ محاضرات الادبا ۔ قاہرہ ۔ ۱۲۸۷ھ
۹۔ ابن خلدون ۔ المقدمہ ۔ لاہور ۔ ۔ ۱۹۶۳ ء
۱۰۔ ابن خلکان ۔ وفیات الاعیان ــــ قاہرہ ۱۲۷۵ ھ
۱۱ ۔ شفیق الرحمن ہاشمی ۔تعلیم اور تعلیمی نظریات ۔ لاہور
۱۲ ۔ عبدالواحد ــــ سید ۱۹۶۳ ء
۱۳ ۔ المبرد ۔ الکامل
۱۴۔ Ali, Amir, Syed, Spirit of Islam, Karachi, 1980
۱۵۔ Adolf Ferrier, Dr., L., Ecole Active, Paris.
(ترجمہ غلام حسین شیخ ۔تعلیم کی نئی بنیادیں ۔ لاہور، ۱۹۵۸)
۱۶۔ Nun, Sir Percy, Education: Data and First Principles, London, 1949.

عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں تعلیم

جناب سیّد الطاف علی بریلوی (علیگ)

انسانی فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ ماضی کے واقعات اور حالات پر قلم اٹھاتے وقت ایک عامی غیر ارادی طور پر اپنے ذاتی مشاہدات اور حالیہ کیفیت سے موازنہ کرکے بات کو آگے بڑھاتا ہے ، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے لے کر خلافت راشدہ کے زمانے تک تعلیم و تعلّم کے بارے میں بھی ہماری موجودہ نسل کے مورخین علی العموم اسی قسم کی کوششوں میں خود بخود شامل ہوجاتے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے جملہ شعبہ ہائے حیات ، ماضی اور حال کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوکر موقتی راہ عمل کی بنیادیں استوار کرتے ہیں ۔ اسلام کی آمد اور پھیلاؤ کے ساتھ عرب و عجم کی ماضی قریب کی روایات اور ماحول میں زبردست تبدیلی آئی ۔ اس تبدیلی کے محرکات ہم سب کے علم میں ہیں ،لیکن یہ انقلاب ایک مختصر وقفہ میں جس طرح ممکن ہوا اس کے بارے میں عرض ہے کہ اس کی تنظیم رسول برحق محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے ممکن ہوسکی ۔ جوں جوں آپ کے تربیت یافتہ مسلمانوں کی تعداد بڑھتی گئی اس مناسبت سے تعلیمی اور تبلیغی دائرہ کار بڑھتا گیا ۔ یہ تعلیم آج کل کے اسکولوں ، مدرسوں اور مکتبوں کے طریقہ کے مطابق نہیں تھی بلکہ اس کا دائرہ بے حد وسیع تھا اور یہ عمل چوبیس گھنٹہ کسی نہ کسی شکل میں جاری رہتا تھا ۔ پہلی تربیت گاہ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خود اپنی مجالس روحانی اور علمی تھیں جن میں آپ قرآن کریم کی آیات مبارکہ کی تفسیر صحابۂ کرامؓ کو بتاتے اور دینی اور دنیاوی مسائل میں ان کی رہبری فرماتے تھے صحابۂ کرامؓ انتہائی ادب و احترام نیز پوری احتیاط کے ساتھ آپ کے فرمودات کو جمع کرتے اور دوسرے حضرات تک پہنچانے کے سلسلے میں سعی بلیغ کرتے تھے ۔ اکثر صحابۂ کرامؓ مسائل حیات کے سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسارات فرماتے جن کا آپ مختصر لیکن جامع جواب دیتے تھے ۔ حضرت ارقمؓ کا مکان جو کوہ صفا کے دامن میں واقع تھا اس کو یہ عزت حاصل تھی کہ 6 ہجری کے آخر تک اس میں اشاعت اسلام اور نو مسلموں کی تربیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود فرماتے رہے ۔ اسی طرح حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کا مکان مسلمانوں

کی پہلی تربیت گاہ شمار کیا جاتا ہے - جہاں 1 ہجری تا 10 ہجری (دس سال) آپ کا قیام رہا - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مصعب بن عمیرؓ کو قرآن کریم کی تعلیم کے واسطے یثرب (مدینہ منورہ) میں متعین فرمایا تھا - اس نیک کام کے واسطے حضرت ابو امامہ اسد بن زرارہؓ نے اپنا مکان پیش کردیا - گویا مدینہ منورہ میں یہ مسلمانوں کی پہلی تربیت گاہ تھی - مدینہ میں ایک اقامتی درس گاہ " دارالقرا " کے نام سے بھی موجود تھی -

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حقیقت کا بخوبی ادراک تھا کہ مسلمانوں کو صد فی صد تعلیم یافتہ یا کم از کم خواندہ ہونا چاہیے - مدینہ منورہ میں آپ کے حکم پر سعید بن العاصؓ اس مشن کی تکمیل کے واسطے مقرر ہوئے - حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں مسجد نبویؐ مسلمانوں کی سب سے بڑی تعلیم گاہ تھی - یہاں دینی و دنیاوی دونوں طرز کی تعلیم مسلسل جاری رہتی تھی - البتہ ایک ایسا بھی حصہ مخصوص تھا جو مسجد کے ایک گوشے میں واقع تھا جس پر سائبان پڑا ہوا تھا ، یہی تاریخ میں صفہ کہلایا - اصحاب صفہؓ کی تعلیم کے انچارج حضرت ابوہریرہؓ تھے - دیگر اساتذہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ، ابی بن کعبؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ کے نام ملتے ہیں - یہاں وہ مہاجرین قیام کرتے تھے جن کے مالی وسائل نہ ہونے کے برابر تھے اور جو تنہا زندگی گزارتے تھے - ان مبارک ہستیوں نے اپنے آپ کو اسلامی تعلیمات کے حصول اور پھر توسیع علم کے واسطے وقف کردیا تھا - اصحاب صفہؓ کے پاس دور و نزدیک سے طلبہ علوم دینی کی تحصیل کے لیے اتے تھے - ان طلبہ اور اصحاب صفہ دونوں گروہوں کی عامۃ المسلمن بالعموم اور صاحب حیثیت مسلمان بالخصوص خبر گیری رکھتے تھے - اصحاب صفہ کے کھانے پینے کے نگراں معاذ بن جبلؓ تھے - اس طرح وہ زندگی کی بنیادی ضروریات سے بے نیاز ہوکر تعلیم و تعلّم میں مشغول رہتے تھے - اس فیض بار جامعہ کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر شریک درس ہوتے تھے - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں توسیع علم کی اہمیت کا یہ عالم تھا کہ زمانہ امن اور حالت جنگ دونوں کیفیتوں میں آپ اس پہلو پر توجہ رکھتے تھے ، چنانچہ 2 ہجری میں جنگ بدر کے موقع پر پڑھے لکھے گرفتار شدہ قیدیوں کی رہائی کے واسطے آپؐ نے جو فدیہ مقرر کیا وہ یہ تھا کہ ہر قیدی دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھادے اور پھر آزادی کی نعمت حاصل کرلے -

آپؐ کے دور میں عرب قبائل عموماً تعلیم کی نعمت سے نا آشنا اور جہالت

کے قعر مذلت میں پڑے ہوئے تھے - ان میں جب بھی کوئی قبیلہ مسلمان ہوتا آپ ان کی تعلیم و تربیت کے واسطے تربیت یافتہ جید عالم و فاضل صحابہ کو متعین فرماتے تھے ، مثلاً حضرت معاذ بن جبل رض اور ابوموسی رض یمن بھیجے گئے - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواتین کی تعلیم کا بھی برابر خیال رہتا تھا - چنانچہ شفا بنت عبداللہ عدویہ رض آپ کی خواہش کے مطابق امہات المومنین کو لکھنا پڑھنا سکھانے کے واسطے تشریف لاتی تھیں -

امہات المومنین میں خواتین کی تعلیم کا حقیقی محور حضرت عائشہ رض کی ذات گرامی تھی - حج کے زمانے میں حضرت عائشہ رض کے خیمہ میں دور دراز کی مسلم خواتین کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہوتا تھا - علمی اعتبار سے ام المومنین حضرت حفصہ رض کا مرتبہ بھی بہت بلند تھا حضرت ابوبکر صدیق رض نے مکمل قرآن مجید آپ کے پاس رکھوا دیا تھا -

اسلامی تحریک، فتوحات اسلام کے ساتھ ساتھ سب سے پہلے خطۂ ایران سے متعارف ہوئی ، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ رسالت میں سورہ فاتحہ کا ترجمہ فارسی زبان میں حضرت سلمان فارسی رض نے فرمایا -

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے سب سے بڑے معلم کا اعزاز حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک سے وابستہ ہے - آپ کا حقیقی اتباع کرنے والی پہلی جماعت میں ازواج مطہرات نیز صحابۂ کرام رض شامل تھے -

طریقۂ درس و تدریس و نصاب تعلیم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولین خواہش تھی کہ لوگوں میں خود احتسابی کی عادت علم دینی و دنیاوی کے ذریعہ سے پیدا ہو تاکہ ایک ایسا مضبوط مسلم معاشرہ وجود میں آجائے جو خدائے واحد کی تعلیمات کو چہار دانگ عالم میں صحیح انداز میں پیش کرنے کے واسطے ایک نمونہ کا کام دے -

مندرجۂ بالا مقصد حاصل کرنے کے واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اولاً قرآن کریم کی تحصیل پر زیادہ زور دیا جاتا تھا - آپ کے اقوال و کردار قرآن کریم کی تعلیمات کے عین مطابق تھے ، جہاں کہیں لوگوں کو مزید ہدایت و تشریح کی ضرورت ہوتی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محفل میں معروضہ پیش کرتے اور مسئلہ فوری طور حل کر دیا جاتا - اکثر صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے ارشادات کو حتی الامکان

صحت کے ساتھ دوسرے ثقہ بزرگوں کو تواتر کے ساتھ سناتے ، ان کے ذہن نشین کراتے اور سینہ بسینہ انؓ روایات کو محفوظ کرنے کی کوشش کرتے تھے -

اس دور کے نصاب تعلیم کی تحصیل کے نتیجے میں لوگ تقویٰ کے معنی اور اہمیت سے کما حقہ واقف ہوگئے تھے - معاشرتی معاملات میں ایک دوسرے کے حقوق کی پاسداری اور وفاداری کا جذبہ لوگوں میں بیدار ہوگیا تھا - وہ قابل اعتماد پڑوسی ، امانت دار ، دیانت دار ، یتیموں اور بے کسوں کے ہمدرد اور غصے سے دور ،نرم خو نیز روز جزا کا ہر وقت خیال رکھنے والے بن گئے تھے -

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں مساجد علم کا مرکز بن چکی تھیں جہاں صحابہ کرامؓ کی رشد و ہدایت کی محفلیں جاری تھیں- جیسا کہ ابتدائی سطور میں عرض کیا جاچکا ہے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سامعین کو جب مخاطب فرماتے تو مختصر جامع اور انتہائی دلنشین انداز میں تقریر کرتے تھے - آپؐ کی زبان مبارک میں شیرینی ، اور اثر انگیزی تھی جس کا کفاّر عرب کو بھی اعتراف تھا - اسی واسطے آپؐ کو افصح العرب کہنا ایک سچی اور حقیقی بات ہے -

اساتذہ کا مرتبہ

حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کے حصول کو ایک عبادت قرار دیا ہے - دوسروں کو ذی علم بنانے کا بڑا اجر و ثواب ہے -

اساتذہ کے بارے میں آپؐ کا ارشاد ہے کہ :

" جن سے تم علم سیکھتے ہو ان کی تعظیم کیا کرو "

" استاد کے سامنے ادب سے بیٹھو اور اس سے خوش خلقی اور نرمی سے پیش آؤ - "

" علم سیکھو اور سکون و وقار سے سیکھو اور جس سے علم سیکھو اس سے تواضع اور انکسار کا برتاؤ کرو - "

کتابیات

سیرت پاک پر معروف کتابوں کے علاوہ درج ذیل مواد سے بھی استفادہ کیا گیا ہے :

1۔ عہد نبوی کی علمی ترقیات ا مجلہ 87 از مولانا محمد حفیظ اللہ پھلواروی ۔ شائع کردہ عالمی ادارۂ اشاعت علوم ۔ ملتان

2۔ " رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نظام تعلیم و تربیت" ۔ مقالہ از پروفیسر رحمت فرخ آبادی ،العلم سہ ماہی اپریل تا جون 1982

3۔ " ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت ۔" از مولانا مناظر احسن گیلانی

4۔ ریڈیائی تقریر ۔ سید الطاف علی بریلوی 25/ستمبر 1970 بعنوان " عہد خلفائے راشدہ رض میں تعلیم "

THE ISLAMIC VIEW OF EDUCATION AND THE CHALLENGE OF TODAY AND TOMORROW

By

RASHID AHMED

The accepted meanings of 'Education' are: bringing up, training, developing character and mental powers, an organized system or course for achieving any or all of these objectives. The real significance of these objectives in any community or culture will depend on this concept of the nature and purpose of human life — individual and collective.

Islam regards man as the noblest of God's creations a bio-spiritual being, His viceregent on earth, capable of taking a hand in the fashioning of his own destiny and becoming under God's will — the lord of the Universe. Lord of the universe? Eyebrows may well be raised over this by those who know of the almost unimaginable vastness and complexity of the universe. But their heads may begin to nod in approval if they ponder over the implications of some of this century's advances in science; the division and sub-division of the particles of matter resulting in the discovery of some particles with zero mass; the replacement of matter by energy as the basic factor in the structure of the universe; the knowledge about the four forces and of waves of energy spanning the vast universe and not always behaving as waves of particles of matter; the advances in chemistry and microbiology pointing to a continuous evolutionary process that bridges the gulf between matter and life; the researches in psychology and the structure and functions of the brain: the experiences such as those of Gurdgeffe and Ouspensky about the spiritual potential of man; and a host of other insights since the first enunciation of the Theory of Relativity that have

led scientists now to talk of the mind-matter universe, an evolutionary universe in which self-awareness and self-motivation can be seen as representing the most highly evolved stage, and man as its visible manifestation. This noblest creation of god is not all good and no evil. He hasn't the constant unchanging and confined virtue of angles. In fact his particular virtue lies in his mastering the evil in himself and developing the good. The descent on earth of Adam, Eve and Satan, take it literally or metaphorically, initiated the drama of the struggle between good and evil in which man is the central character. His task is to win the war for good and his assets or his armaments are his intuition and reason which give him in some measure the ability to assess his situation and make a choice. The winning of the war he is engaged in, according to Islam, is the winning of God's *Raza*, His approval, the way to which is by developing an individual character endowed with knowledge, purity and discipline and using this character to build a human society of brotherhood and cooperation which can only be envisaged in terms of justice, tolerance, truthfulness, compassion, equality of rights, peace and the love that gives and does not grasp.

The Islamic view of Education then is to prepare man for this task: For the task of individual self-mastery leading through collective harmonious cooperative effort to the conquest of nature visualized as the attainment of the highest possible spiritual state and a worldwide just and peaceful society. The building of individual character must necessarily begin in infancy. And this can be done only in the family. The parents therefore must be involved in the process from the start. The job is not to control the child but to help it to control itself. They should wisely, in the light of the guidance provided by God to man down the ages through His messengers, guide the child's habits and, as it grows enough to formulate them, his or her beliefs; beliefs about the nature of the universe, his or her relations to it and his or her relations to fellow human beings. Thus started the process of education which must be continued on an organised and institutional basis. Experience has shown that formal institutional education can begin around the age of five years and continued to the end of the teens and as required into the early twenties. The overall object of educational institutions should be .to transfer to the new generation the accumulated knowledge, insights and experience of past generation

and to guide it at once to extend and expand this heritage and to develop that individual character which is enlightened and pure and disciplined enough to enable them to prefer the collective good to personal gain and live as part of a society of universal human brotherhood. The necessary requirements of a good educational institution therefore are: 1) adequate space and equipment for instruction and games and 2) sufficient number of qualified teachers and coaches. 1) includes buildings, furniture, studios, libraries, laboratories, audio-visual aids, and playgrounds etc. 2) comprises a corps of teachers and instructors most of whom preferably — all -- are fully aware of and dedicated to the objectives of the Islamic view of life and possess the individual character described earlier. Also an adequate number of teachers in all the disciplines of the sciences and humanities that the world knows of today — experts who can teach mathematics, physics, astronomy, chemistry, biology, health, medicine, sociology, history, philosophy, administration etc., etc. One would be surprised if the immediate reaction to this was not — "a tall, an impossible order". But then that would be the likely reaction if one looked at not all but only a few of the major challenges the world is faced with today: the political and military challenge of peace, the economic challenge of poverty and mal-distribution of wealth, the moral and social challenge of distrust and dissension among communities and of corruption and greed, of boredom in affluence, of apathy and alienation of the agony of social injustice, the claustrophobia of closed and controlled societies. Or simply the challenge of surviving tomorrow. The world *has* got itself into an impossible situation.

So let us not allow the dismay caused by a clear look at the world as it is today to overshadow the importance of the measures required to pull ourselves out of that impossible situation. We must start with a bold statement of the ideal to determine our direction and our path. Then, when we start moving howsoever slowly, we are less likely to lose our way.

So let us get back to our statement about the Islamic view of education and explore the practicability of slow advances towards its adoption. First of all we must achieve a consensus on accepting this view as Islamic. We have become so familiar with phrases like Islam gives us 'a comprehensive code of life,"it relates to all aspects of life", "it does not isolate religion from day-to-day living", that

there should be no difficulty in agreeing that the imparting of knowledge as a function of education must include all branches of knowledge and not confine itself to *diniyat* understood as a study of some aspects of Muslim history and of *fiqah*.

Then we must realise that many of the difficulties in the way of mounting the educational effort for achieving its Islamic ends spring from the accumulated result of our past misconceptions and misdeeds. Take the first step of the involvement of parents in the upbringing, character-building and belief-forming of children. Why this goes by default is for two main reasons. First, the parents themselves are ignorant of the principles and objectives of Islam. Second, involved in the materialistic and wealth oriented way of life in an industrialised society, the rush of their competitive work life in which often enough both parents are engaged, they have little time for their children and what attention they do manage to give them has a negative influence because of their own frustrations and cynicism and false values. They lack the faith, the hope, the enthusiasm required for the job. A small dose of education administered to the parents will pay many-fold dividends in the education of the children. So we begin with this small dose.

Then there is the impracticability of obtaining an adequate number of qualified teachers with our limited human and material resources. The employment situation being what it is, numbers by themselves are no great problem. The greater problem is attracting people to the vocation by offering attractive monetary inducements in a competitive society and/or satisfactions of social respect and prestige. It is not difficult to see how much of this is due to the economic system we have embraced. With a more equitable distribution of wealth as well as the sources of wealth production, the problems of economic returns as well as of social prestige can be eased and the way opened for qualified and dedicated teachers. So let us begin with a small dose of economic reform.

But what about the buildings, the equipment, the laboratories etc? It may be small comfort to know that the eradication of corruption and dishonesty can result in spectacular increases in our production of goods and utilisation of our material resources. The hard fact: the stark reality is that a truly Islamic system of education can exist only in a truly Islamic society. The achievement of one is no taller (and no less laudable) an order than the achievement of

the other.

Reforming the educational system needs must proceed hand in hand with reforming all aspects of our social, economic, political and cultural life. The beginnings may be modest. In our situation and with our resources they can only be modest. But they must not be fragmentary or partial. We cannot dwell on one aspect of education and neglect the other. The Islamic system of education like Islam itself is comprehensive and organic: Indivisible. Just as "Iman" without "Amal" is fruitless, barren and "Amal" without "Iman" wayward, lost, so also is the development of character incomplete without the acquisition of knowledge and skills, science and technology, and knowledge and technolgy lead only to animosity, unhappiness and destruction if not subordinated to ethical objectives and harnessed to the promotion of the common good of mankind.

We cannot reject any part of the system on extraneous considerations such as its origin in foreign lands or its links with a foreign culture or its association with a foreign language without damaging the structure of the system. Let us not forget that this educational system is part of a "Deen" which accords man the dignity of being the servant of God and the master of creation, which assigns to him the task of fashioning a community of universal human brotherhood, a society of peace. Such a society can hardly be achieved without a universal cooperative effort. Such an effort will require the overcoming of the rivalries and antagonisms of nationalism and clash of ideologies. It will require a tolerance and understanding of various cultures and appreciation of man's creative ability expressed in various art forms. It will need the pooling together of knowledge and skills, of science and technology and this in turn will impose a twofold necessity resolving, (a) the difficulties of communication imposed by a multiplicity of languages, and (b) the tendency towards the insulation and fragmentation of specialized fields of knowledge. The solution of the language problem may lie as suggested by Toynbee in the adoption of four to six languages at the level of ability to read and write freely in the centres of education. These languages should be from among the most widely spoken and culturally and scientifically the richest languages of the world. Arabic will certainly be one of them. The solution of problems raised by the necessity of specialisation

seems to demand the combining of generalism and specialism in judiciously selected proportions which will avoid both the superficiality of the generalists', and the distortion of the specialists' vision. This may further be helped by a carefully planned allotment of fields of knowledge to students in accordance with their individual aptitudes and natural gifts; and finally such an effort if and when made will depend for its success, in Toynbee's words once again, on "man's ability to see the whole behind the part and to see what lies behind the whole universe".

All these efforts and all these problems relate directly or indirectly to the concept and system of education described at the beginning of this paper as reflecting the Islamic view. By such cooperative efforts alone can mankind meet the challenge of today and tomorrow.

If mankind ever succeeds in making these efforts and solving these problems, it will arrive at a human society that has all the features, general and detailed of an Islamic society. That the contribution of God-fearing non-Muslims of goodwill and enligtenment in achieving this end will be considerable, should be evident from the fact that in describing the efforts to be made and the problems to be solved I have reflected many of the perceptions of Arnold Toynbee an eminent non-Muslim historian and philosopher who believes in the "spiritual presence behind the universe". There is here affirmation of the truth that there is only one "Deen" liked and approved by God and chosen by Him for man and sent down by Him through many Messengers till it was finally revealed in full by the Last of His prophets may peace be upon him.

اسلامی نظریۂ تعلیم کی اساس
نئے نصاب کی تشکیل و تدوین

جناب حافظ حاجی محمد یعقوب ہاشمی

مذاکرۂ ملی تعلیمات نبوی[ص] کے لیے جن تین عنوانات کا تعین فرمایا گیا ہے وہ مسئلے کی نوعیت کے مظہر بھی ہیں اور اس کے تجزیے کی نشان دہی بھی کرتے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ اس مسئلے کے حل کے لیے فکر و عمل دونوں کی راہیں بھی متعین کرتے ہیں ۔ اس لیے میں ان تینوں عنوانات کو ایک دوسرے سے مربوط سمجھتے ہوئے تینوں پر حتی الوسع اختصار سے گفتگو کرنے کی جسارت کروں گا ۔

ایک بات میں شروع میں ہی عرض کرنا چاہوں گا جو اگرچہ پہلے عنوان سے ذرا ہٹ کر ہے تاہم وہ اس تعلیمی نظام کے پس منظر پر روشنی ڈالتی ہے جو ہمیں صبح یوم آزادی پر آج سے کم و بیش سینتیس[۳۷] برس پہلے انگریز سے ورثے میں ملا تھا ۔ جن حضرات کو ویسٹ منسٹر ایبے لندن کے عقبی انکلوژر میں جانے کا اتفاق ہوا ہوگا ان کا ذہن وہاں ایک سنگ مرمر کا کتبہ پڑھ کر اسی طرح صدمے سے دوچار ہوا ہوگا جس طرح میں ہوا تھا :

1858—1947

To all those who served the Crown in the Colonial Territories.

This is to commemorate the civil services of the Crown in India Let them not be forgotten for they served India well.

This Memorial was unveiled by Her Majesty the Queen, on 6th March 1958.

اس خراج عقیدت میں، جو کم و بیش ہماری غلامی کی گزشتہ ایک صدی کے دوران انگریزی استعمار کے عمّال اور ایجنٹوں کو پیش کیا گیا ، منجملہ اور کارناموں کے وہ کارنامہ بھی شامل ہے جو انگریز کے اس تعلیمی نظام کو کامیابی کے ساتھ نافذ کرنے سے متعلق ہے ۔ اسے ۱۸۳۲ء میں لارڈ میکالے نے

مسٹر ٹریولین سے وضع کرایا تھا۔مسٹر ٹریولین (TRIVILIEN) لارڈ میکالے کا برادر نسبتی تھا اور ٹرینٹی کالج کیمبرج میں لارڈ میکالے کا ہم جماعت بھی تھا اور اس کے ساتھ ہی ہندستان آیا تھا۔ٹریولین نے جو تعلیمی رپورٹ مرتب کی تھی اس میں واضح اور غیرمبہم الفاظ میں لکھ دیا تھا کہ ہندستان میں دو قومیں ہیں ۔ ایک قوم ہندوؤں کی ہے اور دوسری مسلمانوں کی ۔ ہندو قوم کوئی قوم نہیں یہ ایک اوہام پرست قوم ہے ۔ان کا مذہب اور ان کی تہذیب چند بےہودہ رسوم و رواج اور توہمات پر مبنی ہے اس لیے اس قوم سے نپٹنا مشکل نہیں ۔البتہ ڈر مسلم قوم سے ہے جن کا مذہب بہت توانا جس کا ماضی بےحد درخشندہ،جس کی تاریخ بہت تابناک اور جس کی روایات بہت گہری اور مضبوط ہیں ۔

علامہ اقبال رح[۳] نے غالباً ٹریولین کے اس خیال کی ترجمانی ابلیس کی زبانی یوں کی ہے کہ

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

اس لیے ٹریولین کے نزدیک اس قوم کا علاج یہ ہے کہ تعلیم کے ذریعہ سے اس کو اس کے ماضی ، اس کی شاندار تاریخ اور اس کی قومی روایات سے بے خبر کر دیا جائے ، اس کے دلوں میں انگریزی زبان اور انگریزی تہذیب تمدن کی برتری کا احساس پیدا کیا جائے اور اس کے اذہان میں انگریزی ثقافت کا تفوق اس طرح راسخ کر دیا جائے کہ یہ لاشعوری طور پر اپنے اسلامی تمدن اور معاشرت پر نہ صرف شرمانے لگے بلکہ ان سے نفرت بھی کرنے لگے۔ علامہ نے لارڈ میکالے کی اس پالیسی کو بھی اپنے اشعار میں یوں بیان فرمایا ہے کہ

اہل حرم سے ان کی روایات چھین لو
آہو کو مرغزار ختن سے نکال دو

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روح محمد ص[۳] اس کے بدن سے نکال دو

لطف یہ کہ ٹریولین کی یہ تعلیمی پالیسی کوئی خفیہ دستاویز نہیں تھی بلکہ ایک کھلا اعلان تھی۔ اور اس کی یہی تعلیمی پالیسی ایک صدی سے زاید عرصے تک برصغیر میں نافذالعمل رہی ۔حقیقت یہ ہے کہ اس کی روح آج بھی ہمارے تعلیمی نظام میں جاری و ساری ہے انگریز کے

دور حکومت کی یہی وہ عظیم کامیابی ہے جس کو انہوں نے ہندستان چھوڑنے کے بعد ویسٹ منسٹر ایبے میں پتھر پر ریکارڈ کر کے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار ۔

یہاں ایک المناک حقیقت کا مختصر طور پر اظہار کرنا بے محل نہ ہوگا کہ اسی انگریزی دور میں ترجمان حقیقت حکیم الامت علامہ اقبال رح[2] نے چھٹی ، ساتویں ، اٹھویں جماعت کے لیے اردو کا کورس مرتب فرما کر نصاب میں داخل کر دیا تھا ۔اس کورس میں علامہ نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے، بچوں کی تربیت اخلاق کے لیے انتہائی ضروری اور قیمتی مواد بہم پہنچایا تھا ، لیکن ہماری قوم نے تصور پاکستان کے اس عظیم احسان کا بدلہ اس طرح دیا کہ آزادی ملتے ہی ، یعنی پاکستان کے قائم ہوتے ہی ، ان کے لیے مرتب کردہ رائج شدہ کورس کو نصاب تعلیم سے خارج کر دیا ۔ انا للہ!

اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ انگریزی کا دیا ہوا نظام تعلیم ان کی کسی بد نیتی پر مبنی نہیں تھا تو ان کا مجوزہ یا رائج کردہ نظام مسلمان قوم کے بچوں کی ضروریات ، ان کے مقصد حیات ، ان کے کلچر ، ان کی تہذیب اور روایات سے مختلف ہی نہیں بلکہ متصادم بھی تھا ۔ان کے لیے ایک غلام قوم کو اسی قسم کی تعلیم اور تربیت دینا ضروری تھا جس سے ان کی قوت حاکمہ مضبوط ہو جیسی کہ انہوں نے مہیا کی۔اس سے قطع نظر بھی ان کے نظام حیات میں دین و دنیا الگ الگ دوائر میں چلتے ہیں ۔ ان کے فلسفے اور عمرانیات دونوں کے اصول اللہ سے مکمل طور پر بے تعلق ہیں ۔ ان کے محض مادیت پر مبنی علوم تو ویسے بھی اللہ یعنی کسی خالق ازلی اور حقیقی کی ضرورت سے بے نیاز ہیں ۔ ان کے نزدیک مادہ ایک خود کار حقیقت ہے جو اپنی حرکت پذیری سے ارتقائی منازل طے کرتا اور مختلف روپ دھارتا چلا جاتا ہے۔اس طرح اس کائنات میں، نعوذ اللہ اگر اللہ کا وجود ہے بھی تو قطعاً غیر ضروری ہے۔ظاہر ہے کہ یہ نظریات حیات اور یہ نظام تعلیم مسلمان قوم کے لیے سمّ قاتل ہے کیونکہ یہ باطل نظام کا مظہر ہے ۔ہماری قوم کی انتہائی بد قسمتی ہے کہ ہمارے ہاں ثانوی تعلیم کا نصاب ہو یا اعلا تعلیم کا ، قیام پاکستان کے بعد اس کو اسلامی بنانے کے لیے اس میں صرف دینیات کے مضمون کا اضافہ کر دیا گیا ہے جس سے طالب علم کے ذہن میں مزید مغائرت ، دوئی اور انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔اور بقول مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی یہ ایسی بات ہے جیسے کوئی شخص کفر کے راستے پر کفر کی منزل کی طرف جا رہا ہو،لیکن ساتھ ساتھ اللہ کا نام بھی لیتا جا رہا ہو ۔

قبل اس کے کہ رائج الوقت نصاب ہائے تعلیم کا جائزہ لیا جائے اور دیکھا جائے کہ ہمارے بچے کیا پڑھ رہے ہیں اور کس قسم کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں ، ضروری ہے کہ اس بات پر غور کیا جائے کہ اسلامی نظریۂ تعلیم کا تصور اساسی کیا ہے -

ظاہر ہے کہ اسلامی نظریۂ تعلیم کا تصور اساسی وہی ہوگا جو اسلام کا تصور اساسی ہے اس لیے یہ معلوم کرنا از حد ضروری ہے کہ اسلام بذات خود کیا ہے - اس کے معنی کیا ہیں اور اس کے تقاضے کیا ہیں -

اسلام کے معنی ہیں اللہ تعالٰی کی عبادت ـــ مکمل ، غیر مشروط اور بلا شرکت غیرے -

اسلام میں اطاعت کی دو قسمیں ہیں :- اطاعتِ اجبار اور اطاعتِ اختیار یعنی جبری اطاعت و اختیاری اطاعت - اطاعتِ اجبار وہ اطاعت ہے جو اللہ کے قوانین طبعی کے تحت کرنی پڑتی ہے ، جیسے سانس کی آمد و رفت ، حرکت قلب ، رگوں میں خون کی گردش وغیرہ - اس اطاعت میں صرف انسان ہی نہیں بلکہ ساری کائنات بھی اللہ کی بندگی میں شریک و شامل ہے ، اس کی خلاف ورزی کوئی بھی شخص کر سکنے پر قادر نہیں -

دوسری اطاعت یعنی اطاعت اختیار یہ ہے کہ جن امور میں اللہ نے انسان کو جبراً اپنے احکام کا پابند نہیں کیا ، بلکہ حق و باطل کا فرق سمجھا کر ، اپنی کتابوں اور انبیا کے ذریعہ سے اپنی اطاعت کی تعلیم دی ہے ، ان امور میں بھی اللہ کی کامل اطاعت کرنا - اطاعت اجبار کے لیے کوئی نبی یا سلسلۂ وحی نہیں ہے - نہ انسان کے لیے نہ باقی کائنات کے لیے ، کیونکہ یہ نظام اللہ تعالٰی کے قوانین طبیعی پر جاری و قائم ہے ، لیکن اطاعت اختیار کے لیے جو انسان پر لازم کی گئی ہے ، اللہ نے انسان کی ہدایت کے لیے اور رہنمائی کی خاطر صحف سماوی نازل کیے ، پیغمبر بھیجے اور کتابوں اور پیغمبروں کو سمجھنے اور ان کا اتباع کرنے کے لیے عقل و فہم کی نعمت عطا فرمائی -

حکم خداوندی ہے کہ قوانین اجبار کے تحت کائنات کی مادی طاقتوں سے جو اسباب و وسائل حاصل کیے جائیں وہ قوانین شریعت کے تحت استعمال کیے جائیں تاکہ ایک طرف تو اللہ تعالٰی کے حقوق پورے ہوں اور دوسری طرف قوانین طبیعت کے ذریعہ سے مہیا کی ہوئی ساری قوتیں اور طاقتیں کل انسانوں کی اجتماعی فلاح و بہبود کے لیے وقف رہیں - مثلاً تلوار طبیعاتی اصول (LAWS OF PHYSICS) کے تحت تیار ہوگی ، لیکن اس

کا استعمال شریعت کے قوانین کے تحت ہوگا۔یعنی یہ دیکھنا ہوگا کہ کہاں اس کا استعمال جائز ہوگا اور کہاں ناجائز۔قوانین شریعت کے علم کی انتہا اجتہاد ہے جس کے ذریعہ سے انسانی زندگی میں روز مرہ ابھرنے والے مسائل کو منشائے ایزدی کے مطابق حل کرنا ممکن ہے۔ قوانین طبیعت کا انتہائے علم یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے مادی ضروریات پوری کرنے کے لیے مطلوبہ چیزیں ایجاد کی جائیں۔ ان دونوں علوم کا منتہا اور مقصود انسان کی زندگی میں عدل و انصاف کا قیام ہے جو جہاد کے بغیر ممکن نہیں۔اس لیے تمام مادّی ایجادی طاقتوں کو اجتہادی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا نام جہاد ہے۔جب تک یہ تینوں باتیں نہیں ہوں گی زندگی نامکمل رہے گی۔

قانون طبیعت یا قانون طبیعیات ہی سائنس ہے اور قانون طبیعیات پر مبنی علوم سائنسی علوم کہے جاسکتے ہیں۔قانون طبیعیات اور قانون شریعت ایک دوسرے کے محتاج اور مددگار ہیں۔اس لیے یہ کہنا کہ اسلام اور سائنس کا آپس میں تصادم ہے یا یہ ایک دوسرے سے متصادم ہیں صحیح نہیں۔ہاں بعض تھیوریاں جو انسان کے غلط استنباط اور غلط توجیہات پر مبنی ہیں، ضرور اسلام سے متصادم ہیں،لیکن ان میں انسان کی عقل ناقص اور عجز فہم کو دخل ہے، خود قانون طبیعیات کو نہیں۔تاہم ان کا ذکر تھوڑا سا آگے چل کر کروں گا۔

یہاں اسلام کے اساسی نظریہ کی مزید وضاحت کے لیے ایک آیۂ کریمہ کا حوالہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

یایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السّلم کافّۃً ولا تتّبعوا خطوٰت الشیطٰن انّہ لکم عدو مبین ۞

(البقرہ : ۲۰۸)

اور تفسیر اس آیۂ کریمہ کی یہ ہے کہ اے ایمان والو تم کسی استثنا و تحفظ کے بغیر پوری زندگی کو اسلام کے تحت لے آؤ۔ تمہارے خیالات، تمہارے نظریات، تمہارے عقاید، تمہارے افکار، تمہارے علوم تمہارے اخلاق، تمہارے طور طریقے، تمہارے معاملات اور تمہاری سعیٔ و عمل کے راستے سب کے سب بالکل تابع اسلام ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ تم اپنی زندگی کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے بعض حصوں میں اسلام کی پیروی کرو اور بعض حصوں کو اس کی پیروی سے مستثنٰی کر لو۔

اسلام کی اساس تین بڑے نظریات یا عقائد پر ہے۔ توحید، رسالت اور آخرت ان میں سے ایک بھی غائب ہو تو ایمان نامکمل ہے،کیونکہ یہ تینوں باتیں ایمان کے اجزا ہیں۔ اسلام کا مقصد مسلمان کے دل میں ایمان

پیدا کرنا ہے اور ایمان کے اندر تقویٰ ، صبر ، توکل ، اسلامی تہذیب وغیرہ سب کچھ آ جاتا ہے -

مسلمانوں کے تعلیمی نظام کی اساس اس واضح حقیقت پر ہے کہ اسلام ایک مذہب نہیں بلکہ ایک دین ہے - اور حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم میں اسلام کے لیے مذہب کا لفظ کہیں استعمال ہی نہیں ہوا - دین انسان کی پیدائش سے لے کر یوم الحساب تک اس کی زندگی پر محیط ہے - یہی وجہ ہے کہ اسلام میں نظریۂ تعلیم کا تصور اساسی باقی اقوام کے تصور اساسی سے یکسر مختلف ہے - اسی حقیقت کے بارے میں علامہ اقبال نے اس طرح اظہار خیال فرمایا ہے :

اپنی ملّت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملّت بھی گئی

ہمارے نظام تعلیم میں سارا بگاڑ اور فساد اہل یورپ کے اس باطل اور فاسد نظریہ کا ہے کہ تعلیم اور مذہب جداگانہ چیزیں ہیں - ان کے ہاں دین کا تو تصور تک نہیں !

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے ، اسلام میں قوانین فطرت (NATURAL LAWS) حقیقت ابدی کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان پر مبنی سائنسی علوم عین اسلامی علوم ہیں - مثلاً فزکس ، کیمسٹری ، بیالوجی ، فزیالوجی ، اناٹومی ، طب ، اسٹرانومی وغیرہ - ان سائنسی علوم کو اسلامی نظام تعلیم و نصاب تعلیم میں رکھنا بے حد ضروری ہے -

تین باطل نظریات

بد قسمتی سے پاکستان میں موجودہ نظام تعلیم ، اعلا تعلیم کی سطح پر انتہائی فاسد اور غیر اسلامی نظریات کا حامل ہے - یہ نظریات تین مختلف علوم سے متعلق ہیں - ان میں ایک علم سائنس کا ہے ، ایک اقتصادیات اور ایک نفسیات کا - یہ تینوں نظریات ارشادات ربانی یعنی قرآن حکیم سے براہ راست متصادم ہیں - لیکن پورے سینتیس برسوں سے

بھی کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں ہیں۔

نظریہ ارتقا

پہلا نظریہ تو THEORY OF EVOLUTION ہے جس کا بانی سر چارلس ڈارون تھا۔ ڈارون کے نظریۂ ارتقائے انسانی کے مطابق انسان پہلے بندر تھا۔اور ترقی کرتے کرتے انسان بن گیا۔اور لوگوں کو تو جانے دیجیے ، اس تھیوری کے مطابق نعوذباللہ ابوالبشر ، ابوالانبیا سیدنا آدم علیہ السلام کا اور پھر ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام کا جو نقشہ IMAGE بنتا ہے وہ ظاہر ہے ۔لیکن اس موضوع پر قرآن حکیم کے ارشادات تخلیق آدم کے بارے میں واضح ہیں ۔ارشاد باری تعالیٰ کے مطابق تخلیق آدم کے سات مدارج ہیں :

۱) خلقه من تراب	اس کو مٹی سے پیدا کیا
۲) من طین	پانی ملی مٹی سے پیدا کیا
۳) من حماٍ مسنون	وہ مٹی گارا سی تھی
۴) من طین لازب	وہ گلاوہ جو قبول صورت کے لیے تیار ہو چکا ہو
۵) من صلصال	یہ مٹی خشک کھڑکھڑانے والی ہو جائے
۶) من صلصال کا الفخار	کسی قدر آگ سے تپ کر ٹھیکرے کی طرح بجنے والی
۷) فا ذا سویته نفخت فیه من روحی	پھر جب میں نے اس کو موزوں کیا اور روح پھونکی

باری تعالیٰ نے تخلیق آدم کے سات مراحل بیان فرمانے کے بعد قرآن حکیم میں تولید انسانی کے بھی سات اسٹیج بیان فرمائے ہیں ۔

۱) من سلالة من طین	گندھی ہوئی مٹی کی ایک قلیل مقدار
۲) نطفةً فی قرار مکین	نطفہ پائیدار جگہ میں یعنی رحم میں
۳) علقه	یعنی خون منجمد
۴) مضغه	گوشت کا لوتھڑا
۵) عظاماً	ہڈیاں
۶) فکسونا العظام لحما	پھر پہنا دیا ہم نے ہڈیوں کو گوشت

۷) ثم انشاناہ خلقا آخر — پھر ہم نے اس کی ایک اور خلقت کردی

اور پھر فرمایا فتبارک اللّٰہ احسن الخالقین

بس بڑی برکت والا ہے ۔ اللّٰہ ۔ بہت اچھا خالق

اب آپ ہی فرمائیے تخلیقِ انسانی کے بارے میں اللّٰہ کی تھیوری کو تسلیم کیاجائیے یا "عیاذاً باللّٰہ" ڈارون کی تھیوری کو جسے ہزارہا طالب علم پاکستان کی یونیورسٹیوں میں ہر سال پڑھتے ہیں اور صحیح تسلیم بھی کرتے ہیں ۔

کارل مارکس کی معاشیات کی تھیوری

دوسری تھیوری جو ہماری یونیورسٹیوں کے نصاب میں ہے ، اور جس نے ساری دنیا کے اقتصادی نظام کو تلپٹ کر کے رکھ دیا ہے ، کارل مارکس کی تھیوری ہے ۔ کارل مارکس نے انسان کو صرف پیٹ ہی قرار دیا ہے ، ہر قسم کی روحانی قوتوں سے محروم و معرّا ! ، حالانکہ مسلمان کا نظریہ وہ ہے جسے علامہ اقبالؒ نے یوں بیان فرمایا ہے کہ

چھوڑ یورپ کے لیے رقص بدن کے خم و پیچ
روح کے رقص میں ہے ضرب کلیم اللّٰہی

سگمنڈ فرایڈ کی تھیوری

تیسری نفسیات کی تھیوری سگمنڈ فرایڈ کی ہے جو پیٹ سے بھی نچلے حصے سے متعلق ہے ۔ فرایڈ کے نزدیک انسان شہوانیات کے مرقع کے سوا کچھ نہیں ۔ فرایڈ کے نزدیک حتیٰ کہ ماں اور بیٹا بھی جنسی مطالعہ میں منسلک ہوتے ہیں ۔ جذباتی طور پر ہی سہی ۔ اس کا نام اوڈی پس کمپلیکس ہے ۔ ڈارون نے تو انسان کو بندر کی سطح پر لا ڈالا تھا ، سگمنڈ فرایڈ نے اس سے بھی نیچے گرادیا ۔

حقیقت یہ ہے کہ ان تین مغربی حکما یعنی ڈارون ، کارل مارکس اور فرایڈ نے ساری دنیا میں اپنی اس ریسرچ کو، جس کا نہ حقائق سے نہ اخلاق سے نہ انسانیت سے تعلق ہے، تسلیم کرا لیا ۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ ہمارے طلبہ کو بھی یونیورسٹیوں میں انہی علوم کی تعلیم دی جا رہی ہے ۔

اب ذرا پاکستان میں انگریزی ادب کی نصاب کی کتابوں کو ملاحظہ فرمائیے کہ ان میں نوجوان طلبہ و طالبات کے ناپختہ اذہان کو کن راہوں پر ڈالا جا رہا ہے ۔ میں اس ضمن میں ، پنجاب یونیورسٹی کی بی ۔ اے

کے انگریزی نصاب کی صرف ایک کتاب کے حوالہ دینا چاہتا ہوں جس کا نام A SELECTION OF MODERN ENGLISH PROSE ہے اور جسے پولیمر پبلی کیشنز ، اردو بازار ، لاہور نے شائع کیا ہے ۔اس میں ایک مضمون ہے THE UNCONSCIOUS ARTISTS اس مضمون میں پرندوں کی لاشعوری فنکاریوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس "فن شریف" میں سر فہرست جنسی افعال کی "فنکاریاں" بھی شامل ہیں ۔اس کے پیرا نمبر ۳ میں بعض پرندوں کا جنس مخالف کو " فنکاری" کے ساتھ دعوت دینا خود اپنی جنس یعنی "مذکر" کو اپنے احاطے میں داخل ہونے سے روکنا پھر مزے سے جنسی فعل میں مصروف ہونا اور اس کے بعد اپنی شاندار کامیابی پر بغلیں بجانا اور گیت گانا بھی پرندوں کی عظیم فنکاریوں میں شامل کیا گیا ہے ۔اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بات بذات خود ایک ریسرچ کی حیثیت رکھتی ہے اور صانع عظیم یعنی خدائے برتر و اعلا کی قدرتوں کی مظہر ہے ، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نو خیز اور نوجوان نسل کے لیے طالب علمی کے اسٹیج پر شہوت رانیوں اور جنسی ہیجانات اور اشتعال انگیزیوں کی طرف توجہ دلانا کونسے تعلیمی مقاصد کی تکمیل ہے ؟ اور اس قسم کے مضامین کو نصاب کی کتابوں میں رکھنا کس بات کی دلیل ہے ؟

اب اسلامیانے (ISLAMIZATION) کے اس "عہد زریں" میں جس کا اعلان ہی گزشتہ دو برسوں سے نہایت زور شور سے نہیں کیا جارہا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلے میں بعض اہم اور ضروری اقدامات بھی کیے جا رہے ہیں، یہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ طلبہ اور طالبات کو کیا تلقین کی جارہی ہے ۔ میرے سامنے فیڈرل تعلیمی اور ثانوی بورڈ اسلام آباد کی منظور شدہ اسلامیات / دینیات کی ایک کتاب پڑی ہے ۔ نام : "اسلامی دستور حیات" ۔ جامع ۔ اسلامی تہذیب ۔ سیرت النبیؐ ۔ خلافت راشدہ برائے ایف ۔ اے ۔ علوم اسلامیہ مطابق نصاب جدید برائے ۱۹۸۳ء ومابعد" شائع کردہ پولیمر پبلی کیشنز، راحت مارکٹ، اردو بازار، لاہور ۔

(یہ وہی طباعتی ادارہ ہے جس نے انگریزی کی وہ کتاب بھی شائع کی ہے جس کا حوالہ اوپر دے چکا ہوں)

اس کتاب کے باب مسجد میں بعنوان "ائمہ نماز کا تقرر" صفحہ ۱۲۵ پر جو سبق ہر سال ہزارہا طلبہ و طالبات کو پڑھایا جا رہا ہے اس کے چند الفاظ ملاحظہ فرمائیے :

> " موجودہ دور کا امام ایک گھٹیا مخلوق ہے جو معاشی اعتبار سے مفلوک الحال ، علم وفضل سے عاری، معاشرہ میں بے حیثیت اور ہر لحاظ سے ناقابل التفات ہے۔"

معلوم نہیں یہ انتہائی زریں و درخشندہ سرٹیفیکٹ اسلامی دستور حیات کے قابل مصنف نے سارے کرہ ارضی پر اسلامی امّہ کے سارے اماموں یعنی پیش اماموں کو عطا فرمایا ہے یا اس کے مستوجب اور مستحق صرف اسلامیہ جمہوریہ یا ملّت اسلامیہ پاکستان کے خوش نصیب امام ہی ہیں - اب یہ سرٹیفیکٹ حاصل کرنے والے طبقے میں ہزاروں ناظمین صلوٰۃ کا بھی اضافہ ہو گیا ہے ، کیونکہ اب ہر طرف نظام صلوٰۃ کا ڈنکا بھی بج رہا ہے ۔نظام صلوٰۃ کے قیام کے ساتھ ساتھ جو بلا شبہہ ایک اسلامی حکومت کی اولین ذمہ داریوں میں شامل ہے ، پیش اماموں کی ان عدیم النظیر اور بے مثال کوالی فی کیشنز کا اعلان اور ان کے صحیح ذہنی ایکس رے کی رونمائی کتنی بڑی خدمت اسلام ہے ؟ اس پر میں اس لیے تبصرہ نہیں کروں گا کہ یہ خود ان حضرات سے متعلق بات ہے جو خود پیش امامی کے منصب پر فائز ہیں یا ان سب حضرات کے لیے لمحۂ فکر یہ ہے جو اسلامیائزیشن کے داعی اور نقیب ہیں -

یونیورسٹیوں اور تعلیمی بورڈوں کے نصاب ہائے تعلیم میں ابھی حال ہی میں تعلیم کو اسلامی نظریۂ تعلیم کے سانچے میں ڈھالنے کے سلسلے میں جو اقدامات کیے گئے ہیں ان کا تذکرہ میں اخبار جنگ،راولپنڈی ۲۳/اکتوبر ۱۹۸۲ء کی اشاعت سے لفظ بلفظ نقل کر کے پیش کرنا چاہتا ہوں ۔اخبار نے " اردو لازمی ترتیب نو کی ترمیم نو اور مولانا حالی "کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ "۔

"نصابی کتابوں کا ذکر آیا ہے تو ایک خبر بھی یاد آتی ہے کہ پاکستان کی وفاقی وزارت تعلیم کی ہدایت پر پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ نے جماعت نہم و دہم کی نصابی کتاب اردو لازمی (ترتیب نو) میں چند ترامیم کر دی ہیں ۔نئی ترمیم شدہ کتاب ۱۹۸۵ء میں شائع کی جائے گی۔ وفاقی وزارت تعلیم نے اس کتاب سے جو اسباق خارج کرنے کا حکم دیا ہے ان کی تفصیل یہ ہے :

حصہ نثر: مناجات از حالی — حالی کی شخصیت ۔خوبصورت بلا- ظہیرالدین بابر — محاورہ اور روزمرہ ، مامون کے اخلاق وعادات -

حصہ نظم: اسلام تلوار ، قطعات و رباعیات ۔راست گوئی- جواہرلت باد صبا، طلوع آفتاب ، زمزمۂ حرم صدیق ، طارق کی دعا ، درۂ خیبر ، غزل میر درد ، غزل میر تقی میر ، غزل حالی ، تمام غزلیات از اکبر الہ آبادی تا حسرت موہانی -

اس ترمیم کا سب سے زیادہ ظلم مولانا الطاف حسین حالی پر ہوا ہے جن کی اور جن کے بارے میں چار پانچ چیزیں میٹرک کے نصاب سے خارج کر دی گئی ہیں ۔ سب سے پہلے مولانا الطاف حسین حالی کی مناجات ہے جس سے کہ اس کتاب کی ابتدا ہوئی ہے۔ اس کے اوپر یہ نوٹ بھی دیا گیا ہے "مسلمان اپنے ہر کام کا آغاز اللہ کے نام سے کرتا ہے اور اس کے حضور اپنی کامیابی کے لیے دعا کرتا ہے۔ اس کتاب کا آغاز بھی ایک قسم کی دعا سے کیا جاتا ہے جو مولانا الطاف حسین حالی نے تحریر کی "۔

اس پوری مناجات میں ہمیں ایسی کوئی بات دکھائی نہیں دی جو قابل اعتراض قرار دی جاسکتی ہو ۔ سوائے ایک شعر میں استعمال ہونے والے ایک لفظ کے۔ شعر ہے ۔

وہ مانگتا ہوں جس کے بیان سے زباں ہے لال
اے وائے گر ادا نہ ہو مطلب فقیر کا

مگر یہاں لال محض رنگ کے طور پر لکھا گیا ہے۔ اس کا مولانا حالی کے نظریات سے کوئی تعلق نہیں ۔ لیکن غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے اور سب جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں سب سے زیادہ پیدا ہونے والی چیز غلط فہمی ہی ہے۔ وہ اپنے بارے میں ہو یا کسی دوسرے کے بارے میں یا مردہ کے بارے میں ، فیض کے بارے میں یا مولانا حالی کے بارے میں۔

اردو لازمی ترتیب نو کی زد میں آنے والا دوسرا مضمون بابائے اردو مولوی عبدالحق کا ہے "حالی کی شخصیت" اس مضمون کو میں نے ہر قسم کی عینک لگا کر دیکھا ۔ کوئی بات بھی ایسی دکھائی نہ دی جو میٹرک کے طالب علموں کے لیے نقصان دہ ہو۔ سوائے ایک پیرے کے جس میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں ۔

"تعصب ان میں نام کو نہ تھا ۔ ہر قوم و ملت کے آدمی سے یکساں خلوص سے پیش آتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے ۔ جب بھی ہندو مسلم نزاع کا کوئی واقعہ سنتے تھے تو انہیں بہت رنج اور افسوس ہوتا تھا ۔ تحریر و تقریر میں تو کیا رنج اور بے تکلفی کی گفتگو میں بھی ان کی زبان

سے ایسا کوئی کلمہ سننے میں نہیں آیا جو کسی فرقے کی
دلآزاری کا باعث ہو ۔اگر کوئی ایسی بات کہتا تو برا مانتے
اور نصیحت کرتے تھے ۔بےتعصبی کا وصف انہی لوگوں میں
پایا جاتا ہے جن کی طبیعت میں انصاف ہو ۔

نصاب سے خارج ہونے والا مضمون محاورہ اور روزمرہ ،
بھی خواجہ الطاف حسین حالی کا ہے اور نظم راست
گوئی بھی مولانا الطاف حسین حالی کی ہے اور اس کے
خارج کیے جانے کی وجہ اس کے سوا اور کوئی سمجھ میں
نہیں آتی کہ اس میں سچ بولنے کی کچھ زیادہ ہی تعریف
کر دی گئی ہے ۔"

یہ سارا اقتباس "جنگ" سے تھا ۔ "جنگ" نے اپنے انداز میں ہر بات
پر ٹھیک تبصرہ کر دیا ہے،لیکن نصاب سے خارج کیے جانے والے مضامین
نظم و نثر کو اگر ایک نظر بھی دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ محاورہ اور روزمرہ
اور راست گوئی پر مضامین کے علاوہ جو نظمیں خارج کی گئی ہیں ان میں
"اسلام"، "زمزمۂ حرم"، "طارق کی دعا" اور حالی کی مناجات بھی شامل
ہیں ۔ طارق کی دعا علامہ اقبال کی وہ معرکتہ آلارا نظم ہے جس میں اہل
ایمان کے اس حیرت انگیز تاریخی کارنامے کا ذکر ہے جس پر خود تاریخ
نازاں ہی نہیں دنگ بھی ہے ۔مسلمانوں کی شجاعت اور بہادری کے اس
محیرالعقل کارنامے کو تسلیم کرتے ہوئے خود اہل یورپ نے اس کی یادگار کے
طور پر اس خاکنائے کا نام جبرالٹر یا جبل الطارق رکھ دیا ہے جہاں
یہ حیرت ناک واقعہ ہوا تھا ۔ آج مسلمانوں کو ان کی عظمت رفتہ یاد
دلانے کے علاوہ انہیں ایمان کی لافانی اور عدیم النظیر قوتوں سے آشنا کرنے
کے لیے غالباً تاریخ اسلامی میں حضور نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معجزوں
کے بعد یہ سب سے بڑی مثال ہے ۔اس واقعہ کو نصاب کے اکسپرٹس کی طرف
سے نصاب سے خارج کرنا "نیتوں" کے جس رجحان کی طرف اشارہ کرتا
ہے اس پر صاف لفظوں میں کچھ عرض نہ کرنا ہی بہتر ہے ۔پھر اس سلسلے
میں سر پیٹ لینے والی بات یہ ہے کہ یہ کلام کسی ٹٹ پونجیے شاعر کا نہیں
بلکہ ترجمان حقیقت حکیم الامت خالق تصور پاکستان کا ہے جس کے کلام سے
متاثر بلکہ شعلہ بجاں ہو کر اس دور سے جواں اٹھے اور انہوں نے پاکستان
قائم کر کے ہی دم لیا ۔تحریک پاکستان کے ان ادنا کارکنوں میں یہ عاجز
راقم الحروف بھی شامل ہے ۔پاکستان میں احیاء اسلام و قیام نظام اسلام
کے موجودہ دور میں اس تعلیمی نصاب سے حالی ، اکبر اور اقبال تینوں
کو خارج کر دیا گیا ہے ۔ یہ تینوں اکابر احیاء ملّت اسلامیہ کے اقانیم ثلاثہ ہیں

حالی اور اکبر دونوں مسلمانان برصغیر کو شعور ملّت بخشنے میں علامہ اقبال کے پیشرو تھے۔ پاکستان کے قیام کی جدوجہد اور اس عظیم اسلامی مملکت کا حصول انہی تین عظیم مُفکرین کی فکر کا مرہون منت ہے۔ ماہرین تعلیم کے اس تازہ اقدام کے بارے میں، میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہوں گا، صرف سرسید علیہ الرحمتہ کا، جن کے دو قومی نظریہ کے اعلان اور ابلاغ اور جن کی تعلیمی تحریک کی وجہ سے بالآخر مسلمانان برصغیر اپنی منزل مقصود کو پہنچے اور ایک اسلامی مملکت کا حصول ممکن ہوگیا، میں ایک ہی جملہ نقل کروں گا جس میں وہ کہتے ہو کہ

" وہ قوم بہت بے غیرت ہے جو اپنے اکابرین اور محسنین کے کام اور ان کی یادگاروں کو بھلا دیتی ہے "۔

خلاصۂ کلام

مضمون طویل ہو گیا ہے۔ اس لیے میں اب ایک اسلامی ریاست کے لیے نظام تعلیم و نصاب تعلیم کی بنیاد کے مضمون کی تلخیص پیش کرتا ہوں۔

اسلام انسان کو دو طرح کے قوانین مہیا کرتا ہے۔ قانون شریعت اور قانون طبیعت۔ قانون شریعت انسانی زندگی میں روزمرہ ابھرنے والے جدید مسائل کو منشائے ایزدی کے مطابق حل کرتا ہے۔ قانون طبیعت کا مقصد زندگی کی مادّی ضروریات پوری کرنے کے لیے مطلوبہ چیزیں ایجاد کرنا ہے۔ اسی قانون کا نام سائنس ہے یعنی NATURAL SCIENCE اور یہ اکتشافات پر محیط ہے۔

جو عالم ایجاد میں ہے صاحب ایجاد
ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ

قانون شریعت کا مقصد اجتہاد، قانون طبیعت (PHYSICAL LAWS) کا مقصد ایجاد ــ دونوں کے مقصد اجتہاد اور بالآخر جہاد یا طاقت اور قوت، ایجادات کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے جو مادّی ذرائع یا ایجادات کی مرہون منت ہے۔ یہیں سائنس بروئے کار ہوتی ہے اور اسی طریقۂ کار سے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تعمیل ہو سکتی ہے کہ

واعدّوا لھم مّا استطعتم من قوّۃ وّمن رباط الخیل ترھبون بہ عدوّ اللہ و عدوّکم (انفال : ٦٠)

"اور ان کافروں کے لیے جس قدر تم سے ہو سکے ہتھیاروں سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھو اور ان کے ذریعہ سے تم ان پر اپنا رعب جمائے رکھو جو اللہ کے دشمن ہیں اور خود تمہارے دشمن ہیں"

اس کا مطلب یہ ہوا شریعت لاز اور فزیکل لاز دونوں پر ساتھ ساتھ عمل کرنے سے مسلمان انفرادی طور پر اپنی حیات مستعار میں اور عقبیٰ میں بھی سرخرو ہوسکتا ہے اور اجتماعی زندگی میں بھی باقی اقوام عالم کے دوش بدوش باعزت اور باوقار رہ سکتا ہے۔

اس طرح قرآن حکیم انفرادی اور قومی لحاظ سے مسلمان کے لیے تعلیم و تربیت کی بنیاد فراہم کرتا ہے اور یہی نظریہ ایک اسلامی ریاست یعنی پاکستان میں نصاب تعلیم اور نظام تعلیم کے لیے صراط مستقیم ہے۔

پاکستان میں اسلامی نظام تعلیم و نصاب تعلیم کا طریقۂ کار

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کے ان مقاصد کو تعلیم کے سانچے میں کسی طرح ڈھالا جائے۔ جیسا کہ اوپر تفصیل سے عرض کیا جا چکا ہے کہ موجودہ طرز تعلیم و نصاب تعلیم دونوں اسلام کے مزاج کے منافی ہیں، کیونکہ بقول مولانا مودودی، "آپ ان کو وہ فلسفہ پڑھاتے ہیں جو کائنات کے مسئلے کو خدا کے بغیر حل کرنا چاہتا ہے۔ وہ سائنس پڑھاتے ہیں جو معقولات سے منحرف اور محسوسات کی غلام ہے۔ تاریخ، سیاسیات، معاشیات اور تمام علوم عمرانیہ کی وہ تعلیم دیتے ہیں جو اپنے اصول سے لے کر فروع تک اور نظریات سے لے کر عملیات تک اسلام کے نظریات اور اصول عمرانی سے یکسر مختلف ہے۔ اس کے بعد آپ کس طرح امید رکھتے ہیں کہ طالب علموں کی نظر اسلامی نظر ہوگی"؟ اور چونکہ جیسا کہ تفصیلاً عرض کیا جا چکا ہے، اعلا تعلیم کی سطح پر ڈارون کی ارتقا کی تھیوری، کارل مارکس کی معاشیات کی تھیوری اور سگمنڈ فرایڈ کی نفسیات کی تھیوری سراسر اسلام یعنی قرآن کے نظریات سے متصادم ہیں، اس لیے پاکستان میں اسلامی تعلیمی نظام رائج کرنے کے لیے نصاب کی مکمل طور پر نئی تدوین از بس لازمی ہے۔

نصاب کی نئی تدوین کس طرح ہو یعنی اس کی اساس کن باتوں پر ہو

۱۔ مقصد کا تعین

ہمارے تعلیمی نظام کا المیہ آج تک یہی رہا ہے کہ ہمارے پیش نظر تعلیم کا مقصد متعین نہیں رہا، نہ اب ہے۔ یہ ایک بے جہت نظام ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ساری قوم کی ہی منزل متعین نہیں۔ اس لیے پہلے یہ طے کرنا ضروری ہے کہ تعلیم کے ذریعہ سے کس قسم کا آدمی تیار کرنا مقصود ہے۔ اس کے مطابق تعلیم کا سانچا تیار کرنا ہوگا، یعنی نصاب تیار کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں اور ایک اسلامی معاشرے میں ایک ایسا انسان تیار کرنے کی ضرورت ہوگی جو اللہ تعالٰی کی اطاعت اور

رضا جوئی کے لیے ہر وقت تیار ہو اور اعلا اسلامی اور اخلاقی اقدار سے اور صفات سے متصف ہو۔

۲۔ نئے تعلیمی نصاب میں ثنویت یعنی دوئی (DUALITY)

اسلام میں دینی اور دنیوی نظام میں تفریق نہیں۔اسی طرح نئے نصاب میں ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ کچھ علوم دینی ہوں کچھ دنیوی ــ یہی دوئی ہے جس کی علامہ اقبال نے یوں مذمّت فرمائی ہے۔

دوئی ملک و دیں کے لیے نامرادی
دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں[۳] کا
بشیری ہے آئینہ دار نذیری

اس لیے ضروری ہے کہ ہماری پوری تعلیم اور اس کا ہر مضمون بیک وقت دینی بھی ہو اور دنیوی بھی اور ایک دوسرے سے مکمل طور پر مربوط اور ہم آہنگ ہو۔

۳۔ تشکیل سیرت و کردار

اسلامی نظریۂ تعلیم کا منتہائے مقصد مسلمان کی سیرت کی تشکیل اور کردار کی تعمیر ہے اور یہ کام کتاب و سنت کی روشنی میں کیا جانا مطلوب ہے۔ایک مسلمان بچّے کا اعلا اخلاقی صفات سے متصف ہونا بےحد ضروری ہے ورنہ مسلمان اور غیر مسلمان میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔

بد قسمتی سے موجودہ نظام تعلیم اس اہم انسانی پہلو سے یکسر عاری ہے۔مسلمان کا مقصدِ حیات تو وہ ہے جو علامہ اقبال[رح] نے اس شعر میں بیان فرمایا ہے کہ

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اس لیے ضروری ہے کہ نئے نصاب تعلیم کے ہر مضمون میں سیرت سازی کے پہلو کو پیش نظر رکھا جائے۔ تعلیم کا مقصد گریجویٹ یا پی ایچ ڈی پیدا کرنا نہ ہو، بلکہ اسلامی کیریکٹر، اسلامی طرز فکر اور اسلامی اسپرٹ پیدا کرنا ہو۔ ایک شخص کے پاس خواہ کتنی علمی ڈگریاں کیوں نہ ہوں، لیکن اگر وہ اپنے اخلاق اور کردار کے لحاظ سے انسان بھی نہیں تو اس کی تعلیم کا کوئی فائدہ نہیں۔لہذا ہر اسٹیج اور ہر سطح پر تشکیلِ سیرت

کا مقصد مد نظر رکھنا اور اس کے لیے نصاب میں ضروری مواد مہیاکرنا ضروری ہے۔

۴۔ ایمانیات کی تلقین و تعلیم

نصاب میں شروع سے یعنی بچّے کے نرسری میں داخل ہوتے وقت سے لے کر اعلا تعلیم کے آخری درجے تک طالبِ علم کے دل و دماغ میں ایمانیات پیدا کرنا از بس ضروری ہے۔بچّے کے دماغ میں اگر شروع سے ہی اسلام کی بنیادی باتیں ڈال دی جائیں تو پھر وہ انہیں ساری زندگی نہیں بھول سکتا۔پرائمری نصاب کی کتب میں اس بارے میں بھی کچھ جملے رکھے جا سکتے ہیں جو بچّہ یاد کرے گا اور وہ عمر بھر اس کے لوح حافظہ پر کندہ رہیں گے۔

۵۔ نصاب میں کلام اقبال کے شامل کیے جانے کی ضرورت

ماہرین اقبالیات کی مسلمہ رائے ہے کہ نئے تعلیمی نصاب میں پانچویں جماعت سے لے کر یونیورسٹی کی تعلیم کے آخری درجے تک طلبہ کی ذہنی سطح و استعداد کو سامنے رکھتے ہوئے حضور نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت اقدس کے مختلف پہلوؤں ، شہدا و غازیانِ اسلام کے تذکروں ،صلحائے عظام و محسنین ملّت کے مختلف کارناموں اور قوم کے اکابر رجال کے حالات کے ساتھ ساتھ کلام اقبال و اقوال اقبال بھی شامل کیے جائیں ،کیونکہ احیائے ملّت کے لیے کلام اقبال اکسیر کا درجہ رکھتا ہے۔

۶۔ نئے اسلامی نظام تعلیم میں اساتذہ کی اہمیت اور ان کا کردار

کوئی بھی تعلیمی نظام ہو اس میں استاد کا مقام اور کردار بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ بلکہ نصاب سے زیادہ استاد کو اوّلیت حاصل ہے ۔ اسلام اور خود شارع اسلام علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذات گرامی اس امر پر شاہد ہے ۔آپ نے فرمایا :

انا بعثت معلّم ۔ یعنی مجھے معلم بنا کر مبعوث فرمایاگیا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ بنی نوع انسان کے معلم اعظم آپؐ ہی تھے ، لیکن جیسا کہ سب کو علم ہے نصاب کے نزول یعنی "کتاب" سے چالیس برس پیشتر آپؐ کو دنیا میں بھیجا گیا اور پورے چالیس برس آپ کو ہدایت انسانی کے لیے تربیت ربانی سے تیار کیا گیا ، پھر آپ کو کائنات کے لیے ازلی اور ابدی تعلیم و ہدایت کی نصاب کی کتاب دی گئی ۔یعنی قرآن حکیم۔پھر اس کتاب کا سمجھنا بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی یعنی استاد معظم کی ذاتی تشریح کے بغیر ناممکن تھا اور اگر آج بھی حضور نبی ختمی

مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو الگ کر کے (نعوذباللہ) اس کتاب کا مطالعہ کرنے یا اسے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو انسان حیات و کائنات کی بھول بھلیوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ یعنی آج بھی حدیث شریف کے بغیر حضور علیہ السلام کی سنت اور ارشادات کے بغیر نصاب کا سمجھنا ممکن نہیں۔ اس لیے اسلامی تعلیمی نظام کے لیے صحیح استاد کا انتخاب ہر بات پر فوقیت رکھتا ہے۔ استاد کا اپنی عملی زندگی میں خود صالح و متقی ہونا بہت ضروری ہے اور اس کا ہر بات میں اسلام کا اتباع کرنا اور عقائد و افکار کے لحاظ سے صحیح مسلمان ہونا ضروری ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ایسا معلم اعلا سے اعلا ڈگری یافتہ ہونے اور مغربی علوم یعنی علوم جدیدہ سے پوری طرح واقف ہونے کے باوصف یورپی تہذیب و تمدن سے مرعوب یا متاثر نہ ہو۔ اس کا قلب خشیت الٰہی سے معمور ہو، وہ ایک منزہ اور مجلّا شخصیت کا حامل ہو تاکہ اس کی ارفع اور مقدس شخصیت کا پرتو طلبہ کا ذہن تحت الشعور قبول کرتا چلا جائے۔

ایسے اساتذہ نایاب تو نہیں، کم یاب ضرور ہیں، لیکن بقول اقبال رح (ابلیس کی زبانی)

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشک سحر گاہی سے جو ظالم وضو

نژاد آئندہ کے لیے نئے نصاب کی تدوین انتہائی مشکل دقیق اور پیچیدہ کام ہے، کیونکہ یہ کام ۳۷ منزلہ ٹیڑھی عمارت کو مکمل طور پر منہدم کر کے نئی تعمیر شروع کرنے کا کام ہے۔ لیکن کوئی کام بھی اگر للٰہیت، خلوص اور لگن سے شروع کیا جائے اور پھر ایسا کام جو ایک ایسی قوم اور مملکت کی تعمیر نو کا ہو جس کی اساس ہی لاالہ الااللہ محمد الرسول اللہ پر ہو، وہ نصرت الٰہی سے کیونکر محروم رہ سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جناب حکیم محمد سعید صاحب نے "تعمیر ملّت" کی خاطر تعلیمی نظام کے ذریعہ سے جس انتہائی ضروری اور نیک کام کا بیڑا اٹھایا ہے وہ انشاءاللہ ضرور کامیابی کی منزلوں کو چھولے گا۔

سفینۂ برگ گل بنائے گا قافلہ مور ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا (اقبال)

میں اقبال کے اس شعر پر اپنے سلسلہ کلام کا اختتام کرتا ہوں جس میں انہوں نے معلّم اعظم رسول رحمت علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے حضور فریاد کی ہے کہ

تو اے مولائے یثرب ؐ آپ میری چارہ سازی کر
میری دانش ہے افرنگی، مرا ایماں ہے زناری

اسلامی نظریۂ تعلیم

جناب پروفیسر محمد خلیل اللہ

دنیا میں موجود الہامی مذاہب میں اسلام وہ واحد دین و مذہب ہے جس نے حصول علم اور مظاہر فطرت پر غور و فکر کی شدت سے تاکید کی ہے۔ قرآن کریم جگہ جگہ انسانوں کو غور و فکر، تعقل و تدبر کا حکم دیتا ہے اور پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ تعلیم و تعلّم کا آپ نے جس قدر اہتمام فرمایا اس کی بہترین مثال اسیران بدر کے متعلق آپ کا فیصلہ ہے جو اسیر پڑھے لکھے تھے، مگر اس قابل نہ تھے کہ اپنی رہائی کے لیے خراج ادا کریں، انہیں حکم فرمایا کہ وہ مسلمان بچوں کو تعلیم دیں اور خدمت کے عوض رہائی حاصل کریں۔

تعلیم اور تعلّم اور ذوق تجسس کی اس ہمت افزائی کا نتیجہ تھا کہ ایک صدی کے اندر اندر عرب کے امی اور جاہل عقلی اور تجربی علوم میں قابل رشک مقام پر پہنچ گئے اور صدیوں تک یہ روایت جاری و ساری رہی۔ اگر ہم اس دور کے علما کے کارناموں پر نظر ڈالیں تو پتہ چلے گا کہ انھوں نے حصول علم کے کسی ذریعہ سے دریغ نہ کیا۔ اقوام قدیم کے علوم کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ اور بھی توانا بنا دیا۔

ماضی میں رائج ہمارے نظام تعلیم پر نظر ڈالیے تو اندازہ ہوگا کہ سارے مروجہ علوم داخل نصاب ہوتے تھے۔ تعلیم کی ابتدا قرآن حکیم سے ہوتی تھی اس کے بعد حدیث و فقہ میں طالب علم کو اتنی واقفیت بہم پہنچائی جاتی تھی کہ وہ زندگی کے عام معاملات میں شریعت کے تقاضوں کو بخوبی سمجھ لیتا تھا۔ پھر دوسرے مروجہ علوم پڑھائے جاتے تھے۔

ایک قدیم عربی کہاوت کے مطابق تین علم، تین چیزوں کے لیے ضروری خیال کیے جاتے تھے: فقہ دین کے لیے، نحو زبان دانی کے لیے اور طب صحت کی حفاظت کے لیے۔

علم کا میدان جوں جوں وسیع ہوتا گیا نصاب تعلیم میں وسعت پیدا ہوتی گئی اور اسی کے ساتھ اختصاص یعنی سپیشلائزیشن کا دور شروع ہوا۔ مگر یہاں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ کسی شعبۂ علم میں اختصاص حاصل کرنے کے یہ معنٰی نہ ہوتے تھے کہ دیگر علوم کو نظر انداز کردیا جائے بلکہ کسی علم میں اختصاص حاصل کرنے والے علما وہ ہوتے تھے جو سارے مروجہ علوم کی بنیادی باتوں سے گہری واقفیت رکھتے تھے اور خاص طور پر دین اور شریعت کے تقاضوں کا انہیں خاصا علم رہتا تھا۔ اس بنیاد کا نتیجہ یہ تھا کہ جب مسلم علما نے غیر مسلم قوموں کے علوم کی طرف توجہ دی تو اس بات کا خاص اہتمام رکھا کہ ان علوم کو ایسے اثرات اور تصورات سے پاک کر دیں جو دین کی بنیادی شرطوں سے مطابقت نہ رکھتے تھے یا ان سے متغائر تھے۔

تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں کہ جب کوئی فلسفی یا سائنسدان اپنی تحریر میں کوئی ایسی بات لکھ جاتا جو بظاہر دین کی روح سے ہٹی ہوئی ہوتی تو دوسرے علما فوراً اسے ٹوک دیتے۔ اس روش کا نتیجہ یہ تھا کہ عوام کے عقائد اور تصورات پر کوئی منفی اثرات مرتب نہ ہو سکتے تھے اور کسی علم کا فروغ دین اور عقائد کے لیے خطرہ نہ بن سکتا تھا۔ نئے نئے علوم کے حصول، تحقیق اور دریافت کا یہ سلسلہ مسلمانوں کے سیاسی عروج کے ساتھ ساتھ جاری رہا۔ علما کی قدر و منزلت معاشرے کا مزاج رہی مگر سیاسی زوال نے علم و فن کے عروج کو بھی متاثر کیا۔ طوائف الملوکی، حکمرانوں کی باہمی رقابتیں اور ان کے نتیجے میں پیش آنے والی جنگوں نے درسگاہوں اور کتب خانوں کو بھی بری طرح متاثر کیا اور علمی حلقے بتدریج محدود ہوتے گئے۔

مسلمانوں کے علمی عروج کا دور مغرب کے جہل اور بربریت کا دور تھا۔ مغربی ممالک میں اکثریت عیسائیوں کی تھی اور عیسائیت کے کلیسائی نظام نے علم و فن کی دنیا کو محدود اور مقید رکھا تھا۔ ہر نیا علم، نئی دریافت کلیسائی رہنماؤں کی نظر میں بدعت اور گناہ تھی۔ یورپ کے بیشتر ممالک میں فلسفیوں اور سائنسدانوں کے ساتھ اس دور میں مذہب کے اجارہ داروں نے جو کچھ کیا اس کے ذکر سے خود ان ممالک کی تاریخیں بھری پڑی ہیں۔

مسلمانوں کے عظیم کارناموں کی شہرت جب مغرب کے ان ذہنی طور پر پسماندہ ملکوں میں پہنچی تو سوچنے والے دماغوں کو کلیسا کی یہ آمریت ناقابل برداشت معلوم ہونے لگی اور ایسی تحریکیں شروع ہوئیں جن کا مقصد اس آمریت اور ابتلا کو ختم کرنا تھا۔ اس کشمکش نے مذہبی اور غیر مذہبی علوم یعنی سیکولر اور نون سیکولر کی اصطلاحوں کو جنم دیا اور بات یہاں تک

بڑھی کہ دین اور مذہب کو انسان کا نجی معاملہ قرار دے دیا گیا جس کا نہ علم کی دنیا سے کوئی واسطہ ہے نہ سیاسیات کی دنیا سے ۔ اگر انصاف سے دیکھیے تو کلیسا کے خلاف یہ بغاوت فطری تھی ، کیونکہ کلیسا کے جامد قوانین اصول ارتقا کے خلاف تھے۔ وہ زندگی کو آگے بڑھنے سے روکتے تھے ۔

اسے تاریخ کی ستم ظریفی کہیے یا ملّت کی بد قسمتی کہ مغرب کا عروج ہمارے زوال کے متوازی رہا۔ عروج و زوال کی متوازی کیفیت اور اس کے اسباب و علل سے بحث کا یہاں موقع نہیں ، کہنا صرف یہ ہے کہ جب کسی ملّت پر زوال آتا ہے تو اس کے قوائے عقل و فکر بھی مفلوج نہیں تو نیم مفلوج ضرور ہو جاتے ہیں اور یہی سب کچھ ہمارے ساتھ بھی ہوا ۔ برعظیم پاک و ہند میں مسلمانوں کی صدیوں پرانی شان و شوکت دیکھتے دیکھتے افسانۂ ماضی بن گئی ۔ ہم نہ صرف مغرب کے سیاسی غلام بن گئے بلکہ ذہنی غلامی بھی اس پر مستزاد ہوگئی ۔ مغرب سے درآمد ہونے والے علوم اور مغرب کا طرز تعلیم ہمارے لیے راہ نجات قرار پائے ۔ یہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مغرب میں علوم و فنون کی ترقی کی بنیاد کلیسا کے اقتدار کی نفی پر رکھی گئی ۔ کلیسا کو غلط یا صحیح بہر طور دین کی نمائندگی حاصل تھی اور اس کے اقتدار کی نفی کے معنیٰ اس دین کی نفی تھی جس کی وہ نمائندہ تھی ۔ اس طرح مغرب میں علوم و فنون لادینی افکار کے تابع ہوگئے اور اس ذہنی کیفیت کے ساتھ وہ علوم ہمارے سامنے بھی پیش کیے گئے ۔ سیاسی اور ذہنی طور پر اپنا سب کچھ کھو کر دیوالیہ پن کی حد تک پہنچ گئے تھے ، اس لیے ان علوم نے ہماری ذہنی کیفیتوں کو بھی متاثر کیا ۔ اس پر مستزاد مستشرقین کی کرم فرمائیاں تھیں جنھوں نے ہمارے اسلاف کے ذہن و فکر کو ہر طرح سے مسخ کر کے پیش کیا ۔ اس کی بہترین مثال مستشرقین کے وہ بیانات ہیں جو انھوں نے معتزلہ اور اشاعرہ کے باہمی اختلاف کے بارے میں پیش کیے اور ہمیں باور کرانے کی کوشش کی کہ معتزلہ کی تحریک مسلمانوں میں عقلی اور فکری آزادی کی واحد تحریک تھی جسے تنگ نظر اشاعرہ نے ختم کر دیا ۔ ان بیانات میں حقیقت کتنی ہے اور افسانہ کس قدر اس سے ہر صاحب علم واقف ہے ۔ اس گفتگو کا مقصد نقطہ یہ ظاہر کرنا تھا کہ مغرب کے زیر اثر جو علوم ہم نے حاصل کیے ان کی بنیاد کس قوم کی ذہنیت پر تھی اور فطری طور پر ہماری نئی نسلوں کے ذہن ان سے کس طرح متاثر ہوئے ۔

مغرب کے علمی تقاضے ہر طرح کی روایت کی نفی کر رہے تھے تو ہماری دینی درس گاہوں میں روایت پسندی کے معاملے میں اتنی ہی شدت اختیار کی گئی ۔ نتیجے کے طور پر دینی درس گاہوں اور مغربی علوم سکھانے

والی درس گاہوں کی حیثیت دو مخالف محاذوں کی ہو گئی ۔اس سے بحث نہیں کہ اس صورت حال کا ذمہ دار کون سا فریق رہا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ قلب و ذہن پر دین کی وہ گرفت جو علمائے سلف کی سب سے بڑی پہچان تھی ، نئی نسلوں میں ڈھیلی پڑتی گئی ۔اس سلسلے میں یہ عرض کرتا چلوں کہ ہمارا دین صرف چند عبادات اور عقائد کا مجموعہ نہیں بلکہ ساری زندگی کے عظیم محرک کی حیثیت رکھتا ہے اور جہاں اس محرک کی فعالیت کمزور یا محدود ہو جائے تو فکر و ذہن میں پختگی پیدا نہیں ہوسکتی۔ اسی حقیقت کی طرف حکیم الامت علامہ اقبال نے اشارہ کیا ہے کہ

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی
اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط ونظام
مردہ لادینی افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطی افکار سے مشرق میں غلام

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بے ربطیِ افکار کا علاج کس طرح کیا جائے ؟ اس کا صاف اور سیدھا سا جواب یہ ہے کہ ہمیں اپنے نظامِ تعلیم اور نصاب تعلیم کا نئے سرے سے جائزہ لینا ہوگا ۔مغرب کے لادین ذہن کے زنگ کو دھونے کا اہتمام کرنا ہوگا اور اپنے نظام تعلیم و تعلم کو دین کے تقاضوں کے مطابق بنانا ہوگا ۔

اس سلسلے میں مجھے اجازت دیجیے کہ اسلامی نظریے کی اپنے ذہن اور اپنے علم کے مطابق تشریح کرتا چلوں

مختصر لفظوں میں اسلامی نظریے کی بنیاد اللّٰہ کی حاکمیت ، پیغمبر اسلام اور آپ کی سنت کی حجیت ، آخرت اور جزا و سزا کی حقیقت میں کامل پر ہے۔ یہ یقین جتنا پختہ اور راسخ ہوتا جائے گا ۔ہمارے اعمال و افعال اسی قدر دین کے تقاضوں کے مطابق ہوتے جائیں گے ۔

ہر مکتب ، مدرسے ، اسکول ، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم میں یہ اہتمام کرنا ہوگا کہ ہر ذہن میں یہ حقائق پوری طرح جاگزیں ہو جائیں۔ ہمیں اپنی نئی نسل کو یہ سکھانا ہوگا کہ اگر ہم ان حقائق پر پورا ایمان رکھتے ہوئے حصول علم کی راہ اختیار کریں تو پھر کوئی علم غیرمذہبی نہیں رہتا ۔

علم کا مقصد یہی یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو سمجھے ، کائنات اور مظاہر کائنات پر غور و فکر کرے اور اللہ کے حکم کے مطابق تسخیر فطرت کی جدوجہد میں مصروف ہو جائے ، مگر اس ساری جدوجہد و کاوش میں یہ حقیقت اس کے پیش نظر رہے کہ اسے ایک دن اپنے ہر فعل اور عمل کا حساب خالق کائنات کو دینا ہے -

ابھی جو معروضات میں نے پیش کیے وہ کوئی خیالی دنیا کی باتیں نہیں ہیں ، آپ کی ہماری زندگی کے ٹھوس حقائق ہیں - ہمارے اسلاف کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں - عقلی اور تجربی علوم کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جس میں انھوں نے کمال حاصل نہ کیا ہو مگر ان کی ایک خصوصیت ہمیشہ نمایاں رہی کہ وہ اپنے دین کے تقاضوں سے کبھی غافل نہ رہے - ان کی تابندہ روایات کو زندہ کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کی سیرت اور ان کے کارناموں کو اس زنگ سے پاک کیا جائے جو مستشرقین کے مذہب بیزار ذہن نے لگایا ہے - وہ امام غزالی ہوں یا فخرالدین رازی ، بو علی سینا ہوں یا عمر خیام غرض جتنی بھی طویل فہرست بنائیے ان سب کے متعلق اس حقیقت کو ماننا پڑے گا کہ وہ اوّل مسلمان تھے اور پھر سب کچھ -

بعض مورخین اور تذکرہ نگاروں کے غیر محتاط انداز بیان نے مستشرقین کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ ہمارے بہت سے زعما کو اپنی طرح دین سے بیزار بنا کر پیش کریں -

سائنسی اور فکری علوم کا نصاب تیار کرنے اور ان کے متعلق کتابوں کی اشاعت میں اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ مغرب کے لادینی رجحان سے انہیں پاک کیا جائے -

اس سے کسی کو انکار نہیں کہ علوم و فنون میں مغرب نے جو ترقیاں کی ہیں وہ قابل رشک ہیں ہمیں ، ان سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے - بس احتیاط صرف اتنی برتنی ہے کہ مغرب کے انداز فکر کو من و عن قبول کر لینے یا اپنا لینے کے بجائے ان پر اپنے دینی تقاضوں کے مطابق غور کر کے راہ عمل اختیار کی جائے -

یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ قرآن ، حدیث اور فقہ کی تعلیم پر بھی پوری توجہ لازم ہے - مگر طریقۂ تعلیم میں روایت پسندی مناسب نہ ہوگی - قرآن حکیم کی ناظرہ تعلیم اب اکثر مدارس میں رائج کر دی گئی ہے - مگر ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن حکیم ترجمے کے ساتھ پڑھایا جائے تاکہ اس کے احکام نوخیز ذہنوں میں اپنی جگہ بنا لیں -

ان معروضات کے ساتھ اپنی گفتگو ختم کرنے سے پہلے حضرت اکبر الہ آبادی کا ایک قطعہ پیش کروں گا۔ اکبر مغربی تعلیم کے بڑے مخالف سمجھے جاتے ہیں مگر غور فرمائیے کہ چار مصرعوں میں انھوں نے تعلیم، مقصد تعلیم اور نظریہ تعلیم کے بارے میں کتنی جامع بات کہہ دی ہے:

تم شوق سے کالج میں پڑھو، پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اڑو، چرخ پہ جھولو
پر بندۂ عاجز کا رہے ایک سخن یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

نظامِ تعلیم، تعمیرِ ملّی اور تعمیرِ کردار

جناب ڈاکٹر انعام الحق کوثر

کوئی اجتماعی تنظیم تعمیر و ترقی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی اورتعمیر و ترقی کے حصول کی دو بنیادی شرائط ہیں : داخلی امن و امان اورمحفوظ سرحدات ۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہر گزنہیں کہ صرف پولیس اور فوج ہی تعمیر و ترقی کے لیے کافی ہیں ۔ یہ دونوں ادارے اصل میں داخلی وخارجی امن شکنی پر حرکت میں آتے ہیں ۔ گویا داخلی و خارجی امن کو پیش آنے والے خطرات کی روک تھام کرتے ہیں لہذا داخلی امن و امان اور محفوظ سرحدات کا قیام کچھ اور عوامل کا مرہون منت ہوتا ہے ۔

ان عوامل میں سر فہرست قومی کردار کی تشکیل ہے ۔ قومی کردار کسی قوم کی شناخت اور پہچان ہی نہیں بلکہ وہ اسکے پورے نظام فکر اور نصب العین کا عملی اور ہمہ وقتی اظہار ہے ۔ یہ ہر فرد میں بھی اجاگر ہوتا ہے اور پورے معاشرے میں بھی ۔ یہ زندگی کے ہر شعبے میں یکساں یا قریباً یکساں طور پر نظر آتا ہے ۔ قوم کا یہ کردار ہی فی الحقیقت داخلی و خارجی امن و امان کی کیفیت و کمیت اورمعیار و مقدار کو متعین کرتا ہے دوسرے لفظوں میں کردار ہی تعمیر و ترقی کا ضامن اور مقیاس ہے ۔ یہ قومی کردار ہی تو ہے کہ ہر پرانی برائی کو لتاڑتا ہے اور ہر نئی برائی کا سر کچلتا ہے ۔ یہ قومی کردار ہی تو ہے کہ قومی املاک اورتنصیبات کواز خود ہرارضی و سماوی آفت اور شرپسندی سے بچاتا ہے ۔ یہ قومی کردار ہی تو ہے جو اچھے آدمیوں کو آگے بڑھاتا ہے اور برے آدمیوں کو پیچھے دھکیلتا ہے اور یوں معاشرے میں خیر کے پہلو کو شر پر غالب رکھتا ہے ۔ اگر قوم کردار سے محروم ہو تو لکھو کھا پولیس اور فوج نہ صرف غیر موثر اور بیکار ہوسکتی ہے بلکہ وہی داخلی و خارجی امن کے لیے سب سے بڑا خطرہ بن جاتی ہے، کیونکہ ایک بے کردار قوم کی پولیس اور فوج بھی نظم و ضبط ،قواعد و ضوابط اور قیود و حدود کے باوجود با کردار نہیں رہ سکتی اور حرص و آز کی رو میں بہہ نکلتی ہے ا لہذا قومی و اجتماعی زندگی اور تعمیر و ترقی کا مرکزی نقطہ کردار ہے ، اور ہر قوم کا اصل اور دائمی مسئلہ صرف یہی ہے کہ فقدان کی صورت میں کردار کیسے پیدا کیا جائے اور اگر وہ موجود ہے تو اسے راسخ کیسے کیا جائے ؟

اب سوال یہ ہے کہ قومی کردار کی تخلیق و استحکام کس طرح ممکن ہے ؟

کیا یہ حکومت کی ذمہ داری ہے ؟

کسی حد تک ہے اور وہ یوں کہ حکومت کے ارباب حل وعقد اگر خود قانون کے پابند ہوں ، اپنے آپ کو منزہ عن الخطانہ سمجھتے ہوں اور عوام سے جن صفات کے متوقع ہیں وہ سب سے پہلے اپنے آپ میں پیدا کریں تویقیناً ان کی ذاتی مثال قومی کردار کی پیدائش و افزائش کے لیے مفید اور ممدو معاون ہوتی ہے ۔ لیکن آج کل کے دور میں تیسری دنیا کی ترقی پذیر اقوام کی حکومتوں پر اندرونی مسائل کی اتنی گرفت اور بیرونی اقوام بالخصوص غالب و قاہر اقوام کی حکومتوں کا اتنا دباؤ ہوتا ہے کہ قومی کردار کے ضمن میں وہ اکثر اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتیں ۔

کیا یہ ادب کی ذمہ داری ہے ؟ کس حد تک ہے ۔

کیا یہ ذرائع ابلاغ عامّہ کی ذمہ داری ہے ؟

ہاں ہے، لیکن صرف اس حد تک کہ یہ اقدار عالیہ اور اچھے انسانوں کو ابھاریں اور اقدار منفیہ اور برے انسانوں کے خلاف نفرت اور جہاد کے جذبات پیدا کریں ۔

لیکن حکومت ہو یا ذرائع ابلاغ عامہ یہ زیادہ سے زیادہ قومی کردار کو تقویت بخش سکتے ہیں ، اسکی ترغیب و تشویق دلا سکتے ہیں ۔

اگر یہ ذہن میں رکھا جائے کہ فرد میں کردار کی تخلیق و ارتسام کا زمانہ وہی ہے جو زمانۂ تعلیم ہے تو یہ سمجھنا آسان ہوجاتا ہے کہ کردار کی تخلیق و تکمیل صرف اور صرف تعلیم کا ہی ثمر ہوسکتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تعلیم مہذب انسان کی ایک دائمی ضرورت ہے ، لیکن اس کے باوجود تعلیم کے صحیح مقام کا تعین انسان کے لیے ایک مسئلے سے کم نہیں رہا ۔ جب تک تعلیم کا درست مفہوم اچھی طرح نہ سمجھ لیا جائے اور اس بات کا پتا نہ لگا لیا جائے کہ اس کے مختلف اجزا کون کون سے ہیں اور ان کا باہمی رشتہ کیا ہے اس وقت تک اس کے احاطہ کار کے متعلق کچھ کہنا ایک بے معنی سی بات ہے ۔

بقا کی تمنا ہر جاندار کی زندگی کا خاصّہ ہے ۔ جان دار اور بےجان چیزوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جاندار مخالف قوتوں کو اپنے ڈھب پر لانے کی صلاحیت رکھتے ہیں جب کہ بے جان اس صلاحیت سے قطعی طور پر نابلد ہیں ۔ حقیر سے حقیر اور کمزور سے کمزور جاندار بھی کسی خطرے

کو محسوس کرکے ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کرتا ہے۔ بقا کی اس قدرتی آرزو اور خواہش کے باوجود ہر ذی روح کو فنا ہونا ہے، لیکن افزائش نسل کے ناطے سے تمام جاندار اپنے پیچھے اپنی اولاد چھوڑ جاتے ہیں جو ان کے جسمانی خصائص کی حامل ہوتی ہے اور اس طرح جانداروں کی جسمانی بقا کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔

انسان اس جسمانی بقا کے علاوہ جس زندگی کو دوام بخشنے کا آرزو مند ہے وہ صرف جسمانی زندگی نہیں بلکہ اس سے مراد رسم و رواج، معاشرتی ادارے، اعتقادات اور تفریحات وغیرہ بھی ہیں۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ افزائش نسل کے ساتھ ساتھ اسکے رہن سہن کے طریقوں، روایات صالحہ، اسکی اپچ اور ذوق جدّت و ندرت کو زندہ رہنے اور پھلنے پھولنے کے پورے مواقع میسّر آتے رہیں۔ چنانچہ تعلیم اس عمل کا نام ہے جس کے ذریعہ سے بچوں کو ایک مخصوص قسم کی معاشرتی زندگی کی لذّت سے آشنا کرکے نہ صرف اس زندگی کا خوگر اور سرگرم اور باعمل محافظ بنایا جاتا ہے بلکہ انہیں اپنی مخصوص صلاحیتوں کی تربیت اور ان سے تمتع کا بھی بھر پور موقع دیا جاتا ہے۔

جب ہم تعلیم کو ایک معاشرتی عمل قرار دیتے ہیں تو ہمیں یہ بھی طے کرنا پڑے گا کہ تعلیم کو کس قسم کے معاشرے کی خدمت بجا لانا ہے۔ جب ہم کسی قوم کی معاشرتی زندگی کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد ایک مشترک انداز فکر و عمل کے سوا کچھ نہیں ہوتی اور معاشرے کا رکن بننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ فرد زندگی کے مختلف مواقع پر اسی ذہنی اور جذباتی رد عمل کا مظاہرہ کرے جسے معاشرے نے پسندیدہ قرار دے دیا ہو۔ چنانچہ تعلیم اس عمل کا نام ہے جو نئی نسل کو معاشرے کے مشترکہ مقاصد، اعتقادات اور تمناؤں میں حصّہ دار بناتا ہے۔

تعلیم کی منزل نہ بچپن میں ختم ہوتی ہے اور نہ بالغ زندگی میں۔ تعلیم کی اصل منزل یہ ہے کہ وہ متعلم کو اپنے ماحول پر قدرت حاصل کرنے کا اہل بنائے۔ اور اسے اس قابل بنائے کہ وہ اجتماعی سرگرمیوں میں براہ راست حصّہ لے سکے اور اپنے آبا و اجداد کے تجربوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں آگے بڑھائے اور ایسے نئے راستے تراشے جو اسکے معاشرے کو بالخصوص اور بنی نوع انسان کو بالعموم منزل مراد تک لے جائیں۔

غیر مہذب اور غیر ترقی یافتہ معاشرے میں اس مقصد کا حصول چنداں مشکل نہ تھا۔ معاشرتی زندگی میں براہ راست حصّہ لینے سے یہ تعلیم حاصل کی جاسکتی تھی، لیکن جوں جوں معاشرہ تہذیب و شائستگی کی منزل کی طرف بڑھنے لگا والدین کے لیے خود تعلیم دینا ممکن نہ رہا بلکہ

نئی پود کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک نظام وضع کرنا پڑا اور اسکے لیے باقاعدہ ادارے قائم کرنے پڑے اور ان اداروں پر یہ ذمہ داری بڑی شدت کے ساتھ عائد کی جاتی ہے کہ وہ اپنے اور زندگی کے درمیان فاصلوں کو اس حد تک نہ بڑھنے دے کہ ان کا کام عملی افادیت سے عاری ہو۔ تعلیم اور زندگی کے درمیان بعد کو کم از کم کرنا ان اداروں کی اوّلین ذمہ داری ہے۔

معاشرہ تعلیمی اداروں سے دو چیزوں کی توقع رکھتا ہے اولاً یہ کہ افراد کی صلاحیتوں کا بھرپور نشو و نما ہو۔ ثانیاً یہ کہ انفرادی نشو و نما معاشرے یعنی ملک و قوم کی لگا تار ترقی کا ذریعہ ثابت ہو۔ اگرچہ معاشرہ سرگرمیوں کے انتخاب میں تعلیمی اداروں کو اپنی پسند سے کام لینے کا اختیار دے دیتا ہے تاہم وہ اس بات کی قطعی اجازت نہیں دیتا کہ معاشرے کا یہ کارندہ معاشرے کی بقا کو معرض خطر میں ڈال دے۔ معاشرہ اپنی بنیادی اقدار کو زندہ رکھنا چاہتا ہے اور تعلیمی اداروں کو یہ کام سونپ دیتا ہے کہ وہ ان اقدار کو نئی نسل کے حوالے کریں اور اسکے فوراً بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان قدروں کو کس طرح مربوط کیا جائے اور اسی سے نظام تعلیم عبارت ہے۔

ہر نظام تعلیم ہمیشہ ایک بڑے نظام کا جزو ہوتا ہے جس کے بغیر اور جس سے الگ وہ وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔ اور وہ بڑا نظام ریاست ہے۔ اور ہر ریاست ایک مخصوص نصب العین حیات پر مبنی ہوتی ہے۔ لہذا اگر کسی مخصوص نصب العین کو براہ راست اور جان بوجھ کر نظام تعلیم میں داخل نہ کیا جائے تو پھر بھی وہ ایک مخصوص نصب العین پر قائم ہوجاتا ہے اور یہ وہی نصب العین ہوتا ہے جو اس کے بنانے اور چلانے والوں اور ان کی قوم کا ہوتا ہے۔ اور پھر وہی نصب العین استادوں کے ذریعہ سے تعلیمی نظام کی ساری فضا اور اسکے واسطے سے طالب علم کے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے اور یہ نصب العین ایک ایسے نظام تعلیم کو وجود میں لاتا ہے جو طالب علم کو مدرسے کی فضا سے باہر بھی گھر، بازار، دفتر، کھیت، کارخانے اور سماج میں متاثر کرتا رہتا ہے۔ گویا ہمارا نظام تعلیم ایک مخصوص نصب العین کی تعلیم ہے۔ اگر ماہر تعلیم یہ دیکھے کہ جو مخصوص نصب العین طالب علم کی تعلیم و تربیت کی بنیاد بننے والا ہے وہ برا ہے تو اسکا فرض ہے کہ وہ طالب علم کو اسکے اثرات سے محفوظ کرنے کا انتظام کرے۔ ویسے وہ ایک برے نصب العین کے اثرات کو اس وقت تک نہیں روک سکتا جب تک کہ وہ ایک اچھے نصب العین کے اثرات کو ان کے بجائے عمل میں نہ لائے۔

تعلیمی نظام میں کوئی بھی شے بلکہ خود تعلیم بھی مقصود بالذات

نہیں بلکہ ہر قومی نصب العین کے حصول کا ایک ذریعہ ہے اور یہ اس کوشش کا نام ہے جو قومی ثقافت ، قومی تہذیب و تمدن کو محفوظ رکھے اور ان کے نشو و نما کے اسباب مہیا کرے -

نظام تعلیم قوم کے افراد کے اندر صحیح شعور پیدا کرتا ہے - وہ افراد کو فنی مہارتوں سے آراستہ کرتا ہے تاکہ وہ دنیا میں باعزت زندگی بسر کرسکیں - معاشرے کے قابل عزت اور قابل احترام افراد کی حیثیت سے انہیں زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ سکھاتا ہے اور سب سے بڑھ کر قومی سیرت و کردار کی پختگی تعلیم کے بغیر ممکن ہی نہیں ہوسکتی -

تعلیم صرف ذہنی بیداری ، معلومات اندوزی اور سوسائٹی میں ایک خاص تشخص اور بلند حیثیت حاصل کرنے کا واسطہ ہی نہیں بلکہ قومی نصب العین اور قومی تعمیر و ترقی کے حصول کا بھی وسیلہ ہے -

بہترین نظام تعلیم ہمیشہ معاشرے کی مصروف قدروں کے تابع ہوتا ہے- اور انہیں نئی نسل کے جسم و جان میں ڈھالتا ہے اور قومی کردار کی تشکیل و تکمیل کرتا ہے اور یہی قومی تعمیر و ترقی کا پیش خیمہ ہے !

اسلامی نصاب و نظام تعلیم

صراطِ مستقیم کی تلاش

محترمہ پروفیسر سلمیٰ زمن

اسلام ایک صاف، سادہ اور عقلی مذہب ہے۔ اس کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لیے ایک کتابِ قانون قرآن کی شکل میں موجود ہے۔ قرآن ہمارے ایمان و عقائد کے مطابق اللہ کا کلام ہے اور اس میں زندگی کے ہر اہم پہلو کے بارے میں اور انفرادی اور اجتماعی تعمیر کردار و اخلاق کے لیے ایک متوازن معاشی و معیشتی نظام کا مضبوط خاکہ پیش کر دیا گیا ہے، اور انسانی حقوق و فرائض، اوامر و نواہی صاف صاف الفاظ میں بیان کر دیے گئے ہیں۔ دنیا کے اور خلائق کی طرح انسان بھی اللہ کی مخلوق ہے، لیکن عقل دے کر اس کو برتری دے دی گئی اور اسے اشرف المخلوقات بنایا گیا، فرشتوں کو آدم کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم اس لیے دیا گیا کہ اللہ نے آدم کو علم اسماء سکھا دیا تھا:

آسمان بار امانت نہ تو انست کشید
قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

قرآن کریم میں بار بار سوچنے، سمجھنے اور غور کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ سورج، چاند، ستارے، زمین، آسمان، پھول، پتّے، درخت، چرند و پرند، انسان، سب اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے ہیں۔ ہم اللہ کی قدرت کا جتنا بھی مشاہدہ کریں اتنا ہی اپنی عقل و فہم میں اضافہ کریں گے۔ اس لیے دنیا کے تمام علوم اور فطرت کی تمام صناعیاں اسلام کے احاطۂ فکر میں آتے ہیں۔ چنانچہ انسان کے فکر و عمل کا دائرۂ کار ساری کائنات ہے جس کا مطالعہ اسلامی تعلیم کی حدود میں شامل ہے۔ علم میں مشاہدہ، جستجو، عینی تصورات، عملی تجربات سب شامل ہیں۔ تعقل اور تجربات ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ اللہ، کائنات اور انسانیت ایک تصویر کے مختلف رخ ہیں اور کائنات کو سمجھے بغیر انسان اللہ کو بھی نہیں سمجھ سکتا۔

علم کی جو اہمیت اسلام میں ہے شاید ہی کسی اور مذہب یا فلسفۂ فکر

میں ہو۔ قرآن کہتا ہے ، " ربّ زد نی علماً " کہو " اے اللّٰہ میر ے علم کو زیاد ہ کر،"ھل یستوی الذین یعلمون واللذین لایعلمون " جو لوگ نہیں جانتے کیا وہ ان لوگوں کے برابر ہو سکتےہیں جو جانتے ہیں ؟ " یعنی نہیں ہو سکتے ـــ حضرت رسالتمآبؐ کا حکم ہے " اطلبو العلم من المھد الی اللّحد" گہوار ے سےلے کر قبر تک علم حاصل کرو" ـــ طلب العلم فریضۃ علٰی کلّ مسلم و مسلمۃ " طلب علم ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے"ـــ اطلبو العلم ولوکان بالصّین" علم کی جستجو جاری رکھو چاہیے اس کے لیے چین ہی کیوں نہ جانا پڑ ے "ـــ رسول اللّٰہ کا ارشاد گرامی ہے،ـــ من مات فی طلب العلم فھو شہید"ـــ" جو شخص طلب علم میں مر جائے وہ شہادت کا درجہ رکھتا ہے "۔

اسلام میں اللّٰہ کی عبادت کا مقصد انسان کو انفرادی اور اجتماعی حیثیتوں سے راہ مستقیم پر چلانا ہے ، تعلیم کو اس قدر اہمیت دی گئی ہےکہ رسول اللّٰہ پر جو پہلی وحی نازل ہوئی اس میں جس کام کی اللّٰہ تعالٰی نے اوّلاً تاکید کی وہ پڑھنا تھا۔" اقراباسم ربک الذی "ـــ پڑھ اللّٰہ کے نام سے ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی رو سے تمام کائنات علم کا عظیم سرمایہ ہے ۔ اسی لیے انسان کو اللّٰہ نے غور کرنے ،سوچنے اور سمجھنے کی ہدایت کی ہے ۔قرآن کو آہستہ آہستہ سمجھ سمجھ کر پڑھنے کی تاکید کی گئی ہے کیونکہ قرآن ہی کے ذریعہ سے اللّٰہ تعالٰی کے احکامات انسان تک پہنچائے گئے ہیں اور اللّٰہ کے احکامات وہی ہیں جو تکمیل انسانیت کے لیے ضروری ہیں ۔اس لیے تعلیم کا کوئی نصاب یا نظام بغیر علم دین کے مکمل نہیں ۔

ہمار ے ملک میں عام طور پر اسلامی تعلیم کا مفہوم قرآن کریم ،حدیث و فقہ کا پڑھانا سمجھا جاتا ہے ، عربی زبان اور اسلامی نظریات کو بھی داخل نصاب کر دیا گیا ہے ، اور ہم یہ سمجھ بیٹھے کہ ہم نے تعلیم کو اسلامی رنگ دے دیا ۔ حالانکہ ان علوم کو سطحی طور پر نصاب کا حصہ بنانے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے بلکہ ہوتا ہے ، کہ جس طرح دوسر ے نصابی مضامین رٹ لیے جاتے ہیں یا ناپسندیدہ طریقے استعمال کر کے پاس کر لیے جاتے ہیں ، اسی طرح اسلامی علوم کے ساتھ بھی کیا جاتا ہےکیونکہ مقصد بندھے ٹکے طریقوں سے امتحان کا پاس کو لینا ہے نہ کہ کردار و اعمال میں اسلامی خصوصیات کا پیدا کرنا۔یوں تو ہر علم کا مقصد انسان کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے ، لیکن اسلامی علوم میں خاص طور پر روحانیت اور اخلاق کے اعلا ترین پہلوؤں کا اجاگر کرنا ہوتا ہے ، اس طرح کہ یہ خصوصیات طلبہ کے ذہن و کردار میں رچ بس جائیں ۔ یہ باتیں کتاب اور لکچر سے نہیں بلکہ باعمل والدین اور تربیت یافتہ اساتذہ کے کردار اور روز مرہ زندگی کی مثالوں سے اور ان کے اور نوجوانوں کے باہمی ارتباط ہی

سے پیدا ہو سکتی ہیں ۔ والدین اور اساتذہ کی اپنی زندگی اگرمثالی اسلامی اصولوں پر مبنی نہ ہو تو موثر نہیں ہو سکتی۔ علم اور عمل دو مختلف چیزیں ہیں ۔ اور عمل کے بغیر علم ایک بے جان جسم کی طرح ہے۔ اسلام کے عروج اور ترقی کا سبب صرف پیروان اسلام کے اعلا کردار و اخلاق کی روشن مثالیں تھیں، ان کی فتوحات نہیں تھیں ۔

بعض اوقات ہم مسلمان بادشاہوں کی فتوحات ، طرز حکومت اور ان کے عہد میں سائنس ، معاشی ، تعلیمی ترقی کو بھی اسلامی نظام تعلیم کا درجہ دیتے ہیں ، لیکن یہ درست نہیں ۔ ایک کتاب میری نظر سے گزری جس کا عنوان "اسلامی نظام تعلیم" تھا ۔اس میں مسلمان حکمرانوں کے دور حکومت میں نظام تعلیم پر بحث کی گئی تھی ۔ حالانکہ اسلامی نظام تعلیم کو مسلمان حکمرانوں کے دور حکومت کے تعلیمی نظام سے خلط ملط نہیں کیا جا سکتا ۔کیونکہ مسلمان حکمرانوں میں منصف مزاج ، خدا ترس اور اسلام کے سچے پیرو بھی گزرے ہیں اور تعیش پسند ، ظالم اور بدکار بھی ۔۔۔ چنانچہ جب ہم اسلامی نصاب اور نظام تعلیم کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیں اس نظام تعلیم کو پیش نظر رکھنا چاہیے جس میں اسلام کے اعلا و ارفع اقدار ، اصول و قوانین سکھائے جائیں اور ان پر عمل کرنے کے مواقع پیدا کیے جائیں ۔

اسلام کی روح کلمۂ طیبہ میں سموئی ہوئی ہے ۔نہیں ہے اللّٰہ کے سوا کوئی معبود اور محمد اس کے رسول ہیں" اس کلمہ میں معانی کے سمندر پنہاں ہیں اللّٰہ تعالیٰ کی وحدت ، برتری اور عظمت پر ایمان کے ساتھ اس کے بھیجے ہوئے رسول پر ایمان لانا ہمارا فرض ہو جاتا ہے ۔ ایمان کے ساتھ عمل کا ہونا بھی لازمی ہے ۔زندگی کے ہر زاویے پر ، ہر موقع پر ، صبح سے شام ، شام سے رات تک ہمارا کھانا پینا ، سونا جاگنا ، کام کاج ، بولنا چالنا ، جو کچھ بھی ہم دنیا میں کرتے ہیں اسلام کی رو سے یہ سارے کام عبادت میں شمار ہوتے ہیں ، بشرطیکہ اعمال صالح ہوں ۔ ناانصافی ، ظلم ، جھوٹ ، مکر و فساد اور وہ سارے نواہی جن سے احتراز کرنے کا حکم قرآن میں موجود ہے ان سے گریز کرنا مسلمان کا فرض ہے ۔ "قل ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للّٰہ رب العالمین" : کہو کہ ہماری نماز ، ہمارا روزہ ، ہماری زندگی ہماری موت سب اللّٰہ کے لیے ہیں جو عالموں کا رب ہے" ۔۔۔ یہی وہ تسلیم و رضا کی خو ہے جو اسلام کی روح ہے اور جس سے مسلمان کا کردار بلند ہوتا ہے ۔

اللّٰہ تعالیٰ نے رسول ص کو انسانیت کا معلم بنا کر بھیجا اور رسول ص نے قرآن کے ذریعہ سے حکمت کا درس دیا اور تزکیۂ نفس کی ہدایت فرمائی

" لقد من اللّٰہ علی المومنین اذ بعث فیہم رسولاً من انفسہم یتلوعلیہم آیتہ و یزکیہم و یعلمہم الکتاب و الحکمتہ

(آل عمران : ۱۶۴)

یعنی بےشک اللّٰہ نے ایمان والوں پر مہربانی کی جب اس نے ان کے پاس ان ہی میں کا ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیتیں سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب کی تعلیم دیتا ہے۔

اس آیت پاک سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف کتاب کا پڑھ لینا کافی نہیں بلکہ تعلیم کا مقصد تزکیۂ نفس بھی ہے ، مہذب و شائستہ بنانا بھی ہے ۔ اس لیے تعلیم کے ساتھ تربیت بھی لازمی اور ضروری ہے۔ تربیت میں ایک طرف تربیت ذہن و دماغ ہے تو دوسری طرف تربیت کردار و عمل اور تربیت جسم ۔ اسلامی نصاب لوگوں کو صرف حرف شناس نہیں بناتا بلکہ اس کی اصلی غایت یہ ہے کہ طلبہ ایسے انسان بنیں جنھیں اللّٰہ اور اس کے بندوں کے متعلق اپنے حقوق و فرائض کا علم ہو۔ عرفان حق اور خدمت خلق اس کے بنیادی تصورات ہوں۔ تعلیم یافتہ فرد کی پہچان یہ نہیں کہ اس کو صرف اپنی جسمانی ، ذہنی یا مادی ترقی کا خیال ہو بلکہ انسانیت اور خلق خدا کی ترقی اور بہتری کا بھی ہو۔ تعلیم کی غرض و غایت نسل انسانی کی اصلاح و فلاح ہے۔ تعلیم کے ذریعہ سے ہر بچے کا ذہنی ، جسمانی ، روحانی نشوونما خود اس کی صلاحیتوں کے مطابق ہونا چاہیے۔ مسابقت دوسروں کے مقابلے میں نہیں خود اپنے مقابلے میں ہو ، تاکہ بچے کے کردار میں خود بینی ، خود غرضی ، اور خود نمائی کے بجائے خودساختگی کے جذبات پیدا ہوں۔ یہ جذبات بہت سی ناپسندیدہ عادتوں کی بیخ کنی کرتے ہیں ۔

علم کا مقصد فتنہ و فساد پھیلانا نہیں اور نہ نسل انسانی کی تباہی اور بربادی کے سامان مہیا کرنا ، جیسا کہ ہم موجودہ ترقی یافتہ دنیا میں دیکھتے ہیں کہ جو قومیں جتنی زیادہ تعلیم یافتہ ہیں اتنا زیادہ وہ اپنے علم کا استعمال اپنی قوت کو بڑھانے اور دوسری قوموں کو زیر کرنے میں صرف کرتی ہیں ۔ قرآن میں بار بار تاکید کی گئی ہے کہ " اللّٰہ کی زمین پر فتنہ و فساد نہ پھیلاؤ "۔ فتنہ و فساد پھیلانے کو قتل کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ علم کو اس طرح استعمال کرنا جس سے ایسے تباہ کن اسلحہ جات بنائے جائیں جن سے اللّٰہ کی بنائی ہوئی مخلوق لمحہ بھر میں جل کر خاک ہو جائے انتہائی غیر اسلامی ، غیر انسانی اور مذموم فعل ہے۔ اسلامی تعلیم سے انسانیت کی ترقی مراد ہے۔ اسلامی نصاب طلبہ کو اللّٰہ تعالیٰ اور

اس کے رسولؐ کے احکامات پر عمل پیرا ہونا سکھاتا ہے اور کتابی علوم کو نظری حدود سے نکال کر عملی زندگی میں ان کا استعمال سکھاتا ہے تاکہ انسان میں علم کی روشنی کے ساتھ ساتھ کردار کی شائستگی ،متانت ،گہرائی اور طمانیت پیدا ہو - یہی اسلامی تعلیم کی روح ہے-

مغربی ممالک میں سولھویں صدی عیسوی میں جب صنعتی انقلاب کی ابتدا ہوئی تو وہاں ہر قسم کی مادی ترقی کی بنیاد پڑی - اور یہ اس دور میں ہوا جب اسلام کے پیرو " پدرم سلطان بود " میں مگن دولت اور تعیش پرستی میں محو رفتہ رفتہ تنزل کی طرف قدم بڑھاتے جا رہے تھے - ان کی آنکھیں اس وقت کھلیں جب آپس کی رسہ کشی اور طوائف الملوکی نے ان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور مغربی اقوام نئے علوم اور سائنس کی طاقت سے انھیں زیر کر چکی تھیں ، اور وہی جو کل تک ان کے باج گزار تھے آج حاکم بن گئے تھے - ان کے نصاب تعلیم اور نظام تعلیم اور حکومت کا رعب مسلمانوں پر ایسا طاری ہوا کہ ان کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں اور وہ روایات علم و فن اور اپنے دین و مذہب کے روشن پہلو فراموش کرکے میکالے کے الفاظ میں صرف خون اور نسل کے اعتبار سے تو ہندستانی رہ گئے ، ذوق و مذاق میں انگریز ہو گئے - اور یہ اثرات ان کے دماغوں میں ایسے گھر ے پڑ ے کہ آج تک قائم ہیں - قابل غور امر یہ ہے کہ جس دور میں مغربی ممالک میں سائنسی اور صنعتی انقلاب آیا اس وقت عیسائیت میں تفرقہ پڑ چکا تھا اور رہبانیت اور پادریت کے منفی پہلوؤں کی وجہ سے عوام اور علما کے سنجیدہ طبقوں میں مذہب کے نام پر ظلم ، ریا ، ہوس اور جاہ پرستی کے خلاف بغاوت کے جذبات پیدا ہو چکے تھے - اسی دوران چونکہ سائنسی ، علمی اور صنعتی ترقی بھی ہوئی اس لیے وہ مادیت کے معترف اور علم بردار ہو گئے - انھوں نے ایشیا اور افریقہ میں سامراجی حکومتیں بھی قائم کیں اور چونکہ اسلامی مملکتوں کا شیرازہ بکھر چکا تھا اس لیے مغربی اقوام کا انداز فکر و فلسفہ ترقی کی معیار و منزل سمجھا جانے لگا - اسلام عہد قدیم کی داستان اور اسلامی نظریات ، روایت پرستی اور فرسودگی کی علامت سمجھے جانے لگے - لیکن کچھ ہی عرصے بعد برصغیر پاک و ہند میں سر سید احمد خان ، اور ان کے ہمعصر محسن الملک ، وقارالملک اور حالی جیسے علما اور رہنما پیدا ہوئے جنھوں نے ہندستانی مسلمانوں کے دلوں میں امید کی شمعیں روشن کیں اور ان میں خود اعتمادی اور یقین کے جذبات بیدار کیے جو رفتہ رفتہ بڑھتے چلے گئے اور برصغیر کی آزادی اور پاکستان کے قیام کی شکل میں رونما ہوئے -

روح تعلیم

لیکن پاکستان میں جہاں تک اسلامی نصاب و نظام تعلیم کا سوال ہے

ابھی تک ہم کسی راستے کا تعین نہیں کر سکے ہیں - ایک طرف وہ لوگ ہیں جو صرف عقائد ، اصول و نظریات ہی تعلیم کو اہمیت دیتے ہیں اور جدید علوم اور سائنس کو مذہب کا دشمن تصور کرتے ہیں اور دوسری جانب وہ ہیں جو عقائد و نظریات کے ساتھ اسلام کے اخلاقی اور انقلابی اور جدید پہلوؤں پر زور دیتے ہیں۔ لیکن اکثریت ان کی ہے جو انگریزی دور کے رائج کیے ہوئے نظام میں صرف سطحی طور پر اسلام کا ملمع کر کے اسے نئے نظام تعلیم کا نام دے رہے ہیں -

اسلام ایک انقلابی نظریۂ حیات لے کر آیا جس میں انسان کی انسان پر رنگ ، نسل اور قوم کی بنیاد پر برتری ختم کر دی گئی -جس میں عورت اور مرد ایک دوسرے کے مددگار و معاون بنائے گئے -جس میں ایک کا حق دوسرے کا فرض گردانا گیا - غلام اور آقا کی تفریق مٹا دی گئی اور بندوں کو اللہ کے حضور اخوت و مساوات کے بندھنوں میں باندھ دیا گیا ــــ اقراء باسم ربک الذی خلق" ـــ کہہ کر تعلیم کو عوامی حق تسلیم کیا گیا اور پڑھنے کی ترغیب دی گئی - مغربی اقوام کے تعلیمی نظام کی طرح غریبوں اور امیروں کے دو مختلف قسم کے نظام اور نصاب تعلیم نہیں بنائے گئے کہ ایک سے محکوم پیدا ہوں اور دوسرے سے حاکم - اسلام نے حاکم ومحکوم کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا اور کہا گیا کہ اللہ کے سامنے سب سے زیادہ قابل عزت وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو!

اسلام نے جس تہذیب کی بنیاد ڈالی وہ روا داری ، مساوات ،اخوت، انصاف اور محبت پر مبنی ہے ، اور یہی خصائص ہمارے تعلیمی نظام کے اساس ہونے چاہیں ، غریب اور امیر بچوں کے لیے علاحدہ درس گاہیں قائم کرنا ، علاحدہ نصاب تعلیم بنانا ، علاحدہ طریقہ تعلیم رائج کرنا نہ صرف غیر اسلامی فعل ہے بلکہ غیر انسانی بھی ہے ، کیونکہ ایسا کرنے سے غریب بچوں کی فطری صلاحیتوں کے نشوونما کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور ان کے تعلیمی وسائل محدود اور پست معیار کے ہو جاتے ہیں -اسی نظام تعلیم کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ناخواندگی عام ہے اور ملک کے ۷۶ فی صد باشندے ناخواندہ ہیں جو ایک اسلامی مملکت کے دامن پر ایک سیاہ داغ ہے - جس قوم کے لیے قرآن کا پڑھنا فرض ہو اس میں ناخواندگی کا پایا جانا گناہ ہے - چونکہ ہم نے دور غلامی میں ایسے نظام تعلیم کو اپنایا جس میں حاکم اور محکوم کے لیے علاحدہ علاحدہ درس گاہیں تھیں، جہاں کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں صرف امرا اور نوابوں کی اولاد بھیجی جاتی تھی اور جہاں پبلک اسکول صرف روسا کے بچوں کے لیے مخصوص تھے اور یہی بچے بڑے ہو کر حاکم اور عالم بنتے تھے، اس لیے برطانوی حاکموں کے ایما پر ہمارے بچوں کے لیے

بھی اسی قسم کی درس گاہیں ضروری سمجھی گئیں ،جہاں بچے قابلیت اور صلاحیت کی بنا پر نہیں بلکہ والدین کی دولت اور عہدے کی بنا پر تعلیم حاصل کرتے تھے اور یہی نظام اب تک ہمارے پاکستان میں قائم ہے بلکہ معیار کے نام پر اسی کی توسیع کی جا رہی ہے ، اور ایسی درس گاہیں قائم کی جا رہی ہیں جن میں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے اور جو برطانوی امتحانی اداروں سے ملحق ہیں ، جہاں پڑھنے کے بعد نوجوان اپنے آپ کو بقیہ قوم سے برتر اور علاحدہ سمجھتے ہیں اور ان کو قومی مسائل سے قطعی کوئی دلچسپی یا لگاؤ نہیں ہوتا -

نصاب تعلیم

اسی طرح نصاب پر پابندیاں عائد کرنا ذہنوں کو پابہ زنجیر کرنے سے کم نہیں- اللہ تعالٰی نے انسان کو دماغ دیا ہے کہ وہ سوچے ، سمجھے اور غور کرے - اگر ہم اس کے ذہن پر اپنے فرسودہ ، خود غرضانہ اور تنگ نظریات کی تالا بندی کر دیں تو یہ ایسی ظالمانہ حرکت ہے جو معاف نہیں کی جا سکتی- اسلام میں آزادیِ فکر و بیان کی تاکید کی گئی ہے - کائنات کی وسیع کتاب انسان کے فکر و نظر کے لیے کھول کر رکھ دی گئی ہے -اس لیے اسلامی نصاب تعلیم وہی ہے جو اللہ کی بنائی ہوئی کائنات میں عیاں ہے - اس کو ہر سطح پر بچے کے جسمانی و دماغی نمو کے مطابق داخل نصاب ہونا چاہیے - ابتدا ہی سے ماحول اور فطرت کا جائزہ ، پھول پتے ، درخت ، پتھر ، پہاڑ ، دریا غرض قدرت کے تمام مناظر کو دیکھنا ، ان کا تجزیہ کرنا بچے کے نصاب میں شریک ہونا چاہیے ، نظری اور عملی دونوں حیثیتوں سے- حسن سلوک ، نیکی ، سچائی ، ایمانداری ، ہمت ، بہادری کے واقعات نہ صرف رسول اکرمؐ اور بزرگان دین کے حالات زندگی سے پڑھائے جانے چاہیں بلکہ روزمرہ کی اجتماعی اور انفرادی زندگی میں بھی ان پر عمل کرنے کی اہمیت واضح کرنی چاہیے -ایک دوسرے کی مدد کرنا ، ذاتی منفعت کو دوسرے کی ضرورت پر قربان کرنا ، صفائی ، سچائی ، ایمانداری ، بہادری اور دوسری نیک خصوصیات کا اجتماعی زندگی میں استعمال اور بجائے انفرادی اور ذاتی مسابقت کے اجتماعی ذمہ داری کے خیال کو نصاب تعلیم میں بنیادی اہمیت دینی چاہیے -امتحان پاس کر لینا اور ڈگریاں لینا ہی مقصد تعلیم نہیں ، بلکہ نصاب ایسا ہونا چاہیے جس سے طالب علم کی پوری شخصیت میں مثبت خصوصیات کی تشکیل ہو سکے -

امتحانات

موجودہ زمانے میں امتحانوں میں بددیانتی اور اساتذہ اور ممتحنوں کو

ڈرا دھما کر یا رشوتیں دے کر نمبر بڑھوانے کی روایت ان غیر اسلامی اطوار میں سے ہے جو ہمارے معاشرے میں عام ہیں اور اسے انحطاط کی طرف لیے جا رہی ہیں ۔ان کی ذمہ داری ارباب حل و عقد ، والدین اور اساتذہ پر بھی اتنی ہی یا اس سے زیادہ ہے جتنی طالب علموں پر ۔ شرمناک بات تو یہ ہے کہ اسلامی نظریات اور دینیات کی تدریس تو ہوتی ہے لیکن ان کے امتحانی پرچوں میں بھی بددیانتی کی جاتی ہے ۔ بلکہ کچھ مثالیں ایسی بھی سامنے آئی ہیں کہ دوران امتحان قرآن پاک کی آیتوں کی نقل کر کے ان کے اوراق کو غسل خانوں میں پھینک دیا گیا ۔ یہ اسلام کی تعلیم نہیں، تضحیک ہے ۔

اسلامی تعلیم دینے کے باوجود مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں تعصب اور نفاق بڑھتا جا رہا ہے اور گزشتہ چند برسوں میں خود پیروان اسلام کے دو فرقوں میں تصادم اتنا بڑھ گیا کہ نہ صرف بلوے ہوئے بلکہ بے گناہوں کی املاک جلائی گئیں اور عبادت گاہوں کو مسمار کرنے کی کوشش کی گئی ۔ ان حرکات کی ذمہ داری غیر ملکی دشمنوں پر رکھ کر مسائل حل نہیں ہوتے۔ بلکہ ان پر سنجیدگی سے غور و فکر اور تجزیہ کی ضرورت ہے کہ اسلام کے پیرو اور علم بردار ہو کر بھی ہمارے دلوں میں شر اور فساد پیدا کس طرح ہوا اور ضرورت وقت یہ ہے کہ اہل فکر اس کے ازالے کے طریقوں پر غور کریں ۔

مقصد تعلیم

اسلامی تعلیم کا مقصد تو یہ ہونا چاہیے کہ ابتدا ہی سے بچے میں صداقت ، دیانت داری اور محنت کی ایسی عادت پڑ جائے کہ وہ کسی حالت میں بھی چوری یا بے ایمانی کرنا ، ایک دوسرے کی مخالفت کرنا یا مذہب کے نام پر تفرقہ پروری کرنا اور قومی املاک کو مسمار کرنا تو کجا اس کے ذہن میں بھی یہ خیالات نہ آئیں ، ایثار و قربانی اس کی فطرت ثانیہ بن جائیں ۔ رواداری ، بزرگوں کا ادب ، چھوٹوں سے شفقت اور ہم عمروں سے لطف و کرم کی خصوصیات اس کے کردار کے جزو بن جائیں ۔ واضح ہو کہ یہ باتیں صرف کہنے سننے سے نہیں پیدا ہوتیں بلکہ ان کا نشوونما اوّلاً والدین کی تربیت اور درس گاہوں میں اساتذہ کی مثال سے ہوتا ہے معاشرے میں بزرگوں کا کردار بچوں کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے ۔ اگر تدریس اور تربیت میں تضاد ہو تو بچے کی شخصیت اس سے متاثر ہوتی ہے اور اس میں دوغلاپن پیدا ہو جاتا ہے جس کی مثالیں آج کل ہم اپنے معاشرے میں دیکھ رہے ہیں ۔

درس گاہوں میں چھوٹی چیزیں ایسی سکھائی جا سکتی ہیں جن سے طلبہ کے کردار میں اسلامی رنگ پیدا ہو - مساوات ، اخوت ، رواداری ، اخلاق ، ایثار ، سچائی ، سادگی ، صفائی ، احساس ذمہ داری، وقت کی پابندی ، محنت غرض کون سی انسانی صفات ایسی ہیں جو اسلامی تعلیم کے دائرے میں نہ آتی ہوں ، لیکن ہم روزانہ زندگی میں یہ دیکھتے ہیں کہ خود والدین اور مدرسین جب ان کے اپنے یا اپنے بچوں کے دنیاوی مفادات کا سوال ہوتا ہے تو وہ قطعی بھول جاتے ہیں کہ وہ دوسروں کے حقوق پامال کر رہے ہیں ، اور بعض اوقات ہمارے عالم بے عمل خود ایسی حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں جن سے خود غرضی ، خود بینی ،اور خودرائی آشکارا ہوتی ہے اور وہ " ہمچو ما دیگرے نیست" کی مکروہ مثالیں بن کر سامنے آتے ہیں -یہی وجہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد گزشتہ کئی برسوں سے اسلامی تعلیم کو داخل نصاب کرنے کے باوجود ہمارے نوجوانوں میں صحیح اسلامی اقدار اور خصوصیات پیدا نہیں ہو سکی ہیں-

نظام تعلیم

اسلامی نظام تعلیم وہ ہے جس میں ہر ایک کو بغیر کسی تخصیص کے مساوی مواقع دیے جائیں تاکہ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کے مطابق علم حاصل کر سکے- ذات ، نسل ، رنگ ، جنس کی قید نہ ہو ، اور نہ کسی کی دولت ، عہدے یا جائے اقامت کو خاص مواعات دی جائیں—اسلامی نصاب تعلیم میں کائناتی وسعت ہوتی ہے نہ کہ تنگ نظری اور تعصب - تاریخ ، جغرافیہ ، معاشرتی علوم ، سائنس ، طب ، انجینیرنگ یا پیشہ ورانہ صنعتی علوم،اسلام کے احاطۂ علمی میں سب شامل ہیں کیونکہ یہ انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں -

تعلیم میں کھیل کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کتابی ، اور ذہنی علوم کی - تندرست دماغ کے لیے تندرست جسم کا ہونا ضروری ہے اس لیے درس گاہوں میں جسمانی ورزش اور کھیل کا انتظام بھی ضروری ہے ، اس کے علاوہ ہر سطح پر پیشہ ورانہ تعلیم کی بھی بہت اہمیت ہے اور اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا -واضح ہو کہ جب ایک دفعہ ذہن و کردار کی تشکیل صحت مند بنیادوں پر ہو گئی ہو تو نوجوان زندگی کے جس شعبے میں بھی قدم رکھیں گے ان میں خود شناسی کے ساتھ ساتھ احکامات خداوندی کی صحیح آگاہی بھی ہوگی اور وہ مذہب کی سطحی رسوم اور ظاہر پرستی کو نہیں بلکہ اسلام کی اصل روح اور اخلاقیات کی بلند ترین حدود کو اپنی زندگی کا لائحۂ عمل بنائیں گے -اسی کو آپ اسلامی نصاب یا اسلامی نظام تعلیم کا نام دے سکتے ہیں اور یہی ہمارے لیے صراط مستقیم ہے -

برِّصغیر میں تعلیمی اصلاح کی کوششیں

جناب عبدالکریم عابد

تعلیمی ادارے دراصل انسان سازی کے کارخانے ہیں، اور جو تعلیمی نظام جس قوم یا ادارے کا ہو وہ اس کے مطابق انسان پیدا کرتا ہے۔ لیکن قوموں کی تاریخ میں ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے جب اس کے تعلیمی ادارے ایسے انسان پیدا کرنے لگتے ہیں جن کی معاشرے میں کھپت نہیں ہوتی اور جو معاشرے کی ضرورتوں کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اور یہیں سے تعلیمی اصلاح کی تحریکیں جنم لیتی ہیں۔

مسلمانوں میں بھی جب بغداد کی جامعہ نظامیہ اور مصر کی جامعہ ازہر کے تعلیمی نصاب کے پیدا کردہ انسان مسلم معاشرہ کی ضروریات کے لیے نامناسب اور ناکافی نظر آئے تو تعلیمی اصلاح کی جدوجہد کا آغاز ہوا۔ اس جدوجہد کا نقطۂ آغاز حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی وہ فکر تھی جس نے ایسے انسان پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دیا جو تقلید سے زیادہ اجتہاد کے قائل ہوں، اور جو بے سرو پا روایات، اوہام یا قدیم یونانی منطق، فلسفہ، علم الکلام کے بوجھ سے نجات حاصل کر کے کتاب و سنت کے اصل سرچشمہ سے سیراب ہوں۔ شاہ صاحب کی یہ فکر برّصغیر کی نئی تعلیمی تحریک کی اساس تھی، اور اس کے مطابق خانوادۂ ولی اللّٰہی اور ان کے شاگردوں نے ایسے علما پیدا کیے جو ولی اللّٰہی طرز فکر کے مطابق تعلیم و تدریس کے مرکز تھے۔ بعد میں دیوبند کا جو ادارہ تشکیل پایا وہ بھی شاہ صاحب کے طرز فکر کا مظہر تھا۔

تحریک دیوبند

دیوبند کا قیام جن تاریخی حالات میں ہوا، اس کا ایک تاریخی ردعمل اور کچھ تاریخی تقاضے تھے جو اس ادارے پر اثر انداز ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب مسلمان بیرونی سامراج کے چیلنج سے دو چار تھے، اور اکابرین دیوبند کا خیال تھا کہ ایک ایسے زمانے میں، جو بیرونی غلبے کا زمانہ ہے، سب سے مقدم چیز یہ ہے کہ ایسے انسان پیدا کریں جن کے دل و دماغ میں بیرونی غلبے کے خلاف نفرت کی شدت پیدا ہو اور اس کے ساتھ ہی اپنی پرانی اقدار اور پرانی تہذیب سے غیر معمولی وابستگی کا جذبہ بھی ان میں

ہونا چاہیے ، کیونکہ بیرونی غلبہ کے عہد میں یہ خدشہ بہت قوی ہوتا ہے کہ محکوم لوگ اپنی اقدار اور اپنی تہذیب کو اپنے ہی ہاتھوں ختم نہ کر دیں۔ بلاشبہ زمانے کی نئی چیزوں کا اپنانا ضروری ہے ، لیکن اس کے لیے ایک آزاد اور زندہ قوم کی ضرورت ہے جس میں ہوشمندی اور بصیرت موجود ہو۔ زوال اور غلامی کے عہد میں ذہن اندھی تقلید پر مائل ہوتے ہیں اور اس دور میں تجدد پسندی یا جدت پسندی اپنی خودی اور شناخت گم کرنے کا سبب ہو سکتی ہے -یہی وہ احساس تھا جو علمائے دیوبند کے جامد رویّہ کے پس پردہ کارفرما تھا۔اس لیے بزرگان دیوبند اپنے تعلیمی نظام کے ذریعے سے ، ایسا دانشور اور تعلیم یافتہ طبقہ پیدا کرنا چاہتے تھے جو سیاسی معاملات میں ترقی پسند ہو اور آزادی کا طلب گار ہو ، لیکن تہذیبی اور مذہبی معاملات میں شدت پسندی سے باز رہے۔دیوبند کے اس نقطۂ نظر سے اختلاف کیا جا سکتا ہے ، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ دیوبند اور دیوبندی علما کے مدارس و مکاتب نے نہ صرف تعلیم کو عام کیا بلکہ آزادی کی جنگ کے مجاہد ، پان اسلام ازم کے علمبردار اور ملّی تہذیب کے محافظ پیدا کیے ، اور اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے مسلمانوں میں بری رسومات ، فضول توہمات کے خلاف آواز اٹھائی -عقد بیوگان سے لے کر تعلیم نسواں تک اور مشرکانہ طور طریقوں سے لے کر بےجا اسراف تک ہر معاملے میں معاشرتی اصلاح کے لیے ، ان علما نے بڑا کام کیا اور یہ کام شاہ ولی اللہ کی تعلیمی تحریک کا ثمر تھا۔

علی گڑھ

دیوبند کے مقابلے میں سرسید کی تحریک نے حقیقت کے اس رخ پر زور دیا کہ جو قومیں علم کے ہتھیار سے محروم ہوتی ہیں ان کا تلوار اٹھانا اپنا گلا کاٹنے کے مترادف ہے - علم سے محرومی کی حالت میں جنگ و جدل کا راستہ اختیار کرنا تباہی کو مزید دعوت دینا ہے۔سرسید نے بتایا کہ انگریز کے پیچھے اصل طاقت جدید علوم،سائنس اور ٹیکنالوجی کی ہے ، چونکہ مسلمان اس اعتبار سے پیچھے جا پڑے ہیں اس لیے اب دنیا کی امامت کے حقدار نہیں رہے۔امامت دوبارہ تلوار کے زور پر نہیں بلکہ علم کے ذریعہ سے حاصل ہوگی -اس لیے ہمیں تعلیم کی راہوں پر تیزی سے آگے بڑھنا ہوگا۔اور جب تک ہم ایک خاص علمی اور تعلیمی سطح حاصل نہ کر لیں انگریز سے ٹکراؤ کی پالیسی بھی نقصان دہ ہے -سرسید نے اس بات پر بھی زور دیا کہ انگریز کو اس ملک میں اپنا نظام حکومت اور کاروبار حکومت چلانے کے لیے جدید تعلیم یافتہ سرکاری ملازمین کی بڑی فوج درکار ہوگی ، اس معاملے میں ہندو ہوشیار ہے ، انگریز کا اعتماد حاصل کر رہا ہے ، اور اس کے معیار کی تعلیم کو اپنا رہا ہے ، لیکن مسلمان یا تو خواب غفلت کا شکار ہیں یا انگریزی تعلیم کی راہوں پر آگے بڑھنے سے گریزاں ہیں -

سرسید نے اس صورت حال کے ازالے کے لیے دردمندی اور دلسوزی سے دعوت دی ۔ان کی کوششوں سے علی گڑھ کا تعلیمی مرکز قائم ہوا اور تمام بڑے بڑے شہروں میں مسلمانوں نے اسکول اور کالج قائم کیے۔ان تعلیمی اداروں کا مقصد ہندستان میں ایسے مسلمان پیدا کرنا تھا جو انگریز سے ٹکراؤ کے بجائے مصالحت کا رویّہ اختیار کریں۔تعلیم کے میدان میں آگے بڑھیں اپنی معاشرتی اصلاح کریں ، ہندو سے بچاؤ کی فکر کریں اور ان کے مقابلے میں اسلامی فکر کی روح کو زندہ رکھیں۔سرسید کی فکر پر قائم ہونے والے ان تعلیمی اداروں نے بڑی تعداد میں ایسے مسلمان پیدا کیے جو ملازمتوں ، کارو بار اور سیاست میں ہندو سے مقابلے کی ذہنیت اور صلاحیت رکھتے تھے۔ اس طبقے ہی نے پاکستان کی تحریک چلائی اور پھر پاکستان کے نظم و نسق کو سنبھالا دیا۔

جامعہ ملیہ

علی گڑھ نے حالات اور وقت کی نزاکت کو پیش نظر رکھ کر مسلمانوں کو انگریز سے مفاہمت کا درس دیا تھا۔لیکن اس علی گڑھ ہی سے تحریک آزادی کے حریت پسندوں نے جنم لیا۔رئیس الاحرار مولانا محمد علی اور ان کے ساتھی بھی علی گڑھ کی دین تھے۔

دراصل علی گڑھ کا اسلامی جذبہ بجائے خود پان اسلام ازم کی خواہش کو جنم دینے والا تھا ،اور جب مولانا محمود الحسن علی گڑھ ائے تو انہوں نے اپنے خطبے میں تسلیم کیا کہ وہ جس پان اسلام ازم کی جدوجہد کر رہے ہیں اس کی اصل روح علما اور عباو قبا میں نہیں ، بلکہ کالجوں کے نوجوانوں میں ہے ۔مولانا محمد علی اور ان کے ساتھیوں کے جذبۂ آزادی نے علی گڑھ کی پرانی روایات سے بغاوت کے بعد ایک نئی تعلیمی تحریک کی شکل اختیار کی۔ یہ جامعہ ملیّہ تھی جس نے علی گڑھ کی جدیدیت کو مغربی لباس سے قومی لباس میں منتقل کرنا چاہا۔اور یہ بھی جامعہ ملیّہ ہی ہے جس نے سطحی اور اوپری ماڈرنزم کے بجائے ، مغربی تہذیب کی حقیقی خوبیوں اور مغرب کے علمی و سائنٹیفک ذہن کو اپنانے کے لیے ایک سنجیدہ کوشش کی۔

جامعہ ملیہ نے ہندستانیت اور اسلامیت کے ٹکراؤ کو دور کرنے پر بھی توجہ دی اور اگر کانگریس اپنی ہندو پرستی سے باز آ جاتی اور معقول رویہ اختیار کرتی تو جامعہ ملیہ کو اپنے اس مشن میں اطمینان بخش کامیابی ہو سکتی تھی ۔جامعہ ملیہ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس نے سوچنے سمجھنے اور بے غرض انداز میں والہانہ کام کرنے والے لوگ پیدا کیے ۔ اس سے خود قائداعظم بھی متاثر تھے۔ ایک موقع پر جب قائداعظم جامعہ ملیہ گئے اور انہیں معلوم ہوا کہ اس کے اساتذہ تیس چالیس روپے ماہوار پر

گزارہ کر رہے ہیں ، تو یہ ماجرا دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے،اور انہوں نے ۲۵ ہزار روپے کا عطیہ بھی اپنی جیب خاص سے جامعہ ملیہ کو دیا۔

ندوۃ العلما

علی گڑھ کے باغیوں نے آ کر جامعہ ملیہ قائم کیا تو دیو بند کے باغی ندوہ پہنچے ، اور دریائے گومتی کے کنارے اس نئی تعلیمی تحریک کا آغاز ہوا ۔ ندوہ نے اردو اور عربی کے صاحب طرز ادیب ہی نہیں پیدا کیے بلکہ ایسے دانشوروں کی ایک کھیپ دی جو زمانۂ جدید کی ضرورتوں کا احساس رکھتے تھے ۔اور اس سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کرتے تھے ۔اگرچہ ندوہ کے بانی علامہ شبلی نعمانی جو تعلیمی نظریات رکھتے تھے وہ بہت زیادہ ترقی پسندانہ اور انقلابی تھے ، اور ان پر عمل نہیں کیا گیا ، اور شبلی نے آخری دنوں میں مایوس ہو کر ندوہ سے قطع تعلق بھی کر لیا تھا ، تاہم ندوۃ العلما نے نئے زمانے کی ضروریات کے مطابق ایسے نئے علما پیدا کیے جو قدامت کے جوہر کو اپنے میں جذب کیے ہوئے تھے ، اور نئے زمانے کے تقاضوں سے بھی باخبر تھے۔

مدرسۃ الاصلاح ،سرائے میر

مدرسۃ الاصلاح ،سرائے میر، کے بانی بھی علامہ شبلی تھے ۔ندوہ سے مایوس ہونے کے بعد انہوں نے یہ ادارہ قائم کیا اور علی گڑھ کے ایک گریجویٹ مولانا حمید الدین فراہی، کو انہوں نے اس دارالعلوم کا سربراہ بنایا ۔مولانا فراہی نے مدرسۃ الاصلاح میں ایک ایسا ذہن تعمیر کرنے کے لیے کام کیا جو قرآن کو براہ راست سمجھنے اور اس پر تدبّر کرنے کا اہل ہو ۔انہوں نے قدیم تفسیروں کے ذخیروں کو نظر انداز کیا اور اپنے طلبہ میں لکیر کا فقیر بننے کے بجائے آزادئ فکر اور جرات فکر پیدا کی ۔اس مدرسہ کے دانشوروں نے جو اصلاحی کے نام سے معروف ہیں علمی حلقوں میں اپنا وجود تسلیم کرایا ہے اور وہ قومی ذہن پر اثر انداز ہوئے ہیں ۔

جامعہ عثمانیہ

حیدر آباد دکن کی سرزمین میں دارالترجمہ عثمانیہ کے قیام کو بھی ایک اہم تعلیمی تحریک قرار دینا چاہیے ۔اس کے محرک اوّل جمال الدین افغانی تھے ۔انہوں نے اپنے قیام دکن کے عرصے میں یہ تجویز پیش کی اور پھر یورپ پہنچ کر بھی اس سلسلے میں کوشاں رہے ۔اور اس کوشش کے نتیجے میں وائسرائے ہند اور سالار جنگ اوّل کی بات چیت کے بعد نظام دکن اس جامعہ کے قیام پر رضا مند ہو گئے تھے ۔جمال الدین افغانی نے قیام دکن کے زمانے میں اس جامعہ کے قیام کے ساتھ دو باتوں پر بڑا زور دیا ۔ایک یہ کہ ایسا دارالترجمہ قائم کیا جائے جو مغربی علوم کو اردو میں منتقل کرے ،اور

دوسری یہ کہ جامعۂ عثمانیہ میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے - جامعہ عثمانیہ کی خوبی یہ تھی کہ یہ آکسفورڈ کی طرح کا ایک مرکز تھا جو طالبان علم و تحقیق کے لیے تسکین کا باعث ہوا - اور جس نے برصغیر میں دانشوروں کو روا داری اور اعتدال پسندی کے ساتھ سوچنا سکھایا - اور مختلف مکاتب فکر کو ایک دوسرے سے نفرت نہ رکھنے اور رواداری کے ساتھ پیش آنے کی تعلیم دی -

قیام پاکستان کے بعد

تعلیمی اصلاح اور ترقی کے سلسلے میں ایک افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد اس شعبے میں کوئی نیا کام نہیں ہوا - نہ ہم نے نئی ضرورتوں کا احساس کیا نہ پرانے معیار تعلیم ہی کو برقرار رکھ سکے - آج معیار تعلیم اپنی پستی کی انتہا پر پہنچ گیا ہے تو دوسری طرف نئے حالات کے تقاضے بھی ایک نئی تعلیمی اصلاح و تحریک کا تقاضا کر رہے ہیں - اور آج نہیں تو کل ہمیں ان تقاضوں کا جواب دینا ہوگا - اوراللہ کرے جلد از جلد ہم یہ فریضہ ادا کر سکیں -

علامہ اقبال کا نظریۂ تعلیم

جناب ڈاکٹر غلام علی الانا

علامہ اقبال کے نظریۂ تعلیم پر غور و فکر سے پیشتر اتنا جان لینا ضروری ہے کہ ایک شاعر اور مفکر کی حیثیت سے اقبال بنیادی طور پر ایک معلم تھے۔ وہ ہمیں ان حقائق سے آگاہ کرنا چاہتے تھے جو تاریخی و تہذیبی عوامل کے تحت اور ان کی ذہانت و فطانت کی بدولت ان پر منکشف ہوئے تھے۔ ان کی شاعری اور فلسفہ ان حقائق کی تشریح و تفسیر کا ذریعہ ہیں۔ اقبال کو قدرت نے یہ موقع بھی دیا کہ وہ ایک باقاعدہ معلم کی حیثیت سے اس دور کے اہم تعلیمی اداروں میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیں اور اس طرح اس شعبے میں مہارت حاصل کریں تاکہ تعلیم و تعلم کے سلسلے میں ان کی رائے میں تجربہ و مشاہدہ کا عنصر بھی کارفرما ہو۔

اقبال نے ۱۸۹۹ء میں ایم اے کیا اور اسی سال یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے وابستہ ہو گئے۔ ان کی تقرری میکلوڈ عریبک ریڈر کی حیثیت سے ہوئی تھی اور ان کے ذمے تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ مختلف مضامین کی تدریس کا کام بھی تھا[1]۔ اس کے علاوہ انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں پہلے فلسفہ اور پھر انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے بھی کام کیا[2]۔ قیام یورپ کے دوران پروفیسر آرنلڈ کی جگہ چند ماہ تک یونیورسٹی کالج لندن میں عربی پڑھائی[3]۔ یورپ سے واپسی پر وکالت کے ساتھ ساتھ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کا درس دیتے رہے۔ ۱۹۱۱ء کے آغاز سے وہ ہمہ تن وکالت کی طرف متوجہ ہو گئے[4]۔ ۱۹۱۸ء میں انہوں نے دو ماہ تک اسلامیہ کالج لاہور کے ایم اے فلسفہ کے طلبہ کو پڑھایا[5]۔ اسلامیہ کالج سے ان کی ذاتی وابستگی تاحیات قائم رہی اور وہ اس کی توسیع و ترقی میں ہمیشہ کوشاں رہے[6]۔

ایک معلم کی حیثیت سے اقبال کا انداز بہت عمدہ اور موثر تھا اور معیار بہت بلند تھا۔ اس امر کی شہادت ان کے نامور شاگردوں مثلاً ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین، ایم اسلم، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اور محمد علی قصوری نے بھی دی ہے[7]۔ ان لوگوں کی روایتوں کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے

که بطور ایک معلم اقبال اپنے طلبہ میں بہت مقبول تھے چونکہ انہیں یہ احساس تھا کہ معلم کا مقام اور مرتبہ بہت بلند ہے اس لیےفرائض تدریس ادا کرنے میں وہ ہمیشہ محنت اور لگن سے کام لیتے رہے - معلم کی اہمیت اور مقام کے بارے میں اقبال کہتے ہیں :

" معلم حقیقت میں قوم کے محافظ ہیں کیونکہ آئندہ نسلوں کو سنوارنا اور ان کو ملک کی خدمت کے قابل بنانا انہی کی قدرت میں ہے - سب محنتوں سے اعلا درجے کی محنت اور سب کارگزاریوں سے زیادہ بیش قیمت کارگزاری ملک کے معلموں کی کارگزاری ہے"[۸]

تعلیم سے اقبال کا ربط و تعلق عمر بھر قائم رہا -اگرچہ اس ربط و تعلق کی نوعیت میں تبدیلی ہوتی رہی - وہ کئی یونیورسٹیوں کے متحن ، صدر متحن رہے ، پنجاب یونیورسٹی کی مختلف فیکلٹیوں اور بورڈوں کے کنوینر یا رکن رہے اور سینٹ اور سنڈیکیٹ کے رکن کی حیثیت سےخدمات انجام دیتے رہے[۹]- اس کے علاوہ انہوں نے انفرادی طور پر یا بعض لوگوں کے اشتراک سے مختلف درجوں کے طالب علموں کے لیے اردو ، فارسی اور تاریخ وغیرہ کے نصابات بھی مرتب کیے[۱۰]- یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ اقبال نے زندگی کے کسی مرحلے پر بھی شعبہ تعلیم کی اہمیت کونظرانداز نہیں کیا اور برصغیر کے تعلیمی ادارے ان کی مہارت سےاستفادہ کرتے رہے-

اب آئیے ان کے تعلیمی افکار کی طرف - اتنی بات تو واضح ہےکہ اقبال کا شمار ان مفکرین میں نہیں کیا جا سکتا جنہوں نے باقاعدہ علمِ تعلیم یا فلسفۂ تعلیم پر کتاب یا کتابیں لکھی ہوں ، لیکن ان کے کلام کے مختلف مجموعوں اور نثری تحریروں کا ایک سرسری سا جائزہ بھی بتادے گاکہ انہوں نےتعلیم کے مختلف پہلوؤں پر مفکرانہ انداز میں اظہار خیال کیا ہے - ان کے تعلیمی افکار گو ایک خاص زماں و مکان سے وابستہ ہیں ، لیکن حقیقت یہ ہے ان کی قدر و قیمت آج بھی اسی طرح برقرار ہے جس طرح ماضی قریب میں تھی ، کیونکہ اقبال نے ہمیں تعلیم و تربیت کے بعض نہایت بنیادی اور اہم تر مسائل کی طرف متوجہ کیا ہے-

اقبال کی نظر بیک وقت مشرق و مغرب دونوں کے فلسفہ تعلیم اور نظام تعلیم پر تھی - وہ دونوں کی خوبیوں اور خامیوں سے آگاہ تھے اور وہ دونوں پر تنقیدی نظر ڈالنے کی صلاحیت رکھتے تھے- یہی وجہ ہے کہ ان کے تعلیمی افکار میں بہت وسعت ، تنوع اور قدرت نظر آتی ہے- مدرسہ، طالب علم ، معلم ، نصاب ، تربیت ، مقاصد تعلیم ، ماہئیت علم اورمنہاج تعلیم

وغیرہ بہت سے موضوعات پر ان کے رشحات فکر ہمارے لیے کشش رکھتے ہیں۔

آج ہم ناخواندگی کے مسئلے سے دو چار ہیں اور اس کے حل کے لیے عملی تدابیر پر غور و فکر کرتے ہیں ۔ اقبال کے زمانے میں یہ مسئلہ زیادہ شدت سے موجود تھا اور اس سلسلے میں بعض سیاسی رہنما جبری تعلیم کے حق میں تھے۔ گوکھلے نے امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں جبری تعلیم کے قانون کا مسودہ پیش کیا تو علامہ اقبال نے لاہور میں اس کی حمایت میں جلسہ کیا اور اس کی تائید میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "جس طرح چیچک کا ٹیکا لازمی اور جبری قرار دیا گیا ہے اور یہ لزوم و جبر اس شخص کے حق میں کسی طرح مضر نہیں ہو سکتا جس کے ٹیکا لگایا جاتا ہے ، اس طرح جبری تعلیم بھی گویا روحانی چیچک کا ٹیکا ہے"[11]

مناسب ہوگا کہ یہاں اس امر کی تصریح کردی جائے کہ جبری اور لازمی تعلیم کی اس تجویز کی تائید میں اقبال کے مد نظر مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم بھی ہے۔اس کی وجہ ظاہر ہے کہ عورتوں کی تعلیم کے بغیر تہذیبی و تمدنی ترقی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ۔اقبال تو عورت کی تعلیم کو مرد کی تعلیم سے بھی زیادہ اہمیت دیتے ہیں [12]

اقبال تعلیم برائے تعلیم کے قائل نہ تھے۔ وہ اس کو ایک بامقصد اور بامعنیٰ عمل سمجھتے تھے۔ ان کی نظر میں تعلیم کو زندگی کے مقصد و مدعا سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔وہ تعلیم جو بلند مقصد حیات سے عاری ہو اور فرد و جماعت کے باہمی رشتوں کو بامعنیٰ نہ بنا سکے ذہنی عیاشی ہے۔ اقبال کی دو فارسی مثنویاں اسرار خودی (۱۹۱۵) اور رموز بےخودی (۱۹۱۸) اقبال کے بنیادی افکار کی ترجمان ہیں۔ ان میں انہوں نے بتایا ہے کہ فرد اپنی ذات کی کس طرح بہتر تعمیر و تشکیل کر سکتا ہے اور جماعت کی تنظیم کن بنیادوں پر بہتر صورت میں ممکن ہے ۔ ان کتابوں کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تعلیم وہی موزوں ہے جس کی مدد سے فرد عرفان خودی کی دولت سے مالا مال ہو، اپنے اندر اخلاقی فضیلتیں پیدا کر سکے اور اپنے آپ کو معاشرے اور انسانیت کے لیے مفید ثابت کر سکے۔

اقبال تعلیم پر ایک اور پہلو سے بھی غور کرتے ہیں اور وہ پہلو تعلیم کی تہذیبی و ثقافتی قدر و قیمت ہے ۔ تعلیم دراصل ایک نسل سے دوسری نسل تک تہذیبی قدروں کی ترسیل کا ذریعہ بھی ہے ۔ اگر تعلیم یہ کام نہیں کر رہی ہے تو قوم اور معاشرے کی بقا خطرے میں پڑ جاتی ہے۔اس کا ایک سبب تو یہ ہو سکتا ہے کہ قوم محکوم اور مغلوب ہے اس کے امور اجتماعی کی باگ ڈور سامراجی قوتوں کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا سبب یہ کہ قوم غفلت کی نیند سو رہی ہے اور احساس زیاں سے محروم ہے ۔ عہد اقبال میں

دونوں اسباب کام کر رہے تھے ۔برصغیر پر انگریزوں کی حکومت تھی اور وہ چاہتے تھے کہ محکوم اور غلام ہندستانی ، خصوصاً مسلمان اپنے شاندار ماضی سے ذہنی طور پر کٹ جائیں ، کیونکہ صرف اسی صورت میں مسلمان انگریزوں کی غلامی پر قانع ہو سکتے تھے۔اس ارادے سے جو اقدامات کیے گئے ان میں سے صرف ایک اقدام کی طرف یہاں اشارہ کیا جاتا ہے ۔ ۱۹۳۲ء میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے پروفیسر جے۔ایف ۔ بروس نے ہندوؤں کے زیر اثر اسلامی تاریخ کو بی ۔اے کے نصاب سے خارج کرنے کی کوشش کی تو اقبال نے اس پر شدید ردِّ عمل کا مظاہرہ کیا اور بروس کی متعصبانہ روش پر تنقید کی اور اس قسم کی کوشش سے باز رہنے کا مشورہ دیا۔[۳]

اس سے پہلے نومبر ۱۹۲۹ء میں اقبال جب علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبہ سے خطاب کے لیے تشریف لے گئے تو انہوں نے طلبہ سے کہا تھا "ایک دوسری بات جس پر میں زور دینا چاہتا ہوں وہ ہمارا انکشاف ماضی ہے ۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں جو صرف اپنے ماضی سے محبت کرتے ہیں میں تو مستقبل کا معتقد ہوں، مگر ماضی کی ضرورت مجھے اس لیے ہے کہ میں حال کو سمجھوں "---------- " میں چاہتا ہوں کہ آپ ان گم گشتہ رشتوں پر نظر ڈالیں جن کے ذریعے سے ہم ماضی و مستقبل سے وابستہ ہیں۔[۴]

اقبال کا یہ نقطۂ نظر مثبت اور عملی قدر و قیمت کا مالک ہے ۔ اگر ہم اسلامی تہذیب و ثقافت کے امین ہیں اور اس کے بقا کے خواہش مند ہیں تو ہمیں یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے کہ یہ تدریس تاریخ کے بغیر ممکن نہیں ۔میں یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ تاریخ سے مراد صرف حکمرانوں کی جنگوں کے حالات نہیں بلکہ ہماری ملّت کے عروج و زوال کی وہ داستان ہے جس کا دامن حقائق و واقعات اور عبرت و موعظت کے خزانے سے معمور ہے ۔ ہم اپنے اسلاف کی کامیابیوں اور ناکامیوں کے اسباب و علل پر غور و فکر کر کے اپنا حال بھی درست کر سکتے ہیں اور مستقبل بھی۔

آپ جانتے ہیں کہ تعلیم دو قسم کی ہے: رسمی اور غیر رسمی —رسمی تعلیم مقصد نہیں ذریعہ ہے جو آدمی میں غیر رسمی تعلیم (جس کی حدیں دنیا میں انسان کی آمد سے لے کر اس کے آخری دم تک وسیع ہیں) حاصل کرنے کی استعداد پیدا کرتا ہے۔لیکن اگر تعلیم کے مقاصد واضح نہیں ہیں یا مقاصد فروتر ہیں ، اساتذہ ذوق تعلیم سے بے بہرہ ہیں اور طالب علموں کی ہمتیں پست ہیں تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تعلیم کا عمل کسب معاش کے عمل کے تابع ہو جاتا ہے اور انسانی ذات کے کمال کا مرتبہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اقبال نے جب مشرقی درس گاہوں پر نظر ڈالی تو انہیں اس المیے کے مشاہدے سے دو چار ہونا پڑا کہ ان درس گاہوں میں وہ

ماحول ہی موجود نہیں ہے جو طالب علموں کو علم و فن کی جستجو کی لذت سے آشنا کرے اور ان میں کردار سازی کے لیے آمادگی پیدا کرے۔

اقبال ان مدرسوں اور مکتبوں کی حالت زار پر اس طرح آنسو بہاتے ہیں :

اقبال یہاں نام نہ لے درسِ خودی کا
موزوں نہیں مکتب کے لیے ایسے مقالات ۱۵

مکتبوں میں کہیں رعنائیِ افکار بھی ہے
خانقاہوں میں کہیں لذتِ اسرار بھی ہے ۱۶

دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار
کیا مدرسہ کیا مدرسہ والوں کی تگ و دو ۱۷

کس کو معلوم ہے ہنگامۂ فردا کا مقام
مسجد و مکتب و میخانہ ہیں مدت سے خموش ۱۸

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غم ناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ ۱۹

مسجد و مدرسہ ، مکتب و خانقاہ ، کی ایک محرومی تو یہ ہے کہ ان کے ماحول پر تقلید کا رنگ غالب ہے۔ جو بات اگلے لوگ کہہ گئے ہیں ان کے نزدیک وہ پتھر پر لکیر کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ اس سے سرِمُو انحراف جرم ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہماری درس گاہوں سے جو نوجوان فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں وہ جدت اور اجتہاد کے ذوق سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ وہ زمانے کی قیادت کرنے کی بجائے ترقی یافتہ قوموں کی پیروی کرنے پر مجبور ہیں :

کر سکتے ہیں جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو ۲۰

اور یہی حال ان تعلیمی اداروں کا تھا جو انگریزی دور میں سرکاری سطح پر مقامی لوگوں کی تدریس کے لیے کھولے گئے تھے۔ ان اداروں کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ یہاں کے لوگوں کو آزادانہ غور و فکر کی صلاحیت سے مالامال کیا جائے اور انہیں آزادی و حریت کی قدر و قیمت سے آگاہ کیا جائے بلکہ ان اداروں کا مقصد تو یہ تھا کہ انگریزی اقتدار کے تسلسل کے لیے کل پُرزے بہم پہنچائے جائیں۔ ان میں جو نصاب پڑھایا جاتا تھا اس کو

پڑھنے کے بعد طالب علم میں بڑی تبدیلی یہ آتی تھی کہ وہ انگریزی حکومت کو اپنے حق میں رحمت خیال کرتا تھا اور اس کی نظر انگریزوں کی ان استحصالی سرگرمیوں پر نہیں پڑتی تھی جن کی بدولت وہ یہاں کے خام مال اور قدرتی ذرائع پر ہاتھ صاف کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان اداروں کے طالب علم ذہنی طور پر اپنی قوم، مذہب اور تہذیب سے کٹ جاتے تھے اور مغربی تہذیب کے شیدائی بن جاتے تھے۔ اقبال نے اپنے دور کے نوجوانوں کی اس خامی کا بنظر غائر مشاہدہ کیا تھا۔ ایک مقام پر کہتے ہیں:

آہ مکتب کا جوانِ گرم خون
ساحرِ افرنگ کا صید زبوں ۲۱

اقبال اپنے مضمون "ملّت بیضا پر ایک عمرانی نظر" میں تعلیم جدید سے پیدا ہونے والی اس صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں:

"اگر ہم اپنے تعلیمی کارناموں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگائیں تو معلوم ہوگا کہ موجودہ نسل کا نوجوان مسلمان قومی سیرت کے اسالیب کے لحاظ سے ایک بالکل نئے اسلوب کا ماحصل ہے، جس کی عقلی زندگی کی تصویر کا پردہ اسلامی تہذیب کا پردہ نہیں ہے حالانکہ اسلامی تہذیب کے بغیر میری رائے میں وہ صرف نیم مسلمان، بلکہ اس سے بھی کچھ کم ہے اور وہ بھی اس صورت میں کہ اس کی خالص دنیوی تعلیم نے اس کے مذہبی عقائد کو متزلزل نہ کیا ہو۔ اس کا دماغ مغربی خیالات کی جولاں گاہ بنا ہوا ہے اور میں علی رؤس الاشہاد کہتا ہوں کہ اپنی قومی روایات کے پیرائے سے عاری ہو کر اور مغربی لٹریچر کے نشے میں ہر وقت سرشار رہ کر اس نے اپنی قومی زندگی کے ستون کو اسلامی مرکز ثقل سے بہت پرے ہٹا دیا ہے۔ بلاخوف تردید میرا یہ دعوا ہے کہ دنیا کی کسی قوم نے ایسی اعلا اور قابل تقلید مثالیں اپنے افراد میں پیدا نہیں کیں جیسی ہماری قوم نے، لیکن بہ ایں ہمہ ہمارے نوجوان کو، جو اپنی قوم کی سوانح عمری سے بالکل نابلد ہے، مغربی تہذیب کے مشاہیر سے استحساناً اور استشہاداً رجوع کرنا پڑتا ہے۔ عقلی و ادراکی لحاظ سے وہ مغربی دنیا کا غلام اور یہی وجہ ہے کہ اس کی روح اس صحیح القوام خودداری کے عنصر سے خالی ہو چکی ہے، جو اپنی قومی تاریخ اور قومی لٹریچر کے مطالعہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ہم نے اپنی تعلیمی

جد وجہد میں اس حقیقت پر ، جس کا اعتراف تجربہ آج
ہم سے کرا رہا ہے ، نظر نہیں ڈالی کہ اغیار کے تمدن کو
بلا شارکت احدے اپنا ہر وقت رفیق بنائے رکھنا ، گویا اپنے
تئیں اس تمدن کا حلقہ بگوش بنا لینا ہے ۔ یہ وہ حلقہ بگوشی
ہے ، جس کے نتائج کسی دوسرے مذہب کے دائرے میں
داخل ہونے سے بڑھ کر خطرناک ہیں ۔ کسی اسلامی مصنف
نے اس حقیقت کو مولانا اکبر سے زیادہ واضح طور پر بیان
نہیں کیا ، جو نئی نسل کے مسلمانوں کی موجودہ عقلی زندگی
پر ایک غائر نظر ڈالنے کے بعد حسرت آفریں لہجہ میں پکار
اٹھتے ہیں :

شیخ مرحوم کا یہ قول مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

شیخ مرحوم کنایہ ہے ٹھیٹھ اسلامی تہذیب کے اس قدامت
انتساب ، نام لیوا سے ، جو مغربی تعلیم کے بارے میں سرسید
احمد خان مرحوم کے ساتھ مدت العمر جھگڑا کیا ۔ آج ہمیں
معلوم ہوتا ہے کہ بےچارے شیخ کا خوف بے بنیاد نہ تھا ۔
کیا اب بھی کسی کو اس میں کلام ہے کہ شیخ مرحوم کے
قول میں سچائی کا جو شائبہ مضمر ہے اس پر ہماری تعلیم
کا ماحصل زندہ گواہ ہے ۔ ۔

مجھے رہ رہ کر یہ رنج دہ تجربہ ہوا ہے کہ مسلمان طالب
علم ، جو اپنی قوم کے عمرانی ، اخلاقی اور سیاسی تصورات
سے نابلد ہے ، روحانی طور پر بمنزلہ ایک بے جان لاش کے
ہے اور اگر موجودہ صورت حالات اور بیس سال تک قائم رہی
تو وہ اسلامی روح جو قدیم اسلامی تہذیب کے چند علم
برداروں کے فرسودہ قالب میں ابھی تک زندہ ہے ، ہماری
جماعت کے جسم سے بالکل ہی نکل جائے گی[۲۲]

س لیے اقبال کی سوچی سمجھی رائے تھی :

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف ۲۳

اپنے عہد کے تعلیمی نظام پر اقبال نے اس بنا پر بھی تنقید کی ہے کہ

اس نے مشرق خصوصاً برصغیر میں لادینی اور بے یقینی کو رواج دیا ہے۔ اس تعلیم کی بدولت بدن ترو تازہ ، مگر روح افسردہ ہو جاتی ہے ، ذہن جلا پا جاتا ہے ، لیکن دل بے نور رہتا ہے ، عقل متحرک و فعال ہو جاتی ہے، عشق و محبت کے جذبات خفتہ و مردہ ہو جاتے ہیں ۔اقبال نہ تو علم کے خلاف ہیں اور نہ عقل کے بلکہ دونوں کو زندگی کے ارتقا کا باعث قرار دیتے ہیں ، لیکن وہ ان پر کلی انحصار کے قائل نہیں ہیں۔وہ علم و عقل کے ساتھ ساتھ فقر و عشق کی اہمیت بھی واضح کرتے ہیں اور ان سب کے امتزاج پر زور دیتے ہیں ، کیونکہ :

علم کا مقصود ہے پاکیِ عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عفت قلب و نگاہ ۲۴

علم بے عشق است از طاغوتیاں
علم با عشق است از لاہوتیاں ۲۵

عشق کی تیغ جگر دار اڑا لی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی ۲۶

اقبال نے فقر اور عشق کے بغیر علم و خرد کی کار فرمائی کا مشاہدہ مغربی معاشروں میں کیا تھا۔ان معاشروں میں اختیار و اقتدار کی ہوس اور مال و زر کی حرص نے غلبہ پا رکھا تھا۔ان کی حکومتیں اور سیاسی تنظیمیں توسیع پسندانہ حکمت عملی پر عمل کر رہی تھیں۔مغربی طاقتوں نے مشرقی ملکوں کو استحصالی ہتھکنڈوں کا نشانہ بنا رکھا تھا۔اکثر مسلمان ملک مغربی طاقتوں کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے گئے تھے اور یہ طاقتیں بڑی ہوشیاری سے ان ملکوں کے عوام کو ان کی تہذیبی و ثقافتی قدروں سےمحروم کرنے میں مصروف تھیں۔اقبال نے اہل مشرق کو بیدار کیا اور انہیں یورپ کی سازشوں سے آگاہ کیا اور بتایا کہ یورپی تہذیب سے مرعوب ہونے میں سراسر نقصان ہے ، کیونکہ اس تہذیب کا ظاہر روشن ہے اور باطن تاریک ہے۔ اس میں خود غرضی کی حکمرانی ہے ، ظلم و ستم عام ہے ،ہمدردی و دردمندی کا فقدان ہے ۔اقبال کہتے ہیں :

یورپ میں بہت روشنیِ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
یہ علم یہ حکمت یہ تدبّر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات

بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کی فتوحات
جو قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہے محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات ۲۷

یہاں ایک بڑا اہم سوال پیدا ہوتا ہے - اور وہ یہ ہے کہ پھر ہمارا رویّہ مغربی علوم کے متعلق کیا ہونا چاہیے؟ اس سلسلے میں سب سے پہلی بات تو یہ جان لینی چاہیے کہ جدید علوم کی بنیاد تین اصولوں پر ہے: ایک مشاہدۂ فطرت، دوسرے استقرائی طرز استدلال اور تیسرے تجربی طریق پر۔ ان اصولوں کی مدد سے موجودہ سائنس نے فطرت کی تسخیر کی مہم کا آغاز کیا اور اس میں نمایاں کامیابی حاصل کی - اقبال قرآن کی روشنی میں ان تینوں اصولوں کے قائل ہیں - قرآن حکیم میں جگہ جگہ مشاہدہ کائنات اور تجربہ کے علاوہ تدبر و تفکر پر زور دیا گیا ہے - اور اس قرآنی تعلیم کے زیر اثر مسلمانوں نے سائنسی علوم و فنون میں ترقی کی - مسلمانوں کے علمی و سائنسی کارناموں کا اعتراف خود اہل مغرب نے بھی کیا ہے - اور یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ اگر مسلمان تجربہ و مشاہدہ کو علم و فن کے میدان میں رواج نہ دیتے تو جدید سائنس کی ترقی مشکوک اور مشتبہ ہو کر رہ جاتی - اس لیے بجا طور پر یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ علوم و فنون کے بانی مسلمان ہیں اور موجودہ سائنسی ترقیوں کی راہ ہمارے اسلاف نے ہموار کی تھی - اقبال کی سوچی سمجھی رائے ہے کہ حکمت اشیا یعنی سائنس، فرنگی زاد نہیں مسلم زاد ہے - یہ ہمارے اسلاف کا ورثہ ہے - اس لیے اگر ہم ان علوم کو حاصل کرتے ہیں تو گویا اپنی ہی کھوئی ہوئی متاع کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

حکمت اشیا فرنگی زاد نیست
اصل او جز لذتِ ایجاد نیست
نیک اگر بینی مسلمان زادہ است
ایں گہر از دست ما افتادہ است
چوں عرب اندر اروپا پر کشاد
علم و حکمت را بنا دیگر نہاد
دانہ آں صحرانشینان کاشتند
حاصلش افرنگیاں برداشتند

ایں پری از شیشہ اسلافِ ماست
باز صید ش کن کہ او از قافِ ماست

اقبال نے یہی بات نثر میں یوں کہی ہے :

" میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ اسلام مغربی تہذیب کے تمام عمدہ اصولوں کا سرچشمہ ہے - پندرہویں صدی عیسوی میں جب سے کہ یورپ کی ترقی کا آغاز ہوا، یورپ میں علم کا چرچا مسلمانوں ہی کی یونیورسٹیوں سے ہوا تھا - ان یونیورسٹیوں میں مختلف ممالک یورپ کے طلبہ آ کر تعلیم حاصل کرتے اور پھر اپنے اپنے حلقوں میں علوم و فنون کی اشاعت کرتے تھے .... غرض یہ کہ وہ تمام اصول جن پر علوم جدید کی بنیاد ہے مسلمانوں کے فیض کا نتیجہ ہیں۔"

اس لیے مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان علوم و فنون کو سیکھیں کہ مغرب کی ترقی کا اصل راز علمی جستجو ہی میں مضمر ہے - لیکن مسلمانوں نے علوم وفنون کے حصول کے بجائے مغربی رہن سہن کی ظاہری طور پر شوخ اور رنگین چیزیں اپنانے ہی کو سب کچھ سمجھ لیا - اقبال نے مسلمانوں کی اس کوتاہ نظری اور کم فہمی پر نکتہ چینی کی اور انہیں مغربی علوم و فنون سیکھنے کی ترغیب دلاتے ہوئے کہا :

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب
نے ز رقص دختران بے حجاب

نے ز سحر ساحران لالہ رُوست
نے ز عریاں ساق و نے از قطع مُوست

محکمی او را نہ از لادینی است
نے فروغش از خطِ لاطینی است

قوت افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است

حکمت از قطع و برید جامہ نیست
مانع علم و ہنر عمامہ نیست

علم و فن را اے جوان شوخ و شنگ
مغز می باید نہ ملبوس فرنگ۔

اندریں رہ جز نگاہ مطلوب نیست
ایں کلہ یا آں کلہ مطلوب نیست

فکرِ چالاکے اگر داری بس است
طبعِ دراکے اگر داری بس است

جدید علوم و فنون کی اہمیت کا اثبات کرنے کے باجود اقبال ان کی اس خامی کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں کہ ان کی تہ میں لادینی طرز فکر کارفرما ہے۔ ایک طرف مشرق ہے کہ جس نے قرآن کی تعلیم فراموش کر کے مشاہدہ و تجربہ کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا ہے اور دوسری طرف مغرب ہے کہ جس میں مشاہدہ اور تجربہ ہی کو سب کچھ خیال کیا جاتا ہے ۔ مشرق میں مادی دنیا اور زندگی کے تقاضوں اور مغربی میں روحانی اقدار سے انکار کی روش نے دنیا بھر کو افراط و تغریط کی لپیٹ میں لے لیا ہے ۔ ایک مفکر کی حیثیت سے اقبال اس روش کو انسانیت کی تباہی کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں - اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنے علمی نصب العین اور تعلیمی لائحۂ عمل پر قرآن حکیم کی روشنی میں نظرثانی کریں اور روح و مادہ اور دین و دنیا کے امتزاج کی مثبت اور حقیقت افروز کوششوں کا آغاز کریں۔ علامہ اقبال کی تعلیمی فکر کے اس پہلو پر ڈاکٹر سید عبد اللہ یوں اظہار خیال کرتے ہیں :

" تعلیم کی پرانی نہج کے متعلق اقبال کا بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس میں دین کی صحیح روح کے برعکس مشاہدہ کائنات اور تسخیر کائنات سے تعلق رکھنے والے علوم کئی صدیوں سے خارج از تعلیم ہیں اور ستم یہ ہے کہ دین اور سائنس کو دو الگ الگ سلسلہ ہائے علم و عمل خیال کر لیا گیا ہے - پرانے درس میں تعقل کا گزر اگر ہے تو صرف عقل کی حد تک یعنی اس سے تعلق مع التجربہ بالکل خارج ہے۔ اقبال کے تصور تعلیم کا خلاصہ یہ ہے۔ تعلیم کا اصل مقصد تسخیر حیات کی استعداد کو تقویت دینا ہے ، اور حیات چونکہ کل ہے جس کے مختلف اجزا کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا، اس لیے اس کا تصور امتزاجی (SYNTHETIC) ہونا چاہیے- یعنی اس میں روح اور بدن کا جھگڑا نہیں اٹھنا چاہیے-

اس طرح اس میں خدا ، کائنات اور انسان کو ایک کلی نظام کی حیثیت سے دیکھنا ضروری ہے - پھر چونکہ تعلیم کا موضوع نفس انسانی ہے ، اس لیے انسانی قویٰ کو تن اور من کے انداز سے نہیں سوچا جانا چاہیے ، کیونکہ تن اور من کوئی الگ حقیقتیں نہیں بلکہ یہ ایک ہی حقیقت کے مختلف رشتے اور سلسلے ہیں ، اس لیے تعلیم ایسی ہو جو تن اور من دونوں پر نظر رکھے - اس طرح مادہ اور روح کی تفریق بھی اقبال کے نزدیک غلط ہے ، کیونکہ ان کے نزدیک روح مادے ہی کی ایک نورانی حقیقت ہے اور مادے کے بغیر روح کا تصور یا تعقل ممکن ہی نہیں ، اس لیے محض مادی یا محض روحانی اساسِ تعلیم ناقص اور غلط ہے - اقبال کے نزدیک تعلیم کی غایت نفس انسانی کو تسخیر کائنات کے لیے تیار کرنا ہے اور اس غرض کے لیے ایسے افراد فائق پیدا کرنا ہے جو صالح سے صالح تر معاشرہ کی تخلیق کر سکیں - اس کے لیے تقویت خودی کی ضرورت بنیادی ہے - مگر یہ خودی وہ جو انفرادیت (INDIVIDUALITY) کی یکتائی (UNIQUENESS) سے لے کر ساری خدائی کی آفاقیت (UNIVERSALITY) تک پھیلی ہوئی ہے - یہ مقامیت اور خصوصیت کو آفاقیت اور عمومیت سے ہمکنار کرسکتی ہے"-

---

حوالے

۱ - ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ، اقبال کا ذہنی ارتقا ، مکتبہ خیابان ادب لاہور ، جنوری ۱۹۷۸ - ص ۱۳

۲ - محمد حنیف شاہد ، مفکر پاکستان ، سنگ میل پبلی کیشنز ، لاہور ، ۱۹۸۲ء - ص - ۷۸ - نیز ص ۱۰۳

۳ - ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ، کتاب مذکور - ص - ۲۷

۴ - محمد حنیف شاہد ، کتاب مذکور - ص - ۱۲۸

۵ - ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ، کتاب مذکور - ص ۸۹ - ۹۰

۶ - محمد حنیف شاہد ، اقبال اور انجمن حمایت اسلام ، کتب خانہ انجمن حمایت اسلام ، لاہور ۱۹۷۶ - ص - ۱۷۳ - ۱۸۲

۷ - مفکر پاکستان ، ص - ۵۸۹ - ۵۹۰

۸ ۔ سید عبد الواحد معینی ومحمد عبد اللہ قریشی (مرتبین) مقالات اقبال ، آئینہ ادب لاہور ۔ بار دوم ، ۱۹۸۲ ۔ص ۔ ۲۲
۹ ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے مفکر پاکستان ، ص ۔ ۱۷۸ ۔ ۱۸۸
۱۰ ۔ بشیر احمد ڈار (مرتب) انوار اقبال ، اقبال اکادمی لاہور ، طبع دوم ۱۹۷۷ء ص ۔ ۲۱ ۔ ۲۵
۱۱ ۔ محمد رفیق افضل، (مرتب) گفتار اقبال ،ادارہ تحقیقات پاکستان ودانشگاہ پنجاب ، لاہور ۔ ۱۹۶۹ ۔ص ۔۳
۱۲ ۔ سید عبد الواحد معینی و محمد عبد اللہ قریشی ، ص ۔ ۹۳
۱۳ ۔ محمد رفیق افضل ، کتاب مذکور ۔ ص ۔ ۱۰۲
۱۴ ۔
۱۵ ۔ کلیات اقبال ، اردو ، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ،اشاعت دوم جنوری ۱۹۷۵ ۔ص ۔ ۵۳۹
۱۶ ۔ ایضاً ، ص ۔ ۳۵۶
۱۷ ۔ ایضاً ، ص ۔ ۵۲۶
۱۸ ۔ ایضاً ، ص ۔ ۳۶۷
۱۹ ۔ ایضاً ، ص ۔ ۳۳۸
۲۰ ۔ ایضاً ، ص ۔ ۵۲۶
۲۱ ۔ ایضاً ، ص ۔ ۲۲۸
۲۲ ۔ سید عبد الواحد معینی ومحمد عبد اللہ قریشی ،کتاب مذکور ۔ص ۔۱۷۲ ۔ ۱۷۳
۲۳ ۔ کلیات اقبال ، اردو ، ص ۔ ۵۲۶
۲۴ ۔ ایضاً ، ص ۔ ۳۶۹
۲۵ ۔ کلیات اقبال ،فارسی ،شیخ غلام علی اینڈ سنز ،لاہور،اشاعت سوم ،مارچ ۱۹۷۸ ۔ص ۔۶۶۳
۲۶ ۔ کلیات اقبال ، اردو ، ص ۔ ۳۰۲
۲۷ ۔ ایضاً ، ص ۔ ۱۰۷ ۔ ۱۰۸
۲۸ ۔ کلیات اقبال ، فارسی ، ص ۔ ۳۸۰
۲۹ ۔ سید عبد الواحد معینی و محمد عبد اللہ قریشی ،کتاب مذکور، ص ۔ ۲۳۹ ۔ ۲۴۰
۳۰ ۔ کلیات اقبال ، فارسی ، ص ۔ ۱۷۸
۳۱ ۔ ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ ، مسائل اقبال ،مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور ، مئی ۱۹۷۴ ۔ص ۔ ۱۸۱ ۔ ۱۸۲

سرصاحبزادہ عبدالقیوم

فلسفۂ تعلیم

جناب پروفیسر پریشان خٹک

صاحبزادہ عبدالقیوم کو عموماً سرسید سرحد" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ انہوں نے سرسید احمد خان ہی کی طرح پٹھانوں کی تعلیمی اصلاحات کے لیے پُر خلوص اور انتھک کوشش کی ہیں۔ ان دونوں شخصیتوں میں جہاں بہت زیادہ قدریں مشترک ہیں وہاں ایک خاص قسم کا فرق بھی ہے۔ سرسید کے سامنے پورے برصغیر کے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کا سوال اگرچہ تھا، لیکن ان کا فلسفہ تعلیم ایک خاص پس منظر رکھتا ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں میں تعلیم کا فقدان اتنا شدید نہ تھا بلکہ ایک خاص قسم کا دینی شعور تھا جسے وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنا تھا۔ برصغیر میں علی گڑھ مسلم کالج سے پہلے بھی دینی درسگاہیں تھیں جو بڑے ذوق شوق سے دین اسلام کی اشاعت کا کام سرانجام دے رہی تھیں، لیکن سر سید کے خیال میں صرف دینی تعلیم مسلمانوں کی ترقی کیلیے کافی نہ تھی۔ وہ اسلامی تعلیم کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے۔ اگرچہ بنیادی عقائد اور اصولوں سے وہ متفق نظر آتے تھے، لیکن جس قسم کی توہم پرستی کا رجحان عام تھا سر سید اس رجحان کو بدلنا چاہتے تھے۔ ان کا فلسفہ تعلیم اس بات کا متقاضی تھا کہ مسلمان اوہام کو چھوڑ کر اپنے دین کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں سائنس حقائق کو دیکھ سکیں۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ایک زبردست تعلیمی جہاد کا اعلان کیا اور علی گڑھ مسلم کالج کی بنیاد رکھی۔

سرسید کو جس طرح سمجھا گیا اس میں سیاسی مضمرات ضرور ہوں گے، لیکن زیادہ تر ان کی مخالفت مسلمانوں نے اسلامی اصولوں کے مطابق کی۔

اب اگر صاحبزادہ عبدالقیوم کی ان کاوشوں کو دیکھا جائے جو انہوں نے پشتونوں کی تعلیم کے سلسلے میں کیں تو صورتِ حال کی مطابقت پائی جاتی ہے، لیکن پس منظر میں نمایاں فرق بھی نظر آتا ہے۔ وہ فرق ماحول کا ہے۔ اسلامیہ کالج اور علی گڑھ مسلم کالج میں "اسلامیہ" اور "مسلم"

کا اشتراک اگرچہ ایک ہی قدر کی نشاندہی کرتا ہےاور یہ حقیقت ہے کہ دونوں نے کفرستان میں اسلام کے نام کا علم بلند کیا پھربھی جو فرق مجھے نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ صاحبزادہ عبدالقیوم نے جن حالات میں اسلامیہ کالج کی بنیاد رکھی وہ حالات ہندستان کے حالات سے قدرے مختلف تھے ۔ شخصیت کے لحاظ سے صاحبزادہ عبدالقیوم کی شخصیت سیاسی طور پر متنازعہ تھی، لیکن ان کےاس اقدام کو یہاں پر جس طرح سراہا گیا وہ ایک تاریخی اور خوشگوار واقعہ ہے ۔

سرسید کے برعکس صاحبزادہ عبدالقیوم کے سامنے ایک ایسا ماحول تھا جسمیں عقیدے کے لحاظ سے ہر فرد ایک مضبوط مسلمان تھا اور انگریزوں کے ہر اقدام کو وہ شک کی نظر سے دیکھا کرتا تھا ۔ یہاں تک کہ انگریزوں کے بنائے ہوئے سکولوں میں وہ تعلیم حاصل کرنا گناہ سمجھتے تھے ۔ اور اس زمانے میں تقریباً ہر پشتون یہ شعر گایا کرتا تھا کہ :

سبق د مدرسے وائی دپارہ د پیسے وائی
جنّت کنے بہ ئے ځائے نہ وی په دوزخ کنے بہ گسے وہی

ترجمہ : جو سکول میں سبق پڑھتا ہے وہ پیسے کے خاطر پڑھتا ہے
اس لئے جنّت میں ان کی کوئی جگہ نہیں دوزخ میں گھسیٹے
جائیں گے ۔

پھر بھی جب صاحبزادہ عبدالقیوم نے سر روس کیپل کی معیت میں اسلامیہ کالج بنانے کا اعلان کیا تو ہر مکتب فکر کی جانب سے اس کا خیر مقدم کیا گیا ۔ یہانتک کہ انگریزوں کے سب سے بڑے دشمن اور مفرور مجاہد حاجی صاحب ترنگزئی نے اس کا سنگ بنیاد رکھا اور کالج کے نشان (INSIGNIA) پر " رب زدنی علما " رقم کیا گیا ، جوکہ اب تک پشاور یونیورسٹی کی پہچان کا کلمہ ہے ۔

اب صاحبزادہ عبدالقیوم جو کہ حقیقت میں انگریزوں کے ملازم تھے اور اسی مشکوک حاکم کے تعاون سے بنائے گئے اسلامیہ کالج کی تعمیر میں یہاں کے پشتونوں نےاس سرگرمی سے کیوں حصہ لیا اور کیوں اتنے خطیر عطیے دیے ؟ تعلیم کے میدان میں پشتونوں نےاس شخص پر اتنا بھرپور اعتماد کیوں کیا ؟ ان کو اپنی زمینیں عطیے کے طور پر کیوں دیں جن کو وہ ووٹ نہ دے سکے ؟ اسلیے کہ پشتون فطری طور پرایک مضبوط عقیدے کا مالک ہےاوراسے یہ ڈر نہیں ہے کہ کسی ڈپلومیٹک مشن کے ذریعہ سے ان کے عقیدے کو متزلزل کیا جاسکے گا ۔ یہیں پر وہ فرق نظر آتا ہے جو سرسید اور صاحبزادہ سر عبدالقیوم کے ماحول میں موجود تھا ۔ پھر بھی صاحبزادہ

عبد القیوم کا جہاد سرسید ہی کے راستے کی تکمیل ہے ، اس لیے کہ سرسید تعلیم کے ذریعہ سے مسلمانوں کا حال بدلنا چاہتے تھے اور یہی بات صاحبزادہ عبد القیوم کے پیش نظر بھی تھی -

صاحبزادہ عبد القیوم کے سامنے ایک ایسی قوم کو تعلیم دینا تھا جو اپنے عقیدے کے لحاظ سے قوی تھی، لیکن تعلیم و ترقی کے لحاظ سے نہایت کمزور - اب اگر علامہ اقبال اس خطّے کے لوگوں سے اتنی بڑی توقعات رکھتے تھے تو ان کی رسا فکر و نظر میں ان کے اصلی اسلامی تشخص کی استواریت اور استقامت تھی - اور حال گواہ ہے کہ جب صاحبزادہ عبد القیوم نے ان لوگوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا تو بہت جلد انہوں نے اپنے اسلامی تشخص کو پہچان لیا اور تحریکِ آزادی میں ان کا حصہ اور پاکستان بنانے میں ان کی جدوجہد کے آئینے میں وہی چیز نظر آتی ہے جو صاحبزادہ عبد القیوم دیکھنا چاہتے تھے -

اس مختصر سی تاریخ میں صاحبزادہ عبد القیوم کا وہ فلسفۂ تعلیم نظر آتا ہے جس کے پیش نظر انہوں نے اسلامیہ کالج کی بنیاد رکھی تھی - جو قدر سرسید اور صاحبزادہ عبد القیوم میں مشترک ہے وہ ان دونوں کا جدید اسلامی نظریۂ تعلیم ہے - ان کے فلسفے میں یہ راز پوشیدہ تھا کہ اس برصغیر کی صدیوں سے زنگ آلود اور اپنے آپ سے غافل قوم میں ایک ایسی فولادی قوت موجود ہے جس کو اگر تعلیم سے صیقل کیا جائے تو ان کے تشخص کی چمک سے اغیار کی آنکھیں چندھیا سکتی ہیں - سائنس ترقی کے اس زمانے میں ان کا زاویۂ نظر بدلنا ہوگا اس لیے کہ ان مسلمانوں پر غفلت کا جو پردہ پڑا ہوا تھا وہ تاریخ کی ایک افیونی تاثیر تھی - وہ ماضی کے نشے میں ایسے دھت تھے کہ بیسویں صدی کے سائنسی حقائق کو وہ نہ دیکھ سکے - مزید برآں مذہب ان کے لیے جاہلیت کے سبب یک وہم بنا یا گیا تھا - اس لیے ان کے عقائد میں وہم کی ایسی پیچیدگی (COMPLEXITY) شامل ہوگئی تھی جس نے تقریباً تقریباً ان کے ذہن کو مفلوج کر رکھا تھا - ان غازیوں نے جس حکمت سے ان ذہنوں کا علاج کیا اور ان کے جسم میں زندگی کی جو حرارت پیدا کی اس کے بدولت انہوں نے ایک اسلامی ریاست کے حصول کا کارنامہ تو سر انجام دیا، لیکن شاید وہ مرض کا تشخیص کے باوجود پورا علاج نہ کرسکے تھے یا یہ خود مکمل علاج کرنا برداشت نہ کرسکے - اسلیے ایک آزاد اسلامی مملکت میں پھر سے وہی جراثیم پھیلنے شروع ہو گئے اور رفتہ رفتہ اس مرض نے پھر سے شدت اختیار کی - یہ کیوں ؟ اس لیے کہ ذاتی امراض اور بین الاقوامی سیاسی مفادات نے ہمارے نظام تعلیم کو ہمارے اسلامی تشخص سے دور کردیا ہے - اب بھی ہمارے سامنے وہی صورت حال ہے جو غلامی کے

دنوں میں صاحبزادہ عبدالقیوم اور سرسید کے سامنے تھی ۔ اس صورت حال کو پھر سے نظام تعلیم کے ذریعہ سے اس طرح بدلنا ہوگا کہ ہمیں علم کا صحیح مفہوم معلوم ہوجائے ۔ اب تک ہم یہ سمجھتے رہے ہیں کہ شاید علم صرف نامعلوم کو معلوم کرنا ہے۔ ہمیں مقصدیت کا کوئی واضح مفہوم معلوم نہیں ہے اگر علم کی مقصدیت کا مفہوم معلوم ہوجائے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم پسماندگی اور اوہام کی تاریکیوں سے نکل جائیں ۔ ہمارے نظام تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ علم کو ہم ایک بنیادی عقیدے کے طور پر اپنائیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد مبارک کے مطابق دنیا و کائنات کو اس طرح مسخر کرسکیں کہ ہمیں علم کے حصول کے راستے میں وہم کی کوئی پابندی یا رکاوٹ نظر نہ آئے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "علم حاصل کرو خواہ اس کے لیے تمہیں چین تک سفر کرنا پڑے" - اور ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ علم مسلمانوں ہی کی میراث ہے ۔ تو آیا اس علم سے مراد صرف دینی درسگاہوں میں عبادات کے طور طریقے جاننا ہے یا ہمیں ایک سالمے یا جوہر میں وہ توانائی بھی ڈھونڈنی ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کا مظہر ہے ۔ اگر ہم اپنے مضبوط عقیدے کے ساتھ ایٹم کے نیوکلیس میں اتر جائیں اور اس توانائی کو اپنے دین اسلام ، جس کے معنی امن و سلامتی کے ہیں ، کے لیے حاصل کریں تو یہ ہماری علمیت کا مقصد ہونا چاہیے ۔

اگر تعلیم سے مراد علم کا حصول ہے تو پھر علم پر پابندی کا مقصد کیا ہے ؟ ہمیں اپنے نظام تعلیم کے ذریعہ سے ایک ایسی فضا قائم کرنے کی ضرورت ہے جہاں ہر فرد دینی ، ذہنی ، اخلاقی اور جسمانی ترقی حاصل کرے ۔ اس طرح ہم ایک ایسے صحت مند معاشرے کو جنم دے سکیں گے جس کے ذریعہ سے ہم اپنے افراد کو خیال کی وہ وسعت دے سکتے ہیں جس سے ہم ایٹم کے نیوکلیس سے لیکر آسمان کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی کائنات کے کونے کونے تک نگاہ دوڑا سکیں ۔ اس طرح صاحبزادہ عبدالقیوم کا وہ مقصد پورا ہوجائے گا جو مسلمانوں کو تنگ نظری اور تعصب کے غاروں سے نکالنا چاہتے تھے اور جن کے پیش نظر تعلیم کا مقصد صرف جینے کے طور طریقے سیکھنے کا نام نہیں ہے بلکہ انسانیت کی تکمیل اور زندگی کی ارتقا کی ذمہ دار بھی ہماری تعلیم ہے، اس لیے کہ دوسری اقوام صرف مادی ترقی کے ذریعہ سے اگر دنیا پر غلبہ پا سکتی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ایک ایسے نظام تعلیم کے ذریعہ سے دنیا کو مسخر نہ کرسکیں جو مادہ کے علاوہ روح کے نشو و نما اور صحت کی بھی قائل ہے ۔ مادی ترقی کے ساتھ ساتھ اگر ہم روحانی اقدار کا بھی خیال رکھیں تو اس خطرناک تجارتی فکر (COMMERCIALIZATION) سے نکل سکتے ہیں جو صرف ذاتی اغراض کی

وجہ سے بڑی تیزی کے ساتھ فروغ پا رہی ہے - ہمیں نوجوان نسل کو یہ تعلیم دینی ہوگی کہ خود کو پہچاننے کا راز اس میں ہے کہ ذات کے چکر سے نکل جائیں اور اس میں یقین کریں کہ ایک مضبوط اسلامی ثقافت کی تعمیر کے لیے بنیادی ضرورت اسلامی اخوت کی ہے - اس اخوت میں یہ فلسفہ پوشیدہ ہے کہ ہم دیانتداری اور خلوص کے ساتھ ایک مشترک اسلامی کاز کے لیے سرگرم ہوں تاکہ دنیا کو وہ امن دے سکیں جس کے لیے ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھیجے گئے تھے -

تعلیماتِ نبوی کی روشنی میں
سیّد مودودی کے تعلیمی نظریات

جناب سیّد اسعد گیلانی

اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے لیے انبیاء کرام کو معلمین انسانیت بنا کر بھیجا اور ان کا یہی فریضہ تھا کہ وہ بنی نوع انسان کو اس دنیا میں فلاح کی زندگی گزارنے کے لیے ہدایت کی تعلیم دیں اور صراط مستقیم کی نشاندہی کریں۔ انسان کو دنیا میں اشرف المخلوقات کے اخلاقی اور نظریاتی معیار کے مطابق زندگی گزارنے کا طریقہ سکھائیں۔ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے وہ اصول مہیا کریں جن پر عمل پیرا ہو کر انسان دنیا میں فلاح اور آخرت میں نجات حاصل کر سکیں۔

رسول اکرمؐ انسانیت کے معلم

رسول اکرمؐ خاتم النبیّین ہونے کی حیثیت سے قیامت تک انسانیت کے معلم ہیں اور معیاری انسان بننے کے لیے بنیادی اصول انہی کی تعلیمات سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ نبی کریمؐ ایک بار مسجد نبوی میں تشریف لائے تو آپ نے وہاں صحابہ کرامؓ کے دو حلقے دیکھے۔ ایک گروہ ذکر و اذکار اور اوراد و وظائف میں مشغول تھا اور دوسرا گروہ درس و تدریس میں مصروف تھا۔ آپ یہ کہہ کر کہ "انما بعثت معلماً" مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے" درس و تدریس کے علمی حلقے میں بیٹھ گئے۔

یہ بات اہل علم پر واضح ہے کہ حضور اکرمؐ نے پوری انسانیت کو علم راسخ سکھایا ہے۔ وہ حقیقی علم جس کے بغیر انسان دنیا میں انسانیت کی معیاری زندگی گزارنے سے قاصر رہتا ہے۔ آپ نے ایک کامل نظام زندگی انسانیت کے لیے مہیا فرمایا ہے جو انفرادی طہارت و نظافت کی تعلیم سے لے کر بین الاقوامی تعلقات کے دائرے تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ تو ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ دینِ اسلام عالم انسانیت کا جامع ترین نظامِ حیات ہے اور اس کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے سے ہی انسانیت کے پیچیدہ جملہ مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

رسولِ اکرمؐ کی نظرمیں علم کی اہمیت و فضیلت

رسولِ اکرمؐ نےعلم و تعلیم کے بارے میں جو ارشادات فرمائے ہیں وہ پوری انسانیت کی رہنمائی کے لیے درخشاں موتیوں کی طرح آج بھی ہمارے سامنے موجود ہیں -

فرمایا: " علم سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ۔" (بیہقی)

"ہر مسلمان مرد و زن پر علم سیکھنا فرض ہے۔"(بیہقی)

" ماں کی گود سے قبر کے آغوش تک علم حاصل کرو۔"(مشکوٰۃ)

احترامِ استاد کے بارے میں آپ نے فرمایا :

" جس سے علم سیکھو اس کی عزت کرو۔" (ترمذی)

" طالب علم کےلیے فرشتے اس کے قدموں پر اپنے پَر بچھاتے ہیں "۔(ابو داؤد)

عبادت پر علم کی فضیلت بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا: "عابد پر عالم کی فضیلت ایسی ہے جیسی چودھویں رات کے چاند کی ستاروں پر۔"(ترمذی)

مزید فرمایا: " علم میں اضافہ کرنا عبادت کی کثرت سے افضل ہے۔"(بیہقی)

علم کے حصول کا مقصد بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا :

" علم سیکھنے کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہے۔"(ابوداؤد)

چنانچہ علم کے فروغ کےلیے خود رسول اکرمؐ نے مکہ مکرمہ میں "دار ارقم" میں علم دین سکھانے کی پہلی درس گاہ قائم فرمائی۔ اپ نے والدین کو بھی یہی حکم دیا کہ وہ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کا بہتر انتظام کریں -

آپ نے فرمایا:" اولاد کےلیےوالدین کا بہترین تحفہ اچھی تعلیم دلوانا ہے۔"

اشاعتِ علم کے لیے رسول اکرمؐ کا اہتمام

رسول اکرمؐ نے بیعت عقبہ اولیٰ کے بعد حضرت مصعب بن عمیر کو معلم بنا کر مدینہ ارسال کیا جن کی تبلیغ و تعلیم سے مدینہ کے بے شمار لوگ مسلمان ہوئے۔ پھر جب خود رسول اکرمؐ مدینہ تشریف لائے تو تعلیم دین کے لیے مسجد نبوی تعمیر فرمائی۔ اس میں اصحاب صفہ کی درس گاہ قائم کی، صحابہ کرامؓ کو تعلیم دینے کے لیے روزانہ مجالس کا اہتمام فرمایا۔ سوالات و جوابات

کے ذریعے علم سکھانے کی بنیاد رکھی۔ مبلغین و معلمین کے وفود بنا بنا کر مختلف علاقوں اور قبائل میں بار بار ارسال کیے۔ علم ریاضی، علم طب، علم وراثت، علم تجوید اور فن خطاطی سیکھنے کے لیے مسلسل حوصلہ افزائی فرمائی۔ جنگی فنون سیکھنے سکھانے کا اہتمام فرمایا۔ قرآن کا علم سکھایا اور اسے سیکھنے کی ترغیب دی۔ خواتین میں علم پھیلانے کا اہتمام فرمایا اور ان کو علم دین سکھانے کے لیے ازواج مطہرات اور دیگر خواتین کو مقرر فرمایا۔ غرض رسول اکرم ؐ نے انسانیت کو ایک ایسا دین دیا جو سراسر علم و فضل پر مبنی تھا اور زندگی کے ہر شعبے سے جہالت اور جاہلیت کو دور کرتا اور علم کی شمع سے زندگیوں کو منور کرتا تھا۔ اسلام کے اس تعلیمی مزاج کو سامنے رکھ کر رسول اکرم ؐ کے نظام تعلیم کے دیے ہوئے خطوط کی روشنی میں امت مسلمہ کے اندر تعلیمات اسلامی و اخلاقی کا ایک ترقی پذیر سلسلہ قائم ہوگیا۔ مسلمانوں نے تعلیم کے میدان میں ہمہ پہلو اتنی ترقی کی کہ وہ علم وعمل میں قوموں کے رہنما اور امام بن گئے۔ دورِ زوال میں بھی مسلمانوں کی صفوں میں ایسے عظیم انسان پیدا ہوتے رہے جو اسلامی تعلیمات کو تیز تر کرنے کی جد وجہد کرتے رہے، چنانچہ سید ابوالاعلیٰ مودودی بھی دور حاضر میں اسی قیمتی سلسلے کی ایک سنہری کڑی ہیں۔

دور حاضر میں سید مودودی کی منفرد آواز

ہمارے اس دور میں سید مودودی کی آواز مکمل تعلیمی انقلاب کے لیے اٹھنے والی بہت بلند اور منفرد آواز ہے۔ انہوں نے اسلام کو جہاں زندگی کا جامع اور کامل نظام ثابت کیا وہاں تعلیم اور نظریۂ تعلیم کے بارے میں بھی اپنے خیالات کا کھل کر اظہار کیا۔ وہ اپنے نظریات میں ایک نئے نظام تعلیم کے داعی تھے۔

سید مودودی کا تصورِ تعلیم

سید مودودی کا تصور تعلیم یہ ہے کہ وہ ہر نظام تعلیم کو کسی نہ کسی تہذیب کا خادم اور ترجمان شمار کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اپنی تہذیب کے احیاء کے لیے اٹھے وہ نظام تعلیم سے تعرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ مسئلۂ تعلیم پر تہذیبی نگاہ ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> " ہر یونیورسٹی کسی کلچر کی خادم ہوتی ہے۔ ایسی مجرد تعلیم جو ہر رنگ اور ہر صورت سے خالی ہو نہ آج تک دنیا کی کسی درس گاہ میں دی گئی ہے اور نہ آج دی جارہی ہے۔ ہر درس گاہ کی تعلیم ایک خاص رنگ اور ایک خاص صورت میں ہوتی ہے اور اس رنگ و صورت کا انتخاب پورے غور و فکر کے

بعد اس مخصوص کلچر کی مناسبت سے کیا جاتا ہے جس کی
خدمت وہ کرنا چاہتی ہے[1]۔"

ان کی رائے میں اسلام بھی اس دور میں نشاۃ ثانیہ کا داعی ہے ۔ اس نشاۃ ثانیہ کے لیے وہ موجودہ دور میں رائج جدید و قدیم دونوں قسم کے نظام ہائے تعلیم کو ازکار رفتہ اور بوسیدگی کا شکار محسوس کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ دونوں قسم کے نظام ہائے تعلیم اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے عمل میں مددگار ہونے کے بجائے رکاوٹ ہیں ۔ اپنی کتاب تعلیمات میں وہ لکھتے ہیں :

"درحقیقت یہ ناگزیر ہو چکا ہے کہ دونوں قسم کے نظام تعلیم ختم کر دیے جائیں جو اب تک ہمارے ہاں رائج ہیں ۔ پرانا مذہبی نظام تعلیم بھی اور موجودہ نظام تعلیم بھی جو انگریز کی رہنمائی میں قائم ہوا تھا ۔ان دونوں کی جگہ ایک نیا نظام تعلیم بنانا چاہیے جو ان دونوں کے نقائص سے پاک ہو اور ہماری موجودہ ضرورتوں کو پوا کر سکے جو ایک مسلمان قوم، ایک آزاد قوم اور ایک ترقی کی خواہش‌مند قوم کی حیثیت سے اس وقت لاحق ہیں[2]۔"

سید مودودی کے تعلیمی نظریات

نظام تعلیم پر بحث سے پہلے وہ بنیادی طور پر اس کائنات کی حقیقت اوراس میں انسان اور مسلمان کی حیثیت کو زیر بحث لاتے ہیں ۔

تصور حقیقت

سید مودودی کی رائے میں یہ نظام کائنات خود بخود نہیں چل رہا ہے بلکہ اسے چلانے والی ایک قوت موجود ہے جسے ہم اللہ کہتے ہیں۔ وہ اس کائنات سے بے تعلق نہیں ہے بلکہ اس کے ذرے ذرے سے اس کا براہ راست تعلق ہے ۔اس کائنات کا ہر کام اس کی رہنمائی میں ہو رہا ہے ۔ انسان کے دائرۂ اختیار کو اس لیے مقرر کیا گیا ہے تاکہ وہ اس دائرے میں اپنا منصبی امتحان دے ۔ امتحان یہ ہے کہ انسان اپنے آزاد دائرہ اختیار میں بھی اپنی آزاد مرضی سے خدا کے احکام کا پابند ہو۔ اس کی زندگی میں بھی خدا کا ہی حکم چلنا چاہیے ۔ یہی اس کائنات کی حقیقت ہے ۔سید مودودی کا یہ تصور حقیقت ان کی تمام تعلیمات کا سر چشمہ ہے، اور ان کے تصور تعلیم میں بھی یہی حقیقت کار فرما ہے[3] ۔

تصور کائنات

یہ کائنات اللہ کی پیدا کردہ ہے اور یہ ایک عارضی سلسلہ ہے ۔ ایک روز اسے ختم ہو جانا ہے ۔انسان کا تعلق اس کائنات سے صرف طبعی خواہشات کی تکمیل کے لیے ہی نہیں ہے بلکہ یہ کائنات انسان کے لیے مسخر کر دی گئی ہے تاکہ وہ اپنی آزاد کارکردگی سے اپنا نامۂ عمل خود تیار کر سکے ۔اس نامۂ عمل کی آزاد کارکردگی پر اس کی آخرت میں کامیابی و ناکامی کا انحصار ہے ۔ اس لیے اس کے مسئول ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ارادہ و عمل میں آزاد ہو ۔ اس لیے وہ کائنات تو اس کی تابع ہے، لیکن وہ اس کائنات کا تابع نہیں ہے[۴] ۔

تصور انسان

سید مودودی کی رائے میں انسان نہ تو مارکس کے الفاظ میں معاشی حیوان ہے اور نہ ڈارون کے الفاظ میں حیوان طبعی ۔بلکہ وہ زمین پر اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے اور ایک ذمہ دار اور مسئول ہستی ہے جسے اپنے اعمال کا اللہ کے ہاں حساب دینا ہے ۔ اسلام کا انسانِ مطلوب کتاب الٰہی کے صفحات میں درج ہے اور نبی کریم کا اسوہ حسنہ اس کا ماڈل ہے ۔ صحابۂ کرامؓ کی زندگیوں کا نمونہ بھی اس کے لیے بہترین نمونہ ہے ۔ ذمہ دار انسان اخلاقی صفات میں آخرت میں اپنی جوابدہی پر نگاہ رکھنے والا ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں اس میں مسئولیت اور ذمہ داری کا عنصر ابھرتا ہے[۵] ۔

سید مودودی کے نزدیک حقیقت نفس الامری سے آگاہی حقیقی علم ہے اور علوم کی تمام اقسام معرفت الٰہی کا علم اور صفات الٰہی کا علم ہے ۔یہی حقیقی اور بنیادی علوم ہیں ۔ باقی سارے علوم ان کی شاخیں ہیں ان دونوں علوم کے حصول کے بعد ہی انسان صاحبِ علم کہلا سکتا ہے ۔اور اگر وہ ان علوم سے بے بہرہ ہے تو اس کے ہاتھ میں علم کی جڑ اور بنیاد نہیں ہے اس لیے وہ جڑ کو چھوڑ کر محض شاخوں میں الجھا ہوا انسان ہے جو حقیقت سے کبھی آشنا نہیں ہو سکتا[۶] ۔

ذریعۂ علم کا تصور

سید مودودی کی رائے میں حواسِ خمسہ کے ذریعہ سے جو علم بھی حاصل ہو وہ ظنی علم ہے ۔ان کی رائے میں علم حقیقی کا سب سے مستند اور حقیقی ذریعہ علم وحی ہے جس کے ذریعہ سے خالق کائنات اپنے بندوں کو دونوں جہانوں کی زندگی کا علم دیتا ہے اس علم کو حاصل کر کے انسان ٹھیک طریقہ سے اس زمین پر چل سکتا ہے ۔" علم وحی کے بغیر

انسان بگاڑ اور فساد کا شکار ہو جاتا ہے اور اصلاح اور فساد میں امتیاز کرنے سے قاصر رہتا ہے[7]"۔

مقاصدِ تعلیم

ان بنیادی تصورات تعلیم کی وضاحت کے بعد وہ مقاصدِ تعلیم کو اس طرح بیان کرتے ہیں -

تعمیر کردار

ان کی رائے میں تعلیم کا حقیقی مقصد تعمیر کردار ہے جس کے بغیر انسان کا وجود صراط مستقیم پر قائم نہیں رہ سکتا۔ تعمیر کردار کے لیے ہی انبیاء کرام آتے رہے اور اسی مقصد کے لیے نظام ہائے تعلیم مرتب کیے جاتے ہیں - ہر نظام تعلیم کا مقصد ایک مخصوص نوعیت کے کردار کی تشکیل ہوتا ہے اور ایسا نظام تعلیم کوئی نہیں ہوتا جو کوئی کردار بھی تشکیل نہ کرے۔ اس لیے اسلامی نظام تعلیم میں کردار سازی کے عنصر کو اسلام کی ضرورت کے مطابق نشو و نما دینا ناگزیر ہے - جو نظام تعلیم انسانی کردار کو اسلام کے مقاصد کے خلاف تیار کرے یا اس کے مطابق تعمیر نہ کرے وہ اسلامی نظام تعلیم نہیں ہے اور اسے مسلمانوں کے معاشرے میں ایک دن جاری رکھنا بھی اسلامی مقاصد کو شدید نقصان پہنچانے اور مسلمان کو نا مسلمان بنانے کے مترادف ہے[8]۔

پوشیدہ صلاحیتوں کا نشوونما

تعلیم کے مقاصد میں جہاں عرفان الٰہی کا حصول شامل ہے وہاں یہ بھی لازم ہے کہ وہ انسان کی پوشیدہ صلاحیتوں کا نشوونما کرے اور اس کی جبلی اور طبعی صلاحیتوں کو بیدار کر کے بروئے کار لائے تاکہ وہ سوسائٹی کے لیے مفید اور کارآمد فرد اور اجتماعی انسانی زندگی میں پاکیزگی اورفلاح و ترقی کا ذریعہ بن سکے[9] -

تہذیب و ثقافت کا تسلسل

سید مودودی کی رائے میں ہر تعلیم کسی نہ کسی تہذیب و ثقافت کی آئینہ دار ہوتی ہے ، تعلیم کا مقصد کلچر کو زندہ رکھنا بھی ہوتا ہے اور اس کے نشو ونما اورتسلسل کا اہتمام کرنا بھی ہوتا ہے تاکہ وہ آئندہ نسلوں میں منتقل ہو سکے -نظام تعلیم اس تصور حیات کو پوری قوم میں پھیلاتا اور نشوونما دیتا ہے جس تصور حیات کی حامل وہ قوم ہوتی ہے-زندہ قوموں کا شیوہ یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنی تہذیبی اور نظریاتی زندگی کے تسلسل

کو قائم رکھنے کے لیے اپنے لیے اپنی ضروریات کے مطابق نظام تعلیم کو ترتیب دیتی ہیں - نظام تعلیم کی حیثیت ملی سانچے کی سی ہوتی ہے جس میں قوم کا فرد فرد ڈھلتا ہے، اس لیے ملت کے سانچے کا غیروں کی ضروریات کے مطابق نہیں بلکہ خالص اپنی ضروریات اور نظریات کے مطابق ہونا لازم ہوتا ہے[10] -

ملی اخلاق کی تربیت

نظام تعلیم کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ ایسے افراد تیار کرے جو مسلمانوں کی ملی روایات اور اسلامی اصولوں کو اپنے کردار کا جزو بنائیں، اسلام کی بہترین نمائندگی اپنے اقوال و اعمال اور گفتار و کردار میں کریں۔ وہ بہترین اہلیت و صلاحیت کے مالک ہوں اور ملت کی اجتماعی زندگی کو ملی تہذیب و ثقافت کے اسلامی اصولوں کے مطابق چلا سکیں[11] -

تشکیل قیادت ملی

نظام تعلیم کا مقصد ایسے افراد تیار کرنا بھی ہوتا ہے جو دین اسلام کو دور جدید میں قابل عمل اور انسانیت کی رہنمائی کے لیے بہترین نظام زندگی ثابت کریں - گویا نظام تعلیم کا مقصد بہترین بااصول نظریاتی شہری تیار کرنا بھی ہوتا ہے - مسلمان دنیا کی رہنمائی کے لیے ایک گروہ کی حیثیت سے برپا کیے گئے ہیں، اس لیے ان کا نظام تعلیم ایسا ہونا چاہیے جو دنیا کی رہنمائی اور قوموں کی قیادت کی صلاحیتیں پیدا کرنے کی اہلیت رکھتا ہو - اسلام اپنے نظام تعلیم کے ذریعہ سے قیادت انسانیت کے لیے بہترین اور باصلاحیت گروہ تیار کرنا چاہتا ہے جس گروہ میں درج ذیل صلاحیتیں ضرور موجود ہوں -

۱) وہ اپنے اندر قرآن کے انسانِ مطلوب کی صفات رکھتا ہو -

۲) وہ امت وسط کی حیثیت سے اعتدال اور صراط مستقیم پر قائم گروہ ہو اور اس کے ہاتھ میں دینِ حق کی تعلیمات کا رشتہ ہو -

۳) اس کا طرز عمل شکرِ خداوندی اور اطاعتِ الٰہی ہو -

۴) وہ انعامات الٰہی کا شعور، کلماتِ الٰہی کا فہم اور خشیتِ الٰہی کا مسلک رکھتا ہو -

۵) وہ توحید، رسالت اور آخرت کے پختہ عقائد پر قائم اور ان کی روشنی میں معاشرتی زندگی کو استوار کرنے کا سلیقہ رکھتا ہو -

۶) وہ اپنی زندگی میں تکبر اور نخوت کی روش سے اجتناب اور بندگیِ رب

کا اہتمام رکھتا ہو -

۷) وہ امر بالمعروف کو زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنائے اور نہی عن المنکر کو مسلک زندگی - وہ تہذیب و شائستگی کا بھی مثالی نمونہ ہو -

اس مقصد کے لیے سید مودودی نے مملکت کے ذمہ دار لوگوں کے سامنے یہ تجویز پیش کی :

" ضرورت ہے کہ ہم اہلِ علم کے ایک گروہ کو اپنے بزرگوں کے چھوڑے ہوئے ذخیرہ کا جائزہ لینے کے لیے مامور کریں[۱۲]۔" اس لیے کہ دنیا میں جو بھی نظام تعلیم قائم کیا جائے اس میں اولین بنیادی سوال یہی ہوتا ہے کہ آپ کس قسم کے آدمی تیار کرنا چاہتے ہیں اسی ضرورت کے اردگرد نظام تعلیم کا سارا نقشہ گردش کرتا ہے - چنانچہ سید مودودی نے سربراہان ملّت کو متنبہ کرتے ہوئے کُھل کر کہا ، " اللہ کے انعام و آزادی کا یہ صحیح شکر نہیں ہے کہ ہم اپنی نئی نسلوں کو فکر و نظر اور سیرت و کردار کے اعتبار سے مسلمان بنا کر اٹھانے کی کوئی فکر نہ کریں اور ان کو تعلیم و تربیت کی اسی ڈگر پر چلاتے رہیں جس پر ہمارے بیرونی آقا ہمیں ڈال گئے تھے[۱۳]"۔

انہوں نے مزید کہا :

" یہ محض تعلیم کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ہمارے قومی وجود اور اس کی بقا کا مسئلہ ہے - ہم یہاں ایک مسلمان قوم کی حیثیت سے اسی طرح زندہ اور باقی رہ سکتے ہیں کہ ہماری نوجوان نسل جو درسگاہوں میں تیار ہو رہی ہے وہ ٹھیک ٹھیک اسلامی تہذیب کی حامل ہو اور اس کی علمبردار بن کر اس سر زمین پر رہے - میں حتماً اس نتیجہ پر پہنچ چکا ہوں کہ مسلمانوں کے مستقل قومی وجود اور ان کی تہذیب کے باقی رہنے کی اب کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ ان کے طرز تعلیم و تربیت میں انقلاب پیدا کیا جائے[۱۴]"۔

انہوں نے ابتدائی جماعتوں میں اس قسم کا نصاب جاری کرنے کا نقشہ پیش کیا ، جس کے ذریعہ سے مسلمان طلبہ میں حسب ذیل اوصاف تعلیم کے ابتدائی دور میں ہی پیدا کر دیے جائیں تاکہ اعلا جماعتوں تک پہنچتے پہنچتے ان میں ایک ملّی اور اسلامی کردار پختہ ہو جائے اور وہی کردار ان کی عملی زندگی کے مراحل میں کام آئے - یہ کردار ابتدائی جماعتوں میں ہی پیدا کیا جا سکتا ہے - اس کردار کا نقشہ پورے نصاب میں کچھ یوں ہے :

۱) شائستگی ، پاکیزگی ، صفائی ، ذوق سلیم -

۲) اخلاق حسنہ ، انفرادی ، عائلی اور اجتماعی زندگی میں -

۳) نظم و ضبط ، ڈسپلن ، محاسبۂ نفس ، احساسِ فرض اور احساسِ ذمہ داری -

۴) وسعتِ قلب، وسعتِ نظر ، وسعتِ تصور، بلند حوصلگی ،خود داری ، حمیت و غیرت ۔
۵) عزم و ارادہ کی پختگی ،متانت و سنجیدگی ، خلوص اور معاملات سے گہری دلچسپی کا ذوق ، جرأت و بہادری ، جفاکشی اور چستی ۔
۶) اسلامی نصب العین کا عشق ۔
۷) جماعتی زندگی کا گہرا شعور اور قرآن و سنت کے بتائے ہوئے اوصاف اور ضروری انتظامی صلاحیت ۔
۸) تحقیق و تجسس اور تفکر و مشاہدہ کی عادت ، منظم رہنے اور منضبط سوچنے کی مشق اور استدلال کرنے کا طریقہ[15]۔

انہوں نے اپنے نظریہ تعلیم کی ان الفاظ میں قطعی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا

"انسان کے لیے ہدایت کے سرچشمے دو ہی ہیں ۔ ایک کتاب اللہ دوسرے اسوۂ رسول اکرم صلعم ان دونوں سے جس نے ہدایت نہ پائی اس کے لیے کوئی تیسرا ذریعۂ ہدایت نہیں ہے ۔ یہ ہماری انتہائی خوش قسمتی ہے کہ ہمارے پاس اللہ کی کتاب بھی اپنے اصل الفاظ میں ہر تحریف سے محفوظ موجود ہے ۔ اور اللہ کے رسول کی حیات پاک کے ہر پہلو سے متعلق مفصل اور مستند معلومات بھی موجود ہیں ۔ مبارک ہے ہر وہ کوشش جو بندگان خدا تک قرآن کی تعلیم اور سیرت پاک کا تصور پہنچانے کے لیے کی جائے[16]"۔

یوں سید مودودی کے تعلیمی افکار پر ہمیں تعلیمات نبوی اور قرآن و سنت کے افکار کی گہری اور واضح چھاپ دکھائی دیتی ہے اپنی تصانیف میں انہوں نے ایک ایسا تصور تعلیم پیش کیا ہے کہ اگر اسے بروئے کار لایا جائے تو وہ ہمارے ملک میں اسلامی کردار کے خسران ، جفاکشی اور دیانتداری کے بحران اور حب الوطنی کے فقدان کے مسائل کو حل کر سکتا ہے ۔

حوالے

۱ ۔ تنقیحات ص ۹۳
۲۔ تعلیمات ، ص ۵۹ ۔ ۶۰
۳ ۔ قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ، ص ۲۷
۴۔ تفہیمات جلد اول ، ص ۲۱۲
۵۔ تفہیم القرآن جلد سوم ، ص ۲۹۳

۶ - تفہیم القرآن جلد چہارم، ص ۲۳۲
۷ - دینیات، ص ۳۷
۸ - تعلیمات، ص ۱۵۱
۹ - تعلیمات، ص ۵۶
۱۰ - تعلیمات، ص ۳ ۱۳
۱۱ - تعلیمات، ص ۱۲۸
۱۲ - اسلامی قانون، ص ۹
۱۳ - روز نامہ تسنیم، لاہور، ۱۵/اگست ۱۹۵۵ ء
۱۴ - ہفت روزہ آئین، لاہور "تعلیم نمبر" مورخہ ۲۵/جولائی ۱۹۸۲ء ص۲۳-۲۵
۱۵ - تعلیمات، ص ۱۰۸ - ۱۱۱ - ۱۱۲
۱۶ - آئین لاہور تعلیم نمبر، جولائی ۱۹۸۲ ء ص ۷۰

فضل اللہ بن روزبہان اصفہانی اور ان کا نظریۂ تعلیم

جناب پروفیسر محمد اسلم

ابوالخیر فضل اللہ بن جمال الدین روز بہان[1] بن فضل اللہ[2] الخنجی، الشیرازی، الاصفہانی، المتخلص امین، المشہور بہ خواجہ مولانا اصفہانی، شیراز میں سنہ ۱۴۶۲ء میں پیدا ہوئے۔

مولانا فضل اللہ شافعی المذہب علما کے ایک ایسے خاندان کے فرد تھے جس کے افراد پشتہا پشت سے عہدہ قضا پر فائز چلے آرہے تھے[3]۔ موصوف اپنی مشہور تصنیف "تاریخ عالم آرائے امینی" میں اپنے والد جمال الدین روز بہان کے متعلق رقمطراز ہیں کہ وہ سرداروں کے زمرے میں داخل تھے، لیکن ان پر کچھ ایسی گزری کہ انہوں نے ملازمت ترک کردی اور اپنے اوقات پڑھنے لکھنے میں صرف کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ ان کا شمار علما میں ہونے لگا۔ مولانا جمال الدین ایران کے آق قویونلو حکمران سلطان یعقوب (م سنہ ۱۴۹۰ء) کے منظور نظر تھے[4]۔

مولانا فضل اللہ کی والدہ اصفہان کے ممتاز گھرانے صاعدی کی فرد تھیں۔ یہ خاندان اپنی علم دوستی اور علمی سرپرستی کے لیے پورے ایران میں مشہور تھا۔ کمال اصفہانی جیسا نامور شاعر اسی خاندان کے دسترخوان کرم کا ریزہ چین تھا[5]۔ مولانا فضل اللہ کے ایک ماموں جمال الدین صاعدی شیرازی کے قرہ قویونلو حاکم پیربوداق بن جہاں شاہ کے دور میں عہدۂ وزارت پر فائز تھے۔ فضل اللہ کا ایک اور ماموں شیراز کے حکمراں جہاں شاہ کا منظور نظر تھا اور اسے دربار شاہی سے اپنے قبیلے کی سرداری کے علاوہ علم اور نقارہ بھی ملا تھا۔ اسی طرح اس کے کئی رشتہ دار مناصب جلیلہ پر فائز تھے۔

اس زمانے میں شیراز کا شمار عالم اسلام کے گنے چنے علمی مراکز میں ہوتا تھا اور اس زمانے کے سب سے بڑے شافعی عالم مولانا جلال الدین دوانی رح (م ۱۵۰۱ء) وہاں درس دیا کرتے تھے۔ فضل اللہ کو ان سے شرف تلمذ تھا۔ شمس الدین السخاوی رح نے ان کے اساتذہ میں عمید الدین شیرازی کا بھی ذکر کیا ہے[6]۔

مولانا فضل اللہ سترہ برس کی عمر میں حج کے ارادے سے شیراز سے نکلے۔ فریضہ حج کی ادائی کے بعد انہوں نے حرمین شریفین میں محدث

شہیر شمس الدین السخاوی اور ابوعبد اللہ محمد بن ابو الفرج سے استفادہ کیا
مولانا فضل اللہ نے عالم جوانی میں سہرورد یہ سلسلے کے ایک بزرگ پیر جمال الدین صوفی جمالی اردستانی کے ہاتھ پر بیعت کرلی اور ان کی نگرانی میں سلوک کی منازل طے کیں - پیر جمال الدین بڑے اونچے پائے کے شاعر تھے - ان کی کلیات ، جس میں ۲۲ مثنویات کے علاوہ رباعیات غزلیات و مفردات بھی شامل ہیں ، کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں مخطوطہ کی صورت میں محفوظ ہے [۸]

۲۵ سال کی عمر میں فضل اللہ اپنی والدہ اور مرشد کے ساتھ شیراز سے مصر کی طرف روانہ ہوئے - مصر میں ان دنوں شیخ محمد الخیضری رح (م سنہ ۱۴۹۹ء) کے علم و فضل کا بڑا شہرہ تھا - فضل اللہ کو ان کے درس میں بیٹھنے کی سعادت ملی - ادھر ان کی تعلیم مکمل ہوئی ، ادھر ان کی والدہ فوت ہوگئیں - فضل اللہ اپنی والدہ کی تدفین کے بعد قاہرہ سے فلسطین کی طرف روانہ ہوئے - بیت المقدس پہنچتے ہی ان کے مرشد اس جہان فانی سے کوچ فرماگئے - فضل اللہ ان صدمات سے بڑے دلبرداشتہ ہوئے اور انہوں نے مدینہ منورہ کی راہ لی [۹]

مدینہ منورہ میں کچھ عرصہ قیام کے بعد فضل اللہ شیراز روانہ ہوئے - اپنے وطن آنے کے بعد انہوں نے " بدیع الزمان فی قصۃ حیہن یقظان " تصنیف کی اور آذربائیجان جاکر اسے سلطان یعقوب کی خدمت میں پیش کیا - سلطان نے ان کی بڑی عزت افزائی کی اور انہیں اپنا روزنامچہ لکھنے کا کام سونپا [۱۰] مولانا فضل اللہ نے " تاریخ عالم آرائے امینی " کے عنوان سے سلطان یعقوب کے عہد کے واقعات کو قلمبند کیا - اس کتاب کا انگریزی زبان میں خلاصہ پروفیسر مینورسکی نے لندن سے سنہ ۱۹۵۷ء میں شائع کردیا ہے - فارسی متن ہنوز منتظر اشاعت ہے -

مولانا فضل اللہ چار سال تک سلطان یعقوب کے دربار میں رہے - اس نیک دل حکمران نے اپنی مملکت میں شرعی اصلاحات نافذ کیں - شراب نوشی کی سزا مقرر ہوئی - شہروں اور قصبوں میں محتسب مقرر ہوئے - داڑھی منڈوانے والے کے لیے موت کی سزا تجویز کی گئی - محکمہ عدل میں بہت سی اصلاحات ہوئیں - اسی طرح انتظام سلطنت کو بھی خلفائے راشدین کے نظام کی طرز پر ڈھالا گیا - سلطان یعقوب اپنی رعایا کے ساتھ نیکی کا سلوک کیا کرتا تھا اور منکرات سے حتی الوسع بچنے کی کوشش کرتا تھا [۱۱]
فضل اللہ نے اس پاکیزہ ماحول میں چار سال گزارے - سلطان یعقوب کی وفات کے بعد ایران مین بد نظمی کا دور دورہ شروع ہوگیا - ان حالات میں فضل اللہ آذربائیجان سے شیراز چلے آئے اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہوگئے [۱۲]

شاہ اسمٰعیل صفوی کی مملکت میں ابطال نہج الباطل کی تصنیف کے بعد رہنا ان کے لیے ممکن نہ تھا ۔ لہٰذا موصوف شاہ اسمٰعیل کے کاشان پر قبضے سے قبل ہی ماوراء النہر تشریف لے گئے ۔ وہاں ان دنوں شیبانی خان ازبک (م سنہ ۱۵۱۰ء) حکمراں تھا ۔ وہ چونکہ شاہ اسمٰعیل کا جانی دشمن تھا اس لیے مولانا فضل اللہ کی اس کے ساتھ خوب بن آئی ۔[۱۳]

مولانا فضل اللہ نے آئندہ چند سال شیبانی خان کی مصاحبت میں گزارے اور دو اسفار میں اس کے ساتھ رہے ۔ مولانا نے شیبانی خان کے سفر ہرات ، مشہد اور بخارا کے حالات " مہمان نامہ بخارا " کے عنوان سے تحریر کیے ہیں ۔ یہ تصنیف دلپذیر سنہ ۱۹۶۲ء میں تہران سے دکتر منوچہر ستودہ کی سعی و کاوش سے زیور طباعت سے آراستہ ہوچکی ہے ۔

شیبانی خان ازبک سنہ ۱۵۱۰ء میں مرو کے مقام پر شاہ اسمٰعیل صفوی کا مقابلہ کرتا ہوا مارا گیا ۔[۱۴] شیبانی خان کے قتل کے بعد ازبک سردار ترکستان کی طرف چلے گئے اور مولانا فضل اللہ نے سمرقند میں قیام کیا ۔ جب سنہ ۱۵۱۲ء میں شیبانی خان کے بھتیجے عبید اللہ خان ازبک نے بابر کو کول ملک کے مقام پر شکست دے کر ماوراء النہر سے کابل کی طرف دھکیل دیا تو مولانا فضل اللہ عبید اللہ خان کے پاس گئے ۔[۱۵] خان موصوف نے چند کتابیں ان سے شیبانی خان کے عہد میں پڑھی تھیں اس لیے اس نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان سے امور جہانبانی پر " سلوک الملوک " کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب لکھوائی ۔ سلوک الملوک کا فارسی متن حیدرآباد دکن سے سنہ ۱۹۶۶ء میں ڈاکٹر نظام الدین مرحوم نے شائع کردیا تھا ۔ اس کا انگریزی ترجمہ راقم الحروف نے کیا تھا جو سنہ ۱۹۷۲ء میں قائد اعظم یونیورسٹی نے طبع کردیا تھا ۔

مولانا فضل اللہ کی بقیہ زندگی بخارا میں عبید اللہ خان کے دربار میں گزری اور وہیں سنہ ۱۵۲۱ء میں ان کا انتقال ہوا ۔[۱۶] رحمۃ اللہ علیہ واسعاً کثیراً

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ انہوں نے خلاصہ کشف الغمہ ، رسالہ در حقیقت و انواع حدیث قدسی ۔ رسالہ حارثیہ ، شرح قصیدۂ بردہ ، مناقب پیر جمال اردستانی ، شرح صحیح مسلم ، شرح وصایائے خواجہ عبد الخالق غجدوانی ، حاشیہ بر حواشی شرح جدید ، حل تجرید ، حاشیہ بر تفسیر کشاف ، رسالہ مقاصد ، حاشیہ برمحالات اور حاشیہ بر کتاب شرح مواقف کے عنوانات سے کئی تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں ۔[۱۷]

آمد برسرمطلب مولانا فضل اللہ نے سلوک الملوک میں جہاں شیخ الاسلام کے فرائض پر بحث کے علاوہ تعلیم و تعلّم کے بارے میں بھی قلم اٹھایا ہے ۔ انہوں نے مملکت میں فروغ تعلیم اور درس و تدریس کی ذمہ داری شیخ الاسلام پر ڈالی ہے ۔ موصوف فرماتے ہیں کہ یہ شیخ الاسلام کے فرائض میں سے ایک اہم فریضہ ہے کہ وہ مملکت میں علوم شریعت کی تعلیم اور اشاعت کا انتظام کرے ۔[۱۸]

مولانا فضل اللہ لکھتے ہیں کہ شیخ الاسلام کو چاہیے کہ وہ اپنے عہدے پر متمکن ہوتے ہی سب سے پہلے علما کے بارے میں استفسارات کرے اور ان کے علمی مرتبے ، ذہن رسا ، طریق تعلیم ، قوت اجتہاد ، افتا اور تدریس کا اندازہ لگائے ۔وہ اس پر بھی غور کرے کہ کس عالم کا رجحان کس صنف علم کی طرف ہے اور وہ کونسا مضمون دوسرے علما کی نسبت احسن طریقے سے پڑھا سکتا ہے ۔یہ سب کچھ جاننے کے بعد شیخ الاسلام ان کا مختلف مدارس میں تقرر کرے ۔[19]

اس کے بعد شیخ الاسلام کو چاہیے کہ وہ طلبہ کا امتحان لے اور یہ معلوم کرے کہ انہیں کس صنف علم کے ساتھ مناسبت اور ذہنی لگاو ہے ۔وہ یہ بھی معلوم کرے کہ ان کی علمی استعداد کیا ہے اور وہ پڑھائی کی طرف توجہ بھی دیتے ہیں یا نہیں ؟ یہ سب کچھ جاننے کے بعد شیخ الاسلام انہیں مختلف استادوں کے سپرد کردے ۔جس طرح ایک مشفق باپ گاہگاہے اپنے بچے کے استاد سے بچے کی علمی استعداد اور پڑھائی میں توجہ اور ترقی کے بارے میں استفسار کرتا رہتا ہے اسی طرح شیخ الاسلام بھی مناسب وقفوں کے بعد اساتذہ ، ان کے شاگردوں کی علمی استعداد اور علم سے دلچسپی کے بارے میں رپورٹ طلب کرتا رہے ۔[20]

طلبہ کو اسباق یاد کرانے کے لیے ٹیوٹرز (TUTORS) کا تقرر بھی ضروری ہے ۔یہ ٹیوٹرز طلبہ کے ساتھ سبق دہراتے رہیں ۔

مولانا فضل اللہ کی یہ رائے ہے کہ اساتذہ کو چاہیے کہ وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے طلبہ کا امتحان (TEST) لیتے رہیں تاکہ وہ پڑھائی پر زیادہ توجہ دیں اور علمی استعداد پیدا کریں ۔امتحان ہی کے ذریعہ سے ان کی علمی ترقی کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے ۔جب کوئی طالبعلم امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرے تو شیخ الاسلام اس کی حوصلہ افزائی کرے۔ ان کی حوصلہ افزائی کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ان کے وظیفہ کی رقم بڑھا دے ، انہیں انعام دے اور انہیں سربراہ مملکت کی خدمت میں پیش کرے ۔ اس طرح ان کی حوصلہ افزائی ہوگی اور دوسرے طلبہ بھی اس عزت افزائی کی خاطر پڑھائی میں زیادہ دلچسپی لیں گے ۔[21]

اگر امتحان میں کوئی طالب علم ناکام ہوجائے یا اس سے پڑھائی میں کوئی تقصیر ہو جائے تو شیخ الاسلام اس سے اس ناکامی یا تقصیر کا سبب دریافت کرے اور معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرے ۔اگر طلبہ کی ناکامی کا سبب معلّم کی کوتاہی یا ٹیوٹر کی کاہلی ہو تو ان کا مواخذہ کرے ۔اس ضمن میں شیخ الاسلام اساتذہ اور ٹیوٹرز کے وظیفے میں کمی کرسکتا ہے یا انہیں کوئی سزا دے سکتا ہے تاکہ آئندہ وہ غفلت اور کاہلی کا مظاہرہ نہ کریں۔ اگر امتحان میں ناکامی کا سبب طالبعلم کی تقصیر ہو تو شیخ الاسلام کو

چاہیے کہ پہلی بار اسے مشفقانہ انداز میں سمجھائے اور تحصیل علم کی تحریص دلائے ۔ اگر دوسرے امتحان میں بھی طالب علم اپنی غفلت اور سستی کی بنا پر ناکام ہوجائے تو اسے زجر کرے ۔ اگر سہ بارہ وہ اس غلطی کا اعادہ کرے تو اس کا وظیفہ بند کردے ۔ اگر کسی طالب علم کی امتحان میں ناکامی کا سبب اس کا فہم ناقص ہو یا کسی خاص صنف علم سے عدم مناسبت ہو تو شیخ الاسلام اس فن کے استاد سے کہے کہ وہ پوری احتیاط کے ساتھ وہ اسباق اسے دوبارہ پڑھائے اور ان کے مطالب و معانی کی تشریح کرے۔[۲۲]

مولانا فضل اللہ فرماتے ہیں کہ علوم کی تین اقسام ہیں :

۱ ۔علوم شرع ، اس زمرہ میں تفسیر ، حدیث اور فقہ آتے ہیں ۔

۲ ۔علوم شرعیہ ، انہیں علوم شرعیہ اس بنا پر کہتے ہیں کہ علوم شرع کی تدریس اور ان کی تحصیل ان پر ہی موقوف ہے ۔ اس زمرے میں اصول تفسیر ، اصول حدیث اور اصول فقہ اتے ہیں ۔ اصول کلام کا شمار بھی اسی ذیل میں ہوتا ہے ۔

۳ ۔ عربی زبان و ادب ، علوم شرع اور علوم شرعیہ پر بنیادی کتابیں عربی زبان میں لکھی گئی ہیں ۔ نیز قرآن اور حدیث کی زبان بھی عربی ہے اور ان کے مطالعہ کے لیے عربی جاننا ضروری ہے ۔ عربی زبان کی تحصیل کے لیے صرف ، نحو ، اشتقاق ، معانی ، بیان اور بدیع جیسی اصناف کا علم ضروری ہے ۔

ان تین اقسام کے علاوہ باقی جتنے بھی علوم ہیں ، وہ علوم فلاسفہ ہیں۔[۲۳]

علوم دینیہ کے علاوہ طب سے تھوڑی سی شد بد ہونی ضروری ہے کیوں کہ اس کا صحت جسم کے ساتھ تعلق ہے اور مرض کا تدارک کرنا سنت ہے ۔ اس لیے بغرض علاج طب کے مطالعے میں کوئی حرج نہیں ۔[۲۴]

طب کے علاوہ تھوڑی سی ریاضی بھی سیکھنی چاہیئے کیونکہ ، کتب فقہ کے کئی ابواب میں اس کی ضرورت پیش آتی ہے ، مثلاً وراثت ، خراج ، عشر اور زکواۃ کے مسائل میں ریاضی پڑھے بغیر کام نہیں چل سکتا ۔[۲۵]

اب رہی منطق ، تو اس کا اس اعتبار سے جاننا ضروری ہے کے علمی مباحث ، معرفت صحت اور معرفت فساد میں اس کی ضرورت پیش آتی ہے ۔ علمائے کرام نے اس حد تک منطق کا حصول ضروری قرار دیا ہے جس حد تک اس کی درس و تدریس کے دوران ضرورت پڑتی ہے ۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ علوم شرقیہ کی تحصیل کسی دوسرے علم کی تحصیل کی محتاج نہ رہے ۔ مولانا فضل اللہ کی رائے میں منطق کی مختصر سی کتابیں پڑھا دینا ہی کافی ہے ۔ موصوف یہ سمجھتے تھے کہ اس فن میں گہری دلچسپی یا استغراق نامناسب ہے اور اس میں خطرہ ہی خطرہ ہے ۔ اس لیے طلبہ کو منطق کی طرف ضرورت سے زیادہ توجہ دینے سے منع کرنا چاہیے۔[۲۶]

مولانا فضل اللہ فرماتے ہیں کہ ان علوم کے ہوتے ہوئے فلسفہ پڑھنے یا پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے ۔ البتہ اس علم سے اس حد تک واقفیت جس سے باطل کا رد کیا جاسکے ، مضر نہیں ۔ ردّ بدعت فرض کفایہ ہے اور بدعت کی تردید کا انحصار بدعت کی معرفت پر ہے اور اتنا تو علمائے علم الکلام کی کتابوں میں بھی درج ہے ۔

پس یہ ثابت ہوا کہ فلسفہ کے درس و تدریس کی ، ما سوا اس کے جتنا علمائے شریعت نے اپنے نصاب میں شامل کیا ہے ، اصلاً ضرورت نہیں ہے ۔ اس لیے یہ شیخ الاسلام کا فرض ہے کہ وہ اپنے ماتحت مدارس میں فلسفہ کی تدریس پر پابندی عائد کرے ۔ وہ کسی قیمت پر بھی کسی استاد یا طالب علم کو فلسفہ پڑھانے یا پڑھنے کی اجازت نہ دے کیونکہ اسلام میں جتنے بھی فسادات پھیلے ہیں ان کی اساس فلسفہ کی تدریس و اشاعت پر ہے ۔[27]

مولانا فضل اللہ ، خلاصۃ الفتاوٰی الحنفیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ محض مناظرہ کی خاطر علم الکلام کا مطالعہ اور اس میں تعمق منع ہے البتہ بقدر ضرورت اس کی تحصیل میں کوئی حرج نہیں ہے ۔

اسی طرح علم نجوم و ہئیت کی اس حد تک تحصیل میں ، جس سے سمت قبلہ اور اوقات نماز کا تعین ہوسکے ، کوئی مضائقہ نہیں ہے ۔ اس سے زیادہ اس علم میں دلچسپی حرام ہے ۔[28]

بعض لوگ بلا وجہ مناظروں میں دلچسپی لیتے ہیں اور مناظروں میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے علم الکلام کا گہرا مطالعہ کرتے ہیں ۔ مناظروں میں مناظر عموماً حیلہ بازی اور مکر و فریب سے کام لیتے ہیں ۔ اس لیے مناظرہ بازی اور اس کی خاطر علم الکلام کا عمیق مطالعہ جائز نہیں ہے ۔[29]

امام طاہر بن احمد البخاری (م سنہ ۵۴۲ھ) صاحب خلاصۃ الفتاوٰی الحنفیہ میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے قاضی الاسلام سے سنا تھا کہ جو شخص مناظرے یا بحث میں محض اپنے حریف کو نیچا دکھانے کے لیے حصہ لے ، وہ کافر ہوجاتا ہے ۔ امام طاہرؒ فرماتے ہیں کہ انہوں نے بعض کتابوں میں یہ پڑھا ہے کہ وہ کافر تو نہیں ہوجاتا، لیکن وہ کفر سے نزدیک ضرور ہوجاتا ہے ۔[30]

مولانا فضل اللہ فرماتے ہیں کہ صاحب خلاصۃ کے اس بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے مدارس میں جو بحثیں اور مناظرے اپنے حریفوں کو نیچا دکھانے کے لیے کیے جاتے ہیں ، وہ حرام ہیں ۔ اگر ضرورت سے زیادہ علم الکلام کی تحصیل ممنوع ہے تو فلسفہ کی تعلیم تو بدرجہ اولٰی منع ہونی چاہیے ۔ اس لیے شیخ الاسلام کا یہ فرض ہے کہ اگر وہ کسی شخص کو فلسفہ کے درس و تدریس میں مشغول دیکھے تو اسے منع کرے اور اسے اس وظیفے سے محروم کردے جو مسلمانوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے دیا جاتا ہے ۔ اس کے علاوہ وہ اسے سزا دے اور اس کی تحقیر و تذلیل میں کوئی کسر

باقی اٹھا نہ رکھے تا آنکہ وہ فلسفہ پڑھنے اور پڑھانے سے باز آجائے اور علوم شرعیہ میں دلچسپی لینے لگے۔[31]

مولانا فضل اللہ کی ان سفارشات پر ماوراء النہر کے حاکم عبداللہ خان ازبک (۱۵۸۳ء تا سنہ ۱۵۹۸ء) نے عمل کیا۔ اس نے اپنی مملکت سے تمام فلاسفروں کو نکال دیا۔ یہ راندۂ درگاہ گروہ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں ماوراء النہر سے بر عظیم پاک و ہند چلا آیا۔ اکبر اور اس کے دربار کے معقولی علما نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اکبر کے عہد میں اسلامی شعار کی تضحیک و تذلیل اور علوم شریعت کی کساد بازاری میں ان نو وارد فلاسفروں کا بھی حصہ ہے۔

شیخ الاسلام کے لیے یہ ضروری ہے کہ مدارس کے اندرونی حالات سے واقف رہے اور اساتذہ اور طلبہ کے بارے میں معلومات فراہم کرتا رہے۔[32] اسے چاہیے کہ وہ ہر مدرسے میں ایک امام مقرر کرے جو وقت پر اساتذہ اور طلبہ کو نماز پڑھائے۔ یہ اس امام کی ذمہ داری ہےکہ وہ طلبہ کو نماز باجماعت کا پابند کرے۔[33]

شیخ الاسلام ایک کام یہ بھی کرے کہ طلبہ کی نگرانی کیلئے جاسوس مقرر کرے جو اوقات تعطیل اور خلوت میں ان کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھے۔ اگر طلبہ میں کوئی طالب علم فسق و فجور کا ارتکاب کرے تو اسے محتسب کے سپرد کیا جائے۔ ایسے طالب علم کو سخت سزا دی جائے اور اس کے جرم کی خوب تشہیر کی جائے۔ ایسے فاسق و فاجر طالب علم کا وظیفہ بھی بند کر دیا جائے اور اسے شہر بدر کیا جائے تاکہ باقی طلبہ عبرت حاصل کریں۔[34]

اسی طرح اگر طلبہ کے بارے میں شیخ الاسلام کو یہ رپورٹ ملےکہ وہ نیک و صالح ہیں اور نماز با جماعت کے پابند ہونے کے ساتھ ساتھ منکرات سے بچتے ہیں تو پھر ان کی تعظیم و تکریم میں مبالغہ کرے۔ شیخ الاسلام کو چاہیے کہ وہ ایسے ہونہار اور صالح طلبہ کے وظائف کی رقم میں اضافہ کرے انہیں اور بھی مراعات دے۔[35]

مولانا فضل اللہ فرماتے ہیں کہ جب مدارس، اساتذہ اورطلبہ کے بارے میں ایسی جامع پالیسی اختیار کی جائے گی تو وہ دن دور نہیں جب نیک و صالح علما پیدا ہوں گے اور طلبہ مرتبۂ طلب سے ترقی کرکے مرتبۂ کمال کو پہنچ جائیں گے۔ ایسے علما درس و تدریس اور قضا و افتا کے فرائض کما حقہ انجام دے سکیں گے۔[36]

علما میں سے اگر کوئی عالم کسی فن میں کمال یا تخصص حاصل کرے تو شیخ الاسلام کو چاہیے کہ اسے حاکم وقت کے سامنے پیش کرے اور وہ اس کے حسب حال اسے کسی عہدے پر فائز کرے۔ اس طرح ملک کے دور دراز علاقوں

میں قابل علما بھیجے تاکہ عوام ان سے استفادہ کرسکیں ۔ ایسے علما کے مملکت میں پھیل جانے سے شریعت میں رونق پیدا ہوگی اور دین کا چراغ روشن ہوگا ۔[۳۷]

حوالہ جات

۱ ۔ فضل اللہ ، تاریخ عالم آرائے امینی ، مخطوطہ فاتح لائبریری استانبول ، ورق ۸۹ الف ۔
۲ ۔ فضل اللہ ،مہمان نامہ بخارا ، مطبوعہ تہران سنہ ۱۹۶۲ء ص ۳۵۲ ۔
۳ ۔ محمد اسلم ، تاریخی مقالات ، مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۷۰ء ص ۳۳
۴ ۔ فضل اللہ ، تاریخ عالم آرائے امینی ، ورق ۸۹ الف
۵ ۔ کمال اسماعیل اصفہانی ، دیوان ، مطبوعہ بمبئی ص ۱۲ ، ۱۵ ، ۱۷
۶ ۔ شمس الدین السخاوی ، الضوء اللامع ، مطبوعہ قاہرہ سنہ ۱۳۵۳ھ ج ۶ ، ص ۱۷۱
۷ ۔ ابن سکندر ، بستان سیاحت ، مطبوعہ تہران سنہ ۱۸۹۷ء ص ۳۲۸ ۔
۸ ۔ نکلسن ، فہرست مخطوطات براؤن ، مطبوعہ کیمبرج سنہ ۱۹۳۲ء مخطوطہ نمبر ۱۳ ۔
۹ ۔ شمس الدین السخاوی ، الضوء اللامع ، ج ۳ ، ص ۱۷۱
۱۰ ۔ فضل اللہ ، تاریخ عالم آرائے امینی ، ورق ۳۰ ب تا ۳۵ الف
۱۱ ۔ مینورسکی ، بلیٹن سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز لندن ، ج ۱۷ سنہ ۱۹۵۵ء ص ۴۵۹
۱۲ ۔ محمد اسلم ، تاریخی مقالات ، ص ۳۲ ۔
۱۳ ۔ فضل اللہ ، مہمان نامہ بخارا ، ص ۳۲ ۔
۱۴ ۔ غلام سرور ، ہسٹری آف شاہ اسماعیل صفوی ، مطبوعہ علی گڈھ سنہ ۱۹۳۹ء ص ۱۱۲۰
۱۵ ۔ فضل اللہ ، سلوک الملوک ،مطبوعہ حیدرآباد دکن سنہ ۱۹۶۶ء ص ۲۰
۱۶ ۔ حسن روملو ، احسن التواریخ ، مطبوعہ بڑودہ سنہ ۱۹۳۱ء ص ۱۷۴ ۔
۱۷ ۔ محمد اسلم ، تاریخی مقالات ، ص ۵۳ ۔
۱۸ ۔ فضل اللہ ، سلوک الملوک ، ص ۶۲ ۔
۱۹ ۔ ایضاً ، ص ۶۴ ۔

۲۰ ـ ایضاً ، ص ۶۵ ـ
۲۱ ـ ایضاً ، ص ۶۵ ـ
۲۲ ـ ایضاً ، ص ۶۵ ـ
۲۳ ـ ایضاً ، ص ۶۶ ـ
۲۴ ـ ایضاً ، ص ۶۶ ـ
۲۵ ـ ایضاً ، ص ۶۶ ـ
۲۶ ـ ایضاً ، ص ۶۶ ـ
۲۷ ـ ایضاً ، ص ۶۷ ـ
۲۸ ـ ایضاً ، ص ۶۷ ـ
۲۹ ـ ایضاً ، ص ۶۷ ـ
۳۰ ـ ایضاً ، ص ۶۷ ـ
۳۱ ـ ایضاً ، ص ۶۸ ـ
۳۲ ـ ایضاً ، ص ۶۸ ـ
۳۳ ـ فضل اللّٰہ ، سلوک الملوک ، ص ۶۸ ـ
۳۴ ـ ایضاً ، ص ۶۸ ـ
۳۵ ـ ایضاً ، ص ۶۸ ـ
۳۶ ـ ایضاً ، ص ۶۹ ـ
۳۷ ـ ایضاً ، ص ۶۹ ـ

جامعہ ملّیہ اسلامیہ
ایک تعلیمی تحریک

جناب پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی

۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو شیخ الہند مولانا محمود الحسن رح نے جس ادارے کی بنیاد ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ کی مسجد میں رکھی تھی اسی کا تخیل لوگوں کے ذہنوں میں پہلے سے موجود تھا، یعنی ایک ایسے ادارے کا تخیل جس میں جدید علوم مادری زبان کے ذریعہ سے پڑھائے جائیں، جس کا نصاب علم اور مذہب کا سنگم ہو، جو تعلیمی اعتبار سے آزاد اور خود مختار ہو اور جس کے طلبہ فارغ التحصیل بن کر محض سرکاری ملازمتوں کا سہارا نہ لیں۔سرسید نے بھی کچھ اسی قسم کی تعلیم کا خواب دیکھا تھا۔سید محمود کے ہائی کورٹ کے جج ہونے پر وہ اکثر کہتے: "میرا جو اصلی مقصد سید محمود کی تعلیم سے تھا وہ حاصل نہ ہوا۔ سید محمود ملازمت کے صیغے میں چاہے کتنی ہی ترقی کریں، مگر قوم کو جس قسم کے تعلیم یافتوں کی ضرورت ہے اس میں سید محمود سے کچھ مدد نہیں پہنچ سکتی"[1]۔ درحقیقت سرسید کا مقصد "نہایت اعلا و ارفع تھا"[2]۔ اور جو لوگ ان کی اسکیم سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ سرسید کیا چاہتے تھے۔

جب برٹش گورنمنٹ نے مسلمانوں کے اس مطالبے کو رد کر دیا کہ مجوزہ مسلم یونیورسٹی آل انڈیا یونیورسٹی ہو جس سے ملک کے دوسرے ادارے خصوصاً مسلمانوں کے کالجوں اور اسکولوں کا الحاق ہو سکے تو وقار الملک نے جامعہ اسلامیہ قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ان کا خیال تھا کہ چونکہ اب علی گڑھ کا ایم۔اے۔او کالج ایک ایسی یونیورسٹی نہیں بن سکتا جس کے ذریعہ سے قومی تعلیمات کا انتظام کیا جا سکے، اس لیے ایک جامعہ اسلامیہ یعنی قومی دارالعلوم قائم کیا جائے اور وہ سرمایہ جو مسلم یونیورسٹی کے لیے جمع ہو رہا ہے یا ہو سکا ہے وہ جامعہ اسلامیہ کے سپرد کر دیا جائے۔

وقارالملک نے تعلیم کے نظام و نصاب کا جو خاکہ پیش کیا تھا اس میں مسلمانان ہند کے ان گروہوں کے واسطے بھی جو سرکاری ملازمتوں کے خواستگار نہیں تھے، تعلیم کا انتظام کرنا مقصود تھا تاکہ مسلمانوں میں تمام ضروری علوم و فنون کی تعلیم کا عام چرچا ہو سکے[3]۔ یہ علوم و فنون اردو زبان

کے ذریعہ سے پڑھائے جائیں گے اور " علٰی قدر مدارج و ضرورت انگریزی زبان کی تعلیم کا اہتمام (بھی) درکار ہوگا "[4]

وقار الملک نے یہ بھی لکھا تھا کہ " دینیات کے اعتبار سے جامعہ اسلامیہ میں ہر قسم کی تعلیم کا انتظام موجود ہو جس سے ایسے روشن ضمیر مفسر ، محدث ، فقیہ ، ادیب اور متکلمین پیدا ہو سکیں جو ایک طرف علوم جدیدہ کے حملوں سے اسلام کی پوری حفاظت کریں اور دوسری طرف اسلام کی خوبیوں اور صداقتوں کا سکہ غیر مذہب کے لوگوں کے دلوں پر بٹھائیں اور اشاعت اسلام کا کام کریں اور فیضان صحبت سے طلبہ کے دلوں میں نور ایمان و اسلام کو پیدا کریں اور ترقی دیں "[5]

ایم۔اے۔او کالج سرسید کے خواب کی ادھوری تعبیر تھی ، ان کا نصب العین دراصل ایک " آزاد محمڈن یونیورسٹی " کا قیام تھا۔اسی خیال کو ۱۸۷۳ء میں سید محمود نے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق اپنی اسکیم میں پیش کیا تھا اور کہا تھا کہ " جب تک خود لوگ اپنی تعلیم کا اہتمام اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے اس وقت تک مناسب طور پر ان کی تعلیم کا ہونا ممکن نہیں ہے - پس ملک کے لیے یہ زیادہ تر مفید ہوگا کہ گورنمنٹ تعلیم کا تمام اہتمام لوگوں پر چھوڑ دے اور خود اس میں دست اندازی سے بالکل علاحدہ ہو جائے "[6]

بیسویں صدی کے پہلے دہے میں علی گڑھ کالج کے یورپین اسٹاف کے خلاف طلبہ اور کالج کے بعض ٹرسٹی حضرات میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ کالج پر ان کا اثر و اقتدار بہت بڑھ گیا ہے اور وہ جس طرح چاہتے ہیں کالج کو انگریزی سامراج کے حق میں استعمال کرتے ہیں ۔اس وقت مقامی اور بین الاقوامی سیاست ، خصوصاً ممالک اسلامیہ میں عیسائی سامراجی طاقتوں کا دباؤ بہت بڑھ رہا تھا ، پھر اس کے بعد طرابلس اور بلقان کی جنگوں نے صورت حال بالکل بدل دی اور مسلمانوں میں، جن میں علی گڑھ کالج کے نئی نسل کے لوگ بھی پیش پیش تھے ، انگریزی حکومت کے خلاف شدید رد عمل کا اظہار ہوا ، مولانا محمد علی کا کامریڈ اور ہمدرد ، مولانا ابوالکلام آزاد کا الہلال اور دہلی میں نظارۃ المعارف کا قیام جس میں شیخ الہند رح کے ایما پر مولانا عبیداللہ سندھی بھی شریک تھے ، اسی رد عمل اور مسلمانوں میں عمومی حرکت کی علامت تھے۔نواب وقارالملک نے بھی جو سرسید کی جماعت کے پہلے شخص تھے ، ترکوں کی کھل کر حمایت اور سیاسی امور میں نوجوان مسلمانوں کی رہنمائی کی اور ان میں قومی و مذہبی احساس پیدا کیا ، دوسری طرف مذہبی حلقے اور علما بھی نواب صاحب کی مذہبی زندگی اور اسلامی معاشرت کی وجہ سے کالج کی طرف توجہ کرنے لگے

یہاں تک کہ جب مسلم یونیورسٹی کی تحریک شروع ہوئی تو مسلمانوں کے ہر طبقے نے اس کا خیر مقدم کیا ، علما نے اس کی تائید کی اور مجلس ندوۃ العلما نے تو مالی اعانت سے بھی دریغ نہیں کیا۔ بعد میں جامعہ اسلامیہ کی تجویز جب پیش کی گئی تو پوری مسلمان قوم نواب صاحب کی ہمنوا تھی اور ۱۹۱۳ء کے وسط تک صورت حال یہ ہو گئی تھی کہ انگریز پرست عناصر اپنے آپ کو الگ تھلگ محسوس کرنے لگے تھے۔

پھر ۱۹۱۴ء میں جب عالمی جنگ چھڑ گئی اور احرار ملّت نظر بند کر دیے گئے تو مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے ان ممبروں نے جو حکومت وقت کی تجویز کے ہمنوا تھے ، اس کی کوشش کی کہ حکومت کی تجویز منظور کر لی جائے ، لیکن اس کوشش میں کئی سال لگ گئے ۔ ادھر علی گڑھ کالج کے بہت سے بہی خواہوں کو جب یہ یقین ہو گیا کہ حکومت کالج کو ایک آزاد یونیورسٹی نہیں بننے دے گی تو انہوں نے وقار الملک کی اسکیم کو عملی شکل دینے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس کام میں ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری اور ان کے ساتھی پیش پیش تھے۔ اس زمانے میں یہ خبر عام تھی کہ "والیٔ بھوپال کی سرپرستی میں عنقریب سلطانیہ کالج کے نام سے ایک آزاد دارالعلوم دہرہ دون میں بننے والا ہے اور علی گڑھ کالج کے اکثر طلبہ یہ سوچ رہے تھے کہ بس اب ہم ہوں گے اور سلطانیہ کالج کی تعلیم اور سامراج دشمنی کی فضا"[؎] اس سے یہ بات واضح ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام سے بہت پہلے مسلمانوں میں آزاد تعلیمی ادارہ کا تصور روز بروز مقبول ہو رہا تھا۔

جنگ ختم ہوئی تو معلوم ہوا کہ دنیائے اسلام پر ایک بڑی مصیبت ٹوٹ چکی ہے اور خود ہندستان میں عوام کی حالت دگرگوں ہے ۔ ہندستان کے مسلمانوں میں ممالک اسلامیہ میں یورپی طاقتوں کی اور خاص طور پر برطانوی سامراج کی اسلام دشمنی کے رویے سے ایک ہلچل پیدا ہوگئی۔ نتیجے میں خلافت تحریک شروع ہوئی اور علما نے جمعیۃ العلما کے نام سے اپنی تنظیم بنائی ۔ اس کے بعد برطانوی حکومت کے خلاف ترک موالات کا بگل بجا۔ اس تحریک میں علما ، علی برادران اور سارے احرار ملّت پیش پیش تھے۔ جامعہ ملیہ کا قیام انہیں ہنگامہ خیز قومی و ملّی تحریکات کا مرہون منت تھا ۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کا تخیل یکایک ذہنوں میں آ گیا ، بلکہ جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا ہے یہ درحقیقت نتیجہ تھا آزاد تعلیم کے اس تخیل کا جو سرسید ،سید محمود ، اور وقارالملک کے ذہنوں میں تھا اور جسے برگ و بار لانے اور اپنے وجود کو عملی زندگی میں مستحکم کرنے کا موقع فراہم کیا ، مسلم یونیورسٹی کے قیام کی تحریک کے سلسلے میں حریت پسند مسلمانوں اور حکومت وقت کے مابین اختلاف اور کشمکش نے ! اور پھر آخر میں خلافت اور ترک موالات کی تحریکوں نے۔

اب اس موقع پر شیخ الہند مولانا محمود الحسن رح کے اس اہم افتتاحی خطبے کو یاد کرنا چاہیے جو انہوں نے ۲۹ راکتوبر ۱۹۲۰ء کو ایم-اے-او کالج علی گڑھ کی مسجد کی دیوار کے سہارے بیٹھ کر قوم کے حریت پسند اجتماع کے سامنے پیش کیا تھا۔ انہوں نے فرمایا تھا:

"اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غمخوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندستان کے دو تاریخی مقاموں (دیو بند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا۔"

شیخ الہند رح نے یہ بات بھی کہی تھی کہ "بغداد میں جب مدرسہ نظامیہ کی بنیاد اسلامی حکومت کے ہاتھوں میں رکھی گئی تو اس دن علما نے جمع ہو کر علم کا ماتم کیا کہ افسوس آج سے علم حکومت کے عہدے اور منصب حاصل کرنے کے لیے پڑھا جائےگا۔ تو کیا آپ ایک ایسے کالج سے فلاح قومی کی امید رکھتے ہیں جس کی امداد اور نظام میں بڑا قوی ہاتھ ایک غیر اسلامی حکومت کا ہو"۔

قدیم و جدید کا یہ ملاپ اور آزاد تعلیمی ادارے کا قیام اس گہرے احساس کا نتیجہ تھا جو تقریباً پچاس سال تک تعلیمی مقاصد کی یک رخی کے سبب مسلمانان ہند میں پیدا ہوا تھا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو اگر اس لحاظ سے دیکھیے تو یہ انگریزی سامراج اور نصاریٰ کی سیاسی و ذہنی غلامی کے خلاف ایک ایسی تعلیمی تحریک تھی جس کا ایک مخصوص نصب العین تھا اور جس کو وطن عزیز کی سیاسی آزادی کے وقت تک، مختلف نشیب و فراز کے باوجود یہ اپنے سینے سے لگائے رہی اور اس کی اشاعت کرتی رہی۔ اس تعلیمی تحریک کی چند خصوصیات تھیں جنھیں اس کے وجود کے اولین برسوں میں حکیم اجمل خان مرحوم اور مولانا محمد علی مرحوم اور دوسرے اکابر ملّت نے اپنے اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا۔ اس برصغیر میں مسلمانوں کی تعلیم کا بنیادی منہاج اور مقصد، ان خصوصیات کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا، ہاں کسی قدر زمانے اور علاقائی حالات کا خیال رکھنا ہوگا۔

حکیم صاحب مرحوم نے دسمبر ۱۹۲۱ء میں فرمایا تھا کہ جدید ملّی تعلیم کا مقصد ایسے مسلمان پیدا کرنا ہے "جو اپنے مذہب سے صرف واقف ہی

نہیں بلکہ ان پر سختی سے عامل بھی ہوں ---- جو جدید علوم سے واقف ہوں ، لیکن نمونہ ہوں اسلامی طرز زندگی کا ، جو اپنی روزی کمانےمیں بھی کسی کے دست نگرنہ ہوں اور ایک خود دار مسلمان کی طرح زندگی بسر کر سکیں"۔ اور اسی لیے کہ پیکر ملّت قرآن سے زندہ ہے،" ہم نے تعلیمِ قرآن کو اپنے نظام میں مرکزی حیثیت دی" اور تمام دیگر علوم جدیدہ کو قرآن اور اسلام کا خادم بنایا۔تاریخ اسلام کی تعلیم اسی لیےضروری قرار دی گئی کہ " نفس ملّیہ" کا تواتر قائم رہے ، اور مسلمانوں میں یہ احساس پیدا ہو کہ وہ ایک عظیم الشان تہذیب کے امانت دار ہیں ۔اس کے علاوہ چونکہ غیرزبان کے ذریعہ سے تعلیم دینے کا طریقہ غیر فطری تھا اور اس سے سوائے اس کے کہ ملازمین و محکومین پیدا ہوتےرہیں ، طلبہ میں ذوق نشوونما اور ان کے اعمال میں اس کا اثر مفقود رہے اور پوری قوم کی ذہنی صلاحیتیں مفلوج ہوکر رہ جائیں ، ہم نے جامعہ ملیہ اسلامیہ" یعنی جدید نظام تعلیم میں اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا اور اس طرح ان تمام مکارانہ کوششوں سے اپنےکو مامون کرلیا جو مذہب سے ناواقفیت، تاریخ ملّی سے بے خبری اور غیر زبان میں تعلیم حاصل کر کے معارف علوم سے بالکل نابلد رہنے کے باعث ہمیں ہمیشہ کے لیے مغرب کے تمدن مادی کی غلامی میں ڈال دیتی تھیں "[8]

مولانا محمد علی نےجنوری ۱۹۲۸ء میں ہمدرد میں اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ جامعہ ملیہ ہے کیا ؟ لکھا تھا کہ"از کلید دیں در دنیا کشاد" جاننے والے جانتے ہیں کہ صدیوں پر پھیلی اسلامی معاشرہ کی پوری تاریخ اس بلیغ مصرعے کی تشریح اور وضاحت ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ہر مسلمان طالب علم کےلیے عربی زبان لازمی قرار دی گئی تھی ، مسلمانوں کے جدید نظام تعلیم میں یہ ایک بڑا اہم اقدام تھا ۔ اللہ کی کتاب جو دین اسلام کی اساس ہے ، عربی زبان میں ہے ، عربی زبان ہی وہ زبان ہے جو دنیا کے تمام مسلمانوں کو ایک تہذیبی رشتے اور ایک " امت مسلمہ" کے احساس کی زنجیر میں جوڑے ہوئے ہے۔ ان دونوں امور کے پیش نظر یہ فیصلہ بڑا تاریخ ساز تھا کہ جامعہ میں عربی زبان پر خاص توجہ دی جائے اور اسے ہر مسلمان طالب علم کےلیےلازمی قرار دے کر تفسیر و حدیث اور عقائد و فقہ کی تعلیم کے ساتھ طلبہ میں براہ راست قرآن فہمی کا شوق پیدا کیا جائے۔غالباً یہی سبب تھا کہ عربی ادب میں نثر کا کورس قرآن کریم اور صرف قرآن کریم کو رکھا گیا تھا۔ پہلی صدی ہجری کے وسط سے لے کر آج تک دنیائے اسلام کے مختلف ملکوں میں جہاں مقامی زبانیں عربی کے علاوہ کچھ اور تھیں یا ہیں عربی زبان ہی کے ذریعہ سے جو اسلامی ثقافت کی زبان رہی ہے ، رشتۂ اتحاد

قائم رہا ہے اور آئندہ بھی یہی صورت رہے گی کیونکہ قرآن کی زبان عربی ہے۔

۱۹۲۷ء میں امیر جامعہ حکیم اجمل خان مرحوم نے اپنی آخری تحریر میں جسے انہوں نے ایک سپاس نامے کی شکل میں غازی امان اللہ خاں کی خدمت میں پیش کیا تھا تاکہ ان کے ذریعہ سے وہ تمام عالم اسلام کو اس تعلیمی تحریک یعنی جامعہ ملیہ کے اغراض و مقاصد سے روشناس کرا دیں جو باتیں کہی تھیں مولانا محمد علی نے ۱۸/جنوری ۱۹۲۸ء کے ہمدرد میں ان کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ " دینداری ہی کو صحیح دنیاداری سمجھنا اور دنیا کو صحیح طریقے پر برتنے ہی کو دین جاننا، (طلبہ کو) اسراف کی عالمگیر وبا سے بچانا، ان میں سادگی اور جفاکشی کی عادت و خصلت پیدا کرنا، پھر دستکاری سیکھنے پر اس قدر اصرار کرنا کہ انہیں اس قسم کی محنت سے عار نہ ہو اور اگر دماغی قابلیت سے کسی وقت اکل حلال کی صورت نہ بھی نکل سکے تب بھی وہ قوت لایموت جائز طریقے پر حاصل کرنے سے محروم نہ رہیں"۔ جامعہ کی وہ دوسری خصوصیات ہیں جو اسے دوسرے تعلیمی اداروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ پھر جامعہ نے خدا پرستی، ملّت پروری اور وطن دوستی کو اس طرح بہم آمیز کیا ہے کہ ملک کی دوسری تعلیم گاہوں میں محبت و اخوت کے ایسے نمونے مشکل ہی سے ملیں گے جیسے کہ اس درس گاہ میں ڈھلتے ہیں۔

جامعہ کا ایک تہذیبی رول بھی تھا جسے شعوری طور پر نتیجہ خیز بنانے کی کوشش کی گئی۔

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ان کا ایک تمدنی نصب العین ہے جو ان کے مذہب کے سائے میں ہر طرح کے یک رخے پن اور جمود سے بری، نامی، جامع اور مکمل ہے، اس لیے اسے ذہنی زندگی کے ہمہ جہتی تقاضوں اور وقت کی ضروریات کے مطابق ہونا چاہیے۔ جامعہ نے اپنے تعلیمی مقاصد میں اس بات کا لحاظ رکھا تھا کہ اس کے مسلمان طلبہ اسلامی تمدن کو اپنی شخصی و ملّی زندگی کی بنیاد بنائیں، لیکن وہ مغربی تہذیب سے جو رفتہ رفتہ عالمی تہذیب بنتی جا رہی ہے اور ہندستان کی قومی تہذیب سے بھی اپنا رشتہ قائم رکھیں، اسی طرح کہ ان کے ملّی تشخص پر کوئی آنچ نہ آئے۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی مسلمان ہیں انہیں اسی طرح کے تمدنی مسائل پیش آئے ہیں اور آئندہ بھی آتے رہیں گے اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے تمدنی نصب العین کی ماہیت کے فریم ورک میں ا تعلیمی نصب العین متعین کریں۔ جامعہ ملیہ نے اپنے نظریۂ تعلیم اور عملی تعلیم سے اس سلسلے میں کچھ رہنمائی کی تھی، درحقیقت یہ خاصا بڑا چیلنج تھا جو اس برصغیر میں اس زمانے میں مسلمانوں کے سامنے تھا۔

یہ چیلنج آج بھی موجود ہے جس کا جواب مسلمان تعقل ،تفکر اور تفقہ سے کام لے کر ایک مثبت ، فعال اور جامع تعلیمی دستور العمل کے ذریعہ سے دے سکتے ہیں ۔

جامعہ ملیہ نے ایک کام اور کیا ہے اور وہ ہے تحقیقات علمی اور اشاعت علوم کا کام ۔ اس کام کو اگرچہ وہ وسیع پیمانے پر نہیں کر سکی ،لیکن اس نے اس کی اہمیت کو سمجھا ، اس طرف توجہ دلائی ، اور یاد دلایا کہ اسلامی تہذیب کا یہ اتنا بڑا کارنامہ رہا ہے کہ دنیا اس بار احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ ہمارے قدیم نظام تعلیم میں بہر حال اس کی گنجائش تھی، لیکن علی گڑھ کالج میں جو نظام تعلیم رائج ہوا وہ اس سے عاری تھا اور اگر اس وقت وہاں تحقیقات علمی کے جوچند محرم راز موجود تھے وہ قدیم تعلیم ہی کے پروردہ و پرداختہ تھے ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اس جمود کو توڑا اور اپنا مطبع قائم کر کے تحقیقات علمی کے شوق کو مہمیز لگائی ۔بعد میں اس کے اساتذہ نے تصنیف و تالیف اور تراجم کے ذریعہ سے اس کام کو خاصا آگے بڑھایا اور حق جوئی اور علم طلبی کی صحت مند روایات قائم کیں ۔

لیکن تمدنی مسائل کا شعور اور تحقیقات علمی کا شوق ، یہ دونوں چیزیں اعلا تعلیم کی سطح سے تعلق رکھتی ہیں ، جامعہ کے وسائل جب بہت محدود ہو گئے اور اعلا تعلیم کی توسیع ممکن نہیں رہی بلکہ اس کا کام سمٹنے لگا تو اس نے تعلیم کی ابتدائی اور ثانوی منزلوں کی طرف توجہ کی کہ طالب علم کو اعلا تعلیم اس وقت ملتی ہے جب اس کی سیرت بن چکی ہو اور پختہ ہو چکی ہو ۔ یہ ممکن تھا کہ جامعہ کی بےسروسامانی نہ بڑھتی تو بچوں کی تعلیم کی طرف توجہ اس طرح مرکوز نہ ہوتی جس طرح ۱۹۲۸ء کے بعد ہوئی جب حکیم اجمل خان مرحوم کا انتقال ہوا ۔تعلیم میں تربیت اور تہذیب نفس کی جو قوتیں ہیں ان کے ظاہر ہونے اور نشوونما پانے کا خاص وقت اسکول کی تعلیم کا زمانہ ہوتا ہے اور اس کےلیے اسکول کی جماعتیں اور دارالاقامے یا گھر خاص مواقع ہوتے ہیں ۔جامعہ ملیہ نے بچوں کی تعلیم کو ایک ایسی تعلیمی تحریک بنا دیا اور ایسے ایسےتعلیمی تجربے کیے کہ ہندستان کے اسکولوں میں اس وقت تک شاید ہی کہیں کیے گئےہوں گے ۔ اس کام میں ڈاکٹر ذاکر حسین ایسے ماہر تعلیم کی رہنمائی جامعہ کو حاصل تھی ۔انھوں نے جرمنی میں جو کچھ دیکھا تھا اس سے بہت اثر لیا تھا ۔ انھیں اس کا بھی احساس تھا کہ مسلمانوں کے لیے ملک بھر میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا ایسا نظام نہ تھا جس میں تعلیم کا جدید طریقوں پر کام کیا جاتا ہو ۔ انھوں نے اور ان کے

ساتھیوں نے طے کیا کہ وہ پہلے اس میدان میں تجربے کریں اور یونیورسٹی کی اعلا تعلیم کو اس حد تک محدود رکھیں کہ اس کی بدولت انہیں اپنی ضرورت کے مطابق اچھے کام کرنے والے مل سکیں ۔اس میں بڑی کامیابی ہوئی اور اس کام کی ضرورت اور افادیت کی وجہ سے قوم نے اس کو پسند کیا اور جامعہ کا دائرہ عمل اتنا وسیع ہوا کہ اس نے ایک تجرباتی تعلیمی ادارے کی حیثیت اختیار کرلی ۔ مکتبہ جامعہ نے (پیام تعلیم) اور اپنے اشاعتی پروگرام کے ذریعہ بچوں کے لیے معیاری لٹریچر فراہم کیا اور اس طرح بچّے جن کی تعلیمی ضرورتیں عام طور پر نظر انداز کر دی جاتی تھی ، قوم کی امانت قرار پائے اور ان کے مستقبل کو قوم کا مستقبل قرار دیا جانے لگا ۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ نے تعلیم گاہوں کو کبھی فلسفی کا اونچا مینار نہیں سمجھا ، اس نے اس پر زور دیا کہ علم کی روشنی اور تعلیم کی برکتیں اگر دوسروں تک نہیں پہنچتیں اور معاشرے کا گوشہ گوشہ اس سے منور نہیں ہو جاتا تو ایسے علم اور ایسی تعلیم سے کیا فائدہ ! تعلیم کا کام ایک پیغمبرانہ کام ہے اور اسے ایک تبلیغی جوش و ولولے سے کرنا چاہیے ۔تعلیم سے متعلق اس نظریے کا نتیجہ تھا کہ جامعہ نے تعلیم بالغان اور سماجی خدمت کی تحریک چلائی ، جس سے ملک و ملّت دونوں کو روشنی ملی ، جامعہ کا یہ تعلیمی کام ایک مجتہدانہ کام تھا ، اور یہ کام اس وقت تک کسی یونیورسٹی کی طرف سے ایسے منصوبہ بند طریقے پر نہیں کیا گیا تھا ۔

جامعہ اس بات سے خوب واقف تھی کہ تعلیمی تجربے اور ترقی کے منصوبے کوئی حقیقت نہیں رکھتے اگر قوم کی معنوی روح اور ذہنی قوت جامد ہو کر رہ جائے ، اس لیے قومی زندگی کا کوئی متحدہ مقصد ہونا چاہیے ،اور " تعلیم کا پہلا مقصد " بقول سید سلیمان ندوی مرحوم " یہ ہونا چاہیے کہ وہ قوم کے افراد میں اس کے واحد مقصد کی تبلیغ اور تکمیل کا فرض انجام دے"[۹] بے مقصد تعلیم زندگی کو بے مقصد بنا دیتی ہے اور اس سے قوم کی معنوی روح مردہ ہو کر رہ جاتی ہے ۔ موجودہ زمانے میں وطنیت کا جو تصور ہے وہ یقیناً کبھی کبھی ایسے اعمال و واقعات کا سبب بن جاتا ہے جن سے انسانیت اور خدا ترسی کا جذبہ پناہ مانگتا ہے ۔ اسلام کا مزاج ایسی وطنیت کے تصور سے ابا کرتا ہے ، بالکل اسی طرح جیسے عقل و خرد کی گستاخیوں سے مذہب کا وہ پہلو ابا کرتا ہے جہاں صرف عقیدے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ مسلمانوں کے تعلیمی نظام میں جس طرح عقل و نقل کی تطبیق ضروری ہے اسی طرح اسلامیت اور وطنیت کی تطبیق کی بھی ضرورت ہے ۔

آج کا دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے اور اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں انہیں مضامین کے پڑھنے والوں کا ہجوم ہوتا ہے ، یعنی

ہماری درس گاہوں میں اب صرف نوشت و خواند کا حرفہ پیشہ سیکھنے کے لیے طلبہ داخل ہوتے ہیں جو اعلا سطح پر بھی کسی پیشے ہی کی تعلیم حاصل کرنے کو ترجیح دیتے ہیں ، یہ بات بذات خود کچھ ایسی بری نہیں ، لیکن اس سے علوم انسانی اور سماجی علوم کی جس طرح بے آبروئی ہوئی ہے اور نظام تعلیم معنوی اعتبار سے جس عدم توازن کا شکار ہوا ہے، اس کا نتیجہ یہ دیکھنے میں آ رہا ہے کہ ہماری جامعات اور نچلی سطح کی ہماری درس گاہوں سے زندہ قوم کے افراد کی تخلیق اور آبیاری نہیں ہو رہی ہے اور اس صورت حال کے خوفناک نتائج بھی سامنے آ رہے ہیں - ضرورت ہے کہ ہم تعلیم کے اس نظام کو بدلیں اور مکتب سے لے کر جامعات تک تعلیم کا ایسا نظام بنائیں جس سے اعلا اخلاقی اقدار کے چشمے پھوٹیں اور حیات ملّی کے اسوار کھلیں -

ہمارا خیال ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تعلیمی تحریک میں ایسے حیات پرور عناصر موجود تھے جن کی مدد سے مسلمان آج بھی اپنی قومی و ملّی ضروریات کے لحاظ سے ایک ایسا نظام تعلیم ترتیب دے سکتے ہیں جو ہر لحاظ سے متوازن ، مفید اور جامع ہوگا اور جس سے دین اور دنیا دونوں کے تقاضے پورے ہوں گے -

---

حوالے

۱ - "وقار الملک اور جامعہ اسلامیہ" ، ماہنامہ جامعہ ، ستمبر ۱۹۳۶ء - یہ مضمون وقار الملک کے ایک قلمی مسودہ سے جامعہ میں نقل کیا گیا تھا جسے انھوں نے دہرہ دون میں یکم اکتوبر ۱۹۱۲ء کو اسی موقع پر تحریر فرمایا تھا جب سکریٹری اوف اسٹیٹ نے مسلم یونیورسٹی کے قیام کی تحریک سے متعلق الحاق وغیرہ کے خلاف قطعی فیصلہ دیدیا تھا-

۲ - ایضاً

۳ - ایضاً

۴ - ایضاً

۵ - ایضاً

۶ - اکرام اللّٰہ ندوی ،وقار حیات ،مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۵۰ء ، صفحات ۲۲ - ۵۷۱

۷ - جامعہ ملیہ اسلامیہ - مختصر تاریخ اور دستور العمل ،جامعہ ملیہ ،دہلی، ۱۹۲۷ء ، صفحہ ۱۹ -

۸ - حکیم محمد اجمل خاں ،خطبۂ صدارت (جو جامعہ اسلامیہ کے پہلے جلسۂ تقسیم اسناد منعقدہ ۷ دسمبر ۱۹۲۱ء میں پڑھا گیا) ،مطبع ملیہ، علی گڑھ ، ۱۹۲۱ء ، صفحات ۷ - ۱۵

۹ - مولانا سید سلیمان ندوی ،مسلمانوں کی آئندہ تعلیم ،مکتبہ جامعہ ،صفحہ ۸

پاکستان کا نظام تعلیم ــــ ایک جائزہ

جناب جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی

ہماری سب سے بڑی شامت اعمال یہ ہے کہ جب ہم اپنے معاشرے کی بگاڑ کی اصلاح کے لیے اٹھتے ہیں تو بگاڑ کی اصل جڑ دیکھنے اور اسے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کے بجائے محض چند اوپری دواؤں سے اس کا سرسری علاج کرنا چاہتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ زندگی کے مختلف گوشوں میں اصلاحات کے سینکڑوں کمیشن قومی دولت کا کروڑوں روپیہ صرف کرنے کے بعد جوں کے توں اٹھ جاتے ہیں، اور ہر کمیشن معاشرے کے لیے کچھ نئے مسائل کھڑے کر دیتا ہے، چنانچہ جس رفتار سے ان کمیشنوں کی تعداد بڑھتی ہے اس سے کہیں زیادہ رفتار سے بگاڑ کی جزئیات میں اضافہ ہو رہا ہے۔

تعلیم کے مسئلے پر غور کرتے وقت اصل دیکھنے کی بات یہ تھی کہ تعلیم کا جو نظام اس وقت ہم نے اپنے اوپر لاد رکھا ہے وہ کس نے، کب اور کیوں ہمارے ملک میں رائج کیا تھا؟ جو مقاصد اس نظام کے بانی کے تھے، اگر وہی مقاصد آپ کے بھی پیش نظر ہیں تو سبحان اللہ! اسی نظام کو بنیادی طور پر برقرار رکھتے ہوئے جزوی اصلاحات کا طریقہ اختیار کرتے رہیئے، لیکن اگر اس نظام کو رائج کرنے والے کے مقاصد آپ کے مقاصد سے مختلف تھے، اور جس قسم کی نسل وہ تیار کرنا چاہتا تھا آپ اس کے بجائے کسی اور قسم کی قوم پیدا کرنا چاہتے ہیں تو پھر اس طرز عمل کا آخر کیا جواز ہے کہ تعلیمی نظام کی ساری مشینری سر سے لے کر پاؤں تک آپ وہی رکھتے ہیں جو میکالے نے سرکاری ملازم یا زیادہ صحیح لفظوں میں اپنے ذہنی غلام پیدا کرنے کے لیے بنائی تھی، لیکن اس میں بس ایک مذہبی تعلیم کا چھوٹا سا پرزہ فٹ کر کے یہ چاہتے ہیں کہ اس سے ایک آزاد مسلمان قوم پیدا ہو، جو نوکری کے بجائے دنیا کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے۔ اور جب وہ پرزہ اس انمل بے جوڑ مشین میں فٹ نہیں ہوتا تو اسے گھس گھس کر اس کی شکل و صورت ہی بگاڑ ڈالتے ہیں۔ آپ کے سارے کمیشن اور سارے مشاورتی بورڈ اس سوچ میں توانائیاں صرف کر رہے ہیں کہ اس پرزے کو کیسے گھسا جائے کہ وہ مشین میں ٹھیک جڑ سکے، حالانکہ اگر آپ وہ چیز پیدا

نہیں کرنا چاہتے جس کے لیے یہ مشین بنائی گئی تھی تو اس کے لیے چند پرزوں کو نہیں ، پوری مشین کو بدلنا پڑے گا ، اور جب تک یہ انقلابی قدم نہیں اٹھایا جائے گا ، آزادی فکر و عمل کی وہ منزل کبھی قریب نہیں آسکے گی جس کے لیے پاکستان بنایا گیا تھا۔

موجودہ نظام تعلیم کا بانی لارڈ میکالے تھا ، اور اس نے جو اپنی تاریخی یادداشت ۱۸۳۵ء میں مقبوضہ ہندستان کے گورنر جنرل کو پیش کی تھی اس میں اس نظام تعلیم کے تمام مقاصد پوری صفائی بلکہ ڈھٹائی سے کھول کھول کر بیان کر دیئے گئے تھے۔ اس کا سب سے بڑا مشن یہ تھا کہ ہندستان کے باشندوں ، بالخصوص مسلمانوں کو ، اپنے سارے تہذیبی ورثے کے بارے میں شدید احساس کمتری کا شکار بنا کر ان کے دلوں پر مغرب کی ہمہ گیر بالادستی کا سکّہ بٹھا دیا جائے ، اور نئی نسل کو ہر ممکن طریقے سے یہ یقین کو لینے پر مجبور کر دیا جائے کہ اگر دنیا میں ترقی اور سربلندی چاہتے ہو تو اپنی فکر ، اپنے فلسفے ، اپنی تہذیب ، اپنی معاشرت اور اپنے سارے ماضی پر ایک حقارت بھری نظر ڈال کر مغرب کے پیچھے پیچھے چلے آؤ ، اور اپنی زندگی کا ہر راستہ اسی کے نقوش قدم میں تلاش کرو ۔

لارڈ میکالے کے مندرجہ ذیل الفاظ بطور خاص غور سے پڑھیے!

> مجھے نہ تو عربی سے کوئی واقفیت ہے نہ سنسکرت سے ، مگر ان کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے میں جو کچھ کر سکتا تھا ،اس میں کوئی کسر میں نے اٹھا نہیں رکھی ۔ ۔
>
> میں اس بات پر بھی تیار ہوں کہ مستشرقین جو اہمیت ان علوم کو دیتے ہیں ، وہی میں بھی دوں ، ان حضرات میں مجھے کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ملا جو اس حقیقت سے انکار کرے کہ یورپ کے کسی اچھے کتب خانے کی محض ایک الماری ہندستان اور عرب کے سارے ادبی سرمایہ پر بھاری ہے ۔
>
> (میکالے کا نظریہ تعلیم ، مترجمہ عبد الحمید صدیقی — ص ۲۷ ، ۲۸ ۔ مطبوعہ روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی ، کراچی)

آگے لکھتا ہے

> میری آج تک کسی ایسے مستشرق سے ملاقات نہیں ہوئی جو اس بات کا دعویدار ہو کہ عربی اور سنسکرت شاعری کو یورپین شاعری کے مقابلے میں کھڑا کیا جاسکتا ہے ، لیکن جب ہم ان تخلیقات کے دائرہ سے باہر نکل کر جن کا محور محض

تخیل ہے ، ان علوم کی طرف نگاہ دوڑاتے ہیں جو حقائق پر مبنی ہیں ، جن میں تجربہ و مشاہدہ بطور اساس کام کرتے ہیں تو اس وقت یورپ کی فضیلت مسلّم ہو جاتی ہے[۵۰]

ایک صفحے کے بعد لکھتا ہے

اب حل طلب مسئلہ صرف یہ رہ جاتا ہے کہ جب ہمیں ایک زبان کی تعلیم دینے کا اختیار حاصل ہے تو کیا پھر بھی ہم ان زبانوں کی تعلیم دیں گے جن میں مسلمہ طور پر کسی موضوع سے متعلق بھی کوئی ایسی قابل قدر کتاب نہیں ملتی جسے ہماری زبان کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہو ؟ جب ہم یورپین علوم پڑھانے کے معاملے میں بالکل آزاد ہیں تو کیا پھر بھی ہم ان علوم کی تعلیم دیں گے جو یورپین علوم سے جہاں کہیں مختلف ہیں ، وہاں ان کی لغویت مسلمہ طور پر نمایاں ہے۔

جب ایک صحیح فلسفہ اور تاریخ کی سرپرستی رکھنے کی قدرت رکھتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ہم سرکاری دولت کے صرف سے وہ طبی اصول پڑھائیں ، جن کو دیکھ کر انگلستان کا نعل بند بھی خفت محسوس کرتا ہے ، وہ علم ہئیت جس پر انگریزی اسکولوں کی بچیاں بھی خندہ زن ہوں گی ، وہ علم تاریخ جو تیس تیس فٹ لمبے قد کے بادشاہوں کے تذکرے سے بھرا پڑا ہے ، جنھوں نے تیس تیس ہزار سال تک حکمرانی اور فرمانروائی کی ، وہ جغرافیہ جو شیرے ، راب اور مکھن کے سمندروں کے بیانات پر مشتمل ہے[۱]۔ (صفحہ ۵۲ تا ۵۴)

آگے لکھتا ہے

اس بات پر بہت اصرار کیا گیا ہے کہ ہند و قانون تو سنسکرت کی کتابوں سے اور محمڈن لاء عربی کتابوں ہی سے اخذ کرنا ہوگا ، لیکن یہ معاملہ مسئلۂ زیر بحث پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ ہمیں پارلیمنٹ نے اس بات کا حکم دیا ہے کہ ہم ہندستان کے لیے قوانین مرتب کریں۔ اس مقصد کے لیے ہمیں لاء کمیشن کی امداد بھی بہم پہنچائی گئی ہے۔ جس وقت نیا ضابطۂ قانون نافذ ہوگا ، اس وقت منصفوں اور صدر امینوں کے لیے شاستر اور ہدایہ بالکل بےکار ہو جائیں گی ، مجھے

امید واثق ہے کہ وہ طلبہ جنھوں نے اب عربی مدارس اور سنسکرت کالجوں میں داخلہ لیا ہے ، ان کے تعلیم سے فارغ ہونے سے پیشتر ، یہ عظیم کام پایہ تکمیل تک پہنچ چکا ہوگا۔ ہمارا یہ فعل بدیہی طور پر احمقانہ ہوگا کہ ہم نئی نسل کو ان حالات کے پیش نظر تعلیم دیں جنہیں ان کے جوان ہونے سے پہلے ہم بدل دینے کا ارادہ رکھتے ہیں ۔ (صفحہ ۶۵)

میکالے عربی زبان کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کرتا ہے ۔

عربی اور سنسکرت کے حق میں ایک اور دلیل جو اس سے بھی کہیں زیادہ کمزور اور بودی ہے ، یہ دی جاتی ہے کہ ان زبانوں میں چونکہ کروڑوں انسانوں کی مقدس کتابیں موجود ہیں ، اس بنا پر یہ خصوصی امداد کے مستحق ہیں ۔ سرکار انگریزی کا بلا شبہ یہ فرض ہے کہ وہ ہندستان کے مذہبی معاملات میں نہ صرف رواداری ہو بلکہ غیر جانب دار بھی ہو ، مگر کسی ایسے ادب کی جو مسلمہ طور پر بہت کم قدر و قیمت کا حامل ہے ، محض اس وجہ سے حوصلہ افزائی کرتے چلے جانا کہ اس میں بعض اہم موضوعات پر انتہائی غلط باتیں موجود ہیں ، میرے نزدیک ایک ایسی روش ہے جس کی تائید نہ عقل کرتی ہے نہ اخلاق اور نہ وہ غیر جانب داری جس کا قائم رکھنا ہم سب کا مقدس فرض ہے ۔ ایک ایسی زبان جس کے بارے میں ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ اس کا دامن ہر قسم کی مفید معلومات سے خالی ہے ، کیا اس کے پڑھانے کا اس لیے التزام کیا جائے کہ وہ ہیبت ناک اوہام کو جنم دیتی ہے ؟ کیا ہم جھوٹی تاریخ ، غلط علم ہئیت اور غلط تاریخ محض اس لیے پڑھائیں کہ ان سے ایک باطل مذہب کی تائید ہوتی ہے ؟

ہم اس بات سے بہت زیادہ احتراز کرتے ہیں ، اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے کہ ان مسیحی مشینریوں کی سرکاری طور پر پشت پناہی کی جائے ، جو اہل ملک کو عیسائی بنانے میں مصروف ہیں[۲]، جب عیسائیت کے بارے میں ہمارا طرز عمل یہ ہے تو کیا یہ مناسب ہوگا کہ ہم حکومت کے خزانے سے رشوت دے کر لوگوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ اپنی نئی نسل کو اس قسم کی تعلیم دلوائیں جس کے ذریعہ سے انسان یہ

جان سکے کہ گدھے کو چھونے کے بعد آدمی کس طرح پاک ہو سکتا ہے، یا وید کے کن اشلوکوں سے بکرا مار دینے کا کفارہ ادا کیا جا سکتا ہے (صفحہ ۲۲ و ۲۷)

عربی مدارس سے شدید نفرت اور اس کے اسباب کا بیان اس طرح فرمایا جاتا ہے۔

عربی اور سنسکرت کالجوں پر اس وقت جو کچھ خرچ ہو رہا ہے، وہ نہ صرف صداقت کی حق تلفی ہے، بلکہ سرکاری خزانے سے غلط کاروں کی پرورش کی جا رہی ہے۔اس رقم سے ایسی پناہ گاہیں تعمیر ہو رہی ہیں، جن میں نہ صرف مجبور و بے بس بیروزگار پناہ لیتے ہیں، بلکہ ان کے اندر ایسے متعصب اور تنگ نظر لوگوں کو بھی پرورش کیا جا رہا ہے جو اپنے تعصبات اور مفادات کی بنا پر پھر نئی تعلیمی اسکیم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ (صفحہ ۲۳)

پھر اپنی اس رپورٹ کے آخر میں نظام تعلیم بدلنے کی اصل غرض و غایت کو نہایت واشگاف الفاظ میں اس طرح بیان کرتا ہے۔

ہم فی الحال اپنے محدود ذرائع کے ساتھ سب لوگوں کی تعلیم کا بندوبست نہیں کر سکتے، ہمیں اس وقت بس ایک طبقہ پیدا کرنے کی سعی کرنی چاہیے جو ہمارے اور ان کروڑوں انسانوں کے مابین ترجمانی کے فرائض سرانجام دے سکے، جن پر ہم اس وقت حکمراں ہیں۔ایک ایسا طبقہ جو خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندستانی ہو، مگر ذوق، طرز فکر، اخلاق اور فہم و فراست کے نقطۂ نظر سے انگریز۔پھر اس کام کی ذمہ داری اس طبقے پر چھوڑ دیں کہ وہ اس ملک کی بولیوں کو سنوارے، مغربی علوم سے سائنسی اصطلاحات لے کر ان زبانوں کو مالا مال کرے، اور آہستہ آہستہ انہیں اس قابل بنائے کہ ان کے ذریعہ سے ملک کی آبادی کو تعلیم دی جا سکے۔ (صفحہ ۲۹)

ان اقتباسات سے یہ بات کسی بھی درجے میں ڈھکی چھپی نہیں رہ جاتی کہ اس نظام تعلیم کے ذریعہ سے انگریزوں کا مقصد کیا تھا؟ اور وہ اس نظام تعلیم کے ذریعہ سے کس قسم کی نسل تیار کرنا چاہتے تھے؟

لارڈ میکالے کے یہ اقتباسات کسی تبصرے کے محتاج نہیں ہیں، میکالے نے اپنی اس رپورٹ میں علوم مشرق کے خلاف جس اندھے تعصب اور للّٰہی

بغض کا مظاہرہ کرتے ہوئے حقائق کو بری طرح مسخ کیا ہے اس پر ہمیں کچھ کہنا نہیں۔ مشرق اور بالخصوص اسلام کے ساتھ۔ یہ بغض تو انگریزوں کے خمیر میں شامل ہے، ایک موروثی روگ کی طرح اس بے چارے کو بھی ورثے میں ملا تھا، لیکن ہمیں کہنا صرف یہ ہے کہ ان اقتباسات میں یہ حقیقت صاف پڑھی جا سکتی ہے کہ اس نظام تعلیم کی بنیاد مشرق، مشرقی علوم، مشرقی مذاہب اور مشرقی تہذیب و معاشرت سے نفرت و عداوت پر رکھی گئی تھی، اور اس نظام کے بانیوں کی تصریح کے مطابق اس کا مقصد ایسے "کالے انگریز" پیدا کرنا تھا جو زندگی کے ہر شعبے میں مغرب کی اندھی تقلید کو اپنا شعار بنا کر زندگی کے آخری سانس تک انگریزوں کے غلام بنے رہیں، اور کبھی ان کی کسی، "اسکیم پر صدائے احتجاج بلند نہ کریں۔" چنانچہ اس نظام تعلیم کے رگ و ریشہ میں مشرق، مشرقی علوم اور مشرقی تہذیب سے نفرت کے تصورات بری طرح سمائے ہوئے ہیں، اور اس نظام تعلیم سے گزر کر جو ذہن تیار ہوتا ہے وہ مغرب کے مقرر کیے ہوئے دائروں سے باہر نکلنے کی مطلق جرات نہیں رکھتا۔

لہذا مسئلہ صرف ایک گھنٹے میں، "مذہبی تعلیم"، دینے کا نہیں، بلکہ اس پورے نظام تعلیم کو یکسر بدلنے کا ہے جس نے ہم سے ہماری قومی خودداری، ہمارا ملی شعور اور ہمارے ماضی کا سارا تہذیبی اثاثہ چھین کر ہمیں تادم زیست مغرب کا غلام بنانے کی سازش کی تھی۔ "یورپ کے کسی اچھے کتب خانے کی محض ایک الماری ہندستان اور عرب کے سارے ادبی سرمایہ پر بھاری ہے" — "عربی زبان میں کسی موضوع سے متعلق بھی کوئی ایسی قابل قدر کتاب نہیں ملتی جسے انگریزی زبان کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہو" — "مشرقی علوم یوروپین علوم سے جہاں کہیں مختلف ہیں وہاں ان کی لغویت مسلمہ طور پر نمایاں ہے" — "طب مشرق کے اصول دیکھ کر انگلستان کا نعل بند بھی خفت محسوس کرتا ہے" — "عربی زبان کا دامن ہر قسم کے مفید معلومات سے خالی ہے، اور وہ ہیبت ناک اوہام کو جنم دیتی ہے" اور "مشرق کی تاریخ اور فلسفہ جھوٹا ہے، اور باطل مذہب کی تائید کے لیے وضع کیا گیا ہے" — ظاہر ہے کہ جس نظام تعلیم کی بنیاد ان تصورات پر اٹھائی گئی ہو، اس میں صرف ایک "مذہبی تعلیم" کا تھوڑا سا اضافہ کر کے اس زہر کا بدرقہ کیسے کر سکتے ہیں جس کے اثرات ہر علم، ہر فن اور ہر نصاب میں غیر محسوس طور پر گھسے ہوئے ہیں؟

اس کے علاوہ انگریز کے ذہن میں کبھی ایک لمحے کے لیے بھی یہ بات نہیں رہی کہ ہندستان اور بالخصوص مسلمانوں میں نئے علوم کے اعلا درجے کے ماہرین پیدا کیے جائیں۔ یہ نظام صرف ایسے سرکاری ملازم پیدا کرنے

کے لیے بنایا گیا تھا جو بقول میکالے " ہمارے اور ان کروڑوں انسانوں کے مابین ترجمانی کے فرائض انجام دے سکے جن پر ہم حکمران ہیں"۔ اس لیے یہاں سائنس اور ٹیکنالوجی کا معیار ہمیشہ سے انتہائی پست رکھا گیا ہے، لہذا اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کے نظام تعلیم سے ایسے افراد تیار ہوں جو کھلے ذہن کے ساتھ دنیا کا ہر مفید علم وفن حاصل کریں، مغرب کی اندھی تقلید کرنے کے بجائے ان علوم و فنون میں اجتہادی بصیرت پیدا کریں اور ذہنی غلامی کے بندھن توڑ کر اپنی زندگی کے راستے اسلامی اصولوں کی روشنی میں آپ متعین کریں تو آپ کو تمام جدید علوم کے نظام و نصاب کو از سر نو مدون کرنا ہوگا، اور ان تمام علوم سے مادہ پرستانہ تصورات کو نکال کر ان میں مسلمانوں کے افکار، مسلمان ذہنیت اور اسلامی طرز فکر کو سمونا پڑے گا۔ اس کے بغیر ایک آزاد مسلمان قوم کی تشکیل مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔)

یہ درست ہے کہ یہ کام محنت طلب بھی ہے اور وقت طلب بھی، ہوسکتا ہے کہ اس نظام کو پوری طرح بدلنے میں سالہا سال لگ جائیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس انقلاب کے پورے ثمرات ہم اپنی زندگی میں نہ دیکھ سکیں، لیکن قوم کی ذہنی تعمیر میں وقت لگنا ناگزیر ہے، لارڈ میکالے نے جو بیج ۱۸۳۵ء میں بویا تھا، وہ آج برگ بار لایا ہے، ہم جو بیج بوئیں گے وہ شاید اکیسویں صدی میں پھل لے کر آئے، لیکن محنت سے ڈر کر ہم نے یہ بیج آج بھی نہ بویا تو ہمارے صحن چمن میں ہمیشہ پھولوں کے بجائے جھاڑ جھنکار ہی اگتے رہیں گے، اور سو سال گزرنے پر بھی ہماری آزادی کا قافلہ اسی منزل پر کھڑا رہے گا جہاں وہ ۱۹۴۷ء میں پہنچا تھا۔

۱ ۔ تعلیم کا مقصد

سب سے پہلی اور بنیادی چیز جس کی طرف سب سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے وہ یہ کہ ہماری قوم کے سامنے تعلیم کا ایک اعلا مقصد اور بلند نصب العین ہونا چاہیے۔ لارڈ میکالے کے لائے ہوئے نظام تعلیم کا مقصد ہی چوں کہ سرکاری ملازم پیدا کرنا تھا اس لیے اس نظام کے اثر سے یہ بات ہمارے طلبہ کے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے کہ پڑھنے لکھنے کا مقصد اچھی ملازمتوں کے حصول سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ ہر علم و فن کے حاصل کرتے وقت ان کے سامنے اس کے سوا کوئی مقصد نہیں ہوتا کہ اس کے ذریعہ سے کوئی اچھا ذریعۂ معاش پیدا کیا جائے، لہذا تعلیم کے سلسلے میں ان کی ساری کاوشیں اسی مقصد کے تحت گھومتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال میں خواہ تعلیم کتنی ہی پھیل جائے، نہ اس سے ملک کو اجتماعی سطح پر کوئی خاطر خواہ فائدہ پہنچ سکتا ہے، اور نہ کوئی ایسی قوم وجود میں آ سکتی ہے جو اپنی روٹی اور پیٹ سے آگے کچھ

سوچ سکتی ہو -

لہذا تعلیم کے سلسلے میں سب سے پہلے طرز فکر کے اندر یہ بنیادی تبدیلی لانے کی ضرورت ہے کہ تعلیم کا مقصد صرف حصول معاش نہیں ، بلکہ ذات کی تکمیل ، اعلا انسانی اوصاف کا حصول اور پوشیدہ صلاحیتوں کا نکھار ہے ، اور ان چیزوں کے ذریعہ ہر فرد کو ملک و ملت بلکہ پوری انسانیت کی حقیقی خدمت کے لیے تیار ہونا ہے -

نئے نظام تعلیم کے ذریعہ سے یہ بات ہمارے ہر پڑھے لکھے شخص کے دماغ اور قلب و روح میں سما جانی چاہیے کہ ایک تعلیم یافتہ انسان کا مقصدِ زندگی اپنے لیے بہتر وسائل معاش حاصل کر کے ہرگز پورا نہیں ہوتا ، بلکہ اس کا اصل مقصد اپنے علم ، اپنے فن ، اپنی ذہانت اور اپنی صلاحیت کے ذریعہ سے خود اپنے نظریات ، اخلاق و کردار کو بہتر بنانا اور ملک و ملّت کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانا ہے - معاش کا حصول تعلیم کا ثانوی مقصد تو ہو سکتا ہے ، لیکن اس کا اولین مقصد ، محرک اور نصب العین نہیں -

نصاب کی تدوین نو

انگریزی اقتدار کے عہد میں ہم پر جو نظام تعلیم مسلط کیا گیا تھا اس میں دوسری خرابیوں کے علاوہ ایک بنیادی خرابی یہ تھی کہ اس میں اسلام کو زندگی کے تمام شعبوں سے کاٹ کر عبادتوں اور نجی زندگی کے چند معاملات تک محدود کر دیا گیا تھا - یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ اسلام زندگی کا ایک مکمل نظام ہے ، اور وہ حکومت و سیاست سے لے کر تجارت و معیشت تک زندگی کے ہر شعبے کے لیے اپنی مخصوص تعلیمات اور ہدایات رکھتا ہے - لہذا جس وقت دنیا میں یہ دین عملاً نافذ تھا اس وقت نظام تعلیم کا حال بھی یہ تھا کہ اسلام کی تعلیم صرف اسلامیات کے مضمون کی حد تک محدود نہ تھی ، بلکہ ہر علم و فن کی تعلیم میں اسلام رچا بسا نظر آتا تھا - طالب علم فلسفہ پڑھ رہا ہو یا منطق ، سائنس کی تعلیم حاصل کر رہا ہو یا حساب و ریاضی کی ، طب کی تعلیم میں مشغول ہو یا صنعت و حرفت کی تعلیم میں ، غرض ہر علم و فن کے رگ و ریشہ میں اسے اسلامی نظریات اور مفکرین اسلام کے افکار یا کم از کم اسلامی طرز فکر سمایا ہوا ملتا تھا - اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ علم و فن کے خواہ کسی گوشے کو اپنی زندگی کا محور بنا لے ، وہ ذہنی اور عملی طور پر سچّا اور پکّا مسلمان ہوتا تھا ، اور اس کے دل و دماغ میں اسلام کے مقابلے میں دوسرے افکار سے مرعوبیت پیدا ہو ہی نہیں سکتی تھی - یہ نظام تعلیم اس میں اتنی صلاحیت پیدا کر دیتا تھا کہ وہ ہر نئی فکر ، نئی تحقیق اور نئے فلسفے سے اس کے

صالح اجزا کو اپنا لے ، اور غیر صالح کو چھوڑ دے ۔

لیکن موجودہ نظام تعلیم میں اسلام کی اس ہمہ گیر حیثیت کو سرے سے ختم کر دیا گیا ہے۔اسلام کو صرف "اسلامیات" کے ایک گھنٹے تک محدود کر دیا گیا ہے ، اور اس ایک گھنٹے میں بھی نصاب اور طرز تعلیم کے معیار کو اس قدر پست کر دیا گیا ہے کہ اس سے اسلام کی صحیح تعلیم کا ہزارواں حصہ بھی طالب علم کے سامنے نہیں آ سکتا۔

یہ بات چند مثالوں سے واضح ہو سکے گی ۔

۱ ۔ آج کل ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جو فلسفہ پڑھایا جاتا ہے اس میں یونانی یا نو افلاطونی فلسفے کے بعد طالب علم سیدھا یورپ کے نشاۃ ثانیہ کے بعد کے فلسفے پر پہنچ جاتا ہے ، اور اس کے ذہن پر یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ نو افلاطونی فلسفہ سے لے کر ڈیکارٹ تک کا پورا زمانہ فکر اور فلسفے میں جمود کا زمانہ ہے ۔ علم وفن کی تاریخ میں بھی اس زمانے کو "تاریک زمانہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے ، حالانکہ یہ دور صرف غیر مسلم یورپ کے لیے "تاریک" تھا ، ورنہ یہی وہ دور ہے جس میں مسلمانوں نے آدھی سے زائد دنیا میں علم و فن کے چراغ روشن کیے ہوئے تھے ، اور خود یورپ کا خطہ اندلس ان کی روشنی سے جگمگا رہا تھا ۔ اس دور کے مسلمان فلاسفہ اور متکلمین نے فکر اور فلسفے کے میدان میں جو نئی راہیں کھولی ہیں ، اور اپنی تحقیقات کا جو بیش بہا ذخیرہ چھوڑا ہے ، موجودہ نظام تعلیم میں سرے سے ان کا کوئی ذکر ہی نہیں ملتا ۔

جدید اسلامی نظام تعلیم میں یہ ضروری ہے کہ اس وسیع علمی خلا کو پر کیا جائے جو مغرب کی تنگ نظری اور تعصب نے مصنوعی طور پر پیدا کیا ہے ، اور فلسفے کی تعلیم میں مسلمان فلاسفہ اور متکلمین کے افکار کو ان کا صحیح مقام عطا کیا جائے۔

۲ ۔ سائنس کے بارے میں یہ حقیقت آج پوری دنیا میں مان لی گئی ہے کہ سائنس کی موجودہ ترقی اس استقرائی طریقے کی مرہون منت ہے جس میں صرف قیاس اور تخمین کے بجائے مشاہدہ اور تجربہ کے ذریعہ سے تحقیقات کی جاتی ہیں ، لیکن ساتھ ہی مغربی نظام تعلیم نے ہر کس و ناکس کے ذہن پر یہ تاثر قائم کرا دیا ہے کہ استقرائی طریقۂ تحقیق کو فلسفے میں سب سے پہلا اختیار کرنے والا بیکن اور سائنس میں کوپر نیکس اور گلیلیو ہے ،

حال آنکہ سائنس اور فلسفے میں اس طریقۂ استدلال کی بنیاد مسلمانوں نے ڈالی تھی ، انھوں نے ہی سائنس کا رخ موڑ کر اسے اس راستے پر ڈالا تھا جس پر آج وہ برق رفتاری سے دوڑ رہی ہے۔ اس کے باوجود ہمارا سائنس کا طالب علم خالد بن یزید ، زکریا رازی ، ابن سینا ، خوارزمی ، ابوریحان بیرونی ، فارابی ، ابن مسکویہ ابن رشد ، کندی ، ابومحمد خوجندی ، جابر بن حیان اور موسیٰ بن شاکر جیسے عظیم سائنس دانوں سے یکسر ناواقف رہتا ہے۔

۳۔ معاشیات کی تعلیم میں طالب علم آج صرف یہی جانتا ہے کہ بنیادی طور پر معاشیات کے دو مکتب فکر ہیں ، سرمایہ داری اور اشتراکیت، اسلام کے معاشی اصول اور قوانین اس کی نگاہوں سے بالکل اوجھل رہتے ہیں ، اور اس کو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اسلام نے بھی معیشت کے بارے میں ایسا نظام بنایا ہے جو مذکورہ دونوں مکاتب فکر سے الگ ہے۔ اسی طرح اس کو یہ پڑھایا جاتا ہے کہ علم معاشیات کی بنیاد آدم اسمتھ نے رکھی تھی ، اور اس سے بہت پہلے کے تمام فقہا سے لے کر ابن خلدون اور شاہ ولی اللہ جیسے مفکرین نے علم معاش کی جو خدمات انجام دی ہیں ان کو فہرست سے یکسر خارج کر دیا گیا ہے ۔

۴۔ علم سیاست میں بھی نو افلاطونی فلسفہ اور جدید مغربی فلاسفہ کے درمیان ایک وسیع خلا ہے جو صرف مغرب کے تعصب اور تنگ نظری کی پیداوار ہے۔ سیاست کے بارے میں اسلام کے اصول و تعلیمات اور مسلمان مفکرین کی کاوشوں کا کوئی ادنیٰ سا عکس بھی موجودہ نصاب میں نہیں ملتا ۔

۵۔ یہی حال عمرانیات کا بھی ہے ، شاید ہی کوئی منصف مزاج اس بات سے انکار کر سکے کہ اس علم کے مدونِ اول ابن خلدون ہیں، لیکن عمرانیات کے موجودہ نصاب سے یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اسلام اور مسلمانوں نے بھی اس علم پر کوئی کام کیا ہے۔

۶۔ نفسیات کی تعلیم اب بڑے پیمانے پر ہونے لگی ہے ، لیکن اس سلسلے میں مسلمانوں کے علمائے تصوف نے جو نئی نئی راہیں نکالی ہیں اور نفس انسانی کے عوارض پر جو مفید ترین بحثیں کی ہیں، موجودہ نظام تعلیم میں اس کی کوئی پرچھائیں بھی موجود نہیں ہے۔

۷۔ قانون اور اصول قانون کے بارے میں بھی ہمارا نصاب تعلیم سراسر مغربی افکار و نظریات ہی سے بھرا ہوا ہے ، اصول قانون کی دقیق بحثوں کو لے کر جس بے نظیر انداز میں فقہائے اسلام نے اصول فقہ مدون کیا ہے ، اس سے استفادہ کا کوئی موقع طالب علم کو نہیں ملتا۔

۸۔ اسی طرح بعض علوم میں خالص اسلامی احکام کے اجزا کی ضرورت ہے ، مثلاً حساب میں سود اور سود در سود کے مسائل تو باقاعدہ پڑھائے جاتے ہیں ، لیکن میراث اور زکوٰۃ نکالنے کے طریقوں سے طالب علم ناواقف رہتا ہے۔اسی طرح جغرافیہ کی تعلیم میں سمت قبلہ ، اوقات نماز اور مواقیتِ احرام معلوم کرنے کے طریقے اس کی نظر سے نہیں گزرتے۔نصاب کی نئی تدوین میں اس قسم کی چیزیں شامل ہونی چاہییے۔ غرض وہ علوم جنہیں آج جدید علوم یا مغربی علوم کا نام دے دیا گیا ہے ہمارے نظام تعلیم میں ٹھیک اسی ترتیب اور اسی ڈھانچے کے ساتھ لیے گئے ہیں جو مغرب نے اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ تعصب برتتے ہوئے اسلام کا نام لیے بغیر بنایا تھا۔اب اگر اپنے نظام تعلیم کو اسلامی بنانا اور اس کے ذریعہ سے صحیح اسلامی قومی شعور پیدا کرنا مقصود ہے تو یہ بات خواہ کتنی محنت طلب کیوں نہ ہو ،لیکن ناگزیر اہمیت رکھتی ہے کہ ان علوم کے سلیبس کو اپنے قومی تقاضوں کے تحت اس طرح مرتب اور مدون کیا جائے کہ اس میں اسلام اور مسلمانوں کے افکار اور کارنامے پوری طرح رچے بسے ہوں[۳]۔

زیر تبصرہ تعلیمی پالیسی کے حصہ اول باب اول کے پیرا گراف نمبر ۵ پر غالباً اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ، لیکن اس بات کو مزید وضاحت اور وسعت کے ساتھ تعلیمی پالیسی کا جزو ہونا چاہییے۔

۲۔ اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز فکر

(نظام تعلیم کو اسلامی بنانے کے سلسلے میں دوسرا اہم کام یہ ہے کہ تعلیم کی نصابی کتابوں کو اس طرح مرتب کیا جائے کہ ان کو پڑھ کر طالب علم میں بحیثیت مجموعی ایک مسلمان ذہنیت اور اسلامی طرز تیار ہو)۔اس کی تشریح اور تفصیل یہ ہے کہ کائنات کے تمام چھوٹے بڑے حقائق خواہ وہ اپنی ذات میں کتنے ہی غیر مختلف فیہ کیوں نہ ہوں ، اپنے ادراک کرنے والے ذہن کے اعتبار سے مختلف نتائج و ثمرات پیدا کرتے ہیں۔ایک ذہن کا آدمی کسی حقیقت کا ادراک کر کے ایک نتیجے پر پہنچتا ہے ، اور دوسرے ذہن کا انسان اسی حقیقت کو سمجھ کر کوئی دوسرا نتیجہ نکال

لیتا ہے ، مثلاً سورج کا وجود اور انسانیت کے لیے اس کا نفع بخش ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں ، لیکن ایک ستارہ پرست شخص نے اس حقیقت سے یہ نتیجہ نکالا کہ اتنی فائدہ مند چیز جس پر زندگی کا دارو مدار ہے یقیناً عبادت کے لائق ہے ، لہذا اس کی پرستش شروع کردی ۔ دوسرا شخص جو مادہ پرست تھا ، اسی حقیقت سے اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ در حقیقت یہ ارتقائے کائنات کے سلسلے کی ایک کڑی ہے جو خود بخود وجود میں آگئی ہے ۔ تیسرے شخص نے جو توحید کا قائل تھا یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اتنا عظیم الشان جسم جو پوری دنیا کو اپنی روشنی اور حرارت سے ایک لگے بندھے نظام کے ساتھ فائدہ پہنچاتا ہے ، یقیناً خود بخود وجود میں نہیں آگیا ،بلکہ کسی نے اس کو پیدا کیا ہے ، اور وہی عبادت کے لائق ہے ۔

یہی حال تمام علوم و فنون کا ہے کہ ان میں جو حقائق بیان ہوتے ہیں وہ اپنے تدوین کرنے والوں کی ذہنیت کے مطابق انسان کو مختلف نتائج تک پہنچاتے ہیں ، اور ان علوم کے پڑھنے والے کا ذہن لازماً ان تدوین کرنے والوں کی ذہنیت اور طرز فکر کو بحیثیت مجموعی اخذ کرتا ہے ۔ مغرب کے مادہ پرست نظام فکر نے انہیں خالص مادی فکر کے ساتھ مرتب کیا ہے جو ان علوم میں سرایت کیے ہوئے ہے ، اور شعوری یا غیر شعوری طور پر ان سے مادہ پرستانہ نتائج ہی نکال کر سامنے لاتی ہے ۔ ہماری زبردست غلطی یہ رہی ہے کہ ہم نے ان علوم کے صرف متن کو نہیں اپنایا بلکہ ان حواشی اور تشریحات کو بھی جوں کا توں اپنے نظام تعلیم میں رکھ لیا جو مادہ پرست ذہنیت نے ان علوم میں گھلا ملا دیے ہیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان طالب علم درس گاہ میں پہنچ کر جس فکر سے آشنا ہوتا ہے ، اور اپنے گرد و پیش کی دنیا میں جس کا چلن دیکھتا ہے وہ اس کے عقائد کے نظام سے بالکل متضاد ہوتی ہے ، اور اس کے علم اور عقیدہ کے درمیان ایک سخت کشمکش برپا کر دیتی ہے ۔

(علم اور عقیدہ کی اس کشمکش کا نتیجہ یا تو یہ نکلتا ہے کہ وہ زندگی کے سنجیدہ مسائل پر سوچنا ہی چھوڑ دیتا ہے ، اور اپنی ساری توجہات کا مرکز روٹی اور پیٹ کو بنا کر علم اور عقیدہ دونوں سے عملاً کنارہ کش ہو جاتا ہے ۔ (اور موجودہ دور میں اکثرت ایسے طلبہ کی ہے) یا پھر وہ اپنے علم کو عقیدے پر فوقیت دے کر عقائد کو محض ایک ڈھکوسلا سمجھنا شروع کر دیتا ہے ، اور دین اور مذہب کے بارے میں تشکیک کا شکار ہو جاتا ہے ، یا وہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ دین کے عقائد و احکام خواہ کتنے ہی برحق ہوں، مگر موجودہ دور میں قابل عمل نہیں ۔

اس ساری خرابی کی جڑ یہی ہے کہ ہم اب تک ان علوم کو اسی ذہنیت کے ساتھ پڑھتے پڑھاتے آئے ہیں جس ذہنیت کے ساتھ وہ مغرب میں پڑھے اور پڑھائے جاتے ہیں -

ہمارا نظام تعلیم اس وقت تک "اسلامی" نہیں کہلا سکتا جب تک کہ ان علوم کو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز فکر کے ساتھ از سر نو مرتب نہ کیا جائے، مزید وضاحت کے لیے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں -

سائنس اللہ تک پہنچنے ، اس کی قدرت کاملہ پر غور کرنے اور انسان میں اللہ کے آگے عجز کا احساس پیدا کرکے اس کے حضور سجدہ ریز ہونے کا بہترین ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے ، لیکن ہمارے زمانے میں سائنس کا طالب علم سائنس اور دینی عقائد کو متضاد سمجھتا ہے ، اور بسا اوقات سائنس پڑھ لینے کے بعد وہ اللہ ، رسول ص ، وحی اور آخرت کا یا تو منکر ہو بیٹھتا ہے یا کم از کم سائنس کی گفتگو کے دوران ان عقائد کا تذکرہ کرتے ہوئے شرماتا ہے - اس کی وجہ یہ نہیں کہ سائنس میں بذات خود کوئی ایسی چیز ہے جو دین سے بیزاری کا احساس پیدا کرتی ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب نے کائنات کے عجیب و غریب حقائق کو جس ذہنیت کے ساتھ بیان کیا ہے وہ مادے کے پار کچھ دیکھنے یا سوچنے کی صلاحیت نہیں رکھتی ، لہذا سائنسی حقائق کے بین السطور وہ یہ بات طالب علم کے ذہن نشین کراتی چلتی ہے کہ یہ سب کچھ کائنات کے میکانیکی ارتقا کا ایک جزو ہے ، ورنہ جو چیز اس کائنات میں آنکھوں سے نظر نہ آ سکے اس کے بارے میں کچھ سوچنا بھی پرلے درجے کی دقیانوسیت ہے-

دوسری طرف قرآن کریم بھی اس کائنات پر غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے ، لیکن جو شخص قرآن کریم میں کائنات کے حقائق کو پڑھتا ہے وہ اس نتیجے پر پہنچ کر رہتا ہے کہ کائنات کا یہ مربوط اور مستحکم نظام از خود وجود میں نہیں آ سکتا ، یقیناً اس کا کوئی پیدا کرنے والا ہے جو اس سارے نظام کی علت اولٰی ہے ، وہی اس نظام کو درہم برہم کر سکتا ہے ، اور پھر اسے کوئی دوسری شکل بھی دے سکتا ہے-

ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی نظام تعلیم میں سائنس کی تعلیم اس ذہنیت کے ساتھ دی جائے -مثال کے طور پر بات کہنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ "آگ میں جلانے کی خاصیت پائی جاتی ہے"، اور "انسان کا دماغ سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہے" ، لیکن اسی بات کو اگر اس طرح کہا جائے کہ "اللہ نے آگ میں جلانے کی خاصیت رکھی ہے" اور "اللہ نے انسان کو سوچنے کے لیے دماغ دیا ہے" ، تو یہی جملے بار بار سامنے آکر خالص اسلامی ذہنیت کی تعمیر کریں گے ، خلاصہ یہ کہ ہمارے پورے

نصاب تعلیم میں اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز فکر اس طرح رچ جانا چاہیے کہ ہماری درس گاہوں سے جو تعلیم یافتہ افراد پیدا ہوں وہ عام مغربی تعلیم یافتہ افراد کی طرح نہ ہوں ، بلکہ وہ مسلمان ڈاکٹر ، مسلمان سائنس داں ، مسلمان انجینئر ، مسلمان فلسفی اور مسلمان فنکار ہوں — یہ ذہنیت نصاب تعلیم میں کس طرح سموئی جائے ؟ اس کا صحیح جواب تو قرون وسطی کے مسلمانوں کی لکھی ہوئی سائنس ، فلسفہ ،طب ،صنعت و حرفت ، معاشیات اور سیاست کی کتابیں دیکھ کر بھی ہو سکتا ہے ، اور اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ نصاب تعلیم کی تدوین و ترتیب ایسے افراد کو سپرد کی جائے جو ان علوم کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام کے قدردان اور کم از کم ذہنی طور پر سچے اور پکّے مسلمان ہوں -

جب تک نصاب تعلیم میں مذکورہ دو چیزوں کی رعایت نہیں کی جائے گی اس وقت تک ایک گھنٹے میں اسلامیات کی تعلیم پاکستان کےنظریاتی مقاصد کو خاطر خواہ فائدہ نہیں پہنچا سکے گی - اس بات کی نشاندھی قدرے تفصیل کے ساتھ اس لیے کر دی گئی ہے کہ زیر تبصرہ تعلیمی پالیسی میں اسلامیات کو دسویں جماعت تک لازمی قرار دینے کا تو ذکر ہے ، لیکن نظام تعلیم کو اسلامی بنانے کے ان دو لوازم یعنی نصاب کی تدوین نو اور اسلامی ذہنیت کی تعمیر موجود نہیں ہے-امید ہے کہ پالیسی کے مبارک مقاصد حاصل کرنے کے لیے ان دو بنیادی باتوں کو کماحقہ اہمیت دی جائے گی -

اسلامیات کی تعلیم

مذکورہ دو باتیں اسلامیات کے علاوہ دوسرے مضامین سے متعلق تھیں ، اسلامی نظام تعلیم میں خاص اسلامیات کے مضمون کو جو اہمیت حاصل ہونی چاہیے وہ محتاج بیان نہیں - زیر تبصرہ پالیسی کے مرتبین نے اس ضرورت کو محسوس کر کے حصہ اوّل باب اوّل کے فقرہ نمبر ۲ میں اسلامیات کو دسویں جماعت تک لازم کرنے کی سفارش کی ہے - یہ سفارش ہر لحاظ سے قابل مبارک باد ہے ، البتہ اس ضمن میں چند باتیں قابل ذکر ہیں -

(الف) معیار کی بلندی

خلاصہ کے پیرا گراف نمبر ۵ میں فاضل مرتبین نے یہ تسلیم کیا ہے کہ اسلامیات کے آٹھویں جماعت تک لازم ہونے کے باوجود جدید نظام تعلیم ہمارے یہاں اب تک لا دینی رہا ہے - اس کی ایک وجہ تو وہی تھی جو ہم نے اوپر تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے - دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ

خاص اسلامیات کے گھنٹے میں جو نصاب پڑھایا جاتا ہے اس کا معیار اتنا پست رہا ہے کہ اس کے ذریعہ سے اسلامی تعلیمات کا ہزارواں حصہ بھی طالب علم کو معلوم نہیں ہوتا ۔اسلامیات کا صحیح مفہوم علم عقائد ، علم تفسیر و اصول تفسیر ، علم حدیث و اصول حدیث ، علم فقہ و اصول فقہ پر مشتمل ہے ۔ اسلامیات کے نصاب میں بھی یہی چیزیں تدریجی انداز میں اعلا معیار تک پڑھانے کی ضرورت ہے ، ورنہ محض اسلام کی برتری کے چند محمل اور کھوکھلے الفاظ رٹنے سے اسلامیات کی تعلیم کا مقصد کبھی حاصل نہیں ہوگا ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دسویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے طالب علم کم از کم اسلامی تعلیمات سے اتنا واقف ہو جائے کہ اپنی روز مرہ کی زندگی سے متعلق اسلامی ہدایات ذہن نشین کر لے ، اور اسلام نے زندگی کے ہر شعبے سے متعلق جو ہدایات دی ہیں ، ان کے مبادی سے واقف ہو جائے ۔ اس سلسلے میں سلیبس کا ایک معیار تجویز کر کے اس یادداشت کے ساتھ منسلک کیا جا رہا ہے ۔

(ب) ناظرہ قرآن کریم

سابقہ حکومت مغربی پاکستان نے تمام اسکولوں میں ناظرہ قرآن کریم کو آٹھویں جماعت تک لازمی کر دیا تھا ، اور اس کا گھنٹہ اسلامیات کے ساتھ ضم کر دیا گیا ہے ۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ پانچویں جماعت تک اسلامیات کے گھنٹے کے علاوہ حسب سابق ناظرہ قرآن کریم کا بقدر ضرورت مستقل وقت ہونا چاہیے ۔ ہمارا تجربہ ہے کہ اگر پڑھانے والے اساتذہ کماحقہ توجہ کے ساتھ پڑھائیں تو ناظرہ قرآن کریم دوسرے مضامین کے ساتھ پانچویں جماعت تک اطمینان سے ختم ہو سکتا ہے ۔اس کی عملی صورت بھی ان تجاویز کے ساتھ پانچویں جماعت تک کے نصاب تعلیم کے نقشے میں منسلک ہے ۔ اسلامیات اور قرآن مجید کی تعلیم میں یہ بات بھی نہایت ضروری ہے کہ امتحانات میں ان کو وہ حیثیت دی جائے جو اردو اور حساب کو حاصل ہے ، یعنی اگر ان میں سے کسی مضمون میں طالب علم فیل ہو جائے تو اسے آگے ترقی نہ دی جائے ۔ موجودہ نظام تعلیم میں چونکہ اسلامیات کے امتحان کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے اس لیے اس کی خاطر خواہ اہمیت طالب علم کے ذہن میں پیدا نہیں ہوتی ۔

(ج) عربی تعلیم

اب تک ہمارے ہاں اوّل سے آخر تک اسلامیات کو عربی سے الگ کر کے پڑھایا گیا ہے ، حالانکہ اسلامیات کی صحیح تعلیم عربی کے بغیر بالکل بےمعنی ہے ۔ نئی تعلیمی پالیسی میں تصریح کی گئی ہے کہ اسلامیات کی

تعلیم کا مقصد اسلامی علوم کے محقق ، اور صاحب نظر عالم پیدا کرنا ہے ، لیکن ہر شخص جسے اسلامی علوم سے ادنا واقفیت ہے یہ بات تسلیم کرے گا کہ یہ مقصد عربی زبان و ادب اور گرامر کی ٹھوس اور معیاری تعلیم کے بغیر بالکل ناممکن ہے ۔ لہذا ہماری تجویز یہ ہے کہ عربی زبان کو اسلامیات کا لازمی جزو ہونا چاہیے ، جس کی عملی شکل ثانوی مدارس کے مجوزہ سلیبس میں لکھ دی گئی ہے ۔ عربی زبان کو نصاب میں اہمیت دینے سے اسلامیات کے علاوہ اردو زبان و ادب کی تعلیم میں بھی مدد ملے گی ، اور عالم اسلام کے ساتھ ہمارا رابطہ مستحکم ہو جائے گا ۔

(د) اساتذہ کا معیار

اب تک اسلامیات کی تعلیم میں جو نقائص رہے ہیں ان کا ایک بڑا سبب اساتذہ کی کمی اور ان کی تربیت کا فقدان بھی رہا ہے ، اسلامیات کا جتنا تھوڑا بہت حصہ نصاب میں رکھا گیا تھا وہ غیر تربیت یافتہ اساتذہ کی وجہ سے پورا نہیں ہوتا تھا ۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے ہماری تجاویز حسب ذیل ہیں ۔

آئندہ کے لیے اسلامیات کے اساتذہ میں مطلوبہ قابلیت کا یہ معیار مقرر کر دیا جائے ۔

(الف) ساتویں جماعت تک کے اساتذہ کے لیے دینی مدارس سے ثانوی مرحلے کا سند یافتہ یا اسلامیات کی مجوزہ فیکلٹی سے انٹرمیڈیٹ یا موجودہ نظام تعلیم کا گریجویٹ جس کا اختیاری مضمون اسلامیات رہا ہو ، اور اس نے اسلامیات کی تدریس کی خصوصی تربیت لی ہو۔

(ب) آٹھویں سے دسویں تک کی جماعتوں کے لیے دینی مدارس سے ثانوی مرحلے کا سند یافتہ جو المنٹری کلاسوں کو پڑھانے کا کم از کم تین سالہ تجربہ رکھتا ہو یا اس نے علوم جدید کی خصوصی تربیت حاصل کی ہو ، یا اسلامیات کی مجوزہ فیکلٹی سے گریجویٹ یا موجودہ نظام تعلیم کا فاضل عربی یا موجودہ نظام تعلیم کا ایم ۔اے اسلامیات کیا ہو ، اور جس نے اسلامیات کی تعلیم کی خصوصی تربیت لی ہو۔

(ج) گریجویشن تک کی تعلیم کے لیے دینی مدارس کے اعلا مرحلے کا سند یافتہ جس نے جدید علوم کی خصوصی تربیت لی ہو ،یا اسلامیات کی مجوزہ فیکلٹی سے ایم ۔اے کیا ہو ۔

(د) ایم ۔اے کی تعلیم کے لیے وہ شخص جو دینی مدارس کے ثانوی مرحلے

میں تدریس کا کم از کم سات سالہ یا اعلا مرحلے میں تدریس کا کم از کم دو سالہ تجربہ رکھتا ہو یا دینی مدارس کے درجات تخصص کا فارغ ہو یا اسلامیات کی فیکلٹی سے ایم۔اے اور گریجویشن تک کی تعلیم کا مناسب تجربہ رکھتا ہو ۔

(ہ) اساتذہ کی خصوصی تربیت

"اساتذہ کے معیار" کے تحت ضمن الف و ب و ج میں اساتذہ کی خصوصی تربیت کا جو ذکر کیا گیا ہے اس کی تشریح درج ذیل ہے ۔

(۱) جب تک مجوزہ پالیسی کے تحت علوم اسلامیہ و عربیہ کے مستند تعلیم پائے ہوئے لوگ اسلامیات کی تدریس کے لیے مہیا نہیں ہوتے اس وقت تک موجودہ نظام تعلیم کے ان افراد سے بھی کام لیا جا سکتا ہے جنہوں نے ماضی میں ابتدا سے گریجویشن تک معارف اسلامیہ (اسلامک اسٹڈیز) کو بطور اختیاری مضمون لیا ہو ۔ لیکن ان کے لیے تربیت کا ایک کورس ترتیب دیا جائے جس میں ناظرہ قرآن کریم، ابتدائی عربی زبان و گرامر، ترجمہ قرآن کریم اور حدیث و فقہ پڑھانے کی تربیت دی جائے ۔ اس تربیت میں کامیاب ہونے کے بعد انہیں تدریس کا اہل قرار دیا جائے ۔ اس تربیتی کورس کا انتظام دینی مدارس میں کیا جائے۔اس طرح قدیم اور جدید طبقوں کے درمیان باہمی ربط اور ہم آہنگی پیدا کرنے میں بھی مدد ملے گی ۔ اس سلسلے میں دینی مدارس ہر قسم کا تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں ۔

(۲) جب تک مجوزہ پالیسی کے تحت دینی مدارس کے طلبہ جدید علوم سے واقف ہو کر فارغ نہیں ہوتے اس وقت تک گریجویشن کی اسلامیات کی تعلیم کے لیے ان افراد سے بھی کام لیا جا سکتا ہے جو ماضی میں کسی معروف دینی درس گاہ سے فارغ ہوئے ہیں، لیکن ان کے لیے تربیت کا ایک کورس ترتیب دیا جائے جس میں انہیں جدید علوم سے روشناس کرایا جائے ۔اس کے بعد انہیں تدریس کا اہل قرار دیا جائے ۔

(۳) مجوزہ پالیسی کے تحت دینی مدارس میں ریاضی اور سائنس کے جو مضامین داخل نصاب کیے جائیں گے ان کو پڑھانے کے لیے دینی مدارس کے موجودہ اساتذہ ہی کو تربیت دی جائے، جیسا کہ زیر تبصرہ پالیسی میں بھی تجویز کیا گیا ہے ۔

(۴) آئندہ مستقل طور پر تربیت اساتذہ کے تمام مراحل میں بشمول بی ۔ایڈ اور ایم ۔ایڈ اسلامیات کی تربیت کا مستقل اور ٹھوس نظام بنایا جائے ۔

(۵) جب تک کسی درس گاہ میں اسلامیات اور ناظرہ قرآن کریم کے تربیت یافتہ اساتذہ موجود نہ ہوں اس وقت تک اسے سرکاری طور پر منظور نہ کیا جائے ۔

۴۔ درس گاہوں کا ماحول

اپنے نظام کو صحیح معنی میں اسلامی اور قومی انداز میں نافذ کرنے کے لیے جتنی اہمیت نصاب تعلیم کو حاصل ہے ، درس گاہوں کے ماحول کا مدار اس سے کم اہمیت نہیں رکھتا ۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ طلبہ کو کسی خاص رنگ میں رنگنے کے لیے اس کا ماحول بڑا موثر ثابت ہوتا ہے ۔ مغربی ممالک میں اسلامیات کی تعلیم اچھے خاصے معیار پر ہوتی ہے ، لیکن اس کے ذریعہ سے کوئی مسلمان طالب علم پیدا نہیں ہوا ۔ اس کی وجہ اسلامی ماحول کا فقدان ہے ، لہذا نئے نظام تعلیم میں اس امر کو بھی پوری اہمیت دینے کی ضرورت ہے ، اس سلسلے میں ہماری تجاویز درج ذیل ہیں ۔

(الف) اساتذہ

مسلمان طلبہ کو تعلیم دینے کے لیے ایسے اساتذہ کا انتخاب ناگزیر ہے جو ایک طرف اپنے تدریسی مضامین میں ماہر اور اپنے علم و فن کا ذوق رکھنے والے ہوں ، اور دوسری طرف نظریہ پاکستان یعنی اسلام سے کماحقہ عقیدت و محبت رکھتے ہوں ۔ خاص طور سے اسلامیات کی تعلیم کے لیے اساتذہ کا انتخاب کرتے وقت اس بات کو لازمی شرط قرار دیا جائے کہ وہ اپنی ظاہری عملی زندگی میں اسلامی تعلیمات کے پابند ہوں ، ورنہ ظاہر ہے کہ وہ طلبہ کے اندر اسلامی روح پھونکنے میں ناکام رہیں گے ۔

(ب) جداگانہ تعلیم

اب تک ہمارے نظام تعلیم کے غیر اسلامی ہونے کی ایک بڑی وجہ مخلوط تعلیم بھی رہی ہے ۔ طلبہ اور طالبات کو مشترک طور پر ایک ساتھ تعلیم دینا مندرجہ ذیل وجوہ سے غلط اور خطرناک ہے ۔

(۱) مرد و عورت کا یہ اختلاط اسلامی تعلیمات کے یکسر مخالف ہے جن کے سانچے میں ہم اپنے نظام تعلیم کو ڈھالنا چاہتے ہیں ۔ امید ہے کہ زیر تبصرہ پالیسی کے مرتبین جن کی پر خلوص کوشش یہ ہے کہ ہمارا نظام تعلیم اسلامی بنیادوں پر استوار ہو جائے ،

لادینی نظام تعلیم کی اس خطرناک ترین یاد گار کو مٹانے کی طرف خصوصی توجہ دیں گے -

(۲) مخلوط تعلیم کی وجہ سے تعلیم کا معیار بہت پست ہوگیا ہے -

(۳) قدرت نے مرد و عورت کو الگ الگ مقاصد کے لیے پیدا کیا ہے ، لہذا دونوں کی تعلیم بھی ان کے مقاصد حیات کے لحاظ سے مختلف ہونی چاہیے - جو نصاب و نظام مرد کے لیے مفید ہو سکتا ہے ضروری نہیں ہے کہ وہ عورت کے لیے بھی مفید ہو ، اس وجہ سے عورتوں کا نظام تعلیم مردوں سے بالکل الگ ہونا چاہیے ، موجودہ نظام تعلیم میں دونوں کو یکساں طرز سے تعلیم دی جاتی ہے جو نتائج کے لحاظ سے مفید نہیں ہوسکتی -

(۴) مخلوط تعلیم کی وجہ سے طلبہ میں جو اخلاقی گراوٹ مسلسل پیدا ہو رہی ہے وہ اب ڈھکی چھپی چیز نہیں رہی - ان حالات میں ہمارا نظام تعلیم اس وقت تک ہمارے قومی تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا جب تک کہ مرد و عورت کے لیے الگ الگ نصاب اور نظام نہ بنایا جائے -

(ج) غیر نصابی سرگرمیاں

(طلبہ کے ماحول کو درست کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ غیر نصابی سرگرمیوں میں کسی ایسی بات کی اجازت نہ دی جائے جو اسلامی تعلیم کے منافی ہو - سابقہ حکومت مغربی پاکستان نے اپنے تعلیمی اداروں میں رقص و سرود پر پابندی عائد کر دی تھی ، یہ ایک نہایت مستحسن اقدام تھا جس پر کماحقہ عمل نہ ہوسکا - ضرورت ہے کہ نئے نظام تعلیم میں رقص و سرود اور غیر اسلامی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی جائے - اس کے علاوہ ایسی غیر نصابی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے جن میں طلبہ کو اسلامی معلومات بڑھانے یا اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے میں مدد ملے -)

(د) یونیفارم

پورے پاکستان میں اگر طلبہ کا یونیفارم ایک کر دیا جائے تو اس سے بھی قومی شعور پیدا کرنے میں مدد ملے گی - دنیا کی تمام زندہ قومیں اپنی نسلوں میں قومی اور اجتماعی احساس پیدا کرنے کے لیے ان کو اپنے قومی لباس کا پابند بناتی ہیں ، کوئی وجہ نہیں کہ پاکستان کے طلبہ اس شعور سے محروم رہیں ، اس لیے ان کا یونیفارم پاکستان کا قومی لباس یعنی شیروانی یا پاجامہ ، شلوار اور ٹوپی ہونا چاہیے -

(۵) شعائر اسلام کا احترام

(درس گاہوں کے ماحول میں اسلامی ارکان و شعائر کے کماحقہ احترام کی مکمل رعایت ہونی چاہیے، نماز کے اوقات میں نماز کے لیے مناسب وقفے ہونے چاہییں، اور بہتر ہے کہ درس گاہ کی حدود عمارت میں مسجد کے قیام کو لازمی قرار دیا جائے۔ اگر مستقل عمارت نہ ہو تو نماز باجماعت کے لیے الگ جگہ بنائی جائے، اور اس بات کی کوشش کی جائے کہ طلبہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے عادی بنیں۔)

عربی مدارس کا مسئلہ

جہاں تک جدید نظام تعلیم میں اسلامی اصلاحات کا تعلق ہے ان کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ دینی مدارس کے نظام تعلیم کو منظم، مربوط اور پاکستان کے لیے زیادہ مفید بنانے کے لیے ہماری تجاویز حسب ذیل ہیں۔

(۱) مدرسہ ایجوکیشن بورڈ

مدارس کو منظم کرنے کے لیے ایک آزاد خود مختار مدرسہ تعلیمی بورڈ کی تشکیل کی جائے، لیکن سابقہ تجربات کے پیش نظر اس بورڈ میں حسب ذیل امور کی رعایت کی جائے، ورنہ یہ تنظیم قطعی طور پر ناکام ہوجائے گی۔

(الف) یہ بورڈ تمام تر موجودہ بڑے دینی مدارس کے ایسے ذمہ دار علمائے دین پر مشتمل ہو جن پر خود یہ دینی مدارس اور پوری امت، علم و فضل اور دینی بصیرت کے لحاظ سے اعتماد کرتی ہو، البتہ جدید علوم کے معاملے میں مشورہ لینے کے لیے دو ایسے صاحبان بھی اس کے رکن ہوں جو جدید نظام تعلیم کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔

(ب) ہر دینی مدرسہ اپنے ہاں بنیادی (المنٹری) مرحلے تک کا اسکول قائم کرے جس میں وہی نصاب پڑھایا جائے جو عام سرکاری اسکولوں میں پڑھایا جا رہا ہو۔ اس مرحلے تک جدید و قدیم نظام تعلیم کا فرق بالکل ختم کر دیا جائے۔ البتہ دینی مدارس کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ اپنی ضرورت کے تحت اس نصاب پر کچھ اضافہ کرنا چاہیں تو کر سکیں، اور دینی مدارس کے خاص نظام تعلیم میں ان ہی طلبہ کو داخلہ دیا جائے جو المنٹری کلاسوں سے فارغ ہوچکے ہوں۔

(ج) دینی مدارس کے خاص نصاب تعلیم کو چار مراحل پر تقسیم کیا جائے: علوم ابتدائیہ، علوم ثانویہ، علوم عالیہ اور علوم تخصص، ان مراحل میں بورڈ اپنی صوابدید پر معاشیات، سیاسیات، اور جدید فلسفہ کے

مضامین شامل کرے ۔

(د) بورڈ کو نصاب تعلیم کے تقرر، امتحانات کے انعقاد اور جملہ تعلیمی امور میں مکمل آزادی اور خود مختاری حاصل ہو، اور اس معاملے میں وہ کسی ہئیت حاکمہ کا پابند نہ ہو۔ زیر تبصرہ پالیسی میں بعض معیاری کالجوں کو اس قسم کی آزادی دی گئی ہے کہ وہ خود امتحانات لیں، اور ڈگری دیں، لہذا مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کو خود مختار رہتے ہوئے اسناد عطا کرنے کی اجازت دینا ایک معقول تجویز ہے ۔

(ہ) موجودہ نظام میں دینی مدارس عوامی تعاون کی بنیاد پر چل رہے ہیں۔ اگر ان مدارس کی موجودہ آزادی میں کوئی فرق آیا یا حکومت نے ان کو مالی امداد دی تو یقین ہے کہ عوامی تعاون کا یہ سلسلہ بالکل بند ہو جائے گا، اور ان مدارس کو چلانے کے لیے حکومت کو کروڑوں روپیہ خرچ کرنا پڑے گا، جس کے بارے میں یقین ہے کہ میزانیہ میں اس کی گنجائش نہیں ہوگی، لہذا یہ ضروری ہے کہ دینی مدارس ایک طرف اپنے تعلیمی معاملات میں مکمل طور پر آزاد ہوں، اور دوسری طرف ان کا مالی نظام جس طرح آج کل عوامی تعاون کی بنیاد پر چل رہا ہے، اسی طرح چلتا رہے، مرکزی بورڈ کے جملہ اخراجات دینی مدارس کے چندے سے پورے کئے جائیں۔

(و) اس بورڈ کی دی ہوئی اسناد کو سرکاری طور پر تسلیم کیا جائے، اور ابتدائی مرحلے کو میٹرک کے مساوی، ثانوی مرحلے کو انٹر کے مساوی، اعلا مرحلے کو گریجویٹ کے مساوی اور تخصص کو ایم ۔ اے کے مساوی قرار دیا جائے ۔

(ز) دینی مدارس کے اس بورڈ کو تسلیم کر لینے کے بعد ادیب، عالم اور فاضل کے امتحانات کی ضرورت باقی نہیں رہتی، لہذا ان امتحانات اور اسناد کو ختم کر دیا جائے ۔

(ح) ملک کے بہت سے دینی مدارس ومکاتب ایسے ہیں کہ جو نہایت محدود پیمانے پر اپنا کام کر رہے ہیں، اپنے محدود مالی وسائل کی وجہ سے ان کا بورڈ کے پورے نظام میں منسلک ہونا ممکن نہیں ہوگا، لہذا جو مدارس اس بورڈ کے ساتھ منسلک نہ ہوسکیں ان کو رجسٹر کر لیا جائے، لیکن سند کی منظوری کے لیے بورڈ سے ملحق ہونا لازمی ہو ۔

یہ نکات اس قدر ناگزیر ہیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک کو بھی فراموش کر دیا گیا تو تنظیم مدارس کے مقصد پر بالکل پانی پھر جائے گا ، اور یا تو موجودہ خلیج جوں کی توں برقرار رہے گی یا ملک میں ایک خوفناک نظریاتی خلا پیدا ہو جائے گا۔

مشنری تعلیمی ادارے

اس میں ذرّہ برابر شک و شبہ اور تردد کی گنجائش نہیں کہ پاکستان میں مشنری تعلیمی ادارے اور رفاہی ادارے درحقیقت مسیحی تبلیغی ادارے ہیں ، یا زیادہ بہتر الفاظ میں مسیحیت کی تبلیغ کے چور دروازے ہیں ، جن کے ذریعہ سے عیسائی مبلغ نہایت خاموش طریقہ پر انتہائی سرگرمی کے ساتھ پاکستان میں عیسائیت کے بیج بو رہے ہیں۔ ان مشنریوں کی کارکردگی کی سالانہ رپورٹوں سے ظاہر ہے کہ پاکستان بننے کے بعد ، پاکستانی باشندوں کو عیسائی بنانے میں اتنی زبردست کامیابی ان مشینریوں کو حاصل ہوئی ہے کہ پورے صد سالہ برطانوی دور استعمار میں پورے برصغیر ہندستان میں اتنی کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی ، چنانچہ مسیحی اقلیت کی جو تعداد پاکستان بننے کے وقت پاکستان کے خطے میں تھی وہ تعداد کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے۔اگر ان ملکی اور غیر ملکی مشنریوں کو اسی طرح خاموشی کے ساتھ کام کرنے دیا گیا تو قوی اندیشہ ہے کہ مستقبل قریب یا بعید میں مسیحی اقلیت ایسی موثر اقلیت بن جائے کہ اس نوازائیدہ خالص اسلامی مملکت کے لیے مستقل خطرہ اور درد سر بن جائے ، اور پاکستان کا وہی حشر ہو جو لبنان کا ہو چکا ہے یا انڈونیشیا میں ہو رہا ہے۔

اس لیے صرف اتنا اقدام ہرگز کافی نہیں کہ تمام غیر ملکی مشنری تعلیمی اداروں کو قومی ملکیت میں لے لیا جائے ، بلکہ ملکی مشنری تعلیمی اداروں پر بھی کڑی نگرانی رکھنے کی سفارش کرنی چاہیے۔اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کے تحت پاکستانی مشنریوں کو صرف اتنی اجازت دی جا سکتی ہے کہ وہ محض عیسائیوں کی تعلیم کے لیے اسکول و کالج اس شرط کے ساتھ قائم رکھ سکتے ہیں کہ

(الف) ان کا نصاب تعلیم ، نظام تعلیم بالکل وہی ہو جو پاکستانی سرکاری اسکولوں میں رائج ہے ، اور ان کی تعلیمی سرگرمیوں میں اسلام ، پیغمبر اسلام اور تعلیمات اسلام کے خلاف ایک لفظ نہ کہا جائے ۔ وہ مسیحی معتقدات عیسائی بچوں کو سکھا سکتے ہیں اس شرط کے ساتھ کہ اسلامی معتقدات کی تنقیص یا ان پر تنقید بالکل نہ کی جائے ۔

(ب) ان مشینری اسکولوں میں مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کو ہرگز داخل نہ کیا جائے۔ ورنہ موجودہ تعلیمی پالیسی کے تحت ملکی مشینریوں کو مستثنیٰ کردینے کی صورت میں غیر ملکی مشینریاں اپنے تعلیمی اداروں اور اثاثوں کا مالک ان مشینوں کو بنا کر ان کے واسطہ سے اپنے موجودہ تبلیغی مشن کو جاری رکھ سکیں گی، اور اسلامی حکومت اس استثنا کی وجہ سے ان کے خلاف کچھ نہ کر سکے گی۔

تعلیم بالغان

۱) تعلیم بالغان کے نصاب میں ناظرہ قرآن کریم اور ضروری اسلامی معلومات (جس کے ذریعہ وہ اسلام کے بنیادی عقائد اور ارکان سے واقف ہو جائیں) ضرور داخل کیے جائیں۔

۲) جس حد تک ممکن ہو تعلیم بالغان کا مرکز مساجد کو قرار دیا جائے۔

۳) تعلیم بالغان کے لیے نوجوانوں کی رضاکارانہ خدمات کا جو طریقہ تجویز کیا گیا ہے، وہ صرف (مرد) طلبہ کے لیے رکھا جائے، طالبات کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔

مخلوط تعلیم

تعلیم نسواں ایک مستقل چیز ہے، اور مخلوط ایک جداگانہ چیز ہے، ان دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ خلط وہی بے دین اور بےحمیت یورپ زدہ لوگ کرتے ہیں جو فروغ تعلیم نسواں کی آڑ میں مخلوط تعلیم کو فروغ دینا اور عام کرنا چاہتے ہیں۔

اسلامی تعلیمات کی حدود میں رہ کر تعلیم نسواں کو زیادہ سے زیادہ عام کرنا چاہیے، تاکہ نئی نسل اعلا اخلاق و کردار کی مالک بن سکے، مگر معاشی اعانت کے لیے عورتوں کی تعلیم کو ذریعہ بنانا غیر فطری بھی ہے اور غیر اسلامی بھی، اس لیے کہ قرآن حکیم بیوی بچوں کی معاشی کفالت کا ذمہ دار مرد کو قرار دیتا ہے، اور اسلامی تعلیمات کی رو سے عورت کی ذمہ داری شرعی فرائض ادا کرنے کے بعد تمام جائز اور مباح امور میں شوہر کی اطاعت کرنا، اس کی حوائج اور سامان راحت و آسائش کو مہیا کرنا ہے، تاکہ بچے اور شوہر تفریح کے لیے گھر سے باہر جانے کی ضرورت ہی محسوس نہ کریں۔

ایک ایسی تعلیم یافتہ عورت جس کا دن کسب معاش میں گھر سے باہر گزرے ، شام کو تھکی ہاری گھر آئے ، ہرگز ان فطری اور شرعی ذمہ داریوں کو نہیں اٹھا سکتی ، اس لیے عورت کو معاشی نقطہ نظر سے تعلیم دینے کا تصور ایک قطعی غلط تصور ہے ، لڑکیوں کا نصاب تعلیم ، نظام تعلیم اور معیار تعلیم مذکورہ بالا مقاصد کے تحت مرتب و مدون اور مردوں سے بالکل الگ اور جداگانہ ہونا چاہیے ، ایسی صورت میں درسگاہوں کا الگ ہونا ناگزیر ہے ، اگر تعلیم نسواں سے اس کے صحیح فوائد حاصل کرنے ہیں تو مخلوط تعلیم کو ختم کرنا قطعی لازمی ہے ، اس لیے کہ مخلوط تعلیم تو اسلامی روح کے بھی قطعی منافی ہے ، اور ذہنی و فکری آسودگی اور اخلاق و پاکیزگی کے لیے بھی سم قاتل ہے ، اس کی اجازت کسی صورت میں بھی نہیں دی جا سکتی ۔

عام طور پر تعلیم نسواں کے فروغ کے حامی وہ یورپ زدہ لوگ ہیں جو پاکستان کو بھی مخلوط تعلیم کے ذریعہ سے فحاشی و عریانی کے لحاظ سے پیرس اور بیروت کا نمونہ بنانا چاہتے ہیں ، یہ لوگ درحقیقت تعلیم نسواں کے بھی دشمن ہیں ، اور دین و ایمان کے بھی دشمن ۔

رجال کار

یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ دنیا کا کوئی نظام خواہ کتنا ہی بہتر سے بہتر کیوں نہ ہو ، اس وقت تک نتیجہ خیز اور بار آور ثابت نہیں ہوسکتا جب تک اس کو چلانے والے رجال کار موزوں اور صحیح نہ ہوں ، اگر ایک ایسا نظام جو نظریاتی اعتبار سے سرتاپا مفید ہو ، غلط ہاتھوں کو سونپ دیا جائے تو وہی ہلاکت خیز بھی ثابت ہو سکتا ہے ۔

لہذا اگر ملک کا نظام تعلیم اسلامی خطوط پر استوار کرنا ہے تو یہ بات بنیادی اہمیت رکھتی ہے کہ اس نظام کو چلانے والے افراد اسلام کا صحیح جذبہ رکھنے والے ہوں ، نیز اسلامیات کے نصاب کی تدوین صرف ان علما کو تفویض کی جائے جو اسلامی علوم کا وسیع اور عمیق علم اور تجربہ رکھتے ہوں ، اس سلسلے میں ہماری تجاویز درج ذیل ہیں ۔

۱) یونیورسٹی اور ثانوی تعلیمی بورڈ کے تمام انتظامی شعبوں کے عہدے صرف ان لوگوں کے سپرد کیے جائیں جو نظریہ پاکستان یعنی اسلام سے عقیدت اور محبت رکھتے ہوں ، اور تعلیم کے مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت کے حامل ہوں ۔

۲۔ مندرجہ ذیل امور کے لیئے صرف ان مستند علمائے دین کا انتخاب کیا جائے جن کے علم و فضل اور فہم بصیرت پر قوم اعتماد کرتی ہے۔

الف) تمام مراحل تعلیم کے لیے اسلامیات کی نصاب کمیٹی ۔
ب) اسلامیات کی نصابی کتب کی تصنیف و تدوین ۔
ج) معارف اسلامیہ کی فیکلٹی کے تمام شعبے ۔

حوالے

۱ ۔ جیسا کہ میکالے نے خود بیان کیا ہے کہ وہ عربی اور سنسکرت سے (دونوں سے) بالکل بابلد تھا ، یہی وجہ ہے کہ غالباً ، طلسم ہوشربا ، کو تمام مشرقی علوم کی نمائندہ کتاب سمجھ کر اس کی ساری باتوں کو مشرقی علم طب، علم فلسفہ ، علم تاریخ اورعلم جغرافیہ کے سرمنڈھ رہا ہے۔

۲ ۔ کیوں کہ اگر مقصد مذکورہ بالا " غیر جانبدارانہ تعلیم " سے حاصل ہو جائے تو اس الجھیڑے میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے ؟

۳ ۔ نمونہ کے طور پر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی کتاب " قانون بین الممالک" ملاحظہ ہو ، جس میں بین الاقوامی قانون کو اسی طرح مدون کیا گیا ہے ۔

اسلامی جمہوریۂ پاکستان کا نظام تعلیم

جناب بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) گلزار احمد

اس عنوان میں چند بنیادی حقائق کی طرف اشارہ ہے جنکی مختصر سی وضاحت کے بغیر درپیش مسئلے کا حل معلوم کرنا ممکن نہ ہوگا۔ مثلاً جو مسئلہ درپیش ہے وہ تعلیم و تعلّم کا ہے۔ البتہ زیر مطالعہ نظام تعلیم پاکستان سے تعلق رکھتا ہے جو اسلامی ملک ہے اس لئے مساوات اسلامی پر مبنی روایات کے مطابق اسکے تمام مسئلے حل ہونے ہیں۔ جس نظام تعلیم کی اساس اسلام کے عائد کردہ معیار عدل و انصاف اور مساوات اسلامی پر مبنی نہ ہوگی وہ نہ تو کامیاب رہیگا اور نہ ہی پاکستان کے عوام الناس اسے قبول کرینگے۔ اگر موجودہ نظام تعلیم ان امیدوں پر پورا نہیں اتر رہا جو اس سے وابستہ ہیں تو عین ممکن ہے کہ اسکی وجہ یہ ہو کہ اسکی اساس اسلام کی منصفانہ روایات پر نہ رکھی گئی ہو اور جو تصور اسلام نے تعلیم، تعلّم، معلم اور شاگرد کے متعلق دیا ہے اس سے انحراف کیا جارہا ہو۔

نظام تعلیم خلا میں وجود نہیں پاتا، اس کے وجود میں آنے کا پس منظر ہوا کرتا ہے۔ وہ یا تو کسی مکتب فکر کے بنیادی اصولوں کی وجہ سے اختیار کیا جاتا ہے یا وقتی اور مقامی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اسے وجود میں لایا جاتا ہے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے اسے اپنی تعلیم کو اسلام کے قوانین کے مطابق رائج کرنا ہوگا۔ حصول علم ہر مسلمان مرد اور ہر مسلمان عورت پر فرض قرار دیا گیا ہے، اس لیے مسلمان معاشرے میں علم کی ضرورت ہو یا نہ ہو اسکے افراد کے لیے حصول علم گود سے گور تک حاصل کرتے رہنا ایک دینی فریضہ ہے۔ یعنی پاکستان میں علم مہیا کرنے کی یہی ضرورت نہیں کہ اسکے انتظامی امور کو اچھی طرح پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہے بلکہ اس ملک کے ہر فرد کے لیے مسلسل حصول علم کی طرف متوجہ رہنا اس کا دینی فریضہ ہے۔

اس بنیادی حقیقت کو اگر ذہن میں نہ رکھا جائے تو نظام تعلیم میں ان گنت خامیاں رہ جانے کا اندیشہ ہے۔ چونکہ یہ دینی فریضہ ہے اس لیے اسکو پورا کرنے کی ذمہ داری فرد پر پڑتی ہے جہاں تک حکومت وقت کا تعلق ہے اس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ہر فرد کے حصول علم کے لیے مواقع فراہم کرے۔ فرد کا آغاز بچپن اور پھر لڑکپن سے ہوتا ہے۔ اس عمر

میں اس کی کفالت اس کے والدین کرتے ہیں ۔ اس فرد کے لیے خود کفالت تک اس فریضے کی یعنے تعلیم کے فریضہ کی ادائی کی ذمہ داری والدین کے کندھوں پر پڑنی چاہیے ۔ جس طرح ماں باپ بچے کو نماز اور روزہ کی پابندی پر کاربند رہنے کے ذمہ دار ہیں اسی طرح وہ اپنی اولاد کو تعلیم دلانے کے ذمہ دار ہیں ۔ جہاں یہ ذمہ داری فرد قبول نہیں کرتا وہاں تعلیم و تعلم کے مسائل الجھے رہتے ہیں ۔ جب فرد اس ذمہ داری سے دست بردار ہوکر یہ بوجھ پورے کا پورا حکومت پر ڈال دیتا ہے تو زیاں اور کج روی کی انتہا نہیں رہتی ۔ حکومت کا فرض یہ ہے کہ وہ ایسے قوانین وضع کرے جنکے اطلاق سے فرد کو حصول علم میں آسانی بھی ہو اور قانونی ذمہ داری بھی ۔ حکومت کا دوسرا فرض یہ ہوگا کہ وہ ایسا نظام تعلیم رائج کرے جس سے ملک کے اندر ذہنی ہم آہنگی پیدا ہو اور اسے پختگی حاصل ہوتی رہے ۔ جب تعلیم کا مہیا کرنا حکومت کا فرض بن جاتا ہے تو تعلیم بھی سیاسی مسئلہ بن جاتی ہے ۔ طلبہ ایک علحدہ طبقہ قرار پاتے ہیں جسے ملک ، قوم ، ملت سے کوئی سروکار نہیں رہتا ۔ طلبہ کا جب جی چاہے وہ درسگاہوں سے مقاطعہ کرلیں ، جب چاہیں اساتذہ کو برہنہ کرلیں ، پرنسپل اور وائس چانسلر کے گھر کا گھیراو کریں اور اپنے آپکو ہر طرح سے قانون سے بالا تر قرار دے دیں ۔ جس ناعاقبت اندیش سیاست داں کا جی چاہے وہ انہیں رشوت دے کر ان سے تخریب کروائے ۔ یہ سب کچھ اس لیے ممکن ہو رہا ہے کہ تعلیم حکومتکی ذمہ داری ہے اور حکومت اسی طرح کی سیاست کے ذریعہ سے بدلی جاسکتی ہے ۔ اگر یہ سلسلہ غلط ہے تو پھر فرد اور معاشرے کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہونا چاہیے ۔ دراصل ہم نے اب تک معاشرے اور حکومت میں جو فرق ہے اس کو محسوس نہیں کیا ۔ مرکزی پارلیمان صوبائی کونسل ، ضلع کونسل یا یونین کونسل ، یہ سب حکومت کے قائم کردہ ادارے ہیں ۔ یہ آنی جانی ادارے ہیں ، ان کو بقا نہیں ۔ اگر بقا ہے تو وہ معاشرے کو ہے ۔ اس لیے معاشرہ وجود میں لانا ضروری ہے ۔ اسلامی ممالک میں معاشرے کو تشکیل دینا چنداں مشکل نہیں ہونا چاہیئے نماز کے وقت پورا محلہ اور پورا گاؤں اکھٹا ہوتا ہے یا ہونا چاہیے ۔ نماز کی امامت اس چھوٹے سے معاشرے کا سربراہ اور معزز اور مقتدر شخص کرتا ہے ئ اس باعزت فرد کو امام بنانے کے لیے انتخاب کا سلسلہ نہیں ہوا کرتا مگر اس فرد کی بات مانی جاتی ہے اور اسکی قیادت لفظ قیادت کے استعمال کے بغیر بھی، قابل قبول ہوتی ہے ۔ اس کو امام بنانے والے ہی اس جغرافیائی مقام کا معاشرہ ہیں ۔ اگر یہ معاشرہ تعلیم کو اپنی تحویل میں لے تو تعلیم کی کمیت و کیفیت ہر دو اپنا صحیح مقام پاتے ہیں ۔ مثالیں سامنے ہیں ۔ پاکستان کے مختلف شہروں اور قصبوں میں معاشرے کے افراد نے انجمنیں قائم کر کے

مدارس جاری کررکھے تھے جو حکومت کے قائم کردہ نصاب کے مطابق تعلیم دیتے تھے اور نہایت اچھے نتائج برآمد ہوتے تھے ۔ وہی مدارس جب قومیائے گئے تو معیار تعلیم اس حد تک گر گیا کہ اب وہ ماقبل کے حکومتی مدارس کی صف میں شامل ہوگئے ہیں ۔ اس غیر ذمہ دارانہ رویہ کا احساس ہی نہیں رہا اور ان اداروں کے اساتذہ ان اداروں کی واپسی کے خلاف منظم تحریکیں چلارہے ہیں ۔ دور غلامی کا پیدا کردہ حکومت ، حاکم ، محکوم ، اور حکومت کے افسروں کا تصور ابھی ذہنوں سے نہیں گیا ۔ انسان محض جسے خلافت ارضی عطا ہوئی تھی اسکا شمار کسی گنتی میں نہیں ۔ جب تک اس انسان کو اپنا صحیح مقام حاصل نہ ہوگا اس وقت تک انسان کے قائم کردہ ادارو ں کی سمت صحیح نہیں کی جاسکتی ۔ دیگر امور کی طرح بالآخر تعلیم کے مسائل حل کرنے کے لیے بھی فرد اور معاشرے کو اسکا صحیح مقام دینا پڑے گا ۔

مطالعے میں آچکا ہے کہ نظام تعلیم کو رائج کرنے کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے ۔ نظام تعلیم سے ہم وہ ادارہ اور اس کی کارکردگی کے طور طریقوں کی نشاندہی لیتے ہیں جو تعلیم دینے دلانے اور حاصل کرنے کے قوانین اور ضوابط پر مشتمل ہو ۔ نظام تعلیم اور نصاب تعلیم مختلف ہیئتوں کے نام ہیں ۔ تعلیم کے نظم ونسق سے متعلق جو ڈھانچہ ، جو ادارہ اور اس کی کارکردگی کا جو طریقہ ہوتا ہے اسے اور اس سے متعلق کاروبار کو نظام تعلیم کہا جاسکتا ہے ۔ نصاب تعلیم اس ماحصل کا نام ہے یا وہ مبلغ علم ہے جو طالبعلم تک پہنچایا جانا قرار دیا جاتا ہے ۔ نصاب تعلیم کا فیصلہ تعلیم دینے اور لینے والوں کو مل جل کر کرنا چاہیے ۔ جہاں مطلق العنان حکومتیں ہوں وہاں تعلیم دینے والے نادر شاہی احکام کے تحت جو چاہتے ہیں نصاب تعلیم میں شامل کرلیتے ہیں اور اسی لیے نت نئی تبدیلیاں نصاب تعلیم میں لائی جاتی ہیں ۔ جب تک تعلیم دینے والے تعلیم حاصل کرنے والوں یعنی معاشرے کے سامنے جوابدہ نہ ہوں اس وقت تک وہ اپنی مطلق العنانی قائم رکھتے ہیں ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تسلسل مفقود ہوکر معیار تعلیم کے ناقص ہونے کا موجب بنتا ہے ۔

- نظام تعلیم کی چند خصوصیتوں کا ہونا ضروری ہے ۔ اولاً نظام تعلیم پورے ملک میں ایک ہو تاکہ حصول علم کے ذریعہ سے افراد کے اندر ذہنی ہم آہنگی پیدا ہو ۔ اس لیے کہ اگر نظام تعلیم ایک سے زائد ہوں گے تو ان کے ذریعہ سے علم کو حاصل کرنے والے مختلف انضباطوں کے تحت زندگی کے اولین ایام گزارنے کی وجہ سے اپنے گرد و پیش اور زندگی کو مختلف زاویوں سے دیکھیں گے اور پھر تمام عمر ایک دوسرے کو سمجھنے میں دشواری محسوس کرتے رہینگے ۔ اس حقیقت کو شاید ہم سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا اس وقت پاکستان میں متعدد نظام ہائے تعلیم رائج ہیں ۔ مثال کے طور پرچند

ایک کو لیجئے ۔ قدیم نظام تعلیم جسے ہم دینی مدارس کا نام دیتے ہیں ۔ پھر اس کے اندر ہر مکتب فکر کا اپنا اپنا علحدہ نصاب تعلیم ہے اور زندگی کے متعلق اپنا اپنا مختلف زاویہ نگاہ ہے ۔ دوسری جانب جدید تمدن کا پیدا کردہ نظام تعلیم ہے ۔ اس کے اندر انگریزی طرز کے پبلک اسکول ہیں جو آغاز کار کے وقت نیم انگریز قسم کے لوگوں کے لیے جاری کیے گیے تھے مگر اب عام ہوگئے ہیں ۔ ان کے علاوہ دیسی آبادی کے انگریزی اردو مدارس ہیں ان کا طریق تعلیم بالکل ہی مختلف ہے ۔ اگر آپ ایک ہی شہر کے ایک ہی محلہ سے ان سب نظام ہائے تعلیم سے ایک ایک فرد " یک دانہ از خروارے " کے طور پر لیں اور انہیں یکجا کریں تو ایسے معلوم ہوگا کہ دنیا کے مختلف حصوں سے مگر ایک ہی زبان بولنے والے متعدد افراد کو لاکر ان لوگوں کو جبراً یکجا کردیا گیا ہے ۔ ان کے کھانے کے طور طریقے ، ان کے پسند کی خوراک ، ان کا لباس ان کے ملنے کے طریقے ، ان کے نشست و برخواست حتیٰ کہ ان کا لب و لہجہ اور ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کا طریقہ بالکل مختلف ہوگا ۔ اگر اجنبی ایسے گروہ کو دیکھے تو وہ یہی کہے گا کہ یہ گروہ اقوام متحدہ کی طرح لا تعداد قومیتوں پر مشتمل ہے حالانکہ وہ ایک ہی شہر اور ایک ہی محلے کے ایک ہی زبان بولنے والے ہیں ۔

دوسری بات جو کسی نظام تعلیم میں ہونا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہر طالب علم اس سے استفادہ کرنے میں آسانی محسوس کرے بلکہ نظام تعلیم ایسا ہو کہ لوگوں کو اپنی جانب دعوت دے ۔ یہ نہیں کہ طالبان علم پر نظام تعلیم علم کے دروازے بند کردے ۔ آج ہمارے موجودہ نظام تعلیم کے قوائد و ضوابط یہ تو بتاسکتے ہیں کہ کس طرح کسب علم ممکن نہیں ، وہ یہ نہیں بتاسکتے کہ علم کس طرح بآسانی حاصل کیا جاسکتا ہے ۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جو لوگ دور غلامی میں ان خاندانوں سے متعلق تھے جنھوں نے اپنی خودداری بیچ کے آقا کے دروازے پر دستک دینے میں عار محسوس نہ کی تھی اور آقا کے علوم حاصل کرلیے تھے اب ان کی اولاد کسی دوسرے کو اس علم کے قریب پھٹکنے نہیں دیتی ۔ اسکولوں ، کالجوں ، یونیورسٹیوں اور امتحانوں میں داخلوں پر پابندیاں اور نا اہل ہونے کے فتووں میں آسانی یہ سب باتیں اس نظام سے طالبان علم کو متنفر کررہی ہیں ۔ مگر جو ضابطہ بن گیا اسے بدلنے کی ہمت اور توفیق کسی کو نہیں ہوتی ۔ علم آج شجر ممنوعہ بن چکا ہے حالانکہ ہم میں سے ہر ایک اقرأ کی تلاوت کرتے وقت ایک گونہ مسرت محسوس کرتا ہے کہ اس کا تعلق ایسے دین سے ہے جس کے عطاکرنے والے خالق کائنات نے جو حکم سب سے پہلے دیا ہے وہ حصول علم کا حکم ہے ۔

پاکستان میں اس وقت یوں تو ہر مکتب فکر اور ہر طبقے کا علحدہ نظام تعلیم ہے مگر عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت ہمارے ہاں دو

بڑے نظام تعلیم ہیں ۔ایک قدیم تعلیم سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا جدید تعلیم کا علمبردار ہے ۔دونوں کے مقاصد مختلف ہیں اس لیے دونوں کے کار پرداز اپنے اپنے طلبہ میں جداگانہ ذہنیت پیدا کرنے کی طرف متوجہ رہتے ہیں ۔اتفاق کی بات کہ دونوں نے زندگی کو آپس میں تقسیم کرلیا ہے ۔ صدیوں پرانی بات ہے کہ پاپائے روم نے دنیا کو پرتگال اور سپین میں بانٹ دیا تھا ۔پرتگال کو مشرق عطا ہوئی تھی اور سپین کو مغرب ۔ ہمارے ملک میں قدیم نظام تعلیم کے داعی مشرق کو عزیز جانتے ہیں ۔اسلیے مشرقی یعنے دینی علوم تک اپنی کاوشیں محدود رکھتے ہیں اور مابعد الموت کی زندگی کو سنوارنے کے مقصد کو پیش نظر رکھتے ہیں ۔جدید نظام تعلیم کے پرستار ہر مشرقی شے کو فرسودہ کہکر اور آخرت کو اپنے نصاب سے خارج کرکے اس دنیا کی زندگی کو مقصد حیات قرار دیتے ہیں اور نصاب سے لے کر طریق کار تک کے ذریعہ سے اس دنیا کے حالات کو سنوارنے کا درس دیتے رہتے ہیں ایک لحاظ سے یہ تقسیم کار سود مند ہے ۔جو اس دنیا کا طلبگار ہے وہ جدید نظام تعلیم سے منسلک ہوجائے اور جو آخرت کو سنوارنے کی فکر رکھتا ہو وہ قدیم نظام تعلیم سے وابستہ رہے مگر دقّت یہ ہے کہ انسان کی زندگی کو اس آسانی سے دو لخت نہیں کیا جاسکتا ۔ طلبگاران آخرت کو یہاں بھی رہنا ہے اور جسم و جان کا رشتہ قائم رکھنا ہے ۔دوسری جانب مشتاقان لذت کام و دہن کی نگاہوں کے سامنے مابعد الموت کا سفر بھی موجود ہے اسلیے انہیں اسکی بھی فکر کرنا پڑتی ہے ۔اس حقیقت کے باوجود ہم نے آج تک ایسا نظام تعلیم مرتب نہیں کیا جو انسان کی تمام ضروریات کو پورا کرتا ہو ۔اگر اس طرف توجہ کی جاتی تو معلوم ہوتا کہ زندگی مکمل ہی اس وقت ہوتی ہے جب روح و بدن یکساں طور پر علم کے سائے میں نشو نما پاتے رہیں ۔یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہر دو ایک ہی چشمہ علم سے سیراب کیے جائیں ۔

قدیم نظام تعلیم : مناسب ہوگا کہ دونوں نظامہائے تعلیم کے چند پہلوؤں پر غور کرلیا جائے تاکہ اگر دونوں کو بہم دیگر مربوط کرنا ہو تو دونوں کے اچھے نقاط کو محفوظ رکھا جائے ۔پہلے قدیم نظام تعلیم کو لیا جائے :۔

۱ ۔اس نظام تعلیم میں نظامت ، محکمہ اور وزارت جیسے گراں بار ادارے موجود نہیں ۔ ہر مدرسہ متفقہ نصاب کے مطابق اور اساتذہ کی صوابدید کی مطابق تعلیم دیتا ہے ۔اسناد عطا ہوتی ہیں مگر تعلیم حاصل کرنے والے کی قبولیت کا انحصار اسکی اسناد پر نہیں ہوتا ۔اس وسیع اور باریک بین دنیا میں اس کی قبولیت اسکی ذاتی قابلیت اور حسن کردار و اخلاق پر منحصر ہوتی ہے ۔

۲ ۔اس نظام تعلیم میں معیار تعلیم توقعات کے مطابق قائم رہتا ہے ۔

جب معیار تعلیم گر جاتا ہے تو تعلیمی ادارہ اپنا وجود ختم کردیتا ہے یعنی اس نظام تعلیم میں زیاں اور خسارہ اپنا اثر دکھاتا ہے ۔

۳ ۔ یہاں امتحانات ہوتے ہیں ۔ مگر پرچے چوری نہیں ہوتے ۔ طلبہ امتحانات میں بیٹھتے ہیں مگر نقل نہیں کرتے ۔ اگر طلبہ تیار نہ ہوں تو وہ مدارس کا مقاطعہ نہیں کرتے ۔ امتحان آئندہ سال دینے پر راضی ہوجاتے ہیں ۔

۴ ۔ یہاں اساتذہ اور طلبہ کا قلبی اور روحانی تعلق ہوتا ہے اور یہ تعلق زمانہ طالب علمی تو کجا تا دم حیات رہتا ہے اور اس کی یاد اساتذہ کے گزر جانے کے بعد بھی دلوں کو گرماتی رہتی ہے ۔

۵ ۔ اس نظام تعلیم میں نظامت کا وجود نہیں اور نہ ہی نگہداشت یا معائنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ۔ مدرسہ ہوتا ہے ، استاد ہوتا ہے اور شاگرد ۔ اس کا ماحصل معاشرے کے سامنے آتا رہتا ہے جب تک یہ ماحصل معاشرے کی توقعات پر پورا اترتا رہتا ہے اس نظام کے تحت چلنے والے مدرسے مقبولیت قائم رکھتے ہیں ۔ جب ان کے تعلیم یافتہ اپنا وقار کھو بیٹھتے ہیں تو مدرسہ و مدرس کی موجودگی کے باوجود درس لینے کے لیے کوئی نہیں آتا ۔

۶ ۔ حکومت اس نظام تعلیم کے نصاب کو علم کا مقام نہیں دیتی ۔ اس لیے اس کے اخراجات کلیتاً معاشرہ برداشت کرتا ہے ۔

<u>جدید نظام تعلیم</u> مندرجہ بالا خصائص تعلیم جدید کے نظام میں کلیتاً مفقود ہیں ۔ اس نظام میں وزارت ، محکمہ ، نظامت ، ضلعی تعلیمی افسر مرکز (تھانہ) کی سطح پر نائب تعلیمی افسر یعنی ایک بھاری بھرکم اور انتہائی گراں بار محکمانہ مشین موجود ہے مگر اس کے باوجود :۔

۱ ۔ پرائمری کے مدارس میں پچاس فیصد اساتذہ بیشتر کام سے غیر حاضر رہتے ہیں ۔ اس لیے وہ اب مقامی اور ضلعی کونسلوں کے تحت ملازمت کرنے پر آمادہ نہیں ۔

۲ ۔ نتائج فرضی ہوتے ہیں ۔ چند سال قبل مڈل کے امتحان میں پورے ضلع میں صرف دو لڑکے فیل ہوئے تھے ۔ وہ اس لیے کہ اساتذہ کے ساتھ ان کے والدین کی رنجش بتائی جاتی تھی ۔

۳ ۔ اس نظام تعلیم کا قبلہ مغرب ہے ۔ اعلا آسامیوں پر فائز افراد گاہے گاہے مغربی ممالک میں اپنی قابلیت بڑھانے کے لیے جاتے رہتے ہیں ۔ مگر وہاں سے حاصل شدہ عقل و دانش کو اپنے ملک کے علمی مفاد کے لیے استعمال نہیں کرسکتے ۔ یا کم از کم گزشتہ دو صدیوں میں کسی طرح کی پیش رفت نہیں ہوئی ۔ (خیال رہے کہ یہ نظام تعلیم دو صدیوں سے اس برصغیر میں رائج ہے مگر اب تک اس نظام تعلیم نے صرف

تین نام پیدا کیے ہیں ۔ اقبالؒ ، ٹیگور اور ایک سائنسدان شاید نامکرجی تھا حالانکہ اقبال محض اس نظام تعلیم کے راستے آگے نہیں بڑھا تھا۔ اسے فیض قدیم نظام تعلیم سے بھی حاصل ہوا تھا ۔)

ہم اس بحث کو طول دینا پسند نہیں کرتے ۔ صرف یہ کہنے پر اکتفا کرینگے کہ ایک نظام کی کامیابی (جہاں تک توقع کی جاتی ہے اور دوسرے کی توقعات سے از حد کم کارکردگی کی چند وجوہات ہیں :۔

اولاً ۔ اس میں عسکریت (REGIMENTATION) اور مرکزیت (CENTRAL CONTROL) دن بدن بڑھتا جارہا ہے ۔ نچلی سطحوں پر نہ اعتبار ہے اور نہ انہیں اختیارات دئیے گئے ہیں ۔

دوم ۔ انتظامی کام اتنا بڑھ گیا ہے کہ درسی فرائض کی ادائی ناممکن ہوگئی ہے ۔

سوم ۔ معاشرے اور اس نظام کو چلانے والوں کے درمیان اتنی وسیع خلیج حائل ہے کہ باید و شاید ۔

چہارم ۔ طلبہ اور اساتذہ کو سیاسی جماعتوں نے سیاست میں اس قدر ملوث کردیا ہے کہ اب تعلیمی ادارے سیاسی جماعتوں سے زیادہ طاقتور ہوگئے ہیں اور تعلیم کی جانب نہ طالب علم توجہ دے سکتا ہے اور اساتذہ اگر چاہیں بھی تو اس رجحان کا سد باب نہیں کرسکتے ۔

پنجم ۔ تعلیمی اداروں کی اندرونی سیاست اس قدر نا گفتہ بہہ ہے کہ اسکا تفصیلی ذکر قرطاس و قلم کے لیے ممکن نہیں ۔ طلبہ کے ہاتھوں اساتذہ کی بے حرمتی اور اساتذہ کے گھروں کا گھیراو کرنے اور کرانے والے جب تہذیب یافتہ با علم افراد ہوں تو اس تعلیمی جہالت سے ناخواندگی ہزار درجہ بہتر ہوگی ۔

ششم ۔ طبقاتی اختلافات کو بڑھانے کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے اس میں خامیاں پیدا ہوگئی ہیں ۔ ان خامیوں کاکوئی علاج بھی ہونا چاہیے۔

تجاویز :

ہم تفصیل میں جائے بغیر چند تجاویز پیش کرنے کی جسارت کرینگے۔

اولاً ۔ قدیم و جدید نظام ہائے تعلیم کے فرق کو ختم کیا جائے اور ملک میں ایک ہی نظام تعلیم رائج کیا جائے تاکہ ذہنی ہم آہنگی پیدا ہو اور پڑھے لکھوں کے درمیان کشیدگی کم ہو ۔
اس فیصلے سے قبل انگریزی ذریعہ تعلیم کو ختم کرکے اردو اور مقامی زبانوں کے ذریعہ تمام علوم کی تدریس شروع کرنی ہوگی ۔ اس ایک فیصلے سے قدیم و جدید نظام ایک دوسرے کے قریب آجائینگے ۔

دوئم ۔ معاشرے کو نظام تعلیم کے ساتھ منسلک کرنا پڑیگا ۔ اب حاکم حکومت اور محکوم یا رعایا کا تصور اور اس پر مبنی عمل کو ختم کرنا ہوگا ۔

یعنی عوام اور حاکمان وقت کے بچوں کے لیے ایک ہی نظام تعلیم ہونا چاہیے۔ اس فیصلے کے نتیجے میں درج ذیل تبدیلیاں لانی ہوں گی ۔

۱ ۔پرائمری تک تعلیم گاؤں اور محلہ کی ذمہ داری ہوگی ۔ کوئی گاؤں اور کوئی محلہ ایسا نہیں جہاں پانچ سات تعلیم یافتہ یہ کام اعزازی طور پر یا معمولی وظیفے کے بدلے نہیں انجام دے سکتے ۔ یہ معاشرے کا کام ہے کہ تنخواہ دار ملازم رکھیں یا اعزازی اور رضاکار اساتذہ کا استعمال کرے ۔ فیس لی جائے ۔

۲ ۔ ثانوی درجہ تک تعلیم یونین کونسل کی ذمہ داری قرار پائے ۔ یہاں بھی فیس لی جائے ۔ تیس طالبعلموں کی جماعت کا استاد اگر بارہ سو رپے ماہوار لیتا ہو تو فی طالبعلم چالیس رپے فیس ہوتی ہے ۔ چالیس رپے کی ایک مرغی یا ڈیڑھ من سوختنی لکڑی ملتی ہے ۔ تو کیا ایک کسان اپنے بچے کی تعلیم کے لیے سال میں بارہ مرغیاں بھی نہیں پال سکتا ۔ ہر شے کے لیے قیمتیں آسمان کو چھو رہی ہیں ۔ اگر کہیں پر پرانے اندازے قائم رکھے گئے ہیں تو وہ اساتذہ کی تنخواہیں ہیں ۔ شاید اس لیے کہ تعلیم عطا کرنے والا طعام کے بغیر ہی زندگی گزار سکتا ہے ۔ اس لیے استاد کو تنخواہ زیادہ دینا ممکن نہیں سمجھا جاتا مگر وہ ایک گھنٹہ ٹیوشن پڑھانے کے لیے منھ مانگے دام حاصل کرسکتا ہے ۔

۳ ۔ کالج یعنی بارھویں جماعت کی ذمہ داری ضلع انتظامیہ پر ہو ۔
۴ ۔ حکومت صرف یونیورسٹیاں اور پیشہ ورانہ ادارے چلائے ۔
۵ ۔ یورپین طرز کے سکول بند کرنے ہونگے ۔

راقم الحروف کو تعلیم ، نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کی باریکیوں کا ذاتی طور پر تجربہ حاصل نہیں ۔ بحیثیت اس ملک کے ایک فرد کے اپنے خیالات کا اختصار کے ساتھ اظہار کرنے کی جرات کی ہے ۔ جب کبھی اس فقیر کا ذہن مسلمانوں کی پہلی ریاست کی طرف جاتا ہے تو اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے اس ریاست کے کاروبار اور اس کے معاشرے کے خدوخال پر غور نہیں کیا ۔ اسلام کے پہلے معاشرے اور اس معاشرے کی قائم کردہ ریاست و حکومت نے اپنا تعلیمی مرکز مسجد کو بنایا تھا ۔ ہم دیار غیر سے آئی ہوئی روایات کے زیر اثر علم کو مسجد سے دور لے جانے کی کوشش کرتے رہے ہیں ۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہمارے ارباب فکر و نظر اجتماعی زندگی کے اس پہلو پر غور فرمائیں کہ کس طرح حصول علم کا فریضہ پورا کرنے کے لیے ہم ایک بار پھر مسجد کو خانۂ خدا سمجھ کر اس کے فرش سے دور نہ بھاگیں بلکہ اسے مقام سجدۂ رب العالمین سمجھ کر اس کے اقراء کے حکم کی تعمیل کریں ۔

پاکستان کا نظام تعلیم
اصلاح کی کوششیں

جناب پروفیسر مسلم سجاد

کسی قوم کی زندگی میں چالیس سال کی مدت کم نہیں ہوتی - چھٹے منصوبے کے اختتام پر ہم یہ مدت پوری کر لیں گے۔ لیکن کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے جن مقاصد کے لیے یہ ملک حاصل کیا تھا ان کے حصول کے لیے بحیثیت ایک قوم قابل اطمینان حد تک پیش رفت کی ہے ؟ اس وقت ہمارے غور و فکر کا دائرہ تعلیم ہے جو کسی قوم کے اجتماعی مقاصد کے حصول میں اساسی اور فیصلہ کن اہمیت رکھتا ہے ۔ اس مقالے میں تعلیم کے حوالے سے یہ جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے کہ حصول آزادی کے وقت جو نظام ہم نے سابق آقاؤں سے ورثے میں پایا تھا کیا ہم اس میں اس طرح اصلاح کرنے میں کامیابی حاصل کر سکے ہیں کہ وہ پاکستان کی آزاد اسلامی مملکت کے شایان شان ہو ؟

پاکستان اور دنیا کی ایک عام دوسری مملکت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے۔ نظریاتی ریاست میں تعلیم کی اہمیت غیر معمولی ہوتی ہے ۔ نئی نسل کو اس طرح تربیت دینی ہوتی ہے کہ وہ ریاست کے نظریے کی محافظ اور علمبردار بنے۔ دنیا اس ملک کے شہریوں کو آزما کر اور ان کی اخلاقی اور مادی حالت کو پرکھ کر یہ رائے قائم کرتی ہے کہ یہ نظریہ انسان کے لیے کیسا ہے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان جس نظریے پر مبنی ہے وہ کسی انسان کا بنایا ہوا نظریہ نہیں ہے بلکہ خالق انسان کی جانب سے رسولؐ کے ذریعہ سے آیا ہوا وہ نظریہ ہے جس پر عمل انسان کی دنیاوی اور اُخروی فوز و فلاح کا ضامن ہے ۔ ہم حقیقی ذریعۂ علم کی بنیاد پر اس سچائی پر ایمان رکھتے ہیں کہ یہی ایک نظریہ برحق ہے ۔ اصلاح کی کوششوں کا جائزہ لینے کے لیے ہمارا معیار یہی نظریہ ہے جو کسی بھی قوم کے انفرادی اور اجتماعی تقاضے ہر دور میں بہ تمام و کمال پورے کرتا ہے ۔!

اگر ہم آزادی حاصل کرنے کے بعد اپنی منزل کا صحیح تعین کرکے تعلیم کو اس کے حصول کا موثر ذریعہ بنا لیتے تو آج دنیا چین ، جاپان اور جرمنی

کے بجائے ہماری مثالیں دے رہی ہوتی ۔ جاپان کے میجی انقلاب کی مثال دی جاتی ہے ، چین آنکھوں کے سامنے کہاں سے کہاں جا پہنچا۔ دوسری جنگ کے بعد جرمنی کی کیا حالت تھی اور پندرہ بیس سال میں اس نے حالات کا کس طرح مقابلہ کیا ۔ ہم خود اپنے بچوں کو ان کی مثالیں دیتے ہیں حالانکہ مادی ترقی کے لحاظ سے وہ قابل تقلید ہوں، لیکن انسان کی زندگی کو بحیثیت انسان جو کچھ ملا ہے وہ کسی طور قابل تقلید نہیں۔ جب کہ ہم نے ان سے اچھی اور بہتر مثال قائم کرنے کا موقع ضائع کر دیا ۔

تعلیم کے لحاظ سے آج ہم کہاں کھڑے ہیں ؟ خواندگی کی کل اوسط شرح ۳ء۲۳ فی صد (نظرثانی شدہ ۲۶ فی صد) ۔ خواتین میں ۷ء۱۳ فیصد ہے۔ دیہی علاقے میں کل اوسط ۸ء۱۲ فی صد ہے۔ دیہی خواتین میں ۵ء۵ فی صد ہے اور بلوچستان کی دیہی خواتین میں ۸ء۰ فی صد ہے (بحوالہ نیشنل سنٹر رپورٹ ۱۹۸۱ء)۔ خواندگی کی تعریف ہم جانتے ہیں۔ ان شرحوں سے تعلیم کی حالت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ پرائمری میں داخلے کی عمر کے صرف ۵۰ فیصد بچّے داخلہ پاتے ہیں جن میں سے ۵۰ فیصد ڈراپ آؤٹ ہوتے ہیں ۔ یعنی یونیورسل کی دلّی ہنوز دور است ۔ ثانوی میں داخلے کی عمر کے صرف ۲۱ فیصد ۸۳ ۔ ۸۲ ۱۹ء میں داخل تھے ۔۔۔ تعلیم کے لیے وسائل کا معاملہ ہے ۔ قومی آمدنی (جی ۔ این ۔ پی) کا ۷ء۱ فیصد اور بجٹ کا چھ فی صد ہم خرچ کرتے ہیں ۔ جب کہ یہ کم از کم ۴ فیصد اور ۲۰ فیصد ہونا چاہیے ۔ دوسرے ممالک سے تقابل کر کے شرمندہ نہیں کرنا چاہتا ۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ چھ سال کے دور اصلاح اور قومی تعلیمی پالیسی کے نفاذ کے پانچویں سال وفاقی وزیر تعلیم نے یوں اقبال جرم کیا " پاکستان بحیثیت قوم خطرے میں ہے اور مکمل انتشار اور تباہی کے کنارے ہے " (ایکشن پلان ۱۹۸۳ء)

یہ تو اعداد وشمار کی کہانی ہے، لیکن اس نظام کی تربیت یافتہ ایک نسل نے عملاً ملک کا انتظام سنبھال لیا ہے ۔ اس کے اخلاص و کردار کی نظریے سے وابستگی وفاداری کی ، اور قوم کے لیے ایثار و قربانی کی کیا کیفیت ہے ۔ حقیقت حال ہم سب کے گرد و پیش ہے اور ہم سب کچھ جانتے ہیں ۔ ہمیں اپنے دلوں کو ٹٹول کر یہ دیکھنا چاہیے کہ معاشرے میں جو اچھائی اور بھلائی پائی جاتی ہے اس میں کتنا دخل نظام تعلیم کا ہے اور کتنا مسلم معاشرہ اور خاندان کی اپنی روایات کا جو نظام تعلیم سے مدد کے بغیر بلکہ اس کی علی الرغم آج بھی موثر ہے ۔

اصلاح کی ذمہ داری کس کی ہے ؟ ہر فریق دوسرے پر ذمہ داری ڈال کر اپنے کو بری قرار دیتا ہے ۔ حکومت ، معاشرے کے قائدین ، والدین ،

ذرائع ابلاغ، استاد اور خود طلبہ سب ذمہ داری میں کم یا زیادہ شریک ہیں ۔ اگر تعلیم میں اصلاح نہ ہوئی تو نقصان کس کا ہوگا ۔اس لیے ہر ایک کو اپنے فرض کو محسوس کرنا چاہیے اور ادا کرنا چاہیے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اجتماعی کوششوں کو ایک رخ دینے میں فیصلہ کن کردار حکومت کا ہوتا ہے کہ جو ذرائع اور وسائل پر قبضہ رکھتی ہے اور چاہے تو دوسرے تمام عناصر کو، طلبہ کو، اساتذہ کو، والدین کو اور ذرائع ابلاغ کو متحرک کر کے قومی مقاصد کے حصول میں انہیں ان کا کردار ادا کرنے پر آمادہ کر سکتی ہے ۔اس لیے اس جائزے میں اصل اہمیت سرکاری سطح پر کی گئی کوششوں کو دی گئی ہے اور ایک سرسری جائزہ دوسرے عوامل کے کردار کا بھی لیا گیا ہے ۔

اصلاح کی کوششیں

تعلیم کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ کرنے کی جو کوششیں گزشتہ ۳۷ سال میں کی گئی ہیں ان کا ایک مختصر سا تعارف یہ ہے ۔

۱ ۔ نومبر ۱۹۴۷ء میں کراچی میں ایک کل پاکستان تعلیمی کانفرنس بلائی گئی جس نے کچھ بنیادی امور طے کیے ۔

۲۔ ۴ ، ۵ دسمبر ۱۹۵۱ء کو کراچی میں تعلیمی افسران کے ایک اجلاس میں تعلیم کا پہلا شش سالہ منصوبہ منظور کیا گیا ۔

۳ ۔ ۲ جنوری ۱۹۵۲ء کو کونسل ایجوکیشن کمیٹی نے جو ۹ ستمبر ۱۹۴۹ء کو قائم کی گئی تھی اپنی رپورٹ پیش کی ۔ اس رپورٹ نے نظام تعلیم کے بنیادی مسائل سے جاندار انداز میں بحث کی۔

۴۔ ۱۹۵۶ء میں پہلا پنج سالہ منصوبہ پیش کیا گیا جس میں تعلیم کے بارے میں بھی منصوبہ بندی کی گئی ۔

۵۔ ۲۲ مئی ۱۹۵۵ء کو لاہور کے ثانوی تعلیمی بورڈ نے ایک کمیٹی بنائی جس نے اعلا ثانوی جماعتوں تک کے نظام میں اصلاحات تجویز کیں ۔اس کی رپورٹ ۳۰ مارچ ۱۹۵۷ء کو منظور کی گئی۔

۶۔ ۳ جنوری ۱۹۵۷ء کو مشرقی پاکستان کی حکومت نے مشرقی پاکستان میں نظام تعلیم کی تنظیم کے لیے ایک تعلیمی اصلاحات کا کمیشن مقرر کیا جس نے سوالنامہ جاری کر کے آراء حاصل کیں اور ۱۱ جولائی ۵۷ء کو اپنی رپورٹ پیش کی ۔

۷ ۔ ۱۹۵۹ء میں صدر ایوب خاں کی مارشل لا حکومت نے پورے ملک کے کے نظام تعلیم کو ملکی اور قومی ضروریات کے مطابق ڈھالنے کے لیے

ایک قومی تعلیمی کمیشن بنایا۔اس کمیشن نے ایک مسبوط رپورٹ اسی سال پیش کی۔

۸۔ ۱۹۷۰ء دسمبر ۱۹۷۲ء میں حکومت نے طلبہ کا بہبود کمیشن قائم کیا جس نے ایک ضخیم رپورٹ ۱۹۷۲ء میں پیش کی۔

۹۔ ۱۹۶۹ء میں یحییٰ خان کی مارشل لا حکومت نے ایک کمیٹی قائم کی جس نے پورے نظام تعلیم کے بارے میں دور رس اصلاحی تدابیر تجویز کیں۔

۱۰۔ ۱۹۷۲ء میں بھٹو دور حکومت میں ایک نمائندہ اجلاس میں تعلیم کے مسئلے پر غور کیا گیا اور تعلیمی پالیسی تیار کی گئی۔

۱۱۔ ۱۹۷۸ء میں صدر ضیاءالحق کی مارشل لا حکومت نے مشورہ اور تجاویز کے بعد ایک قومی تعلیمی پالیسی پیش کی۔

۱۲۔ ۱۹۸۳ء میں ڈاکٹر محمد افضل کے وزیر تعلیم بننے کے بعد ۱۹۸۳ء تا ۱۹۸۸ء کے چھٹے منصوبے کے لیے تعلیم کا ایکشن پلان تیار کیا گیا۔

یہ وہ کل کوششیں ہیں جو ہمارے ملک میں نظام تعلیم کی اصلاح کے لیے کی گئی ہیں۔ ان سب کا جو کچھ حاصل ہے وہ تقریباً اسی طرح کے نظام تعلیم کی صورت میں ہے جیسا کہ ۱۹۴۷ء میں تھا، بلکہ کچھ مزید بگڑی ہوئی شکل میں اور سنگین‌تر مسائل کے ساتھ ہمارے سامنے ہے۔ لیکن ان کوششوں کا ایک سرسری مطالعہ یہ سمجھنے میں مدد دے گا کہ تعلیم کے معاملے میں ارباب اقتدار اور ماہرین تعلیم کا کیا نقطۂ نظر رہا ہے اور آج تک نظام تعلیم کے مسلمانوں کی خواہشات اور امنگوں کے مطابق نہ ہونے بلکہ ان کو شکست دینے اور ملکی ضروریات کو اطمینان بخش طریقے پر پورا نہ کرنے میں کن امور کا دخل رہا ہے۔

۱۔ ۱۹۴۷ء کی تعلیمی کانفرنس کی روداد اور چھے سالہ منصوبے کے مقدمے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں رخ درست تھا اور منزل کا شعور بھی تھا۔ کانفرنس نے اسلام کا تعلیمی نظریہ تسلیم کیا اور پورے نظام تعلیم میں اسلامی نظریۂ حیات کو جاری کرنے کے لیے اقدامات تجویز کرنے کی قرارداد منظور کی۔چھٹے منصوبے کی ابتدائی بحث میں کہا گیا کہ ——— "رائج نظام تعلیم ہر طرح سے ناقص ہے اور عوام کی خواہشات کے برعکس ہے۔ اور آزاد ترقی پذیر معاشرے کے لیے ناکافی ہے۔ ہماری اساس قرارداد مقاصد ہے۔ تعلیم خلا میں نہیں دی جاسکتی، اسے نظریاتی انقلاب

کا ذریعہ بنناچاہیے جس کے لیے پاکستان قائم ہوا " ـــــــــ

"ـــــ(تعلیم کا مقصد انسان کو اس کی اصل حیثیت یعنی خلیفۃ اللہ کے لیے تیار کرنا ہوناچاہیے تاکہ وہ حدود الٰہی کے اندر رہ کر تسخیر کائنات کر سکے اور اسے اپنے اعمال کی جوابدہی کا احساس ہو" ـــــ اس مقدمے میں یہ بھی کہا گیا ـــــ" موجودہ نظریاتی بحران میں پاکستان کو ایک نئے نظام کا علمبردار بن کر سامنے آنا ہے۔اسلامی نظریے کی بنیاد پر تشکیل پایا ہوا نظام تعلیم ہی پاکستان کو یہ مقام دلا سکتا ہے۔اس مقصد کوحاصل کرنےکے لیےدو میدانوں کی طرف خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔ (۱)اساتذہ کی اصلاح و تربیت اور (۲) نصاب کی اصلاح ، اس طرح کہ ہم اسلامی نظریۂ حیات کو اختیار کریں اور دنیاوی لحاظ سے ترقی یافتہ ممالک سے کسی طرح بھی کم نہ ہوں" ـــــ)

(یہ طویل اقتباس اس لیے نقل کیا گیا کہ یہ معلوم ہو کہ ۳۷ سال پہلے بھی مسائل کا صحیح شعور موجود تھا ۔اگر آج اس طرح کی باتیں کی جائیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہوگی - لیکن اگر سرکاری منصوبوں میں جیسا کہ چھٹے منصوبے کے تحت تعلیم کے ایکشن پلان برائے۸۳ تا ۱۹۸۸ء میں ہے، یہ منزل ہی گم کر دی جائے تو پھر قوم کے لیے لمحہ فکر یہ ضرور ہے۔)

<u>لیکن عملاً کیا کیا گیا</u>

- اساتذہ کے لیے تین ماہ کے ریفریشر کورس کا منصوبہ تھاتاکہ انہیں اسلامی نظریے کی صحیح فہم حاصل ہو اور وہ اسے عملاً زندگی میں اختیار کرنے پر آمادہ ہوں ۔اس پر عمل نہیں کیا گیا۔
- ثانوی تعلیم کا ایک منصوبہ کراچی بورڈ کے صدر نے پیش کیا جس میں نظریۂ اسلامی کا کہیں ذکر نہ تھا ، لیکن موسیقی بطور مضمون متعارف کروایا گیا۔
- موتمر عالم اسلامی کو عربی تعلیم کا مرکز بنانے کے لیے چار لاکھ روپے دیئے گئے ،لیکن فنون لطیفہ کے لیے بھی ۱۹ لاکھ روپے رکھے گئے ۔

۲۔ ۱۹۵۲ء میں کمرشیل ایجوکیشن کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کی ۔ یہ رپورٹ اسٹیٹ بنک کے پہلے گورنر جناب زاہد حسین نے لکھی تھی ۔ آج کل ہمارے ماہرین تعلیم کے ذہن یہ قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتے کہ ٹکنیکل تعلیم میں مذہب اور ثقافت کا دخل ہے ۔

لیکن اس رپورٹ کے مصنف نے ٹکنیکل تعلیم کا نظریاتی پاکستانی تصور پیش کیا اور اس بات کو حقیقی اہمیت دی کہ تعلیم پانے والا پاکستانی مسلمان نسل کا فرد ہے۔

"ـــــــ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ قرار داد مقاصد منظور کر کے ہم نے اپنے اوپر یہ ذمہ داری لے لی ہے کہ مطالعے کے نصاب اس طرح مرتب کیے جائیں کہ ہماری تعلیم میں، اسلامی جذبہ جاری و ساری ہو ـــــــ"

"ـــــــ ہمیں غیر ملکی کمیٹیوں کو قابل معافی سمجھنا چاہیے اگر وہ ایسا نصاب مرتب نہ کر سکیں جن سے ہمارے نوجوانوں کو ہماری روایات کے مطابق تہذیبی بنیادیں فراہم ہوسکیں ـــــــ"

"ـــــــ ہمارے لیے یہ ناقابل تصور ہے کہ مستقبل میں تجارت کی زبان انگریزی رہے۔ کامرس کی تعلیم، تعلیم کی ایک قسم ہے اور اسے بھی اردو میں ہونا چاہیے ـــــــ"

"ـــــــ نصاب میں اصل اہمیت قرآن کے بعد نبی اکرمؐ کے اسوہ حسنہ کو دی جائے۔ ثانوی مدارس میں ان کی حیات طیبہ اس طرح پڑھائی جائے کہ ان کا مقصد اور وہ اصول جن کے لیے انہوں نے جدوجہد کی، ذہن نشین ہو جائیں ـــــــ"

رپورٹ کے مصنف کے جدید تعلیم یافتہ ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر ان کا یہ نظریاتی پاکستانی تصور مشعل راہ بنایا جاتا تو آج ہماری کہانی مختلف ہوتی ۔ ان کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی اور گاڑی اسی طرح چلتی رہی ۔

۳۔ اس دور میں عمل کا اندازہ ان باتوں سے ہو سکتا ہے۔

۱ ۔ ایک گروہ اسلامیات کے گھنٹہ (پیریڈ) کو اسلام کے تقاضوں کی تکمیل سمجھتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۵۲ء کے مشاورتی بورڈ کے اجلاس میں وزیر تعلیم نے کہا، "۱۹۴۷ء کی کانفرنس کی نظام تعلیم کو اسلامی بنانے کی سفارش پر توجہ دی گئی ہے اور مرکزی و صوبائی حکومتوں نے مذہبی تعلیم کو نصابات میں شامل کر لیا ہے "۔

۲۔ مسجدوں میں اسکول کھولنے کی تجویز پر کہا گیا، " نظام تعلیم کی اسلامی نظریے کے مطابق تشکیل تو ہو چکی ہے اس لیے اس نقطۂ نظر سے مسجدوں کو بطور اسکول استعمال کرنے کی

ضرورت نہیں ہے ۔اسکولوں میں مذہبی تعلیم لازمی ہے "۔

۳۔ مشنری اسکولوں کے احتجاج پر درسی کتب وزارت تعلیمات میں جمع کی گئیں اور آخر بات یہ طے ہوئی " ٹیکسٹ بک کمیٹیوں، مصنفوں اور نظرثانی کرنے والوں پر یہ واضح کر دیا جائے کہ پاکستانی اسکولوں میں استعمال ہونے والی کتابیں مسلم اور غیر مسلم دونوں طلبہ کے لیے ہیں ، اور اس طرح لکھی جانی چاہییں کہ کسی کے جذبات مجروح نہ ہوں ۔مثلاً رسول اکرمؐ کو ایک ایسی تاریخی شخصیت کی حیثیت سے پیش کیا جائے جو مسلمانوں کے پیغمبر تھے ، دوسروں کے نہیں ۔قرآن کو سماوی کتاب کہا جائے،لیکن یہ واضح کر دیا جائے کہ یہ صرف مسلمانوں کی سماوی کتاب ہے"، یہ تبدیلیاں کروانے کے باوجود ان اسکولوں نے یہ کتابیں استعمال نہ کیں اور وزیر تعلیم ایک جگہ اس کی شکایت کرتے نظر آتے ہیں ۔

۴۔ مشنری اسکولوں میں مسلمان طلبہ کی لازمی مذہبی تعلیم کے انتظام کے لیے حکومت نے پیش کش کی کہ اسکول کی عمارت میں کمرے کرایے پر لے کر یا الگ تعمیر کروا کے اپنا استاد بھیج کر پڑھوائے (مسلمانوں کی حکومت میں مسلمانوں کی بے بسی!)

۴۔ اسلامیات کا پیریڈ مسلمانوں کے اس ملک میں جس نشیب و فراز سے گزرا ہے وہ ایک دلچسپ تاریخی کہانی ہے ۔اس کے ایک حصے کا بیان یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ۔ اسے بارہویں تک لازمی کیا گیا تھا ۔لیکن غالباً یہ ناگوار تھا ۔چنانچہ لاہور بورڈ کی ثانوی تعلیم پر رپورٹ نے اسے صرف دسویں تک لازمی رکھا اور اصل کام یہ دکھایا کہ اسے غیر امتحانی کر دیا ـــــ صفحہ ۹۵ پر اس کے لیے یہ دلیل درج ہے "ـــــ اگر مذہبی تعلیم کو آخرکار امتحانی مضمون بنانا قابل عمل ہو تو بھی اس کو فی الفور امتحانی بنانا مطلوب نہیں ہے۔ اسی طرح نہ یہ مطلوب ہے اور نہ ہی اسے مانا جائے گا ۔ (گویا یہی ایک رکاوٹ ہے!) کہ اسے اسکول کے نصاب سے بالکل خارج کر دیا جائے ۔اس لیے صرف دو راستے رہ جاتے ہیں ـــــ

(۱) اسے غیر امتحانی مضمون بنا دیا جائے (۲) اسکول کے اپنے امتحان میں اس میں پاس ہونا ضروری ہو ـــــ "

۵۔ جب اس کمیٹی کے سامنے یہ موقف پیش کیا گیا کہ نظام تعلیم کا اولین مقصد طلبہ کی اسلامی تعلیم و تربیت ہے تو جواب دیا گیا ،

"ــــــ چونکہ پاکستان میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں رہتے ہیں اس لیے تعلیم کا مقصد طلبہ کو اسلامی جمہوریہ پاکستان کا شہری بنانا ہوگا ۔ مسلمانوں کو لازمی مذہبی تعلیم اور سوشل اسٹڈیز کے ذریعہ سے اسلامی طرز زندگی سے خوب واقف کرایا جائے گا ۔"

۶۔ ۱۹۵۸ء تک کے دور کے کچھ دوسرے نمایاں پہلو یہ ہیں :

۱ ۔ ہمیں تعلیم میں ملکی ضروریات کے لحاظ سے کوئی حقیقی منصوبہ بندی نظر نہیں آتی ۔ مرکزی وزارت نے صوبوں کو تعلیمی منصوبے کے لیے سفارشات بھیجنے کو خط لکھا جس میں کہا گیا ،
"کسی منصوبے کے نہ ہونے کی بنا پر ہم قومی ترقی کی کل رقم میں سے تعلیم کے حصے کے لیے دباؤ نہ ڈال سکے غیرملکی وظائف بھی اسی لیے ضائع جا رہے ہیں کہ اس کے لیے منصوبہ بندی نہیں ہے"۔

۲۔ ملک کی اسّی فیصد دیہی آبادی کے لیے کسی خصوصی زرعی تعلیم کا تذکرہ نہیں ملتا ۔

۳ ۔ خواندگی کی شرح بڑھانے کا کوئی عزم کوئی منصوبہ نہیں ، صرف رسمی سا تذکرہ ہے ۔

۴۔ لازمی پرائمری تعلیم کا ارادہ تو درج ہے ، لیکن تکمیل کے آثار دور دور نہیں ۔

۵۔ تعلیم کو محدود رکھنے کا رجحان سرکاری پالیسی محسوس ہوتی ہے ۔ مشنری اسکولوں کو فراخدلی سے گرانٹ دی گئی ۔ پبلک اسکول کھولے گئے ۔ ایچی سن کالج کو یونیورسٹی سے زیادہ گرانٹ دی گئی ۔

۷ ۔ ۱۹۵۹ء میں قومی تعلیمی کمیشن نے رپورٹ پیش کی ۔ یہ شریف رپورٹ کے نام سے مشہور ہے ۔ یہ نظام تعلیم کے مکمل جائزے اور اس کی " اصلاح " کے لیے مبسوط اور ہمہ گیر تجاویز پرمشتمل تھی۔ یہ اہل پاکستان کی بد قسمتی تھی کہ یہ رپورٹ دینی و ملّی نقطہ نگاہ سے مایوس کن اور مغربی سیکولر ذہن کی آئینہ دار تھی ۔ اس سے قبل کوئی اچھی فکر رہی تو وہ بے عملی کا شکار ہوگئی ، لیکن یہ سوچی سمجھی کوشش تھی ۔ اس پر بھی عمل نہ ہوتا تو زیادہ نقصان دہ نہ ہوتی ، لیکن یہ اس ذہن کی ترجمان تھی جو اسلامی نقطۂ نظر سے تعلیم کی تشکیل نو کو کامیابی سے روکے ہوئے تھا ۔ اب انہیں کھلا موقع ملا ۔ فوجی حکومت نے فوجی انداز سے عمل

بھی شروع کر دیا۔ (اس وقت مارشل لا عمل نہ کرنے کا ہم معنی نہ ہوا تھا)۔

ملک میں ایک قلیل عنصر کا یہ ذہن تو معلوم ہے کہ وہ اسے امریکا اور یورپ کا نمونہ بنانا چاہتے ہیں اور اسلام سے الرجی رکھتے ہیں ۔لیکن اس کمیشن کے ذریعہ سے اس عنصر کو نئی نسل کی تشکیل پر فیصلہ کن اثرات ڈالنے کا موقع ملا۔اس رپورٹ کے بارے میں کچھ نکات ذیل میں دیے جا رہے ہیں:

۱ ۔ قومیت کا جاہلی تصور پیش کیا گیا ۔ پاکستان کے اسلامی تشخص کی کوئی وقعت محسوس نہیں ہوتی ۔

۲۔ تعلیم مملکت کی ذمہ داری اور عوام کا حق نہیں ، بازار کی جنس ہے۔

۳ ۔ اسلامیات آٹھویں تک لازمی رکھی گئی (یعنی بارھویں اور دسویں کی لازمی ختم کر دی گئی)

رپورٹ میں اس کا حوالہ بار بار اس طرح دیا گیا ہے کہ جیسے اسلام کی خاطر اس سے زیادہ اور کیا کیا جا سکتا تھا۔

۴۔ فنون لطیفہ ، موسیقی اور رقص کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے۔ سفارش ہے کہ ہر استاد کو اس کی تربیت دی جائے ،بالخصوص موسیقی اور مصوری کی۔

۵۔ دینی مدارس کے بارے میں اشاروں میں یہ تجویز موجود ہے کہ انہیں ختم کر دیا جائے ۔ کمیشن کو حیرت ہے کہ یہاں اب تک اسلام کو اصل اہمیت دی جاتی ہے اور دوسرے مضامین کو ثانوی حیثیت حاصل ہے۔کمیشن نے آٹھویں جماعت تک لازمی والا جو نظام تجویز کیا ہے وہ ایک متوازن نظام ہے۔

۶۔ طالبات کی تعلیم کے بارے میں خالص مغربی نظریہ پیش کیا گیا ہے ، یعنی ان کو لائٹ اور ہیوی موٹر گاڑیوں اور ٹرک چلانے کی تربیت دی جانی چاہیے ۔

۷۔ کردار کی تعمیر پر ایک چھے صفحے کا باب ہے ،لیکن اس میں ایک جگہ بھی لفظ اسلام نہیں آیا ہے ۔

۸۔ معیار کے نام پر تعلیم کو محدود کرنے کی متعدد تجاویز پیش کی گئی ہیں ۔

یہ رپورٹ تین سالہ کورس کی وجہ سے طلبہ کے ملک گیر احتجاج کا سبب بنی اور صدر ایوب کی حکومت کو یہ کورس واپس لینا پڑا ، لیکن اس کی تجاویز پر محکمہ تعلیم میں عمل کی کوشش کی جاتی رہی ، نتیجے کے طور پر تعلیم کے بگاڑ میں اضافہ ہوتا رہا ۔

۸ ۔ طلبہ احتجاج کے نتیجے میں طلبہ کو مطمئن کرنے کے لیے حکومت نے جسٹس حمود الرحمن کی سرکردگی میں ایک اسٹوڈنٹس ویلفیئر کمیشن قائم کیا ۔ اس کمیشن نے پورے ملک کا دورہ کیا، ہر جگہ ملاقاتیں کیں اور ایک مفصل رپورٹ پیش کی ۔ نظام تعلیم کا نظریہ اور مقصد اس کمیشن کا موضوع نہیں تھا تاہم طلبہ کے حوالے سے درس گاہوں کے انتظامات اور دیگر بہت سے امور کے بارے میں اس کمیشن نے متعدد اچھی تجاویز پیش کیں لیکن تعلیمی دنیا پر ان کا کوئی خاص اثر محسوس نہ ہوا ۔ اس لیے کہ ان تجاویز پر عمل کے لیے غیر معمولی وسائل درکار تھے اور اس وجہ سے بھی کہ اگلے سال عشرہ ترقی کے ساتھ ہی ایوب حکومت کا خاتمہ بھی قریب آگیا ۔

۹ ۔ ۱۹۶۹ء میں ائیرمارشل نور خاں کی سربراہی میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس نے ایک مختصر رپورٹ (ساٹھ صفحات) پیش کی ۔ اس میں صرف کام کی باتیں تھیں ۔ مرض کی صحیح تشخیص کی گئی تھی ۔ علاج کی جزئیات میں اختلاف ہو سکتا تھا، لیکن شریف رپورٹ کے پس منظر میں نور خاں رپورٹ اہل ملک کی خوش قسمتی تھی کہ ایک دفعہ پھر تعلیم کی گاڑی کو صحیح رخ پر ڈالنے کا کام سنجیدگی سے کیا جا رہا تھا ۔ اس رپورٹ میں کہا گیا "—— اب تک اس نظام تعلیم میں بنیادی تبدیلی نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ تبدیلی کا کام ان افراد کو سونپا گیا جو خود اس نظام کی پیداوار تھے اور کوئی ایسا طریقہ نہ تھا کہ یہ نظام رائے عامہ سے متاثر ہوتا ——" اس کی قابل تحسین تجاویز میں سے چند یہ ہیں :

۱ ۔ ذریعۂ تعلیم اور صوبائی و مرکزی سرکاری زبان، قومی زبانوں کو بنایا جائے ۔
۲ ۔ غیر ملکی مشنری ادارے قومیا لیے جائیں ۔
۳ ۔ تعلیم بالغان کو خصوصی اہمیت دے کر تعلیم یافتہ معاشرہ تشکیل دیا جائے ۔
۴ ۔ تعلیمی اداروں کو نظریۂ پاکستان کے تحفظ کی شرط کے ساتھ خود مختاری دی جائے ۔

۵ ۔ تعلیمی اداروں کو نوکر شاہی تسلط سے آزاد کر کے ان کے معاملات تعلیم سے متعلق افراد کے سپرد کیے جائیں ۔

۶ ۔ استاد کو تعلیمی نظام میں اور معاشرے میں مناسب مقام دینے کے لیے اقدامات کیے جائیں ۔

۷ ۔ طالبات کے لیے بڑی تعداد میں علاحدہ کالج کھولے جائیں ۔

۸ ۔ جامعات کے شعبۂ معارف اسلامیہ کی تحقیقات کو سیاسیات ، معاشیات اور دیگر مضامین کے نصاب میں سمویا جائے ۔

۹ ۔ دینی مدارس کی ڈگریوں کو اضافی تعلیم کے بعد موجودہ ڈگریوں کے مماثل قرار دیا جائے ۔ ان سے ملازمتوں میں تفریق نہ رکھی جائے ۔

اس رپورٹ کی بعض تجاویز محل نظر بھی تھیں مثلاً سپاہ دانش کا یہ تصور کہ طالبات گروہ در گروہ دیہاتوں میں جائیں اور علم کی روشنی پھیلائیں، مگر بحیثیت مجموعی مثبت ذہن کے ساتھ عملی تجاویز پیش کی گئیں ۔ ان سفارشات پر عمل شروع بھی ہوا (مثلاً جامعات کے صدور شعبہ کے منصب کا گردشی ہونا) لیکن ہنگامی حالات اور کم مدت کار کی وجہ سے اثرات ظاہر نہ ہوئے ۔

۱۰ ۔ ۱۹۷۲ء میں وزیرتعلیم عبدالحفیظ پیرزادہ نے ازسرنو غور و خوض کے بعد نئی پالیسی اختیار کی ۔ حکمرانوں کا اپنا ذہن کچھ بھی رہا ہو، لیکن اس دور میں طلبہ کی بیشتر یونینوں پر اسلامی ذہن کے طلبہ کے انتخاب کی وجہ سے ان کے دباؤ کا کچھ نہ کچھ اثر تھا ۔ پالیسی پر غور کے لیے اسلام آباد میں طلبہ نمائندوں کی کانفرنس منعقد کی گئی ۔

اس دور کا سب سے دور رس فیصلہ تعلیمی اداروں کو قومیانے کا تھا ۔ اچھے اور برے سب طرح کے ادارے قومیائے گئے اور سرکاری و نجی اداروں میں مسابقت کی صحت مند فضا کے بجائے سب ادارے کم معیاری کا شکار ہوئے ۔ اساتذہ کو ملازمت کا تحفظ حاصل ہوا، لیکن اس کے بعض مقامات پر منفی اثرات بھی ہوئے ۔ اس دور میں تعلیمی اداروں میں سیاسی اثرات کا نفوذ بڑھا اور نظم و ضبط کی خراب حالت رونما ہوئی ۔ تعلیمی معیار کی پستی جو پہلے بھی تھی اس دور میں واضح طور پر محسوس ہوئی ۔ تعلیمی بجٹ میں اضافہ ہوا ، لیکن قومیانے کی وجہ سے یہ اضافہ کوئی خوشگوار اثر نہ ڈال سکا ۔

۱۱ ۔ ۱۹۷۷ء کے فوجی انقلاب کے بعد جب حکمرانوں نے انتخابات موخر

کر کے اصلاحات کا آغاز کیا تو تعلیم کو بھی اہمیت دی گئی۔ جنرل محمد ضیاءالحق نے اسلامی نظام کے قیام کو اپنی حکومت کا نصب العین قرار دیا۔ اس لحاظ سے اسلامی نظام تعلیم کا نفاذ بھی اس کا فرض منصبی ٹھہرا۔ درسی کتب سے اسلام اور پاکستان کے خلاف مواد خارج کیا گیا۔ گریجویشن تک اسلامیات اور مطالعۂ پاکستان لازمی کیے گئے۔ چھٹی جماعت سے عربی لازمی کی گئی۔ تعلیم گاہوں میں نماز کے اہتمام کے لیے ہدایات دی گئی۔ ان اقدامات کے ساتھ ہی ایک ہمہ گیر قومی تعلیمی پالیسی بھی تشکیل دی گئی۔ یہ پالیسی مجموعی طور پر ایک قابل تحسین پالیسی تھی۔ اگر اس پر موجودہ حکومت اپنے فوجی ہونے کا لحاظ رکھتے ہوئے عمل کروا لیتی تو آج تعلیمی دنیا کا نقشہ مختلف ہوتا۔ لیکن ہوا یہ کہ اچھی پالیسی ہمیشہ کی طرح وزارت میں موجود مغرب زدہ ذہن کے ہاتھوں بے عملی کا شکار ہوگئی۔ خواتین یونیورسٹی جو صدر مملکت کے بقول ایسا فیصلہ تھا کہ ہفتوں میں نافذ ہو جاتا، چھے سال بعد بھی سرخ فیتے میں الجھا ہوا ہے۔

اس پالیسی میں تعلیم کے قومی مقاصد کو اسلامی نقطہ نظر سے بیان کیا گیا اور بڑی حد تک تجاویز اور سفارشات بھی اس کے مطابق پیش کی گئیں، عمرانی و سائنسی مضامین میں اسلامی نظریے کو سمونا اور اس کے مطابق نصابات کی تدوین اور نئی درسی کتب کی تیاری، خواتین کے لیے علاحدہ نصابات پر آغاز کار، پانچ سال میں تمام اساتذہ کو خصوصی تربیتی پروگرام سے گزارنا، تعلیم بالغان کے لیے کمیشن کا قیام، پرائمری تعلیم عام کرنے کے لیے محلہ اور مسجد اسکولوں کا قیام، مخلوط تعلیم کی حوصلہ شکنی، خواتین یونیورسٹیوں کا قیام، اردو کو درجہ بدرجہ بطور ذریعۂ تعلیم اختیار کرنا، قومی تعلیمی کونسل کا قیام، اور کئی سفارشات جن پر اگر صحیح اسپرٹ کے ساتھ عمل ہو جاتا تو کچھ نہ کچھ نتائج ضرور سامنے آجاتے۔

اس پالیسی کے تحت پانچویں منصوبے کے ہدف مقرر کیے گئے، ان کے حصول کا جائزہ اس وقت موضوع نہیں، تاہم ان پانچ سالوں میں اسی حکومت سے یہ مطالبے کیے جاتے رہے ہیں کہ وہ اپنی پالیسی کی خلاف ورزیوں کو روکے۔

۱۲۔ ۸۸-۱۹۸۳ء کے لیے چھٹے منصوبے میں تعلیم کا شعبہ بھی زیرغور آیا۔ اس کے لیے جو سفارشات تھیں محکمہ تعلیم نے ان پر غور کرکے ایک ایکشن پلان تیار کیا۔ کمیشن نے اور وزارت نے اس کام میں قومی تعلیمی پالیسی سے رہنمائی حاصل نہیں کی اس لیے یہ منصوبہ اس پالیسی کا تسلسل نہیں، بلکہ غلط نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ اس

کا حقیقی تسلسل ۱۹۵۹ء کی شریف رپورٹ سے ہے۔تفصیلات میں اس کے بعض پہلو قابل تعریف ہیں مثلاً پرائمری تعلیم اور تعلیم عامہ کے لیے غیر معمولی وسائل فراہم کیے جائیں ۔ اس ایکشن پلان کے مرتبین موجودہ نظام تعلیم میں کسی بنیادی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کہ سہولتیں فراہم کر کے اور انتظام بہتر بنا کر پاکستان کے تعلیمی مسائل حل کیے جا سکتے ہیں ۔

تعلیمی پالیسی اور ایکشن پلان کا تفصیلی جائزہ اس لیے پیش نہیں کیا جا رہا ہے کہ آئندہ صفحات میں ناکامی کے اسباب اور آئندہ کا لائحہ عمل پیش کیا گیا ہے ۔ یہ عمومی طور پر تو کل ماضی سے متعلق ہے لیکن خصوصی طور پر ماضی قریب کے اسی دور کے پس منظر میں ہے جس میں یہ پالیسی تشکیل دی گئی اور اب چھٹے منصوبے کے تحت ایکشن پلان کے مطابق عمل ہو رہا ہے ۔

اصلاح کی غیر سرکاری کوشش

تعلیمی اصلاح کی کوششوں کا جائزہ غیر سرکاری سطح پر کی جانے والی کوششوں کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا ۔اس ضمن میں ملک کی بعض قد آور شخصیات کا کردار اہم ہے جو تعلیم کی نظریۂ پاکستان اور قیام پاکستان کے تقاضوں کے مطابق تشکیل کی طرف متوجہ کرتے رہے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ، ڈاکٹر رفیع الدین ، اور پروفیسر حمید احمد خاں نے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے سرکاری اداروں کو توجہ دلاتے ہوئے اور اپنے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے اصلاح کا حق ادا کیا ۔

طلبہ اور اساتذہ اس مسئلے کے راست فریق ہیں ۔طلبہ کے لیے حقوق اور سہولت کی لڑائی لڑنے والی تو کئی طلبہ تنظیمیں رہیں ،لیکن نظام تعلیم میں اصلاح کی کوششوں کے ضمن میں اسلامی جمعیت طلبہ کا کردار قابل رشک ہے ۔انہوں نے ایک طرف طلبہ کی اجتماعی قوت کو منظم کر کے اصلاح کی عملی کوشش کی تو دوسری طرف اصلاح کے لیے قیمتی اور وقیع لٹریچر پیش کیا اور حکومت کے قائم کردہ کمیشنوں کو طویل اور اہم یادداشتیں پیش کیں ۔ جسٹس حمود الرحمن نے اپنی رپورٹ میں ان کی اسی صفحے کی یادداشت کا خصوصی ذکر کیا ۔ ۱۹۷۲ء میں جناب بھٹو کے بلائے گئے اجلاس میں طلبہ نمائندوں کی حیثیت سے انہوں نے فیصلہ کن کردار ادا کیا ۔ ۱۹۷۲ء میں تین سو صفحات پر مشتمل مجلہ تعلیم کا مسئلہ ، مخلوط تعلیم پر ایک تحقیقی کتابچہ اور کئی دیگر مطبوعات اصلاح کی کوششوں میں

ان کے حصے کا ثبوت ہیں۔

اساتذہ کی تنظیموں میں سے تنظیم اساتذۂ پاکستان نے اساتذہ کے لیے حقوق و مراعات سے آگے بڑھ کر نظام تعلیم میں مکمل اصلاح کے لیے آواز بلند کی اور متعدد کانفرنسوں کے ذریعہ سے اساتذہ میں بیداری پیدا کی۔ کئی اہم مسائل پر لٹریچر پیش کیا اور تعلیمی تحقیق کے لیے ایک مستقل ادارہ قائم کیا۔

لاہور میں ایک ادارہ آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس قائم ہے جس نے اسلامی تعلیم نام کا رسالہ اردو اور انگریزی میں کئی سال تک شائع کیا۔ اس ادارے نے ڈاکٹر رفیع الدین صاحب کی ایک کتاب شائع کی جو فزکس کی اسلامی نقطہ نظر سے تدریس کے لیے ایک نمونے کی کتاب تھی۔

اسلام آباد میں انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز نے بھی تعلیمی اصلاح کے ضمن میں کوشش کی ہے اور متعدد فکر انگیز کتابچے شائع کیے ہیں۔ تعلیم کے موضوع پر پاکستان کے حوالے سے شرح کتابیات تیار کی ہے۔

اور اب ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کا یہ مذاکرۂ ملی تعلیمات نبوی۔ نظریۂ و فلسفۂ تعلیم اسلامی بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ قومی زندگی کے اس اہم ترین شعبے کے بارے میں اہل علم کے تبادلہ خیال کے نتیجے میں یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ حکومت بھی صحیح اقدامات کی طرف متوجہ ہو اور ہمدرد فاؤنڈیشن اس مذاکرۂ ملی کو مذاکرے سے آگے بڑھا کر تعلیم میں اصلاح کی تحریک بنادے۔

ناکامی کے اسباب

اس جائزے کی روشنی میں اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس ۳۷ سال کی مدت میں ہمارے ملک میں تعلیم تختۂ مشق تو بنی رہی، لیکن اسے کبھی ایسی قیادت میسر نہ آئی کہ جو خلوص اور عزم سے ملی اور قومی مقاصد کو مطمح نظر بناکر قوم کے تمام عناصر کا سرگرم تعاون حاصل کرکے فیصلہ کن اقدامات کرتی۔ ہم ژولیدہ فکری کا شکار رہے۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ آج ہمیں تعلیم کے میدان میں گوناگوں مسائل درپیش ہیں۔ کوئی بھی غیر جانبدار یہ فیصلہ دینے میں حق بجانب ہوگا کہ ہم ناکام رہے ہیں۔ نظریاتی لحاظ سے بھی اور دنیا کے عام معیار کے لحاظ سے بھی۔

اگر ہمیں آئندہ کوئی اصلاح واقعی مقصود ہے تو ہمیں ناکامی کے اسباب کا تعین کرنا چاہیے۔ میری نظر میں یہ اسباب یہ ہیں۔

۱ - یکسوئی فکر سے محروم

حکومت اور معاشرے کے دیگر عناصر پاکستان کےقیام کے مقاصد اور ان کے حصول کے لیے کسی طریق کار پر اتفاق سے محروم تھے - تعلیم کے بارے میں کوئی ایسا قومی COCENSUS نہیں بن سکا جس پر بحیثیت مجموعی عمل ہوتا رہتا - کوئی ایک رخ طے ہوتا اور گرتے پڑتے ہی سہی چلتے تو رہتے۔ مغرب زدہ سیکولر ذہن نے، جو انگریزوں کا وارث ہونے کی وجہ سے ملک کے سیاہ و سفید کا مالک تھا، اپنی فکر کے مطابق تعلیم اور ملک کی گاڑی کو چلایا تو قوم کی حمایت حاصل نہ ہوئی اور جب جدوجہد آزادی میں کار فرما حیات بخش نظریے کے تحت کوئی منصوبہ بندی کی گئی تو مغرب زدہ ذہن نے اسےناکام بنادیا - اس طرح ہم باہم ٹکرا کے وہاں پہنچ گئے جہاں آج ہم کھڑے ہیں - ۱۹۴۷ کی کانفرنس ، ۱۹۶۹ کی نورخاں رپورٹ اور ۱۹۷۸ کی تعلیمی پالیسی ایک مثبت ذہن کی آئینہ دار ہیں اور ۱۹۵۸ کی شریف کمیشن رپورٹ اور ۱۹۸۳ کا ڈاکٹر افضل کا ایکشن پلان دوسرے ذہن کا ------ بدقسمتی سے اس وقت قوم مارشل لاء کی چھتری تلے ایکشن پلان کی زد میں ہے -

۲ - اہمیت کا عدم احساس

تعلیم کی زبانی کلامی اہمیت تو بہت بیان کی گئی، لیکن درحقیقت تعلیم کی اہمیت محسوس نہیں کی گئی - جن قوموں نے تعلیم کی اہمیت محسوس کی ان کی پالیساں اور طریقے بالکل مختلف رہے ہیں - ہم نے دفاع ،صنعت اور زراعت کی اہمیت محسوس کی تو ان میں کچھ نہ کچھ حاصل کرلیا - یہ ہماری کوتاہ نظری تھی کہ ہم نے اس پر قناعت کی - اگر ہماری قیادت وسیع النظر اور راست فکر ہوتی ، اسلامی نہ سہی محض قومی ہوتی ، اس ملک کے کل باشندوں کی فلاح کو اپنے سامنے رکھتی تو تعلیم کو روز اول سے حقیقی اہمیت دیتی - اور آج ہم نہ صرف دفاع ، زراعت و صنعت بلکہ آبادی کے لیے رہائش ، علاج اور دیگر سہولتوں کی فراہمی کے لحاظ سے کہیں آگے ہوتے۔ ہمارا یہ حال نہ ہوتا کہ ہم ملک کےمستقبل کی طرف سے خدشے میں مبتلا ہوں - نظریاتی ریاست ہونےکا تقاضا تو یہ تھا کہ ہم تعلیم کو دفاع سے زیادہ نہیں تو برابر اہمیت ضرور دیتے، لیکن آبادی کوجاہل رکھنے کی وڈیرا شاہی ذہنیت جب قومی پالیسی بن جائے تو ماتم کرنے کا مقام ہے - قومی آمدنی میں تعلیم کا حصہ، بجٹ میں تعلیم کے لیے مخصوص کی جانے والی رقم ، اس میں سے خرچ کی جانے والی رقم، اس کی بھی غلط ترجیحات ، اور اس میں بھی بدعنوانیاں - ان کے اعداد و شمار اگر دیکھے جائیں تومعلوم

ھوجاتا ھے کہ تقاریر سے قطع نظر ھم در حقیقت تعلیم کو کتنی اھمیت دے رھے ھیں -

۳ - تحرک MOTIVATION کی کمی

اصلاح کی جو کچھ بھی اور جیسی کچھ بھی کوشش کی گئی وہ بالعموم اس لیے بھی ناکامی کا شکار ھوئی کہ اس کے لیے مناسب فضا پیدا کرکے متعلقہ افراد کا خوشدلانہ تعاون حاصل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی - پالیسیاں نافذ کردینے کے اعلان سے نافذ نہیں ھوجاتیں - نتائج حاصل کرنے کے لیے منصوبہ بندی اور محنت کی جاتی ھے اور کوشش کی جاتی ھے کہ ملک کی آبادی بالخصوص متعلقہ افراد کو اس میں مثبت طور پر شریک کیا جائے -- فی زمانہ یہ بھی ایک سائنس اور فن ھے کہ تعاون کس طرح حاصل کیا جائے - اگر مقاصدِ منصوبہ اور حکمتِ عملی ملّی آرزوؤں اور قومی ضروریات کے مطابق ھوں تو تعاون حاصل کرنا آسان ھوجاتا ھے - بصورت دیگر کشمکش میں صلاحیتوں کا اوروسائل کا ضیاع ھوتا ھے - پاکستان میں یہ روایت رھی کہ تعلیم کے ذمہ داروں اور افسروں نے اساتذہ اور طلبہ کو اپنا ساتھی سمجھنے کے بجائے دوسرا فریق اور ماتحت سمجھا - MOTIVATION کے لیے ضروری تھا کہ اساتذہ کو محوری مقام دیا جاتا - ان کا منصب اعلا ھوتا اور ان کو ھر مرحلے پر شریک کیا جاتا - یہی معاملہ طلبہ اور والدین کا ھے - ھر ایک تعلیم سے براہ راست متعلق ھے، لیکن اسے معاملات سے بالکل دور رکھا جاتا ھے - تعلیمی منصوبہ کی نقل حاصل کرنا بھی ایک کام ھوتا ھے کجا یہ کہ اھم نکات اردو میں ھر اسکول کالج تک پہنچائے جائیں - مطلع ھوئے بغیر کوئی کس طرح تعاون پیش کرے - MOTVATION اس کے بغیر نہیں ھوسکتا کہ ذمہ دار اپنی خامیاں کھلے دل سے سننے اور ماننے کے لیے تیار ھوں - کیا وجہ ھے کہ اساتذہ نے معاشی لحاظ سے جو کچھ حاصل کیا ھے وہ انہوں نے لڑ بھڑ کر حاصل کیا ھے - اور جس کا اعلان کردیا جاتا ھے اس کے حصول میں جو ھفت خوان طے کرنے پڑتے ھیں اس سے اساتذہ ھی واقف ھیں - یہ تعاون حاصل کرنے کا طریقہ بہر حال نہیں ھے -

ھمارے ذمہ دار، ان اساتذہ اور طلبہ کے تعاون کی اھمیت پر تقریر کرتے نہیں تھکتے، لیکن ان کی خاطر اقدامات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے - نتیجتاً اسلام آباد سکریٹریٹ کے بلاک ڈی کے منصوبے کچھ خرابیاں پیدا کرکے بلاک ڈی ھی میں دفن ھوتے رھتے ھیں -

۴ ۔ احتساب کا فقدان

اصلاح کی کوششوں میں ناکامی کی ایک اہم وجہ ذمہ داری کے تعین کا ، کارکردگی پر گرفت کا اور احتساب کے نظام کا تقریباً ختم ہوجانا ہے ۔ جتنے منصوبے اور پالیسیاں بنائی گئیں ان کی ناکامی واضح ہے ۔ رائج ایکشن پلان میں موجودہ حالت کا جو بھیانک نقشہ کھینچا گیا ہے وہ ماضی کی تمام سرکاری کارگزاریوں پر سرکاری تبصرے کی حیثیت رکھتا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ اس کا ذمہ دار کون ہے ؟ اگر پانچویں منصوبے کے ہدف حاصل نہیں ہوئے ہیں تو کسی کو ذمہ دار ٹھہرایا جانا چاہیے اور جوابدہی کا عمل ہونا چاہیے ، ورنہ چھٹے منصوبے کے ہدف بھی حاصل نہ ہوں گے ۔ اور کسی کا بال بیکا نہ ہوگا ۔ یہ تسلیم کرلیا گیا کہ اضافی کتب کے ڈھیر نیشنل بک فاؤنڈیشن کے گوداموں میں پڑے ہوئے ہیں ۔ پرائمری ٹیچرز کے لاکھوں " کٹ " زنگ آلود ہوگئے ہیں ۔ ہزاروں اسکول صرف کاغذ پر موجود ہیں ، لیکن اس پر کسی کی پکڑ نہیں ۔ اس طرح تو کبھی کوئی اصلاح نہیں ہوسکتی ، جب کہ سارے عوامل بھی اصلاح کے خلاف لیے جارہے ہوں ۔

۵ ۔ اجتماعی فضا کا عدم تعاون

اصلاح کی کوششوں میں ناکامی کی ایک وجہ ملک کا اجتماعی ماحول اور فضا بھی ہے ۔ اگر ہر شعبہ زندگی میں بدعنوانیوں کا راج ہو تو محکمۂ تعلیم اپنا حصہ ادا کرنے سے کیوں محروم رہے ۔ اگر پورا معاشرہ اخلاقی زوال کا شکار ہو تو شعبہ تعلیم کیوں محفوظ رہے ۔

معاشرے میں اسلامی اقدار کا مضحکہ اڑایا جارہا ہو تو درس گاہوں میں احترام کی فضا کیسے بنے ۔ نظام تعلیم اجتماعی زندگی سے کٹ کر کسی خلا میں نہیں چلایا جاتا ، زندہ ماحول میں برپا ہوتا ہے ۔ اس کے کارندے اسی معاشرے کے رکن ہوتے ہیں ، یہ ضرور ہے کہ استاد سے بہتر توقعات کا جواز ہے ، لیکن اس میں استاد کے ساتھ تعاون تو کیا جائے ۔ جن اقدار کے خلاف چلنے پر معاشرہ مجبور کررہا ہو ان کو استاد یا نظام تعلیم نئی نسل کی زندگیوں میں کس طرح جاری و ساری کردے ۔

یہ وہ اہم اور بنیادی اسباب ہیں جن کا خیال رکھے بغیر ہم آئندہ بھی کسی اصلاحی کوشش میں کامیابی کی توقع نہیں کرسکتے ۔ جب بھی اس ملک کے نظام تعلیم میں اصلاح کی کوئی کوشش کامیاب ہوگی ، درج بالا عوامل کا لحاظ رکھ کر ہی ہوگی ۔

اصلاح کا لائحہ عمل ـــ بنیادی خطوط کار

اصلاح کی کوششوں اور بگاڑ کے عمل کے بعد آج ہم تعلیمی دنیا میں جس صورت حال سے دوچار ہیں وہ سب کے سامنے ہے ۔ اگر ہم محض ماتم کرنے والے لوگ نہیں ہیں تو ہمیں ناکامی کے اسباب کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اگر کوئی کوشش آج شروع کی جائے تو اس کے لیے منصوبہ بندی کن خطوط پر کی جائے گی اور کس دائروں کو زیادہ اہمیت دی جائے گی ۔ ۱۹۴۷ میں کچھ دوسرے حالات تھے اور اصلاح شاید آسان تھی، لیکن اب تقریباً ۴۰ سال کے سفر کے بعد کچھ نئے مسائل توجہ کا تقاضا کرتے ہیں ۔

۱ ۔ تعلیم اور تربیت کا تعلق

موجودہ نظام میں تعلیم کا تربیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ترکی جیسے سیکولر ملک میں وزارت تعلیم و تربیت ہوتی ہے ۔ تربیت کی اصطلاح یہاں اسلامی پس منظر میں استعمال کی جارہی ہے ۔ یہ تعلق قائم کیے بغیر ہم نئی نسل سے وہ توقعات ہی کیوں کرتے ہیں جن پر وہ پوری نہیں اترتی اور پھر ہم ان کی تعلیم کو قصوروار ٹھہراتے ہیں ۔ یہ تعلق قائم کرنے کے لیے تعلیم کا محکمہ باکردار لوگوں کے سپرد کرنا ہوگا ۔ مثلاً وزرائے تعلیم کو کردار کے لحاظ سے نہ صرف اچھی شہرت کا مالک ہونا چاہیے بلکہ اچھے کردار کا ہونا بھی چاہیے ۔ اسی طرح اساتذہ کے انتخاب و ترقی میں ان کی قابلیت کے ساتھ ساتھ فیصلہ کن اہمیت ان کے سیرت و کردار کو بھی حاصل ہونا چاہیے ۔ اس تصور کے ساتھ مخلوط تعلیم کا کوئی جواز نہیں ۔ نیز درس گاہوں میں رقص و سرود کی محفلیں اور ان کی سرپرستی نہیں بلکہ نماز کا اہتمام اور اسلامی شعائر اور تقریبات کا لحاظ رکھا جانا چاہیے ۔

۲ ۔ طبقاتی کردار کی نفی

تعلیم کو موجود طبقات کو توڑنے اور معاشرتی عدل قائم کرنے میں ایک اہم عامل ہونا چاہیے ۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں سات سالہ دور نفاذِ اسلام کے بعد تعلیم کا طبقاتی کردار سنگین سے سنگین تر ہوتا جارہا ہے اور حکومت کے طرز عمل کا ـــــ اعلان کردہ پالیسیوں کا نہیں ـــــ مطالعہ یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ حکومت خود تعلیم کو طبقات کے قیام و دوام کا ذریعہ بنائے رکھنا چاہتی ہے ۔ اگر کوئی اصلاح پیش نظر ہے تو وہ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ قوم کے ہر فرد کو تعلیمی ترقی کے لیے یکساں مواقع ملیں اور امیر ہو یا غریب آگے وہی بڑھے جو صلاحیت رکھتا ہو نہ کہ وہ جو

مال و زر رکھتا ہو اور اچھی تعلیم (یا بعض صورتوں میں اچھے نتائج) خرید سکتا ہو ۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ تمام تعلیمی ادارے سہولتوں کے لحاظ سے کسی اوسط معیار کے اس پاس ، ہوں طلبہ اور استاد کا تناسب تقریباً ایک ہو ۔ یکساں درسی کتب استعمال کی جائیں ۔ قومی زبان ہر علاقے اور سطح پر ذریعہ تعلیم ہو ۔ مخلوط تعلیم ہر ادارے میں ممنوع ہو ۔ قومی لباس بطور یونیفارم ہر ادارے میں رائج کیا جائے ۔ واضح رہے کہ اس تجویز کے ذریعے قوم کے لیے قیادت فراہم کرنے والے اداروں کی نفی نہیں کی جا رہی ،لیکن ایسے اداروں میں محض صلاحیت کی بنیاد پر ہر کسی کا پہنچنا ممکن ہونا چاہیے ۔ کسی مخصوص طبقے سے متعلق نہ ہونا کسی کے لیے ان اداروں میں داخلوں میں روکاوٹ نہ ہو ۔

۳ ۔ جہالت کا خاتمہ

گزشتہ دو سالوں میں تعلیم عامہ کی طرف کچھ توجہ دی گئی ہے یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ کروڑوں کے خرچ کے نتائج صرف کاغذوں پر فی صد میں اضافے سے ظاہر ہوں گے یا معاشرے میں محسوس بھی ہوں گے ۔ تعلیمی اداروں میں رائج نظام کی اصلاح کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ مرحلہ وار پروگرام کے تحت اداروں میں داخلے کی عمر کے تمام بچوں اور نوجوانوں کو نہ صرف داخلے کا موقع ملے بلکہ بنیادی تعلیم لازمی کی جائے ۔ ساتھ ہی ہنگامی طور پر بالغ ان پڑھوں کی ضروری تعلیم کا بندوبست کیا جائے ۔ تعلیم کو فروغ دینے ، عام کرنے اور بہتر کرنے کی قومی پالیسی ہونی چاہیے ۔ وسائل کی رکاوٹ بھی اس لیے ہے کہ تعلیم عام کرنے کی اہمیت محسوس نہیں کی جاتی ۔ بلکہ سوچے سمجھے ذہن کے ساتھ تعلیم محدود کرنے اور ادارے نہ کھولنے کی پالیسی اپنائی جاتی ہے ۔ آج جب ٹی وی ڈراموں پر ہم اپنے دیہی معاشرے کی جھلک دیکھتے ہیں تو تھرا اٹھتے ہیں ، (کیا اس کی ذمہ دار وہ قیادت نہیں جو باوردی ہو یا بےوردی لیکن گزشتہ ۳۷ سالوں میں ملک کے عوام کو اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اقدار سے آشنا نہ کرسکی ؟)

۴ ۔ تعلیم اور معاشی منصوبہ بندی

تعلیم کے اعلا مقاصد بیان کرتے ہوئے کتنے ہی مقدس الفاظ کیوں نہ استعمال کیے جائیں ،لیکن اس دور میں تعلیم اور معیشت کا ناگزیر تعلق ایک حقیقت ہے ۔ اسے برا سمجھنے کا رجحان بھی غلط ہے اس لیے کہ

کسب حلال ایک اعلا اسلامی قدر ہے - بد قسمتی سے ہمارا نظام تعلیم اس لحاظ سے بھی بڑا خام ہے اور منصوبہ بندی کے فقدان کا شکار ہے- تعلیم پرجو محدود وسائل خرچ ہورہے ہیں ان کا بیشتر حصہ ضائع چلا جاتا ہے۔ میٹرک (یا آٹھویں) تک تو ہر مرد و عورت ضرور پڑھے، لیکن اس کے بعد کوئی خواہ مخواہ تعلیم حاصل نہ کرے بلکہ اس کا کوئی مقصد ہو اور اس کی تعلیم قوم کے لیے افادی حیثیت رکھتی ہو - خواتین کا جو معاشی رول ہے وہ اسلامی اقدار اور جدید تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے کھلے ذہن سے طے کیا جائے اور اس مناسبت سے ان کے لیے تعلیم کے مکمل جداگانہ انتظامات ہوں - اسی طرح مردوں کے لیے جو امکانات ہیں ان کی ضرورت کا اندازہ لگایا جائے اور اس کے لحاظ سے انتظامات کیے جائیں - صلاحیت معیار ہو ، اور مسابقت کی فضا ہو - ہم ترقی یافتہ ممالک کی گردان تو کرتے ہیں، لیکن ان سے اچھی باتیں، معلوم نہیں، کیوں نہیں سیکھتے - اپنی کل آبادی کو زندگی کی ضروری آسائش فراہم کرنا اتنا بڑا ہدف ہے کہ اس کے لیے افرادِ کار کی تیاری اور منصوبہ بندی بذات خود چیلنج ہے- اساتذہ ، سائنس داں ، افسر ، صنعت کار ، تاجر ، ڈاکٹر ، انجینئر ، فنی ماہر، دفاتر کے عملے سب کی برابر کھپت بڑھتی رہے اور دوسری طرف اس مناسبت سے تیاری ہوتی رہے - یہ نہیں ہونا چاہیے کہ عوام کو علاج کی بنیادی سہولتیں بھی مہیا نہ ہوں اورہم میڈیکل کالج کھولنا بند کردیں اور نشستیں کم کرنا شروع کردیں -

۵ - نجی شعبے کی شرکت

قومیانے کا دور گزار کر اب تعلیم میں نجی شعبے کی اہمیت تسلیم کی جارہی ہے - لیکن یہ جس انداز سے ہورہی ہے وہ اہل نظر کے لیے سخت تشویش کا باعث ہے - نجی شعبے کی شرکت ایک منصوبے کے تحت اور کچھ شرائط کے ساتھ ہونا چاہیے تھی، لیکن اب تو اسے ایک کاروبار اور صنعت کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے جس میں زر و زمین کے علاوہ دوسری کششیں بھی ہیں —— ہم کوئی اشتراکی معاشرہ نہیں کہ تعلیم سو فی صد سرکاری ہو اور نہ مغربی معاشرہ ہیں کہ سرکار کو مطلب نہ ہو کہ کون کیا کررہا ہے - اسلامی تقاضوں کے تحت اور موجودہ تعلیمی صورت حال کو دیکھتے ہوئے ایک معتدل اور قابل عمل پالیسی وضع کرنا چاہیے اور اس پر عمل کرنا چاہیے - میں صرف کراچی کی مثال دیتا ہوں جو اس لحاظ سے بد قسمت شہر ہے کہ وسائل کی فراوانی کے باوجود اس کے شہری اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے سرگرداں رہتے ہیں - جس شہر میں وی سی آر کی فیس مقررہ تاریخ تک آٹھ کروڑ سے زائد جمع ہو اس کے بچے اسکولوں

میں دریوں پر بیٹھتے ہوں اور مخدوش عمارت میں تعلیم حاصل کرتے ہوں - کیا یہ صرف قیادت اور منصوبہ بندی کا مسئلہ نہیں جو وسائل کو اس طرح CHANNELIZE کرائے کہ کراچی کو آٹھ دس سال میں ورلڈ بنک کے قرضے کے بغیر ایک مثالی ترقی یافتہ شہر بنا دے - اس شہر میں تعلیم کی ذمہ داری کا اگر کسی کو احساس بھی ہو تو کیا یہ کوئی لاینحل مسئلہ ہے ؟ یہ تعین کرکے کہ شہر کے کس حصے میں کس نوعیت کے لڑکے یا لڑکیوں کے تعلیمی اداروں کی ضرورت ہے اہل شہر کو دعوت دی جائے کہ وہ آگے بڑھیں - کیا فیڈریشن آف چیمبر آف کامرس شہر کے تینوں اضلاع میں کامرس کی تعلیم کے تین کمپلیکس تعمیر نہیں کرسکتی ؟ اگر کے ڈی اے پولی کلینک کا منصوبہ بنا سکتی ہے تو تعلیمی ادارے کیوں نہیں کھول سکتی ہے - اس طرح بنکنگ کونسل ، ہمدرد فاونڈیشن اور دوسرے اداروں کو اپنا کردار ادا کرنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے -

کراچی کے صنعت کار ہیں جن سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ شہر کے ہر علاقے میں MONOTRADE فنی اداروں کا جال پھیلا دیں - لیکن یہ سب تو جب ہو جب سرکاری افسران نجی شعبے کو صحت مندانہ انداز سے خوش آمدید کہیں - لیکن اگر صرف وہی منصوبے منظور ہوتے ہوں جن میں بالائی آمدنی ملے تو پھر اس میدان میں وہی افراد اور ادارے آگے آئیں گے جو آرہے ہیں -

٦- سرکاری وسائل کی فراہمی

یہ بات بہت کہی جاچکی ہے کہ ہم تعلیم پر بہت کم خرچ کررہے ہیں - لازماً نتائج اسی مناسبت سے حاصل ہورہے ہیں - تعلیم پر خرچ کا اندازہ کرنے کے لیے قومی آمدنی اور بجٹ کے اشاریے معروف ہیں - ایک اسلامی نظریاتی مملکت ہونے کے ناتے ہمارا تعلیمی بجٹ دنیا کے لیے مثالی ہونا چاہیے تھا - لیکن فی الوقت تو ہم اس پر صرف منہ چھپا سکتے ہیں — وسائل کا فراہم ہونا مسئلے کا ایک پہلو ہے - ان وسائل کا بھی خرچ نہ ہونا مسئلے کا دوسرا پہلو ہے (پانچویں پنج سالہ منصوبے میں تعلیم کے لیے ٦ء ٩ بلین روپے رکھے گئے تھے، لیکن صرف ٢ء ٥ بلین روپے خرچ کیے گئے جب کہ کل منصوبہ ١٢٨٥٢ بلین روپے کا تھا - اور عملاً تخمینوں سے زائد کل ١٥٣٥٢ بلین روپے خرچ کیے گئے) تیسرا پہلو جو کچھ خرچ ہوتا ہے وہ بھی غلط منصوبہ بندی کے تحت خرچ ہوتا ہے - یعنی انتظامی اخراجات زیادہ اور تعلیم کے عمل سے متعلق اخراجات کم - اور چوتھا پہلو بد عنوانیاں ہیں جو افسران کے درجہ بدرجہ کمیشن کی صورت میں منصوبوں

کا ناس کردیتی ہیں - بولان میڈیکل کالج کے سلسلے میں جو کہانیاں مشہور ہیں وہ کون نہیں جانتا - اصلاح کی کوئی کوشش مالیات کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتی اس لیے قومی ترقی میں تعلیم کو اس کا جائز حق ملنا چاہیے - کتنا ہی اچھا منصوبہ ہو بجٹ کی کمی آڑے آجاتی ہے - محلہ اور مسجد اسکولوں میں اساتذہ کو ڈیڑھ سو رپے ماہانہ دیے جائیں تو یہ بجٹ کا مسئلہ ہے، لیکن اگر یہ ڈیڑھ سو بھی آٹھ آٹھ ماہ تک نہ ملیں اور اخباری بیانات اور اداریوں کا موضوع بن جائیں تو یہ انتظامی مسئلہ ہے - اور اگر جعلی اسکول معائنے کے وقت دکھا دیے جائیں تو یہ کردار اور دیانت کا مسئلہ ہے - لیکن منصوبے کی ناکامی تو بہرحال مقدر ہوجاتی ہے -

۷ - تنفیذ کی مشنری

کسی نظام میں کوئی بھی اصلاح محض وعظ اور خواہش سے روبہ عمل نہیں آسکتی - اس کے لیے ناگزیر ہے کہ تدابیر اختیار کی جائیں اور انہیں نافذ کیا جائے - لیکن تنفیذ کے لیے جو مشنری قائم ہے وہ سرے سے کام نہ کرتی ہو تو ساری اسکیمیں اور منصوبے دھرے رہ جاتے ہیں - پاکستان میں تعلیم کی کہانی یہی ہے - تقاریر تو بہت دور کی بات ہے ضابطے اورقواعد بھی بے اثر ہیں - ہدایات کے سرکلر میزوں کی زینت رہتے ہیں - تحقیقاتی رپورٹیں فائلوں کی ، اور بڑی بڑی اسکیمیں الماریوں کی اور یہ سب قالین شدہ یخ زدہ دفاتر میں رکھی رہتی ہیں - اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنی ذمہ داری سے پہلوتہی کرتا ہے اور کوئی اس سے پوچھنے والا نہیں ہو تا کہ ایسا کیوں ہوا - یہ سلسلہ اوپر تک چلا جاتا ہے - طالب علم سے استاد نہیں پوچھتا کہ تم کل کیوں نہیں آئے - استاد سے پرنسپل نہیں پوچھتا کہ تم نے آج کلاس کیوں نہیں لی - پرنسپل سے ڈائرکٹر نہیں پوچھتا کہ تم نے اس ہفتے میں کتنے گھنٹے کالج میں گزارے اور ڈائرکٹر سے سکریٹری نہیں پوچھتا کہ تم ہر وقت دفتر میں کیوں بیٹھے رہتے ہو - یہ کہنا آسان ہے کہ رویہ بدل دیا جائے - یہ وعظ بھی بہت ہوچکا ہے کہ ہر ایک اپنی اصلاح کرلے - کسی ایک چیز کوٹیسٹ کیس بنایا جائے - استاد کے وقت پر آنے جانے اور کلاس لینے کو ، نماز کے سرکلر کو ، شجرکاری کے سرکلر کو ، کوئی ہدایت ہو تو اس پر عمل ہو اور نہ کرنے والوں کی پرسش ہو ، افسران بالا کے پاس خفیہ رپورٹ کا اختیار ، ترقی کے معاملات اور ماہانہ تنخواہ ہے جو قومی خزانے سے دی جاتی ہے - لیکن جسے خدا کا خوف نہ ہو ، قوم کا درد نہ ہو وہ سب ہی اعانت مجرمانہ کے مرتکب ہوتے ہیں -

میری دانست میں یہ اصلاح کا نقطۂ آغاز ہے۔ تجاویز اور سفارشات کی کمی نہیں ہے، لیکن بالکل سامنے کی باتوں کی تو فکر کی جائے ۔ حال ہی میں وزارت تعلیم سندھ کی کسی اسٹیرنگ کمیٹی نے ساٹھ فی صد حاضری کے بغیر فارم نہ بھیجنے کی سفارش کی ہے ۔ لیکن کتنے کالجوں میں حاضری کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے ۔ اگر اس حکم پر اس طرح عمل ہو کہ کالجوں کے معائنے کیے جائیں اور حاضری کا ریکارڈ نہ رکھنے پر پرسش اور کارروائی ہو تو یہی نقطۂ آغاز بن سکتا ہے ۔ لیکن نیت شرط ہے ۔

۸- خواتین کی تعلیم

خواتین کی تعلیم کو بجا طور پر تعلیمی اصلاح کی کوششوں میں ایک نمایاں مقام ہونا چاہیے ۔ تعلیم کا راست تعلق معاشرے میں مفوضہ کردار سے ہے۔ اس معاملے میں ہمارا مسلم معاشرہ اور مغرب کا سیکولر معاشرہ دو مختلف نقطۂ نظر رکھتے ہیں ۔ اور مسلم معاشروں میں مغرب کی یلغار سے مسائل پیدا ہورہے ہیں جن کا اظہار ہمارے ملک میں بھی آج کل ہورہا ہے ۔ مسائل کی ایک قسم وہ بھی ہے جو عورتوں کو اسلام کے دیے ہوئے حقوق نہ دینے سے پیدا ہوتی ہے۔ خواتین کی جہالت پورے معاشرے پر سنگین اثرات ڈالتی ہے اور ان کی تعلیم سے خوشگوار اثرات کی توقع کی جاسکتی ہے ۔ ان کی تعلیم کیا ہو ، کس طرح ہو ان مسائل پر پاکستان کے مخصوص اسلامی پس منظر میں غور کرکے ایک پالیسی بنانے کی ضرورت ہے ۔ مثلاً میٹرک ، (یا آٹھویں) تک کی بنیادی تعلیم کی سہولت فراہم ہو ، اس کے بعد گھرداری کو بھی علم کی شکل دے کر اس میں تعلیم و تربیت کی سہولت ہو ۔ معاشی سرگرمیوں کے ایسے میدان فراہم کیے جائیں جہاں خواتین ، خواتین کے ساتھ مل جل کر اسلامی ہدایات کے تحت مخلوط معاشرے کے مفاسد سے بچتے ہوئے زندگی گزار سکیں ۔ ان پیشوں کی مناسبت سے خواتین کے لیے علاحدہ تعلیمی سہولتیں موجود ہوں ۔ ہمارے منصوبہ سازوں کو اپنی فکر میں یہ تبدیلی لانا چاہیے کہ جو خاتون گھر پر رہ کر خاندان سنبھالتی ہے اور اولاد کی تعلیم و تربیت کا فرض انجام دیتی ہے وہ قومی ترقی میں بہ تمام و کمال شریک ہے ۔ ایسی خاتون کو کم تر سمجھنا سمجھنے والے کی عقل کا پھیر ہے ۔

۹- دینی مدارس

دینی مدارس کا تاریخی نظام ملک کے قریے قریے میں پھیلا ہوا ہے اور متوازی طور پر ایک نسل تیار کرتا ہے جو معاشرے کی دینی ضروریات پورا

کرتی ہے - یہ نظام بعض مسائل کا حل ہے اور بعض مسائل کو پیدا کرتا ہے- اس پر کسی تفصیلی بحث کا یہ موقع نہیں،لیکن تعلیمی اصلاح کے مجموعی پس منظر میں اتنا کہنا ضروری ہے کہ ان مدارس کے ذمہ دار علما کا قدیم نصاب پر اصرار مناسب نہیں ہے- نصاب پر تو برابر نظر ثانی ہوتے رہنا چاہیے - اسے صدیوں تک قائم رکھنا کون سی تعلیمی حکمت عملی ہے ؟ ان مدارس کے نظام میں اصلاح کی ماضی قریب میں موجودہ حکومت نے بعض کوششیں کی ہیں ،لیکن جب تک خود ان کے ذمہ دار اصلاح کی ضرورت محسوس نہیں کریں گے اور اس کے دائرۂ کار کا تعین نہیں کریں گے حقیقی اصلاح نہیں ہوسکے گی - یہ رائے نہیں دی جاسکتی کہ اس نظام کو جدید رائج نظام تعلیم میں ضم کردیا جائے یہ شاید عملاً ممکن بھی نہیں اور مفید بھی نہیں ہے،لیکن قومی نقطۂ نظر سے جہاں یہ ضروری ہے کہ موجودہ نظام تعلیم کی روح کو اسلامی کیا جائے وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ دینی مدارس کی روح کو برقرار رکھتے ہوئے ایسی تبدیلیاں کی جائیں کہ اس کے فارغ التحصیل نوجوان آج کے اسلامی معاشرے کے قابل فخر و تقلید شہری بن سکیں -

۱۰- نمونے کی درس گاہوں کا قیام

اصلاح کے لیے ایک عملی تدبیر یہ ہے کہ ملک کے وہ افراد اور ادارے جو اصلاح کا درد رکھتے ہیں اور پاکستان کے مستقبل سے اپنی بقا کو وابستہ سمجھتے ہیں وہ حکومت کی نجی ادارے قائم کرنے کی پالیسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آگے بڑھیں اور ایسے ادارے قائم کریں جن سے سچی پاکستانی مسلمان نسل تیار ہو - ملک میں اتنے انسانی وسائل اور مالی وسائل موجود ہیں کہ یہ کام ممکن نظر آتا ہے - بدقسمتی سے اس وقت یہ میدان خالصتاً کاروباری ذہنیت کے افراد کے ہاتھوں میں چلا گیا ہے- مسلمانوں ہی نے علی گڑھ، اور جامعہ ملیہ قائم کی جو ایک تحریک بن گئی اور معاشرے نے ان کے اثر کو محسوس کیا - آج معاشرہ کتنا ہی روبہ زوال کیوں نہ ہو،اگر ہم نے زوال ہی کو اپنا مقدر نہیں سمجھ لیا ہے تو کچھ نہ کچھ افراد کو اور اداروں کو ملک کے مختلف حصوں میں ایسے تعلیمی ادارے قائم کرنے چاہییں جو مشعل راہ ثابت ہوں اور جو آئندہ خود حکومت کے لیے لائحہ عمل فراہم کریں -

۱۱- نظریاتی تشکیل

آخری نقطہ موجودہ نظام تعلیم کی نظریاتی تشکیلِ نو ہے - یہ ایک ہمہ گیر اصلاح ہے جسے بجا طور پر انقلاب بھی کہا جاسکتا ہے - اب

تک جو نکات بیان کیے گئے ہیں وہ سب اسی نظریاتی اصلاح کے مختلف مظاہر ہیں ۔ آغاز میں تعلیم اور تربیت کے تعلق کو واضح کرکے اور اس ضمن میں بعض اقدامات کی نشاندہی کرکے اس کی طرف اشارہ کیا گیا تھا ۔ اب اختتام پر بھی اس نقطہ کا بیان کرکے دراصل یہ بتانا مقصود ہے کہ پاکستان میں نظام تعلیم میں اصلاح کا پورا عمل نظریے کے گرد ہی گردش کرسکتا ہے ۔ اس ذیل میں پہلا نکتہ یہ ہے کہ نصابات کی تدوینِ نو اور نئی درسی کتب کی تالیف و ترتیب اس اصلاح کا ایک اہم میدان ہے ۔ مسئلہ تو علوم کی تدوینِ نو کا ہے کہ انہیں مغربی تہذیبی اقدار سے آزاد کرکے اسلامی تہذیب کی اقدار کے تحت مدون کیا جائے ، لیکن اس تاریخی کام کے انتظار میں جو کام ہوسکتا ہے اس کو بھی ملتوی کرتے رہنا کوئی مناسب حکمت عملی نہیں ۔ جن حکومتوں نے اسلامی نظام کو اپنا مقصد بنایا ہے انہیں اس طرف خصوصی توجہ دینا چاہیے ۔ اگر چالیس سال پہلے پاکستان میں یہ کام شروع ہوجاتا تو آج کافی کام کیا جاچکا ہوتا اور عملی انقلاب کا آغاز نظر آتا اور ایران ، سوڈان اور دوسرے اسلامی ممالک ہم سے خوشہ چینی کرتے ۔ لیکن اگر یہ کام آج بھی شروع نہ کیا گیا تو چالیس بعد پھر ہم اسی مقام پر ہوں گے ۔ عالمی تعلیمی کانفرنسوں نے اور پاکستان کی قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۷۹ نے اس بارے میں واضح خطوط دیتے تھے ، لیکن حکومت نے ان خطوط پر سنجیدگی سے کام کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی ۔ مستقبل میں تعلیمی اصلاح کے لیے اس طرف توجہ ناگزیر ہے ۔

پاکستان کے نظام تعلیم میں اصلاح کی کوششیں کے عنوان پر میں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ۔ میں حکیم محمد سعید صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اس مقالے کے ذریعہ سے اپنی بات کہنے کا موقع دیا ۔ میری یہ دعا ہے کہ اس میں جو حق ہے وہ کام کرنے والوں کے دل میں گھر کرے اور جو حق نہیں ہے اس کے اثر سے مجھے بھی محفوظ رکھے ۔

پاکستان میں اعلا تعلیم کا انحطاط
اثرات و نتائج

جناب ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

۱ - قیام پاکستان کے وقت اعلا تعلیم کے دوائر میں مسلمان اساتذہ کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی - غیر مسلم اساتذہ کے انخلا اور ہر جگہ نوجوان اور نو مشق مسلمان اساتذہ کی تقرری سے قدرتی طور پر معیار تدریس میں کمی نمایاں ہوئی - نتیجہ یہ ہوا کہ آنے والے گریجویٹوں کی قابلیت کا معیار پست تھا -

۲ - پاکستان بنتے ہی ایک طبقہ متروکہ املاک کی وجہ سے زیادہ دولت مند ہوگیا اور مہاجرین کا ایک طبقہ افراتفری کی اس فضا میں وسائل آمدنی کے عدم حصول کی وجہ سے بے آسرا ہوگیا - اس سے ایک ذہنی کشمکش نے جنم لیا جس سے طلبہ بھی متاثر ہوئے -

۳ - انگریز سے ورثے میں پایا ہوا نظام تعلیم کسی اعلا مقصد کا حامل نہیں تھا - بلکہ وہ اجنبی راج کی مخصوص روایات کا عکاس تھا - اس پر ہمارے ہاں کے رائے عامہ کے رہنماؤں نے تسلسل اور تواتر کے ساتھ نکتہ چینی کی اور سمت، مقصد اور ڈھانچہ بدلنے کا مطالبہ کیا، لیکن المیہ یہ تھا کہ مثبت اور واضح تجاویز پیش نہیں کی گئیں - اس لیے یہ مفید بحث نعرہ زنی کا شکار بن گئی اور ظاہر ہے نعروں سے کوئی نیا انقلابی نظام تعلیم پیدا نہیں ہو سکتا -

۴ - پاکستان بننے سے چند سال پہلے بعض قابل مسلمان مصنفین نے اسلامی سیاست، اسلامی قانون، اسلامی بین الاقوامی قانون اور علم کے مختلف دوائر میں مسلمانوں کے کارہائے نمایاں پر کتابیں لکھی تھیں - اگر اعلا تعلیم کے اساتذہ ان سے فائدہ اٹھا کر صرف اتنا ہی کر لیتے کہ نصاب تعلیم (سلیبس) میں مغربی علوم کی کتابوں کے ساتھ ساتھ اسلامی کارہائے نمایاں بھی شامل ہو جاتے تو اس سے ایک خاص حد تک تعلیمی نظام اسلامایا جا سکتا تھا، لیکن سال ہا سال تک ایسا نہ کیا گیا -

۵ - اگر اعلا تعلیم میں قومی زبان اردو کو شجر ممنوعہ نہ قرار دیا جاتا، اور جس طرح ۱۹۲۵ء میں اردو اور انگریزی زبان دونوں کو رائج کیا گیا ایسا ہی

پہلے کر لیا جاتا تو اعلا تعلیم کی مختلف شاخوں میں علم کے نئے باب وا ہو جاتے اور آنے والی نسل کے نقطۂ نگاہ میں قدرے وسعت پیدا ہو جاتی۔

۶۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض حکومتوں نے وقتاً فوقتاً تعلیمی کمیشن مقرر کیے جنھوں نے بڑی محنت سے کام کر کے بھاری بھرکم اور ضخیم رپورٹیں مرتب کر ڈالیں، لیکن ان کی سفارشات اس اعتبار سے محل نظر تھیں کہ عملی پہلو کی طرف دھیان نہیں دیا گیا۔ سمت اور مقصد کے تعین کی طرف کوئی مثبت کردار ادا نہ کیا گیا، اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ کمیشنوں کے ارکان میں اساتذہ نہ ہونے کے برابر تھے اور تعلیمی بیوروکریٹس نے اپنی رائے ہی کو مقدم جانا اور اسی کو ٹھونسنا چاہا، جس میں ناکامی ہوئی۔

۷۔ کمیشنوں نے زیادہ زور دو باتوں پر دیا: ایک تعلیمی نظام کے ڈھانچے میں تبدیلی، دوسرے امتحانی نظام میں تبدیلی اور اس میں بھی یہ نہ سوچا کہ ایسی تبدیلیوں کے لیے بھی بعض اخلاقی اور معاشرتی قدروں کا وجود ضروری ہے۔ چنانچہ یہ تبدیلیاں بھی ناکام رہیں۔ ثانوی تعلیم کو اعلا ثانوی تعلیم سے منسلک کر کے اسکولوں اور کالجوں کے درمیان درسگاہوں کی ایک نئی قسم "ہائر سیکنڈری ایجوکیشن اسکولز" کے نام سے رائج کی گئی۔ اس سے نظام تعلیم کے ڈھانچے میں بڑی افراتفری مچی۔ اسکول بنائے بھی گئے اور پھر توڑ بھی دیے گئے، اس سے اساتذہ اور طلبہ میں بہت بے دلی پھیلی۔

۸۔ شریف کمیشن میں یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے لیے کام کا جو گوشوارہ تجویز کیا گیا وہ یونیورسٹیوں کے کام سے بے خبری کا مظہر تھا، کیونکہ اس میں فرض کر لیا گیا کہ ایک استاد کو لیکچر کی تیاری کے لیے بہت کم وقت درکار ہے اور ریسرچ ایسی چیز ہے کہ جو روزانہ دفتر میں بیٹھ کر اس طرح کی جا سکتی ہے کہ ایک گھنٹے سے زیادہ وقت صرف نہ ہو۔ اس طرح نظم و نسق کے لیے روزانہ کے حساب سے وقت مقرر کر دیا گیا۔ کمیشن کے ارکان اس بات سے بالکل بے خبر معلوم ہوتے تھے کہ استاد کبھی ریسرچ کرنے پر آتا ہے تو دنیا و مافیہا سے کئی کئی گھنٹے بے خبر رہتا ہے اور بعض اوقات ریسرچ میں مآخذی مواد کے سلسلے میں ایسی رکاوٹ آجاتی ہے کہ تحقیق کا سلسلہ کئی کئی دن اور بعض صورتوں میں ہفتوں بند رہتا ہے۔ اس طرح نظم و نسق کا کام اوّل تو ہر استاد کا نہیں ہوتا، اور اگر ہوتا ہے تو اسے ایک گھنٹہ روزانہ کے حساب سے تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ شریف کمیشن گوشوارے کے اعتبار سے یہ محسوس کرتا تھا کہ استاد یونیورسٹی میں ہر روز دس گھنٹے بسر کر سکتا ہے۔ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس دوران میں روشنی کی ضرورت بھی ہوتی ہے اور اس پر پیسے بھی صرف ہوتے ہیں۔

۹۔ امتحانی نظام بھی بہت سے تجربات سے گزرا ، اور ان تجربات نے اعلا تعلیم کو بہ حیثیت مجموعیٔ مجروح کیا۔ پہلے ایم اے کا امتحان بی اے کی طرح ہوتا تھا ، اس کے بعد اندرونی اور بیرونی ممتحن کا وہ نظام رائج کیا گیا جس میں امیدوار کے اپنے اساتذہ کو بھی مواقع فراہم ہوئے کہ بیرونی ممتحن کی رائے کو متاثر کر سکیں ، اندرونی ممتحن نمونے کا پرچہ بناکر بیرونی ممتحن کو بھیج دیتا جو اس امر کا پابند تھا کہ اس میں سے کم ازکم پچیس فی صد سوال ضرور اپنے پرچے میں شامل کر کے یونیورسٹی کو بھیج دے ۔ کم از کمؒ کے الفاظ نے کھلی چھٹی دے دی کہ وہ چاہے تو سارے کا سارا وہی پرچہ نقل کر دے اور اگر وہ صرف پچیس فی صد سوال لیتا ہے تو اس کا مطلب تھا کہ پچاس فی صد سوال لے لیتا ہے،کیونکہ ماڈل پرچے اور اصل پرچے میں لازماً سو فی صد چانس دیا جاتا تھا ، کچھ نہ پوچھیے ، اس سے کیا قباحتیں پیدا ہوئیں۔ سست اساتذہ نے صرف وہی چند سوال پڑھانے کی زحمت گوارا فرمائی جو نمونے کے پرچے میں دیے ہوئے تھے۔ ایک یہ روایت چل نکلی کہ جو سوال پچھلے سال کے پرچے میں دیے گئے وہ سال رواں کے پرچے میں نہیں دیے جاتے تھے۔ اس سے طلبہ کی محنت بہت بہت کم رہ گئی اور پاس ہونا ، بلکہ ڈویژن اور پوزیشن لینا بھی آسان تر ہوگیا۔

۱۰۔ سیمسٹر امتحانی نظام نے اگلی پچھلی ساری کسر نکال دی ۔ یہ نظام اصول اور بنیادی طور پر اچھا تھا ، لیکن طلبہ کے ایجی ٹیشن اور دباؤ کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایسی شرائط حذف ہوگئیں جن سے معیار قائم کیا جا سکتا تھا ۔ طلبہ کی جماعتوں کے دباؤ سے نمبر زیادہ ملنے لگے اور مصنوعی ہردلعزیزی کے لالچی اساتذہ نے گریڈوں کے لنگر کھول دیئے،جو چند باضمیر اساتذہ باقی تھے انہیں بھی اسی رو میں بہنا پڑا۔

۱۱۔ ملکی فضا میں ایک بڑا تضاد ابھرا ۔ مارشل لا نظامتوں نے سیاست کو کالعدم قرار دیا ، لیکن یونیورسٹیوں میں سیاست بازی کے لیے اذن عام دے دیا ،نتیجہ یہ ہوا کہ ہر سیاسی جماعت نے اپنی طلبہ کی جماعت بنائی اور یونین کے انتخابات اپنی پوری خرابیوں اور بد عنوانیوں کے سائے میں جنرل بنیاد پر لڑے جانے لگے ۔ طلبہ کی سیاست نے طلبہ کا ایک نیا گروہ یونیورسٹیوں میں دخیل کر دیا ۔ یہ طلبہ اپنی اپنی متعلقہ جماعت کے کل وقتی کارکن تھے اور ان کا جملہ خرچ جماعت برداشت کرتی تھی ۔ تشدد عام ہو گیا ۔ ہوسٹلوں میں پیشہ ور گروہ کے طلبہ رہنے لگے اور ہر ہوسٹل میں جدید اسلحہ جمع ہونے لگا اور خونی تصادم روزمرہ کا شغل بن گئے۔اپنے سے مختلف رائے کے اساتذہ کی سر عام توہین ہونے لگی اوراساتذہ بھی یونیورسٹی کے دائرے میں سیاست بازی کرنے لگے ۔

۱۲ - یونیورسٹی کے انتظامی اداروں (سینیٹ، سنڈیکیٹ وغیرہ) میں طلبہ کو نمائندگی ملی اور یوں ایک اعتبار سے طلبہ کو حق حاصل ہو گیا کہ اساتذہ کی تقرری اور ترقی اور تنزلی کو متاثر کریں - اس سے بہت سے اساتذہ طلبہ کی جماعتوں کے تابع ہو گئے اور یہ روش چل نکلی کہ نہ طلبہ کو پڑھائی کی ضرورت ہے نہ اساتذہ کو لیکچروں کی تیاری درکار ہے اور نہ اساتذہ کو ریسرچ کر کے علم کے نئے باب وا کرنے چاہئیں، کیونکہ یہ چیزیں ترقی کا معیار نہ رہیں -

سب سے بڑھ کر یہ کہ یونیورسٹیوں میں حریت خیال اور آزادی اظہار کے عناصر کے معنی بدل گئے - اب وہی خیال یا نظریہ درست قرار دیا گیا جو برسر اقتدار طالب علم جماعت اور اس کی وساطت سے کسی سیاسی پارٹی کا ہو - اس سے مختلف خیال "کفر" قرار دیا گیا - نہ فکر و خیال کی آزادی برقرار رہی نہ نظریات کی چھان پھٹک کی روایت موجود رہی - ایسے میں باضمیر اساتذہ کس طرح اپنے فرائض منصبی ادا کر سکتے ہیں؟ انہیں یا تو نکلنا پڑا یا خاموشی اختیار کرنی پڑی اور جب طلبہ کے سامنے متنوع خیالات اور نظریات کی پیشکش بند ہو گئی تو ان کے ذہن بھی جامد ہو گئے -

۱۳- چونکہ ہر حکومت کی خواہش رہی ہے کہ طلبہ پر امن رہیں، اس لیے جامعات کے سربراہوں نے طلبہ کی جماعتوں کے ہر غلط یا صحیح حکم پر صاد کرنا شروع کر دیا - مبادا کہ کشمکش کی نوبت آ جائے اور وہ کوئی سنگین صورت لے کر وائس چانسلر کو نااہل ثابت کر دے - تعجب کی بات ہے کہ بعض علمی معاملات میں بھی یہی روش اختیار کی گئی، چنانچہ اچھے ضابطے ختم ہوتے چلے گئے اور ان کی جگہ من مانے ضوابط نے لے لی -

۱۴- ہمارے ہاں طلبہ اور اساتذہ دونوں کے نقطہ ہائے نگاہ غیر تعلیمی اور غیر علمی صورت اختیار کرنے لگے - طلبہ نے ایسے اقدامات کیے جن سے کامیاب طلبہ کا تناسب بڑھتا چلا جائے اور اچھی پوزیشن لینا بھی آسان ہو جائے - اساتذہ نے ان معاملات میں طلبہ سے تعاون کیا بلکہ دونوں فریق ایک دوسرے کے کام میں آسانیاں پیدا کرنے لگے - طلبہ اور اساتذہ کی انجمنوں کی سالانہ رپورٹوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ تدریس کا معیار بڑھانے کا خیال کسی کو نہ آیا اور یہ جماعتیں محض ٹریڈ یونین بن کر رہ گئیں، طلبہ کی جماعتیں محض آسانیوں کے حصول کا ذریعہ بن گئیں اور اساتذہ کی انجمنیں تنخواہوں اور دوسری مالی مراعات میں اضافے کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئیں - اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تدریس و تعلیم کے موضوعات پر مذاکرے ہوتے رہے، لیکن یہ محض نشستند و گفتند و برخاستند کا نمونہ

پیش کرتے تھے، اور ان سے نہ طلبہ کی انجمنوں کا کوئی تعلق تھا اور نہ اساتذہ کی انجمنوں کا۔

۱۵۔ ایم اے اور پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالوں کی رہنمائی کو "اقتدار اور اثر" کا ذریعہ سمجھ لیا گیا۔ چنانچہ بہت سے شعبوں میں اساتذہ نے کوشش کی کہ زیادہ سے زیادہ مقالوں کی رہنمائی اپنے ذمے لے لیں۔ اس کوشش میں صدر شعبہ جات کو خصوصی کامیابی حاصل ہوئی، لیکن یہ کامیابی مقالہ نگاروں کے لیے ایک المیہ بن کر رہ گئی، کیونکہ کسی استاد میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ بیک وقت دس دس بیس بیس تحقیقی مقالوں کی رہنمائی کا حق ادا کرے۔ چنانچہ بیشتر اساتذہ نے امیدواروں کو بغیر رہنمائی کے کھلا چھوڑ دیا کہ وہ جس طرح چاہیں مقالہ لکھ ڈالیں۔ چنانچہ تحقیقی مقالے یا تھیسس کا مطلب یہ ہو گیا کہ ایک ضخیم ٹائپ شدہ کتاب، جس میں حوالوں کی بھر مار ہو اور آخر میں ایک طویل فہرست مآخذ۔ تھیسس کے لیے نمبروں کا جو لنگر کھلا وہ حیرت ناک تھا، کیونکہ نوّے (۹۰) پچانوے (۹۵) فی صد نمبر عام طور پر دے دیے جاتے تھے۔ اگر کوئی کمیشن ہماری یونیورسٹیوں کے تحقیقی مقالوں کا تجزیہ کرے تو ساری حقیقت الم نشرح ہو سکتی ہے۔ بس مستثنیات کے سوا نہ اساتذہ کو ریسرچ سے رغبت رہی نہ طلبہ کو اور مقصود صرف ڈگری اور اعلا گریڈ ٹھیرے۔

۱۶۔ بعض یونیورسیٹیوں میں اساتذہ کی ریسرچ کے لیے "حوصلہ افزائی" کا بندوبست کیا گیا، لیکن یہ بھی دھڑے بندی کا شکار ہو گیا۔ اچھے اور محنتی اساتذہ کی اچھی اور تحقیقی کاوشیں نظر انداز ہو گئیں اور تیسرے درجے کے ایسے مواد کو ریسرچ قرار دے کر فوائد کا ذریعہ بنا دیا گیا جو ریسرچ کہلانے کا مستحق ہی نہیں تھا۔

۱۷۔ خود اپنے بنائے ہوئے اچھے اور مفید قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی بھی زوال کا سبب بنی۔ اکثر اساتذہ حاضری نہیں لیتے اور کسی دن محض خانہ پری کے لیے بہت سے دنوں کی سو فی صد حاضری ریکارڈ کر دیتے ہیں۔ امتحان میں بیٹھنے کے لیے ستر فی صد حاضریوں کا ہونا ضروری ہے، لیکن ایک کیس ان امیدواروں کا ہوتا ہے جو سارا سال شاذ ہی کلاس میں آنے کے باوجود از روئے قانون حاضر رہے اور ایک کیس ان امیدواروں کا ہوتا ہے جن کے اساتذہ ایمان داری سے حاضری لگاتے ہیں اور چند امیدوار از روئے قانون امتحان میں بیٹھنے کے مجاز نہیں ہوتے۔ ان کے لیے امتحان میں بیٹھنے کا جواز پیدا کرنے کی خاطر "اسپیشل لیکچرز" کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ اس کا اصولی مطلب تو یہ ہے کہ ایسے امیدواروں کے لیے اساتذہ اسپیشل لیکچر دیں تاکہ ان کی حاضریاں پوری ہو سکیں،

لیکن عام طور پر یہ کام بھی رجسٹروں میں اندراجات تک محدود ہوتا ہے۔

۱۸۔ جب اعلا تعلیم کے ادارے یا دوسرے الفاظ میں جامعات کی صورت یہ ہو، جو مندرجہ بالا نکات میں پیش کی جا چکی ہے تو اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اثرات و نتائج کیا ہوں گے۔ اب اساتذہ کا معیار بھی پست ہے، طلبہ کا معیار بھی پست ہے۔ انتظامیہ ادارے بھی قابل رشک حیثیت کے مالک ہیں۔ جامعات کے سرکاری اور غیر سرکاری انتخابی ادارے بھی کسی اچھی صورت کے حامل نہیں ہیں، کیونکہ الیکشنوں میں چکو بازی چلتی ہے۔ ایسے میں اس نظام سے اچھی توقعات کیسے باندھی جا سکتی ہیں!

۱۹۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک اور یونیورسٹی کمیشن قائم کیا جائے۔ اسے خاصا اسٹاف بھی دیا جائے اور یہ کمیشن جامعات کے حالات کی اچھی طرح جانچ پڑتال کرے اور اس دوران میں یونیورسیٹیوں کی تعداد میں اضافہ، شعبوں کی تعداد میں اضافہ اور تمام نئی تقرریاں بند رکھی جائیں۔ اس کمیشن کے سپرد ایک اہم کام یہ کیا جائے کہ اعلا تعلیم کی منصوبہ بندی کرنے کے لیے ایک خاکہ پیش کرے۔ منصوبہ بندی سے میری مراد یہ ہے کہ اعلا تعلیم کو روزگار کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے۔ وہ یوں، کہ پہلے اندازہ کیا جائے کہ مختلف مضامین اور علوم میں گریجویٹوں کی کتنی تعداد درکار ہے اور اس کے بعد اتنے ہی گریجویٹوں کی تیاری کا منصوبہ باندھا جائے۔ اس طرح اعلا تعلیم یافتہ افراد کی بے روزگاری اور ترک وطن کا مسئلہ حل ہو سکے گا۔

۲۰۔ آخری نکتہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا نکات عمومی صورت حالات کے عکاس ہیں، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس حوصلہ شکن فضا میں بھی اعلا تعلیم کے بعض ننھے ننھے شالی جزیرے موجود ہیں۔ گویا اچھے آدمی موجود ہیں۔ اچھا کام ہو سکتا ہے، لیکن اس کے لیے خود اپنے مفادات کی قربانی ناگزیر ہے۔

زوالِ تعلیم - اسباب اور مداوا

جناب پروفیسر محمد عثمان

۱ - بظاہر ۳۷ برس گزر جانے کے باوجود ہماری شرح خواندگی قریب قریب وہی ہے جو تخلیق پاکستان کے وقت تھی اور یہ کس قدر افسوسناک اور حیرت انگیز بات ہے - اس کے باوجود اسکولوں اور کالجوں میں طلبہ کی تعداد ہمارا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے - عام اسکولوں کی حالت زار بیان کرنا مشکل ہے - ایک کلاس میں جہاں زیادہ سے زیادہ پچاس لڑکے یا لڑکیاں ہونی چاہییں وہاں ایک سو دس ، ایک سو بیس تک نوبت جا پہنچی ہے - استاد کے لیے انفرادی توجہ تو درکنار پوری جماعت کو کنٹرول کرنا دشوار ہو گیا ہے - جس اسکول کی عمارت، لائبریری یا سائنس لیب ۲ ہزار بچوں کا تقاضا کرتی ہے وہاں کئی ہزار بچّے زیر تعلیم ہیں - معیار علم کے گرنے کی غالباً پہلی وجہ یہ ہے کہ طلبہ کی تعداد دیگر موجود ضروریاتِ مدرسہ کے مقابلے میں تناسب سے باہر ہے - یہ صورت حال اس امر کے باوجود ہے کہ پچاس فیصد بچّے اسکول جاتے ہی نہیں - غور فرمائیے اگر ملک کے تمام بچّے جنہیں زیر تعلیم ہونا چاہیے اسکول جانے لگیں تو ہمارا نظام تعلیم ایک روز کے اندر اندر مکمل افراتفری کا شکار ہو کر رہ جائے !

۲ - اور اب استاد وہ استاد نہیں رہا جس کے ہم گن گاتے ہیں - ایسا بلا وجہ نہیں - اس بدلی ہوئی صورت کی ذمہ داری استاد پر عائد نہیں ہوتی - اس کی ذمہ داری معاشرے ، حکومت اور معروضی حالات پر ہے - تاہم یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ استاد کا دل اس کے کام میں نہیں —— اور جب دل ہی شریک کار نہ ہو تو کامیابی کی توقع عبث ہے - گویا زوال تعلیم کا دوسرا بڑا سبب استاد کا علم اور تعلیم سے زیادہ اپنی معاشی پریشانیوں کو دور کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہونا ہے - استاد کیوں استاد نہیں رہا ؟ اس میں تدریس کا شوق کیوں باقی نہیں ؟ یہ ایک الگ نہایت اہم معاشرتی سوال ہے - ہمارے موضوع بحث کی حد تک یہ کہنا کافی ہوگا کہ سوائے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے چند استادوں کے اور پرائمری کی معدودے چند استثناؤں کے ، استاد کی لگن کا خاتمہ ہو چکا ہے - اور یہ خاتمہ تعلیم کا خاتمہ ہے !

۳۔ تیسرا سبب کتب نصابی کی غیر دلکشی اور تدوین نصاب میں ہماری کوتاہی ہے۔ یہ بات ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے بارے میں بالخصوص کہی جا سکتی ہے اور آغاز کار میں اگر بچّے اور کتاب کے درمیان کوئی ذہنی اور جذباتی رشتہ ہی قائم نہیں ہوتا تو تعلیم پر زوال نہیں آئے گا تو کیا اس پر بہار آئے گی؟ ٹیکسٹ بک بورڈ جس بے دلی سے نصاب تیار کرتے ہیں، جس بے پروائی سے مولفین یا مصنفین کتاب ترتیب یا تصنیف فرماتے ہیں اور پھر ناشرین اس کا جو حشر کرتے ہیں اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ موجودہ بیس پچیس فیصد امتحانی کامیابی بھی ہمیں کیونکر نصیب ہوتی ہے۔ پنجاب میں میٹرک کے نئے نصاب اردو کو سرسری نظر سے بھی دیکھیں تو بے شمار سقم اور غلطیاں سامنے آ جائیں گی۔ آپ ڈاکٹر مصطفےٰ خان کا مضمون نظریہ پاکستان پڑھیے۔ آپ کو افسوس ہوگا کہ ایسے اہم موضوع پر ایسا مبہم اور غیر دل نشین مضمون شامل نصاب ہے۔ اگر نویں دسویں کا طالب علم اس مضمون کو دس بار بھی پڑھ جائے تو اس کے پلّے کچھ نہ پڑے گا اور وہ یہ جاننے سے قاصر رہے گا کہ نظریۂ پاکستان ہے کیا اور ہم اس سے کیا مراد لیتے ہیں۔ مولفین میں جانے پہچانے نام شامل ہیں۔ مگر ان کی لاعلمی کا یہ عالم ہے کہ سید سلیمان ندوی کی تصانیف میں رحمت عالم اور خطبات مدراس کو دو الگ الگ کتابیں بتایا گیا ہے۔ حالانکہ سید مرحوم کے خطبات مدراس رحمت عالم ہی ہیں۔ رحمت عالم کو ابتداً مدراس میں خطبات کی صورت میں پیش کیا گیا تھا۔ یہ خطبات کا وہی سلسلہ تھا جس کے زیر اہتمام علامہ اقبال نے اپنے شہرۂ آفاق انگریزی خطبات عطا کیے تھے۔ نصابی کتب ترتیب دینے والے مولفین کی اس قسم کی غلطی قابل معافی نہیں۔ یہ ایسی ہی غفلت اور جہالت ہوگی جیسے علامہ اقبال کی تصانیف کی فہرست تیار کرتے وقت ہم ایک تصنیف تو انگریزی خطبات، بتائیں اور ایک اور کتاب کا نام "RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM" درج کریں، حالانکہ یہ ایک ہی کتاب کے دو نام ہیں۔ ایک اصل نام اور دوسرا اصل نام کے طویل ہونے کے باعث مختصر و معروف نام جو عام لوگوں میں مشہور ہو گیا ہے۔

۴۔ دنیا بھر کے طلبہ سیاست میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ مگر ہمارے ہاں سیاست تعلیم گاہوں میں یوں گھس آئی ہے جیسے دکان شیشہ میں کوئی بد مست بیل!! توڑ پھوڑ، مار دھاڑ، سینہ زوری اور دنگا فساد، استادوں کی بے حرمتی۔ کتابوں اور امتحانوں سے دوری اور بیزاری، نیز منتظموں کے خلاف مسلسل محاذ آرائی۔ طالب علموں کے سیاست میں بے جا ملوث ہونے سے ایسی فضا بن گئی ہے کہ کوئی عزت نفس والا انسان بہ آسانی پرنسپل یا وائس چانسلر ہونا پسند نہیں کرتا۔ طلبہ کے اس رجحان کی انتہا پسندی تعلیم و تعلّم کے حق میں زہر ہلاہل ہے۔

۵- ملک کو سیاسی استحکام نصیب نہیں۔تعلیم و ثقافت اور علم و فن میں ترقی اس کےمقدر میں نہیں - پاکستان جب سے بنا ہے سول حکومت اور مارشل لا میں آنکھ مچولی کا ایک ایسا خوفناک کھیل کھیلا جا رہا ہے کہ الامان و الحفیظ - اگر تعلیم کی راہ میں مضبوط قدموں سے آگے بڑھنا ہے تو تدبیر سیاسی استحکام کی کرنا ہوگی-ایک ایسا طرز سیاست و حکومت جس پر قوم متفق ہو جائے اور اس راستے کو ایمان کی طرح قبول کر کے اس پر گامزن ہو ہ۔اس استحکام کے بغیر تعلیم میں بچوں کی پیش‌رفت ناممکن ہے -

۶ - اس سیاسی عدم استحکام کا یہ شاخسانہ ہے کہ جس قدر وسائل قوم کو تعلیم کے میدان میں مطلوب ہیں وہ کبھی مہیا نہیں ہوئے ، نہ مہیا کیے جا سکتے ہیں -موجودہ طرز معیشت اور انکم ٹیکس کا نظام ، نظام زکوٰۃ و عشر سمیت،ہمیں اس قابل نہیں بناتا کہ تعلیم ،جدید عہد کی معقول تعلیم،کے اخراجات کے ہم متحمل ہو سکیں -کہیں کہیں ہماری نالائقی نے یہ دن بھی دکھایا ہے کہ حکومت نے کسی تعلیمی مد میں کوئی رقم مہیا کی اور تعلیم کے منتظم بر وقت اس سے فائدہ اٹھانے کے قابل نہ ہوئے -مگر زیادہ تر صورت یہ ہے کہ کافی رقوم نہ اعلا تعلیم کے لیے مہیا کی جا سکتی ہیں اور نہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے لیے- عمارتیں ناکافی ، کتب خانے نایاب ، سائنسی تجربہ گاہیں مفقود ، استادوں کی تنخواہیں ناواجب و نامناسب - ہم کل قومی پیداوار کا کوئی ڈھائی فیصد تعلیم پر خرچ کرتے ہیں اور ہم ایک ایسی قوم ہیں جس کی آبادی زیادہ اور آبادی کے مقابلے میں قومی پیداوار خاصی کم ہے -لہٰذا تعلیم پر کل قومی پیداوار کا اڑہائی فیصد ناکافی رقم ثابت ہوتی ہے -ترقی یافتہ ملک جن کی آبادی اور قومی پیداوار کا تناسب بہت اچھا ہے ، وہ تعلیم پر کہیں ۴ فیصد اورکہیں۵ فیصد اور کہیں اس سے بھی زیادہ کل قومی پیداوار کا خرچ کرتے ہیں -اور یہیں سے بے پناہ فرق پڑ جاتا ہے-انگلستان ، فرانس ، امریکا وغیرہ تعلیم و تحقیق پر جس طرح اور جس انداز سے خرچ کر رہے ہیں وہ نتیجوں کی کامیاب فصل بھی اسی طور کاٹ رہے ہیں - ہم ناکافی بوتے ہیں اور ناکافی کاٹتے ہیں - تعلیم کے لیے بڑی اور نئی رقوم مہیا کرنا ہمارا ایک بنیادی تقاضا ہے اور فنڈز کی کمی زوال تعلیم کا ایک نہایت اہم سبب ہے -

اب تک میں نے زوال تعلیم کے چھے اسباب بیان کیے ہیں -اوّل طلبہ کی جماعتوں میں بے قابو تعداد ، دوم استادوں کا لگن سے عاری ہوجانا، سوم نصابی کتب کی غیر دلکشی ،چہارم طلبہ کا ناواجب حد تک سیاست میں ملوث ہونا ، پنجم سیاسی عدم استحکام اور ششم تعلیم کے لیے ناکافی فنڈز - اب میں چند اور اسباب بیان کرتا ہوں -

۷ - امریکا اور یورپ کی نیورسٹیوں کی فضا بظاہر آزادی اور جنسی اجازتوں سے معمور نظر آتی ہے ، پھر کیا وجہ ہے کہ وہاں کے نوجوان تعلیم میں بہت محنتی اور لائق فائق نکلتے ہیں اور ماحول کی دلکشی کےباوجود اپناوقت ضائع نہیں کرتے ؟ وجہ عیاں ہے کہ ہر لڑکی اور لڑکے کو معلوم ہے کہ اگر اس کے اندر قابلیت نہ ہوگی تو دنیائے عمل میں اس کی قیمت ایک کوڑی کے برابر بھی نہیں ہوگی ، اور کوئی اثر و رسوخ اور رشتہ و پیوند اس کی مدد کو نہیں پہنچے گا ۔ اس کے برعکس ہماری انتہائی بد قسمتی ہے کہ اس ملک میں روزگار کے بیشتر مواقع قابلیت اور ذاتی جوہر سے نہیں بلکہ والدین کی پہنچ اور خاندان کے اثر و رسوخ کی بدولت حاصل ہوتے ہیں ۔ لہٰذا ہمارے نوجوانوں میں قابلیت کے لیے سچی آرزو اور حقیقی ضرورت کا احساس ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ آج بھی معاشرتی صورت حال بدل جائے تو دیکھیے گا کہ یہی نوجوان جس کو کتاب ، مطالعہ اور محنت سے سروکار نہیں ، کل محنتی اور وقت کی قدر کرنے والا بن جائے گا ۔ مجھے کہنا یہ ہے کہ ہمارا موجودہ معاشرتی ڈھانچہ بے شمار نوجوانوں کو محنت پر اکساتا ہی نہیں ۔ جب تک روزگار کے مواقع قابلیت کے ساتھ منسلک نہیں ہوتے ، زوالِ تعلیم کا ایک بڑا سبب باقی رہے گا ۔

۸ - ہمارے ہاں تعلیم کی ساری کی ساری منصوبہ بندی مرکزی وزارت تعلیم کے افسروں کے ہاتھ میں ہے کہ جو افسر زیادہ اور ماہر تعلیم برائے نام ہوتے ہیں ۔ وہ اسکول کے اچھے استادوں ، کالج کے قابل پروفیسروں اور یونیورسٹی کے ذہین اور تجربہ کار استادوں کو شاذو نادر ہی اپنے مشوروں میں شامل کرتے ہیں اور اس ذریعہ سے رہنمائی حاصل کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ لہٰذا ملک کی اپنی ذہانت و مہارت اور تجربہ و بصیرت تعلیمی منصوبہ بندی میں شامل ہی نہیں ہوتے !! یا یوں کہیے کہ تعلیمی منصوبہ بندی اس ملک کی سچی مہارت سے محروم چلی آتی ہے ۔

۹ - ہمارے ہاں بڑے بڑے تعلیمی فیصلے در حقیقت تعلیمی نہیں سیاسی فیصلے ہوتے ہیں ۔ بھٹو مرحوم نے نجی اسکولوں اور کالجوں کو قومی تحویل میں لے لیا تو یہ اقدام تعلیمی کم اور سیاسی زیادہ تھا ۔ اور تنہا اس فیصلے نے تعلیمی معیاروں کو جتنا متاثر کیا ہے شاید ہی کسی دوسرے فیصلے نے کیا ہو ۔ کچھ عرصہ پہلے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلبہ کی یونینوں پر پابندی بھی تعلیمی سے زیادہ سیاسی فیصلہ تھا ۔ اس روش کو بدلنا ہوگا ورنہ زوال تعلیم کو روکنا مشکل ہوگا ۔

۱۰ - ہم آج تک یہ نہ سمجھ سکے اور نہ فیصلہ کر پائے کہ تعلیم اور نظریۂ پاکستان کو کس طرح ہم آہنگ کرنا چاہیے ۔ آئیڈیالوجی کا مسئلہ بیک وقت

اہم اور نازک ہوتا ہے۔ مگر اب تک ہمارے ہاں کسی علمی سطح پر یہ تحقیق نہیں ہوئی کہ مقاصدِ تحریکِ پاکستان اور تعلیم پاکستان کو کس طرح شیر و شکر ہونا ہے - ہم اس راہ میں برابر ٹھوکریں کھا رہے ہیں اور فروغِ نظریہ کے نام پر تنگ نظری اور گروہی مفاد کا شکار ہو رہے ہیں -

۱۱ - ہم لازمی مضامین کی تعداد بڑھاتے چلے جا رہے ہیں - آج کل پرائمری میں آٹھ اور مڈل میں نو مضامین پڑھائے جاتے ہیں - کالجوں میں اردو ، اسلامیات اور مطالعۂ پاکستان لازمی مضامین کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں - حال ہی میں مڈل اور ہائی اسکولوں میں عربی کو لازمی مضمون قرار دیا گیا ہے - لڑکا کتابوں کے بوجھ تلے اور سچا اور ضروری علم مضامین کی کثرت تلے دم توڑ رہا ہے - اور یہ کوئی نہیں سوچتا کہ علم کا تعلق مضامین کی بے جا کثرت سے نہیں مضامین کی سلیقہ مند قلت سے ہے - آج دنیا بھر کے ماہرین اس امر پر زور دے رہے ہیں کہ پرائمری اور مڈل میں ہر قسم کی ضروری معلومات کو یکجا کر کے اور مضامین کو متعارف کیے بغیر نصاب میں شامل کیا جائے تاکہ بچوں کے لیے تفہیم سہل ہو۔ مگر ہم ہیں کہ مضمون بڑھائے جاتے ہیں اور ایک لمحے کے لیے رک کر بھی نہیں سوچتے کہ اس روش کے نتائج کس قدر خطرناک اور مایوس کن ہوں گے -

زوال تعلیم کے چھے اسباب میں اوپر بیان کر آیا ہوں - جو اسباب میں نے مزید بیان کیے ہیں وہ مختصراً یہ ہیں : ہفتم ، روزگار کے مواقع کا قابلیت پر منحصر نہ ہونا ، ہشتم تعلیم کی منصوبہ بندی میں ملکی فکر و مہارت کی عدم شرکت ، نہم تعلیم کے میدان میں سیاسی فیصلوں کی روایت ، دہم ، بے جواز کثرتِ مضامین - یہ ہیں مختصراً وہ دس اسباب جو ہمارے ہاں زوال تعلیم کے ذمہ دار ہیں - کچھ ثانوی اسباب اور بھی ہیں مثلاً امتحانات میں بدعنوانیاں ، اسکولوں میں نگرانی کے نظام کا غیر موثر ہو کر رہ جانا ، تعلیم گاہوں میں کتب خانوں اور تجربہ گاہوں کی کمی -

مسائل کا حل — تجاویز

سوال یہ ہے کہ ہمیں کرنا کیا چاہیے - میرا جواب حسب ذیل ہے :

۱ - زیادہ رپے کی فراہمی کو ممکن بنایا جائے - اگر موجودہ معاشی ڈھانچا زیادہ رقم فراہم کرنے سے قاصر ہے تو اس طرز معیشت کو ترک کر کے ایسی طرز معیشت اختیار کی جائے جو قوم کو تعلیم یافتہ بنانے کے اخراجات برداشت کر سکتی ہو - وقتی علاج کے طور پر نجی شعبے میں تعلیمی اداروں کے قیام کی حوصلہ افزائی مفید ثابت ہو سکتی ہے -

۲۔ پرائمری اور مڈل میں کم سے کم مضامین کی پالیسی اختیار کی جائے۔ ریاضی کے علاوہ سبھی کچھ نصاب اردو کے ذریعہ سے پڑھایا جا سکتا ہے ، اور بہتر نتائج کے ساتھ پڑھایا جا سکتا ہے۔

۳۔ کالجوں اور جامعات میں اردو،اسلامیات اور مطالعۂ پاکستان کی لازمی حیثیت پر نظرثانی کی جائے ۔یہ مضامین لازمی مضامین کے طور پر میٹرک تک پڑھائے جائیں،کالجوں اور جامعات میں ان کی حیثیت انتخابی (ELECTIVE) ہونی چاہیے۔

۴۔ انگریزی زبان کی تدریس تمام ملک میں چھٹی جماعت سے شروع کی جائے ، پانچویں جماعت تک فقط اردو یا علاقائی زبانوں سےکام لیا جائے۔اس فیصلے سے قومی یکجہتی کی طرف ایک بڑا قدم اٹھانا ممکن ہوگا ۔

۵۔ پرائمری میں سوائےریاضی کے سبھی مضامین یعنی تاریخ ، جغرافیہ، اسلامیات ، مطالعۂ پاکستان ، سائنس، انگریزی ، زراعت ، ہوم اکنامکس وغیرہ اڑا دیے جائیں ۔ اور زبان کی تدریس کے معیار کو تسلی بخش بنایا جائے ۔

۶۔ چھٹی جماعت سے اردو کے ساتھ انگریزی کی ملک گیر تدریس کا معقول انتظام ہو ۔ریاضی کے علاوہ دوسرے مضامین آہستہ آہستہ داخل نصاب کیے جائیں۔ اسلامیات ، مطالعۂ پاکستان ، عربی ، فارسی اور اس قبیل کی تمام نظریاتی تعلیم میٹرک تک مکمل کر لی جائے ۔ کالجوں اور جامعات میں ان میں سے کوئی مضمون بشمول اردو لازمی نہ ہو ۔ میٹرک تک اردو (یا علاقائی زبان) لازمی ہو ۔میٹرک کے بعد بی ۔اے تک انگریزی لازمی ہو ۔ اسلامیات ، مطالعۂ پاکستان ، عربی ، فارسی وغیرہ مضامین کالجوں میں انتخابی (ELECTIVE) مضامین ہوں ۔ جو طلبہ پڑھنا چاہیں انتخاب کریں ۔

۷۔ ملک میں دہرے تعلیمی نظام کا خاتمہ کیا جائے۔دو متوازی نظام قومی یکجہتی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں ۔انگریزی اسکول اور دیسی اسکول ، امرا کے اسکول اور غربا کے اسکول،خواص کے اسکول اور عوام کے اسکول !! ۔ کوئی زندہ قوم اس صورت حال کو تادیر برداشت نہیں کر سکتی ۔ جو برداشت کرتی ہے ، وہ کبھی ایک قوم نہیں بنتی !

۸ ۔ تعلیمیمنصوبہ بندی کا کام افسروں کے ہاتھ سے لے کر سچےماہرین

تعلیم اور کارکن اساتذہ کے حوالے کیا جائے ۔ملک میں سچے ماہرین تعلیم کی کمی نہیں ۔

۹۔ تعلیم کے میدان میں تعلیمی فیصلے کرنے کی روایت قائم کی جائے۔

۱۰۔ تعلیم کے مثلث یعنی طالب‌علم ، کتاب اور استاد کے مسائل کا گہری نظر سے جائزہ لیا جائے ۔ استاد کے لیے بہتر شرائط کار ، کتاب کے لیے دلکشی کا سازو سامان اور طالب علم کے لیے سازگار تعلیمی ماحول پیدا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے۔

۱۱۔ یاد رہنا چاہیے کہ ہمیں اپنے تہذیبی ورثہ کے ساتھ تمام علوم و فنون اور ٹیکنالوجی میں دنیا بھر کی اقوام کے قدم بہ قدم اور شانہ بہ شانہ چلنا ہے اور پاکستان کی بقا و سالمیت کے ساتھ ایک جدید مسلم معاشرے کی تشکیل کرنی ہے جو اسلام کے معاشی عدل اور معاشرتی مساوات و اخوت کی بنیادوں پر استوار ہوگا ۔ لہذا ہماری تعلیم کی تمام منصوبہ بندی ان اعلا قومی مقاصد کے پیش نظر ہونی چاہیے ۔

پاکستان میں معیارِ تعلیم کا انحطاط

جناب وارث سرہندی

ہمارے یہاں معیار تعلیم ایک مدت سے دردِ سر بنا ہوا ہے کیونکہ ہمارے تعلیمی اداروں سے جو طلبہ فارغ التحصیل ہوکر نکلتے ہیں ، ان کی اکثریت مطلوبہ تعلیمی قابلیت سے محروم ہوتی ہے ۔ آئے دن اس موضوع پر جرائد میں مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں اور مذاکروں میں کئی بار یہ مسئلہ زیر بحث آیا ہے ۔ حکومتی سطح پر بھی اس انحطاط کو روکنے اور معیار تعلیم بلند کرنے کی مساعی جاری ہیں ۔ ہر چند سال بعد نصاب تعلیم تبدیل ہوتا ہے ، انداز تدریس اور طریق امتحانات میں طرح طرح کے تجربات کئے گئے ہیں ، مگر بات سدھرنے کی بجائے بگڑتی جارہی ہے ۔ چند سال پہلے ہمارے اعلا تعلیمی اداروں میں سمسٹر سسٹم رائج کیا گیا تھا ، مگر یہ تجربہ بہت جلد ناکام ہوگیا اور اس کے نتائج زبوں تر برآمد ہوئے ۔ اب پھر وہی پرانا طریق تدریس و امتحان اختیار کیا گیا ہے ، مگر معاملہ جوں کا توں ہے ۔ سدھار اور ترقی کے آثار نمایاں نہیں ہوئے ۔

ذریعۂ تعلیم

بعض محبِ وطن ماہرینِ تعلیم نے یہ خیال ظاہر کیا تھا ، اور اب بھی وہ اپنے اس خیال پر قائم ہیں ، کہ اس انحطاط کی ایک وجہ انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانا ہے ، کیونکہ طلبہ کی بیشتر توانائیاں اس غیر ملکی زبان کے سیکھنے میں صرف ہوجاتی ہیں اور وہ نفسِ مضمون پر کماحقہٗ ، توجہ دینے سے قاصر رہتے ہیں ، جس کی وجہ سے زیر درس مضامین میں مہارت حاصل نہیں کرسکتے ۔ ماہرین کی اس رائے میں وزن ضرور ہے اور معیار تعلیم کے انحطاط کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے ، مگر محض ذریعۂ تعلیم ہی اس کا واحد سبب نہیں ہے ، کیونکہ ہم اس کا تجربہ کرچکے ہیں ۔ کئی سال سے ثانوی اور اعلا ثانوی مدارج میں بیشتر مضامین اردو میں پڑھائے جارہے ہیں ۔ اس سے طلبہ کو زیر درس مضامین کے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے ، لیکن باایں ہمہ معیار تعلیم میں انحطاط کا رجحان نہ صرف برقرار ہے ، بلکہ کچھ زیادہ ابتری پیدا ہوگئی ہے ۔ نتیجہ بالکل خلاف توقع ہے یعنی معیار تعلیم بھی بلند

نہ ہوا اور ہمارے طلبہ انگریزی زبان سے بھی دور ہوگئے ۔ عجیب بات ہے کہ انگریزی دور کا میٹرک پاس اعلا اور معیاری انگریزی میں نہ سہی ٹوٹی پھوٹی انگریزی ہی میں سہی لکھ پڑھ لیتا تھا اور دفتری کام بھی انجام دے لیتا تھا مگر پاکستان کا میٹرک پاس ٹوٹی پھوٹی انگریزی بھی لکھ اور بول نہیں سکتا ۔ اب تو یہ حال ہے کہ ایک ط م یا اوسط درجہ کا گریجویٹ بھی چند فقرے صحیح انگریزی میں نہیں لکھ سکتا ۔ انگریزی کے متعلق تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ غیر ملکی زبان ہے ۔ اردو میں بھی ہمارے طلبہ بحیثیت مجموعی نمایاں قابلیت کا مظاہرہ کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ اس کے برعکس انگریزی دور میں ، جب ہر طرف انگریزی کا بول بالا تھا اور اردو کو سرکار دربار کی سرپرستی حاصل نہ تھی ، ایک پرائمری پاس شخص بھی اردو میں اچھا خاصا کام چلا لیتا تھا ۔ پرائمری پاس تھانیدار اور تحصیل دار تک دیکھنے میں آتے تھے ، جو اپنا منصبی کام بخوبی انجام دیتے تھے ۔ اس زمانہ میں مڈل پاس کو اچھا خاصا تعلیم یافتہ سمجھا جاتا تھا ۔ ابتدائی اور وسطانی مدارس میں مڈل پاس اساتذہ تعلیم دیتے تھے اور نتائج بہت اچھے نکلتے تھے ۔ اس زمانے میں گریجویٹ ہونا ایک بڑی بات تھی اور اسے تعلیمی لحاظ سے ایک ممتاز مقام حاصل ہوتا تھا ۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اس دور کے گریجویٹ اس مقام کے مستحق بھی تھے ، کیونکہ وہ اپنے مضامین پر حاوی ہوتے تھے اور بے تکلف انگریزی اور اردو میں اپنا مافی الضمیر ظاہر کرسکتے تھے ۔ یہی حال دوسرے مضامین کا تھا ۔ اس لئے اس دور کے گریجویٹ اپنے نام کے ساتھ بی ۔ اے لکھنے میں فخر محسوس کرتے تھے مگر اب معاملہ قطعاً اس کے برعکس ہے ۔ پاکستان بننے کے بعد ہم نے تعلیمی میدان میں بلحاظ کمیت تو بہت ترقی کی ہے یعنی مختلف تعلیمی مدارج کے سند یافتگان کی ایک بھیڑ لگ گئی ہے ، مگر بلحاظ کیفیت حالات زبوں تر ہیں ان بظاہر اعلا تعلیم یافتہ یا زیادہ صحیح الفاظ میں اعلا سند یافتہ لوگوں کے ہجوم میں معدودے چند لوگ ایسے نظر آتے ہیں جو صحیح معنوں میں ان تعلیمی اسناد کا بھرم قائم رکھ سکتے ہیں ۔

سوچنے کی بات ہے کہ ایسا کیوں ہے ؟ کیا پاکستان میں ذہین بچے پیدا ہونے بند ہوگئے ہیں ؟ اگر ایسا نہیں ہے اور واقعۃً ایسا نہیں ہے ، کیونکہ ہمارے بچے بحیثیت مجموعی ذہین ہوتے ہیں۔ ان میں نہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کا فقدان ہے اور نہ قوت کار کی کمی ہے ۔ آئے دن اس کا ثبوت کسی نہ کسی انداز میں ملتا رہتا ہے۔ حتی کہ جرائم کے نت نئے طریقوں سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے

ہاں ذہانت کی کمی نہیں ہے ۔

اگر ذریعۂ تعلیم اور طریقِ تعلیم ہی اس انحطاط کا واحد سبب ہوتا تو ہمارا معیار تعلیم پہلے سے کہیں بہتر و برتر ہوتا ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خرابی کی جڑ اور بنائے فساد کوئی اور چیز ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ ذریعۂ تعلیم کی بھی ایک اہمیت ہے اور اپنی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے جو آسانی اور ذہنی بالیدگی پیدا ہوسکتی ہے ، وہ کسی غیر زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے پیدا نہیں ہوسکتی ۔ دوسرے ممالک کے تعلیمی اور علمی کارناموں سے ہمیں اس کا واضح ثبوت ملتا ہے ۔ ان ممالک میں ذریعۂ تعلیم ان کی قومی زبانیں ہیں اور وہ ہر قسم کے علوم و فنون میں شاندار قابلیت اور کارکردگی کا مظاہرہ کررہے ہیں ۔

ایک گروہ کا ادعا یہ ہے کہ ہمارے معیار تعلیم میں انحطاط کا سبب انگریزی زبان سے ہماری بے پروائی ہے ۔ کیونکہ انگریزی میں سائنس اور عصری علوم کا جو گراں قدر سرمایہ موجود ہے وہ اردو میں نہیں ہے ۔ اس لئے ہم انگریزی کو اپنائے بغیر عصری علوم میں کوئی قابل ذکر مقام حاصل نہیں کرسکتے ۔ مگر یہ محض ادعا اور بے ثبوت دعوا ہے ۔ اگر انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنانے ہی پر علمی ترقی موقوف ہوتی تو چین اور جاپان فنی شعبوں میں اتنی ترقی کبھی نہ کرسکتے ۔ دور کیوں جائیے ۔ ہمارے یہاں جن لوگوں نے انگریزی زبان کے ذریعہ سے تعلیم حاصل کی ہے وہ بھی مجموعی طور پر علمی اور فنی میدان میں کوئی قابل رشک کارنامہ پیش نہیں کرسکے ۔ اس غلط رجحان کا البتہ یہ نتیجہ ضرور نکلا ہے کہ ہمارے یہاں انگریزی ذریعہ تعلیم کے حامل مدارس کی بھرمار ہوگئی ہے ۔ مگر ان مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ بھی کسی شعبہ علم میں کسی امتیازی قابلیت کا مظاہرہ نہیں کرسکے ۔ الاّ یہ کہ وہ منہ ٹیڑھا کرکے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں چند فقرے بول لیتے ہیں اور جس مضحکہ خیز انداز میں وہ انگریزی ملی اردو بولتے ہیں ، اس سے زبان ہی نہیں دہن بھی بگڑ جاتا ہے ۔ اگر علمی ترقی کا انحصار محض انگریزی پر ہوتا تو ہمارے اسلاف کوئی علمی کارنامہ نہ کرسکتے ۔ سرسید ، حالی ، شبلی ، نذیر احمد ، محمد حسین آزاد اور علامہ اقبال جیسے جید اہل علم و ادب انگریزی کی پیداوار نہ تھے ۔ ان حضرات میں علامہ اقبال کے سوا کسی نے انگریزی زبان میں تعلیم حاصل نہ کی تھی اور علامہ اقبال کی ابتدائی تعلیم بھی انگریزی زبان کی رہین منت نہ تھی ۔

ان شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے معیار تعلیم کے زوال کا بنیادی سبب ذریعۂ تعلیم یا طریقِ تعلیم نہیں ہے بلکہ خرابی کی جڑ کوئی اور ہے۔ جب تک یہ جڑ نہیں کاٹی جائے گی ، ہمارا تعلیمی معیار بہتر نہیں ہوگا۔ ہم نے تعلیمی نظام کی اصلاح کی خاطر اب تک جو کچھ کیا ہے ، اس کی نوعیت فروعی تھی۔ چنانچہ اصلی خرابی قائم رہنے کے باعث ہماری مساعی برگ و بار نہ لا سکیں۔ اس لیے ہمیں فروع سے زیادہ ان اساسی اسباب کی طرف توجہ دینی چاہیے جو خرابی کا منبع ہیں۔ اس کے لیے ہمیں اپنے موجودہ اور سابقہ نظام تعلیم کے مضمرات کا گہری نظر سے مشاہدہ اور تجزیہ کرکے کسی حتمی نتیجہ پر پہنچنا چاہیے۔ خرابی کا اصلی سبب معلوم ہونے کے بعد اسے دور کرنا زیادہ مشکل نہ ہوگا۔

میں اس سلسلے میں چند اشارات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا ، ہوسکتا ہے یہ اشارات سود مند ثابت ہوں اور ان سے خرابی کے بنیادی اسباب کا سراغ لگانے اور ان کے ازالہ میں مدد مل سکے۔

میری نظر میں تمام خرابیوں کی اصل یہ ہے کہ ہم صحیح نصب العین سے ہٹ گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب تک نصب العین صحیح نہ ہو منزل نہیں مل سکتی۔ صحیح نصب العین ہی کی روشنی میں منزل کا تعین ہوسکتا ہے اور اس تک پہنچنے کے راستے تلاش کئے جا سکتے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ ہمارے اسلاف نے علمی میدان میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے تھے۔ اور ہر شعبۂ علم میں ، وہ تاریخ ہو یا جغرافیہ ریاضی ہو یا ہئیت ، طب ہو یا جراحت ، فلسفہ ہو یا منطق ، شعر ہو یا نثر ، لسانیات ہو یا عمرانیات ، حرب ہو یا ضرب ، فنون لطیفہ ہو یا میکانیات ، غرض وہ کونسا شعبہ علم و فن ہے ، جس میں انہوں نے اپنی مجتہدانہ بصیرت اور بالغ نظری کا ثبوت نہ دیا ہو اور علم استادی بلند نہ کیا ہو۔ مغرب کی موجودہ ترقی ہمارے اسلاف کی علمی کاوشوں اور اختراعات فائقہ سے استبصار و استفادہ کا نتیجہ ہے۔ کتنی عجیب اور افسوس ناک بات ہے کہ اہل مغرب ہمارے اسلاف کی زلّہ ربای سے ترقی کے بام بلند تک پہنچ گئے ہیں اور ہم ان اسلاف کے اخلاف ، ہر میدان میں پس ماندہ رہ گئے ہیں اور آج مغرب کی کاسہ لیسی میں اپنی عافیت تلاش کرتے ہیں۔ ہمارے اسلاف کی ترقی کی اصلی وجہ یہ تھی کہ ان کا نصب العین صحیح تھا۔ وہ نصب العین تھا رضائے الٰہی کا حصول۔ رضائے الٰہی معلوم کرنے کے لیے وہ قرآن حکیم میں غور و تدبر کرتے تھے

اور اس کے حصول کے لیے وہ اپنی زندگیاں وقف کردیتے تھے۔ کم از کم اس بات پر سب ہی اسلامی طبقات فکر متفق ہیں کہ خدمتِ خلق رضائے الٰہی کے حصول کا اہم ذریعہ ہے ۔ چنانچہ ہمارے اسلاف اس کو اپنا نصب العین قرار دے کر اپنی صلاحیت اور رجحان کے مطابق اس کے حصول کے لیے تن من دھن سے مصروف ہوگئے ۔ یہ حقیقت ہے کہ جب انسان کسی بات کو نصب العین قرار دے کر اس کے حصول میں لگ جاتا ہے تو راہ میں حائل موانع اور دشواریاں اسے روک نہیں سکتیں اور وہ ان پر قابو پاکر اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔ دور کیوں جائیے ۔ جب ہم نے پاکستان کے قیام کو اپنا نصب العین بنالیا تھا تو چند سالوں میں بظاہر ناسازگار حالات کے باوجود اپنی منزل مقصود پر پہنچ کر دم لیا ۔ لیکن بد قسمتی سے قیام پاکستان کے بعد ہمارا نصب العین غلط ہوگیا اور اس کا نتیجہ بھی ہمارے سامنے ہے ۔

اگر مقصود نظر اللّٰہ تعالٰی کی رضا جوئی اور خدمت خلق ہو تو طالب کی لغات میں نہ ستائش کی تمنا رہتی ہے اور نہ صلہ کی پروا ۔ اس کی جدوجہد ہی اس کا صلہ ہوتی ہے ۔ ابونصر فارابی کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ اس کی علمی شہرت سے متاثر ہوکر اس زمانے کے ایک بادشاہ یا امیر نے اشرفیوں کی تھیلیاں دے کر اپنا ایلچی ابونصر کے پاس بھیجا اور پیام دیا کہ اگر فارابی اس کے دربار سے وابستہ ہوجائے تو اس پر مال وزر اور اعزاز و اکرام کی بارش کردی جائے گی ۔ جب ایلچی ابو نصر کے پاس پہنچا اور اس نے اپنا مدعا بیان کیا تو ابونصر نے اس سے کچھ دیر توقف کرنے کے لیے کہا اور خود اندر چلا گیا ۔ جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں باسی روٹی کا ایک ٹکڑا تھا ۔ ایلچی کو یہ ٹکڑا دکھا کر کہا کہ ابونصر کے پاس اس وقت یہی کچھ ہے ، لیکن جب تک اس کے پاس نان خشک کا ایک ٹکڑا بھی موجود ہے اسے کسی کی دربار داری کی ضرورت نہیں ہے ۔ اس لیے وہ اپنی اشرفیاں اٹھائے اور واپس چلا جائے ۔ چنانچہ ایلچی اپنا سا منہ لے کر واپس چلا گیا ۔

ایسا کیوں ہوا ؟ اس لیے کہ ابونصر جیسے لوگوں کو اپنے مقصد اور نصب العین سے گہرا لگاؤ تھا اور اس کے حصول کی کوشش سے ان کو جو لذت ملتی تھی وہ مال و زر اور جاہ و جلال کے ظاہری مناظر سے نہیں مل سکتی تھی ۔ علاوہ بریں یہ خدشہ بھی تھا کہ وہ دربار داری کے بکھیڑوں میں الجھ کر اپنے نصب العین سے ہٹ جائیں گے اور وہ رضائے الٰہی کے حصول کے بجائے بادشاہ کی رضا جوئی میں مشغول ہوجائیں گے ۔ نصب العین سے یہی وابستگی تھی جو ان کو دوسری

تمام باتوں سے بے نیاز کردیتی تھی اور وہ اپنی جدوجہد میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔ اس طرح وہ نہ صرف بلندی و عروج کے نت نئے مقامات حاصل کرتے تھے اور علوم و فنون میں ترقی کی فنی راہیں نکلتی تھیں ، بلکہ اس سے خلق خدا کو بھی فائدہ پہنچتا تھا ، چنانچہ وہ محبوب خلائق بن جاتے تھے اور لوگوں کے دلوں میں ان کے لیے وہ محبت و عزت پیدا ہوجاتی تھی ، جو کسی صاحب جاہ و منصب اور مالک لشکر و حکومت کے لیے نہیں ہوسکتی ۔

نصب العین کا تعیّن

حاصل کلام یہ کہ معیار تعلیم بلند کرنے کے لیے صحیح نصب العین کا تعین ضروری ہے ۔ اس ضمن میں یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ مغربی اقوام جن کا نقطہ نظر سراسر مادی ہے اور رضائے الٰہی کا حصول ان کا نصب العین نہیں ہے ان کا معیار تعلیم کیوں بلند ہے۔ یہ اعتراض بادی النظر میں وقیع معلوم ہوتا ہے ۔ اگر جملہ حقائق کو پیش نظر رکھا جائے تو اس کا سبب بھی نصب العین ہی قرار پائے گا ۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے : من جدّ وجدّ یعنی جو کوشش کرتا ہے وہ پالیتا ہے ۔ کوشش کرنے اور پانے کے لیے ایک نصب العین کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اہل مغرب کا نصب العین رضائے الٰہی کا حصول نہ سہی ، سراسر مادی سہی مگر قوم و ملک کی فلاح و ترقی تو بہرحال ان کا نصب العین ہے ۔ اس نصب العین کے تحت وہ علمی میدان میں تگ و تاز کرتے ہیں اور اس مقصد کے حصول کے لیے وہ اپنی توانائیاں وقف کردیتے ہیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ علمی میدان میں نت نئی ایجادات و اختراعات کرتے رہتے ہیں ۔ چونکہ ان کے تعلیمی ادارے فروغ علم کے نصب العین پر سختی سے کاربند ہوتے ہیں ، اس لیے ان میں علمی ماحول پیدا ہوجاتا ہے جس سے معیار تعلیم بلند کرنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

اس موقع پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ اگر مادی نقطۂ نظر اختیار کرنے سے علمی و تعلیمی میدان میں عروج حاصل کیا جاسکتا ہے تو پھر دینی اور روحانی نقطہ نظر اپنانے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ ایک حد تک درست ضرور ہے ، مگر یہ کلّی صداقت نہیں ہے ۔ یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اہل مغرب کا نقطہ نظر مادی تو ہوتا ہے مگر بحیثیت مجموعی ذاتی نہیں ہوتا بلکہ قومی ہوتا ہے ۔ یعنی مادی ترقی کا مقصد قوم کی ترقی ہوتا ہے اور محض ذاتی مفاد نہیں ۔ مگر ہمارا المیہ یہ

ہے کہ ہم قومی سے زیادہ ذاتی مفاد کو ترجیح دیتے ہیں - خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا - بات مادی اور روحانی نقطہ نظر کی ہورہی تھی - روحانی اور دینی نقطہ نظر ، جو رضائے الٰہی کے حصول کا دوسرا نام ہے ، اختیار کرنے سے انسان کو کلّی ترقی حاصل ہوتی ہے یعنی اس کی روح بھی مطمئن ہوتی ہے اور جسم بھی - اسلام مادی اسباب سے قطع نظر نہیں کرتا اور نہ مادی ترقی سے مانع ہے ، البتہ وہ مادی ترقی کو روحانی ترقی کے تابع رکھتا ہے یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی نقطہ نظر سے مادی مفادات کے حصول کے لیے اخلاقی پابندی یا احکام الٰہی کی پابندی بھی ضروری ہے - اس لیے دینی اور روحانی نقطہ نظر کو اپنانے کے بعد مادی ترقی بھی ہوتی ہے ، مگر اس ترقی میں تخریب و غارت گری کے جراثیم بار نہیں پاتے اور اس سے ایسا اخلاقی ماحول پیدا ہوتا ہے ، جس سے بنی نوع انسان کو امن و عافیت کی نعمت حاصل ہوتی ہے - اس سے خود غرضی ، جو فساد کی جڑ ہے ، کٹ جاتی ہے اور خلوص کی فضا پیدا ہوتی ہے ، جو اطمینان قلب کا موجب بنتی ہے - غرض یہ ہمہ جہت ترقی ہوتی ہے ، ادھوری اور ناقص نہیں -

اس کے برعکس مادی نقطہ نظر سے جو ترقی ہوتی ہے ، وہ وحی کی راہ نمائی سے محروم اور یک طرفہ ترقی ہوتی ہے اور اس میں خود غرضی کا زہر شامل ہوتا ہے - یہ خود غرضی انفرادی بھی ہوسکتی ہے اور قومی بھی - چنانچہ مغرب کی موجودہ ترقی میں بھی یہ زہر شامل ہے ، جو پوری دنیا کو مسموم کئے ہوئے ہیں - اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی یہ ترقی ان کے لیے ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے لیے پھانسی کا پھندا بن گئی ہے - علاوہ بریں مغربی دنیا روحانی سکون اور اطمینان سے محروم ہونے کے باعث ذہنی ناآسودگی اور اضطراب کا شکار رہے - مغرب میں نشہ آور چیزوں پر انحصار کا روز افزوں رجحان ذہنی اضطراب کا غماز - لوگ ذہنی اضطراب و خلفشار سے نجات حاصل کرنے کے لیے یہ زہر کھا رہے ہیں کیوں کہ اس سے نجات کا ان کے پاس کوئی بہتر متبادل نہیں ہے - حکومتوں کی شدید کوششوں اور سخت سزاؤں کے باوجود اس رجحان پر قابو نہیں پایا جاسکا ، کیوں کہ انسان محض مادی پیکر نہیں ہے بلکہ اس میں ایک روح بھی جاری و ساری ہوتی ہے اور محض مادی تقاضے پورے کرنے سے روح کی تسکین نہیں ہوسکتی - اس لیے مادی اور جسمانی آسائشوں کے باوجود روح کی بیتابی و بیقراری بڑھتی جاتی ہے - اس کا مداوا ان کے پاس اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ نشہ کے ذریعہ یک گونہ بیخودی حاصل کرکے وقتی طور پر اس خلفشار سے فرار اختیار کرسکیں - جو لوگ روحانیت پر اعتقاد رکھتے ہیں اور روح کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتے ہیں ان کو نشہ کی ضرورت نہیں ہوتی -

یہی وجہ ہے کہ نشہ بازی کا وہ طوفان مشرق میں نہیں جو مغرب پر مسلط ہے اگرچہ اب یہ لت مشرق میں بھی پھیل رہی ہے۔ مگر اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ لوگ مغرب کی مادی چمک دمک سے متاثر ہو کر مادی نقطہ نظر اپنا رہے ہیں اور روحانی اور اخلاقی اقدار سے صرف نظر کر رہے ہیں ۔ اسی لیے ان میں نشہ کا رجحان بڑھ رہا ہے اور فتنہ و فساد کے دروازے کھل رہے ہیں۔

بات معیار تعلیم کی ہو رہی تھی ، مگر بات میں سے بات نکل آئی اور روحانی و مادی نقطہ نظر کی بحث چل نکلی ، تاہم یہ بحث معیار تعلیم کے موضوع سے غیر متعلق بھی نہیں ہے ۔ میری رائے میں اس کا معیار تعلیم سے گہرا تعلق ہے ۔

بدقسمتی سے قیام پاکستان کے بعد یہ بات مشہور کر دی گئی کہ پاکستان کا قیام اقتصادی اور معاشی ضرورت کے تحت عمل میں آیا ہے ۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے ۔ پاکستان کے قیام کا مقصد اس خطۂ ارض میں اسلامی نظام حیات کی ترویج و نفاذ تھا ۔ اقتصادی خوش حالی مقصود بالذات نہیں تھی ، کیوں کہ یہ تو حیات انسانی کا محض ایک شعبہ ہے اور اسلام تمام شعبہ ہائے حیات کو محیط ہے ۔ اسلامی نظام کے صحیح معنوں میں نفاذ سے اقتصادی اور معاشی خوش حالی خود بخود حاصل ہو جاتی ہے ۔ مگر اس غلط پرچار نے معاشی خوش حالی کو اسلام سے الگ کر کے مقصود نظر بنانے کی راہ ہموار کی ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستانی قوم کا ایک بڑا حصہ اپنے حقیقی نصب العین سے ہٹ کر دولت کے پیچھے بھاگنے لگا ۔ اس وقت ہر طرف دولت کے لیے دوڑ لگی ہوئی ہے ۔ جس کو دیکھیے دولت و ثروت کے حصول کے لیے دیوانہ وار بھاگ رہا ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیمی اداروں میں بھی یہی مقصد کار فرما ہو گیا اور اخلاقی قدریں پس پشت ڈال دی گئیں ۔ ان حالات میں تعلیم و تعلم اور اخلاقی تربیت کی ذمہ داری کون نباہتا ۔ چنانچہ تعلیمی اداروں سے تعلیمی ماحول رخصت ہو گیا ۔ طلبہ کا مقصد حصول علم کی بجائے حصول سند ٹھہرا جو حصول ملازمت یا بالفاظ دیگر حصول دولت کا ذریعہ قرار پائی ۔ ان حالات میں نہ اساتذہ کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس رہا اور نہ والدین کو اتنی فرصت رہی کہ وہ بچوں کی اخلاقی تربیت پر توجہ دے سکیں ۔ ایسی صورت میں طلبہ سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ علم حاصل کرنے میں اپنی توانائیاں صرف کریں۔ چنانچہ انہوں نے بھی سند حاصل کرنے اور امتحان میں کامیاب ہونے کے لیے چور دروازوں کے استعمال کو آسان سمجھا ۔ امتحانی مراکز میں نقل اور دوسرے ناجائز ذرائع کی وبا عام ہو گئی ہے اور اس ناجائز کاروبار میں اساتذہ اور والدین برابر کے شریک ہیں ۔ اب صورت حال یہ ہے کہ جو

لوگ ناجائز ذرائع اختیار نہیں کرتے اور محض محنت و مطالعہ کو شعار بناتے ہیں وہ امتحان کے نتائج نکلنے پر پیچھے رہ جاتے ہیں اور ناجائز ذرائع اپنانے والے آگے نکل جاتے ہیں ۔ اس سے لائق اور محنتی طلبہ اور ذمہ دار و دیانت دار اساتذہ میں بد دلی پیدا ہوتی ہے ۔ ان حالات میں معیار تعلیم پست نہیں ہوگا تو کیا ہوگا ۔

دوسری غلطی ہم نے یہ کی کہ طلبہ کو سیاست میں کھینچ لیا ۔ بعض برخود غلط اور حصول اقتدار کے بھوکے سیاست دانوں نے طلبہ کو اپنا آلہ کار بنا کر ان سے توڑ پھوڑ اور جلاؤ گھیراؤ جیسے ناشائتہ کام کرائے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ درس گاہوں میں تعلیمی ماحول کا فقدان ہوگیا اور وہ مادر پدر آزاد سیاست کا اکھاڑا بن گئیں ۔ طلبہ اور حکومت کے درمیان تناؤ کی مستقل کیفیت پیدا ہوگئی ، جو نہ طلبہ کے لیے مفید ہے نہ حکومت کے لیے ۔ اس صورت حال کی ذمہ داری ہم سب پر عائد ہوتی ہے ۔ والدین نے طلبہ کی اخلاقی تربیت سے چشم پوشی کی اور اسے محض اساتذہ کی ذمہ داری قرار دے کر خود کو بری الذمہ قرار دے لیا ۔

قیام پاکستان سے پہلے درس گاہوں میں کسی نہ کسی حد تک تعلیمی ماحول پایا جاتا تھا ۔ اساتذہ محض حصول معاوضہ کے لیے نہیں ، بلکہ اپنی اخلاقی ذمہ داری سمجھ کر بچوں کو تعلیم دیتے تھے اور والدین بھی اساتذہ سے تعاون کرتے تھے ۔ اس وقت شاگرد اپنے استاد کا ادب و احترام والدین سے بڑھ کر کرتے تھے اور دل لگا کر علم حاصل کرتے تھے اس لیے تعلیمی معیار مقابلتاً بلند تھا ۔ اگرچہ اس زمانے میں اساتذہ کی تنخواہیں مقابلتاً کم تھیں اور ان کی مالی حالت بہتر نہ تھی ، مگر ان کو معاشرے میں ایک باعزت مقام حاصل تھا ، کیونکہ معیار عزّ و شرف محض دولت نہیں تھی ، بلکہ علم و اخلاق کو اس پر برتری تھی ۔ اس لیے اساتذہ مطمئن تھے ۔ اب چونکہ معیار بدل گیا ہے اور دولت ہی عزت کا معیار ہے ، اس لیے اساتذہ بھی مجبور ہیں کہ وہ اس معاشرہ میں عزت حاصل کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی کوشش کریں ۔ آخر وہ بھی اس معاشرے کے افراد ہیں ، اس سے الگ ہوکر کیسے رہ سکتے ہیں ۔

اس تمام بحث سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ نقطہ اور نصب العین تبدیل ہوجانے سے معاشرے کا رنگ کیسے بدل جاتا ہے ۔

یہ تو تھی معیار تعلیم کے انحطاط کی بنیادی وجہ ۔ اس کے علاوہ چند ذیلی وجوہ بھی ہیں ، جنہوں نے اس پستی میں مزید اضافہ کیا ۔ ان کی ذمہ داری محکمہ تعلیم اور تعلیمی نصاب مقرر کرنے

والوں پر عائد ہوتی ہے ۔ ہوسکتا ہے اس کام میں ان کی نیت نیک ہو ، مگر انہوں نے بچوں کی ذہنی وسعت و نفسیات کو نصاب مقرر کرتے وقت قطعاً نظر انداز کر دیا ہے ۔

ابتدائی مدارج میں اتنے زیادہ مضامین نصاب تعلیم میں شامل کر دیے گئے ہیں کہ ان مضامین کی کتابوں کا وزن طالب علم کے وزن سے زیادہ ہوتا ہے، کتابیں اٹھاتے وقت بچہ کی کمر دوہری ہوجاتی ہے ۔ نوعمری میں بچے کے ذہن میں جودت اور براقی تو ہوتی ہے ، مگر اس کے ذہن میں اتنی وسعت و گنجائش نہیں ہوتی کہ وہ مضامین کے اس گراں بار انبار کو اپنے ذہن میں سمیٹ سکے ۔ جب کسی پر اس کی طاقت و استطاعت سے زیادہ بوجھ ڈالا جائے گا تو اس کے قوا مضمحل ہوجائیں گے ۔ یہی حال ہمارے بچوں کا ہورہا ہے ۔ مضامین کے اس انبار سے ان کے قوائے ذہنی پر اضمحلال طاری ہوجاتا ہے اور ان کی ذہنی جودت و فراست دم توڑ دیتی ہے ۔ کتابیں اور مضامین کم از کم ہوں اور انداز دلچسپ اور فکر انگیز ہو تو بچوں کو مطالعہ میں دلچسپی ہو اور ان میں تجسس پیدا ہو ، جس سے ان کے ذہن کو جلا ملے ۔ مگر معاملہ اس کے برعکس ہے ۔ چنانچہ طلبہ کے ساتھ اساتذہ بھی اس صورت حال پر قابو پانے سے عاجز آچکے ہیں ۔ تعلیم کا مسلمہ اصول یہ ہے کہ آسان سے بتدریج مشکل کی طرف قدم بڑھایا جائے تاکہ طلبہ بتدریج اپنے مضامین پر حاوی ہوتے جائیں اور ان کی ذہنی وسعت میں اضافہ ہوتا جائے ، مگر ہمارے یہاں معاملہ برعکس ہے یعنی مشکل سے آسان کی طرف رجعت ہوتی ہے ۔ ابتدائی جماعتوں میں مضامین کی بھرمار ہوتی ہے اور بڑی اور اعلا جماعتوں میں بوجھ کم ہوتا ہے ۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ بوجھ کی زیادتی سے جو شخص پہلے ہی مرحلہ میں پس کر رہ جائے گا اس سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ آگے بڑھ کر منزل مقصود پالے گا ۔

ترقی کی جان تدریج ہے اور اس اصول کو اللّٰہ تعالٰی نے بھی اپنایا ہے ۔ انسان اور کائنات کی ترقی میں تدریج کا اصول کار فرما ہے ۔ آں حضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے بھی اپنی تبلیغ میں اسی اصول کو مد نظر رکھا ۔ قرآن حکیم کے نزول اور احکام کے نفاذ میں بھی تدریج کا لحاظ کیا گیا ۔ مگر ہمارے یہاں اس اصول کو پس پشت ڈال دیا گیا ۔ ایک معقول مدت تک تعلیم و تدریس سے میرا عملی تعلق رہا ہے اور میرا یہ ذاتی مشاہدہ و تجربہ ہے کہ اصول تدریج کی خلاف ورزی نے تعلیمی معیار کی پستی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے ۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ چھوٹی جماعتوں کے لیے مقرر کتابوں میں عبارتیں اور نظمیں مشکل

ہیں ، جو اس جماعت کے بچے کی ذہنی استعداد سے کہیں بالا تر ہیں اور بڑی جماعتوں میں آسان ہیں ۔ ان عبارتوں اور نظموں کو سمجھانے میں بہت دقت پیش آتی ہے اور انتہائی کوشش کے باوجود بچے سمجھ نہیں سکتے ۔ اس لیے ضروری ہے کہ تعلیمی نصاب مقرر کرتے وقت ان باتوں کا خیال رکھا جائے اور اصول تدریج کی پابندی کی جائے ۔ کسی جماعت کے لیے نصاب تعلیم مقرر کرتے وقت ان اساتذہ سے ضرور مشورہ لیا جائے جو اس جماعت کو تعلیم دینے کا عملی تجربہ رکھتے ہیں ۔ مگر ہمارے یہاں عموماً یہ ہوتا ہے کہ ابتدائی جماعتوں کے نصاب وہ اساتذہ تیار کرتے ہیں جو اعلا مدارج اور جماعات میں تعلیم دیتے ہیں ، حالانکہ ان کو ابتدائی جماعتوں کی تدریس کا کوئی عملی تجربہ نہیں ہوتا اور وہ ابتدائی مدارج کے طلبہ کی نفسیات ، ذہنی وسعت اور اس سلسلہ میں پیش آمدہ دشواریوں سے کماحقہ واقف نہیں ہوتے ۔

ہمارے تعلیمی معیار پر نجی تعلیمی اداروں کو سرکاری تحویل میں لینے سے بھی برا اثر پڑا ہے ۔ جب تک یہ ادارے مختلف انجمنوں کی نگرانی میں تھے ، ان کا تعلیمی معیار بہتر تھا اور ان میں سرکاری اداروں سے سے مسابقت کا جذبہ کارفرما تھا ۔ مگر اب معاملہ دگرگوں ہے ۔ پہلے انجمنیں براہ راست ہمہ وقت ان کی نگرانی کرتی تھیں اور اساتذہ و طلبہ کی کارکردگی کا محاسبہ کرتی تھیں ۔ علاوہ بریں محکمہ تعلیم کے عہدہ دار بھی کم از کم سال میں ایک بار ان اداروں کا معائنہ کرتے تھے اور ان کے نتائج معائنہ پر اساتذہ کی ترقی و تنزل اور ادارہ کی مالی امداد پر بہت کچھ انحصار ہوتا تھا ۔ انجمنوں کو یہ ڈر ہوتا تھا کہ کہیں تعلیمی معیار میں کمی آجانے کے باعث ان کو ملنے والی مالی امداد ختم یا کم نہ ہوجائے اور مدرسین کو یہ خیال ہوتا تھا کہ اس سے نہ صرف ان کی سبکی ہوگی ، بلکہ ان کی ترقی بھی رک جائے گی اور بعض صورتوں میں ان کی برطرفی بھی عمل میں آسکتی ہے ۔ جب سے یہ ادارے سرکاری تحویل میں چلے گئے ہیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے ۔ پہلے سال میں کم از کم ایک بار محکمہ تعلیم کی جانب سے ان اداروں کا معائنہ ہوتا تھا ، مگر اب ایسا ہرگز نہیں ہوتا ۔ اساتذہ کو اب نہ یہ خوف ہے کہ ان کو ملازمت سے نکال دیا جائے گا اور نہ ترقی رکنے کا ڈر ہے ۔ شکایات بہت زیادہ ہوں تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ استاد تبدیل کردیا جاتا ہے ۔ مگر یہ بھی شاذ و نادر ہی ہوتا ہے ، کیونکہ محکمہ تعلیم کے حکام سے مل ملا کر کام نکال لیا جاتا ہے ۔ اس لیے اساتذہ تعلیم کی طرف قطعاً توجہ نہیں دیتے اور وہ اپنی تنخواہ کو وظیفہ سمجھ کر قبول کرتے ہیں ۔ اکثر اساتذہ کے دوسرے کاروبار بھی ہیں ، جو ان کی توجہ مرکوز کیے

رکھتے ہیں - پابندی وقت کا کوئی خیال نہیں رکھتا ، جب مرضی ہو آئیں اور جب مرضی ہو چلے جائیں - ادارہ کے سربراہوں کا حال اس سے بھی خراب ہے - وہ کبھی کبھار ہی مدرسہ میں آتے ہیں - دوسرے مقامات کے بارے میں تو میں پورے وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا ، لیکن میرے گرد و نواح میں جو ابتدائی اور ثانوی مدارس ہیں ، ان کا یہی حال ہے ، جو میں بیان کرچکا ہوں - اس قصبے میں ایک لڑکیوں کا اور دوسرا لڑکوں کا ہائی اسکول ہے اور تیسرا پرائمری اسکول ہے - ان دونوں ہائی اسکولوں کے سربراہ یعنی ہیڈ ماسٹر اور ہیڈ مسٹریس کبھی کبھار ہی اسکول میں نظر آتے ہیں - ان کو اپنے ذاتی کاموں ہی سے فرصت نہیں ملتی کہ اپنے فرائض منصبی پر توجہ دے سکیں - جب سربراہ کا یہ حال ہوگا تو ماتحت عملے سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے فرائض پوری تن دہی سے ادا کریں گے ، مشہور ہے کہ جیسا راجا ویسی پرجا :

قیاس کن ز گلستانِ من بہارِ مرا

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ نجی اداروں میں اساتذہ کو تحفظ حاصل نہیں تھا ، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اساتذہ کے حقوق کا تحفظ کرتے وقت ان کو فرائض سے مستثنیٰ قرار دے دیا جائے - اگر ان اداروں کو سرکاری تحویل میں لیا گیا ہے تو ان کی پوری نگرانی اور محاسبہ بھی ہونا چاہیے - ورنہ تعلیم پر حکومت جو کروڑوں روپے خرچ کررہی ہے وہ ضائع ہورہے ہیں - جب ابتدا ہی خراب ہو تو انجام کیسے اچھا ہوسکتا ہے - اس لیے ضرورت ہے کہ پہلے ابتدائی اور ثانوی مدارس کی اصلاح پر بھرپور توجہ دی جائے اور نصاب تعلیم کو بچوں کی ذہنی استعداد کے مطابق بنایا جائے -

لبِ لباب

اس تمام بحث کا لبِ لباب یہ ہے :

1- سب سے پہلے اپنا قبلہ درست کیا جائے یعنی نصب العین درست کیا جائے اور یہ اس وقت ہوسکتا ہے ، جب اسلام سے ہماری وابستگی محض زبانی نہ ہو بلکہ ذہنی اور عملی ہو - اس کے لیے معاشرہ کی قدروں کو اسلامی نقطہ نظر سے متعین کرنا ہوگا جس کے مطابق عزت و شرافت کا معیار دولت و ثروت نہیں بلکہ تقویٰ اور صالحیت ہوگا -

2- اپنے بچوں کی تربیت اسلامی نقطہ نظر سے کی جائے تاکہ ابتدائے عمر ہی سے ان کے ذہنوں میں اسلامی اصول جاگزین ہوجائیں -

اگر ایسا ہوا تو معاشرے میں ایک اخلاقی ماحول پیدا ہوگا جو درس گاہوں میں صحیح تعلیمی ماحول پیدا کرنے میں مدد دے گا ۔

3۔ نصابی کتابیں ، خواہ کسی بھی مضمون سے متعلق ہوں ، ان کو اسلامی نقطہ نظر سے مرتب کیا جائے تاکہ اسلامی اور اخلاقی قدریں طلبہ کے دل میں گھر کر جائیں ۔

4۔ ابتدائی جماعتوں میں طلبہ پر مضامین اور کتابوں کا انبار نہ لادا جائے جو ان کی ذہنی وسعت اور استعداد کو مفلوج کردے ۔ بلکہ ایک دو کتابوں سے تعلیم کا آغاز کیا جائے اور بتدریج مضامین اور کتابوں میں بچوں کی ذہنی استعداد کے مطابق اضافہ ہوتا رہے ۔ آسان سے مشکل کی طرف بڑھنے کا اصول مد نظر رکھا جائے ۔

5۔ اساتذہ کا وقار قائم کیا جائے اور ان کو سرکار دربار میں دوسرے طبقوں سے برتر نہیں تو کم تر مقام بھی حاصل نہ ہو ۔ اساتذہ کے معاوضوں کا تعین اس طرح کیا جائے کہ ان کو کوئی دوسرا کام کرنے کی ضرورت نہ رہے اور وہ اپنی توجہ تعلیم و تدریس میں صرف کرسکیں ۔

6۔ اساتذہ کے انتخاب میں احتیاط ملحوظ رکھی جائے ، صرف اہل اور غیر معمولی طور پر لائق اور تعلیم و تدریس سے شغف رکھنے والے افراد ہی اس معزز پیشہ کے لیے منتخب کیے جائیں ۔ اس وقت یہ ہوتا ہے کہ جس شخص کو کسی اور محکمہ میں بار نہیں ملتا وہ مجبوراً تعلیم کے پیشہ سے وابستہ ہوجاتا ہے ۔ ایسا اس لیے ہے کہ دوسرے محکموں میں نہ صرف معاوضہ بہتر ملتا ہے ، بلکہ عزت اور وقار میں بھی اضافہ ہوتا ہے ۔ اس غلط روش کا تدارک ضروری ہے ۔

7۔ درس گاہوں کو سیاست اور دوسری غیر تعلیمی سرگرمیوں سے پاک کیا جائے ۔

8۔ ان درس گاہوں کا معائنہ باقاعدگی سے سال میں دو بار ہو اور اساتذہ کی ترقی کا انحصار ان کی تعلیمی کارکردگی اور نتائج پر ہو ۔

9۔ خلاصوں اور اس قسم کی دوسری امدادی کتابوں کی اشاعت ممنوع قرار دی جائے تاکہ طلبہ اور اساتذہ دونوں اپنے اپنے مضامین کی تیاری میں محنت اور دلجمعی سے مشغول ہوسکیں ۔

10۔ امتحانی پرچے درسی کتابوں سے تیار نہ کیے جائیں ، بلکہ درسی کتابوں میں طلبہ کو جو معلومات مہیا کی گئی ہیں ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسے سوالات پرچوں میں پوچھے جائیں جن سے طلبہ کی قابلیت و اہلیت کا اندازہ ہوسکے ۔ موجودہ طریق امتحان میں محض طلبہ کی قوت حافظہ کی آزمائش ہوتی ہے ، جس سے کتابیں رٹنے اور نقل کرنے کا رجحان پرورش پاتا ہے۔ اگر سوالات کا انداز بدل دیا جائے تو یہ رجحان ختم ہوجائے گا اور امتحانی مراکز میں ناجائز ذرائع کے استعمال کی نوبت بھی نہ آئے گی ۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ۔ قیام پاکستان سے پہلے اور اس کے چند سال بعد تک کم از کم زبان اور حساب کے پرچوں میں اس طرح کے سوالات آتے رہے ہیں ۔ ترجمہ کے لیے نصابی کتابوں سے نہیں بلکہ کہیں باہر سے کوئی پارہ عبارت دیا جاتا تھا جس کا طلبہ کو ترجمہ کرنا ہوتا تھا ۔ اس سے طلبہ کی اس زبان میں قابلیت کا اندازہ ہوجاتا تھا اور طلبہ بھی کتابیں رٹنے کی بجائے اس زبان میں مطلوبہ استعداد اور قابلیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے ۔

اعلا مدارج کے امتحانات میں مقالہ نگاری کے پرچہ کے حل کے لیے اس موضوع سے متعلق کتابیں امتحانی مراکز میں ساتھ لانے کی اجازت دی جائے تاکہ وہ اپنے مقالات میں ان کتابوں کے ضروری حوالے دے سکیں اس سے طلبہ میں جہاں رٹنے اور نقل کرنے کا رجحان ختم ہوگا ، وہاں ان میں تلاش اور جستجو کا مادہ بھی پیدا ہوگا ۔ کیونکہ وہی طالب علم کسی کتاب سے صحیح حوالے درج کرسکے گا جس نے اس کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہوگا اور اس کو سمجھتا ہوگا ۔ اس سے تصنیف و تالیف کا رجحان پیدا کرنے میں بھی مدد ملے گی ۔

اگر ہم کسی موضوع پر کوئی کتاب یا مقالہ لکھتے وقت ، اس موضوع سے متعلق کتابوں سے استفادہ کرتے ہوئے ان کے حوالے اور اقتباسات درج کرسکتے ہیں ، جن کو بخوبی سمجھا جاتا ہے ، تو طلبہ کا کیا قصور ہے کہ ان کو اس سہولت سے محروم کیا جائے

11۔ ہر سطح پر قومی زبان یعنی اردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے اور اس وقت ذریعہ تعلیم کے سلسلے میں جو دورنگی پائی جاتی ہے اس کو یک قلم ختم کیا جائے تاکہ طلبہ کامل ذہنی یکسوئی کے ساتھ مطالعہ کرسکیں ۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ انگریزی زبان کی تعلیم کو یکسر

نصاب تعلیم سے خارج کردیا جائے - ایک غیر ملکی زبان کی حیثیت سے انگریزی ضرور سکھائی جائے اور اس میں اتنی قابلیت و استعداد پیدا کی جائے کہ طلبہ اس میں بے تکلف اظہار خیال کرسکیں اور اس کو سمجھ سکیں - اسی طرح دنیا کی دوسری مشہور زبانوں کی تعلیم کا انتظام بھی کیا جائے ، مگر ان کی حیثیت اختیاری ہو -

ثانوی مدارج میں اردو کے ساتھ عربی یا فارسی میں سے کسی ایک زبان کی تعلیم لازمی ہو -

12- قرآن حکیم اور ارکان اسلام کی تعلیم ثانوی مدارج تک مکمل ہوجانی چاہیے، اس کے بعد جو طالب علم اسلامی علوم میں اختصاص حاصل کرنا چاہے ، اس کے لیے اردو کے علاوہ عربی سے واقفیت لازمی قرار دی جائے -

اگر ان نکات کو ملحوظ رکھ کر تعلیمی نظام وضع کیا جائے تو انشاءاللّٰہ ہمارے تعلیمی معیار کا انحطاط ختم ہوجائے گا ، بلکہ معیار بلند سے بلند تر ہوتا جائے گا -

یہاں یہ وضاحت کردینا بھی ضروری ہے کہ میں نے اس مضمون میں جو تجاویز پیش کی ہیں وہ حرف آخر نہیں ہیں ، ان کی حیثیت اشارات کی ہے ، ماہرین تعلیم ان میں مناسب ترمیم و اضافہ کرکے ایک قابل عمل اور بہتر نظام تعلیم کا خاکہ مرتب کرسکتے ہیں -

ملّی و قومی تقاضے اور ہماری موجودہ تعلیم

جناب ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی

قائد اعظم محمد علی جناح نے استقلال پاکستان کے دو ہی ماہ بعد نومبر ۱۹۴۷ء میں پہلی تعلیمی کانفرنس کو جو پیغام دیا تھا اس میں کہا تھا "تعلیم اور صحیح قسم کی تعلیم کی اہمیت پر جتنا بھی زور دیا جائے کم ہے۔ تقریباً ایک صدی کے دور غلامی میں قوم کی تعلیم کا سوال صحیح توجہ سے محروم رہا اور اگر ہمیں صحیح معنوں میں جلد از جلد اور معتدبہ ترقی کرنی ہے تو اس مسئلے کے حل کی طرف جلد متوجہ ہو جانا چاہیے اور اپنی تعلیمی پالیسی اور پروگرام کو ایسا بنانا چاہیے جو اہل ملک کے مزاج کے مطابق اور ہماری تاریخ و ثقافت سے پوری طرح ہم آہنگ ہو۔ البتہ اسی کے ساتھ ساتھ یہ ضرور مد نظر رہے کہ جدید اقدار حیات اور جدید ترقیات علمی بھی کسی صورت نظر انداز نہ ہوں۔" اس کے بعد اس پیغام میں قائد اعظم نے صنعتی اور سائنسی تعلیم اور توسیع صنائع وغیرہ پر زور دیا اور یہ ارشاد فرمایا کہ "صحیح قسم کی تعلیم کے ذریعہ سے ایسی روح پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ ہر پاکستانی نوجوان اخلاقی ذمہ داری اور اعلا سیرت و کردار کا مکمل نمونہ بن سکے۔" لیکن یہ کس قدر دکھ اور افسوس کی بات ہے کہ ہمارے تعلیمی نظام کی روح آج بھی یعنی استقلال پاکستان کے بعد ۳۷ سال گزر جانے پر بھی بڑی حد تک بدیسی ہے۔ اس روح کو ابھی تک ان چیزوں سے مغائرت ہے جن کے بغیر تہذیب و ثقافت کے الفاظ بے معنی ہو جاتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم اپنے ذہن میں پھر اس بات کو تازہ کریں کہ ہمارا مقصود اور نصب العین کیا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے ہم نے اب تک کیا کچھ کیا ہے۔ جہاں تک تعلیمی نظام کا تعلق ہے اپنا احتساب کرنے پر ہمیں یہ نظر آئے گا کہ ہم نے اب تک جو کچھ کیا ہے وہ بالکل ناکافی ہے۔

خیر مضٰی ما مضٰی جو وقت ضائع ہو گیا اس پر افسوس کرنے کے بجائے ہمیں حال اور مستقبل کی فکر کرنی چاہیے کہ اب ہم کس طرح قائد اعظم کے بتائے ہوئے راستے پر چل سکتے ہیں۔ جیسا کہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے جس کی بنیاد اسلام پر رکھی گئی ہے، اس لیے پاکستان کا کوئی فلسفہ خواہ وہ تعلیمی ہو کہ سیاسی یا اقتصادی

یا معاشرتی ، دین کے عنصر سے خالی نہیں ہو سکتا - لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہم نے اب تک تعلیم کے نظام ونصاب اور فلسفے میں دین کو وہ اہمیت نہیں دی ہے جو دینی چاہیے - دین کا مرکزی نکتہ ہے عقیدہ یا ایمان ، چنانچہ اسلام کے عقائد و اقدار و افکار پر یقین و ایمان پیدا کرنا ہماری تعلیم کا مرکزی مسئلہ ہونا چاہیے - یہ سمجھنا کہ ہم سب مسلمان ہیں اور ہمارے بچّے مسلمان ہیں لہذا اسلام پر ایمان تو ایک امر تسلیم شدہ ہے ، سوائے خوش فہمی اور خود فریبی کے اور کچھ نہیں - ایمان یا اعتقاد اس کو کہتے ہیں جو عمل میں ظاہر ہو نہ کہ محض زبان پر ہو - اس معیار سے اپنے اور اپنے بچوں کے عمل پر نظر ڈالیے آپ کو پتا چل جائے گا کہ اسلام پر ہمارا ایمان کس پیمانے کا ہے - میری ناچیز رائے میں محض فقہ و اسلامیات کی تعلیم لازمی قرار دے کر ہم اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتے ، اسلامی عقائد و اقدار ، تعلیمات و افکار کو طالب علموں کے دلوں میں اتارنا بھی ضروری ہے - اس کا موثر ترین طریقہ میری ناچیز رائے میں یہ ہے کہ انہیں سوانح و سیرت رسول پاکؐ کی صحیح تعلیم دی جائے - مختلف درجوں کے طلبہ کے لیے ان کی ذہنی سطح کے مطابق سوانح و سیرت رسول اکرمؐ پر ایسی کتابیں، کتابچے، مضامین اور مقالات مرتب کروانے چاہییں جن میں خیرالبشرؐ کی بشری حیثیت پر زور دیتے ہوئے آپ کے فضائل و محاسن آپ کی زندگی کے واقعات کے حوالے سے پیش کیے گئے ہوں - امید رکھنی چاہیے کہ آپ کی سیرت و سوانح کا مطالعہ طلبہ میں آپؐ کی ذات سے عقیدت و محبت ضرور پیدا کرے گا - رسول اکرمؐ کی سیرت جسے کہ حضرت عائشہؓ نے مجسم قرآن قرار دیا ہے اگر طلبہ کے دلوں پر نقش ہو جائے تو وہ زندگی کے ہر مرحلے پر یہ سوچ کر قدم اٹھانے پر مائل ہو جائیں گے کہ اس معاملے میں ہمارے کردار و اخلاق اور قول و عمل کی حیثیت اسوۂ رسولؐ کے حوالے سے کیسی ہے - حضور اکرمؐ کی پیروی سے جو ذوق زندگی پیدا ہوتا ہے وہ انسانی راحت و غم کے معیار بدل دیتا ہے - جدید دور میں مغربی اثرات کے تحت خوشی کا ذریعہ مال و دولت اور حسیاتی لذتیں سمجھی جاتی ہیں - یہ خوشی داخلی نہیں ، خارج سے حاصل ہوتی ہے - حضورؐ کی سیرت ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ خارجی راحتوں اور نعمتوں پر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر واجب ہے لیکن سچی خوشی اور طمانیت قلب کے لیے خارجی وسائل کافی نہیں - اس کے بغیر بھی سچی خوشی حاصل ہوتی ہے اور یہ حاصل ہوتی ہے عبادت و اطاعت الٰہی ، خدمت خلق ، ہمدردی بنی نوع انسان اور اس فقر و استغنا اور سادگی سے جو زندگی کی خارجی ضرورتوں کو کم کرنا سکھاتی ہے - سیرت رسولؐ کی تعلیم صحیح طریقے پر دی جائے تو ہرگز رائیگاں نہیں جائے گی بلکہ اس سے ہمارے طلبہ کے دلوں میں ایمان و یقین کی شمع جلانے میں بھی مدد ملے گی اور ان کے کردار کو صحیح خطوط پر ڈھالنے

میں بھی -رسول اکرمؐ کے علاوہ صحابہؓ کبار اور صحابیات کے سوانح حیات اور سیرت و کردار سے بھی طلبہ کو روشناس کرانا چاہیے- لیکن یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ بقول اکبر الہ آبادی

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں آدمی، آدمی بناتے ہیں

سیرت رسولؐ و سوانح صحابہ و صحابیات کی تعلیم دینے والے اساتذہ کی ذاتی سیرت و شخصیت بھی پاکیزہ ہونی چاہیے ورنہ مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوں گے -استاد کی شخصیت کا طلبہ پر بڑا اثر پڑتا ہے خاص طور پر بچپن اور لڑکپن کے زمانے میں- اس لیے یہ بہت ضروری ہے کہ ہم اپنے بچوں کو اچھے اساتذہ فراہم کریں جو ان کی شخصیتوں کو جلا دے سکیں، ان کے ذہن کو ابھار سکیں، ان کی عادات میں باقاعدگی، اطوار میں شائستگی اور کردار میں پاکیزگی پیدا کر سکیں- اچھے اساتذہ اسی وقت مل سکیں گے جب ان کا' خصوصاً پرائمری، مڈل اور ہائی اسکول کے اساتذہ کا' معاشرتی رتبہ اور معیار زندگی بلند کیا جائے تاکہ ملک کے بہترین اور ذہین ترین افراد معلمی کا شریفانہ پیشہ اختیار کرنے کو قابل غور سمجھیں- اساتذہ کا معاشی اور معاشرتی معیار پست رکھ کر تعلیم پر اخراجات کو کم کرنا بالکل غلط حکمت عملی ہے -

آج کا زمانہ عقلیت کا زمانہ ہے -اس لیے ضروری ہے کہ اعلا سطحوں پر طالب علموں کو نہ صرف سیرت رسولؐ و سوانح صحابہ و صحابیات کی تعلیم دی جائے بلکہ اسلامی عقائد و اقدار اور افکار و تصورات کی حکمت و معنویت اور عام زندگی میں ان کی اہمیت بھی ذہن نشین کرائی جائے - جو کچھ سکھایا جائے اس کے لیے عقلی اساس بھی فراہم کی جائے- اسلام کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اخلاقی نظام کی اساسیات اور ان کے مصالح سمجھائے جائیں تاکہ وہ اسلام کی حقانیت کے دل سے قائل ہو سکیں -

(کسی بھی تعلیمی نظام میں سب سے بڑا سوال یہ مد نظر ہوتا ہے کہ مجوزہ نظام سے کس قسم کا ذہن اور کیسی شخصیت پیدا کرنا مقصود ہے - اب اگر ہمارا مقصود بحیثیت ایک نظریاتی مملکت کے یہ ہے کہ اچھے پاکستانی مسلمان پیدا کیے جائیں جو اچھے اور مفید شہری بھی ہوں اور جو ملک اور قوم کو ترقی کی راہ پر گامزن کر سکیں تو اس کے لیے صرف علوم و فنون کی تعلیم دے دینا اور چند ہنر مندیاں سکھا دینا کافی نہیں ہے- ضروری ہے کہ تمام علوم و فنون کو اسلامی رنگ میں رنگ دیا جائے)-اب بعض لوگ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ علوم و فنون کا تعلق تو طبیعی حقائق اور قوانین سے ہے اور یہ قوانین و حقائق سب کے لیے یکساں ہیں -انہیں

اسلامی رنگ دینے کے کیا معنی ہیں؟ یہ صحیح ہے کہ طبیعی علوم اور خاص طور پر علوم صحیحہ میں مشاہدات اور تجربات کے ذریعے جو قوانین اور حقائق اخذ کیے جاتے ہیں وہ نہ اسلامی ہوتے ہیں نہ غیر اسلامی، وہ تو بس حقائق و قوانین ہوتے ہیں - لیکن یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ علوم ممکن ہی اس لیے ہوتے ہیں کہ مظاہر فطرت میں ایک طرح کا نظم، ایک قسم کی ترتیب پائی جاتی ہے - موجوداتِ کائنات کے اندرونی نظم و آہنگ کو تمام جزئیات کے ساتھ جاننے کی کوشش ہی سے سائنسی علوم وجود میں آتے ہیں - چنانچہ سائنسی علوم کا مطالعہ کرتے ہوئے ہر سوچنے سمجھنے والے شخص کے ذہن میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ مظاہر فطرت میں یہ نظم و آہنگ یہ توازن اور یہ ربط باہمی کیسے وجود میں آ گیا اور یہ سیکڑوں برس سے کیسے قائم ہے - یہ محض اتفاق سے تو ممکن نہیں، نظم و ترتیب، توازن اور ربط باہم، ذہن و شعور کو مستلزم ہے - اب یا تو ہم خود فطرت ہی کو ذہن و شعور کا حامل قرار دیں گے یا پھر ایک ایسی ہستی کو مانیں گے جو اعلا ترین ذہن و شعور کی حامل ہے اور جس نے یہ کائنات بنائی ہے اور اسے چلا رہی ہے - اسی ذی شعور برتر ہستی کو مذہب کی زبان میں اللہ کہا جاتا ہے اور اللہ کو ماننے ہی کا نام مذہب ہے - چنانچہ سائنسی علوم کو اسلامی رنگ میں رنگنے سے مراد یہی ہے کہ یہ تعلیم اس انداز سے دی جائے کہ طالب علموں کے ذہن میں اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس کی صفات کا شعور پیدا ہو اور اس کی عظمت و بزرگی اور قدرت و حکمت کا یقین دل میں جاگزیں ہو - یہ نہ ہو کہ وہ قدرت ہی کو قائم بالذات یعنی اللہ سمجھ لیں - اب جہاں تک عمرانی علوم کا تعلق ہے ان کی حیثیت علوم صحیحہ کی نہیں ہے کیونکہ ان علوم کے موضوع بحث کا سب سے بڑا عنصر انسان ہے جو ایک ذی ارادہ اور ذی شعور و جذبات ہستی ہے جس کے عمل کے بارے میں کبھی کوئی پیشین گوئی قطعی یقین کے ساتھ نہیں کی جا سکتی - یہی وجہ ہے کہ عمرانی علوم میں ہمیں بے شمار اختلافات سے سابقہ پڑتا ہے - اقتصادیات ہو کہ عمرانیات، سیاسیات ہو کہ قانون، تاریخ ہو کہ بشریات تمام عمرانی علوم میں ہمیں مختلف قسم کے نظریات اور نقاط نظر ملتے ہیں جو ایک دوسرے کے متضاد بھی ہوتے ہیں - ان عمرانی علوم کو اسلامی رنگ دینے کا مطلب یہ ہے کہ ان علوم کو پڑھاتے وقت اسلامی اصول و اقدار اور افکار و تصورات کی روشنی میں مختلف ماہرین کے خیالات و نظریات کی تنقید کی جائے اور بتایا جائے کہ وہ کس حد تک اسلامی تصورات سے مطابقت رکھتے ہیں اور کس حد تک مخالفت -

(سائنسی علوم کی تعلیم کے دوران میں طلبہ کی توجہ ان آیات قرآنی کی طرف مبذول کراتے رہنا چاہیے جو براہ راست مظاہر فطرت کا بغور مشاہدہ

کرنے اور ان پر تدبر و تفکر کرنے کی دعوت دیتی ہیں ۔سائنس کا مطالعہ ان آیات قرآنی کی روشنی میں ایک مذہبی فریضہ قرار پاتا ہے اور سائنسی تحقیق و تفتیش ایک قسم کی عبادت ۔ نیز ہمارے تعلیمی اداروں میں جو سائنسی تعلیم دی جاتی ہے اس میں بالعموم مسلمان سائنسدانوں کا نام تک نہیں آتا جس سے لازماً طالب علموں کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے سائنس کے میدان میں کچھ کیا ہی نہیں ، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سائنس کے ہر شعبے میں کئی سوبرآوردہ مسلمان عالموں نے خاصے اہم کارنامے انجام دیے ہیں ۔ضرورت ہے کہ ہمارے سائنسی نصاب میں مسلمان سائنسدانوں کے کارنامے بھی شامل کیے جائیں تاکہ طلبہ کے دل سے یہ خیال دور ہو کہ اسلام اور مسلمانوں کو سائنس سے کوئی تعلق نہیں ۔

دور جدید کے مشہور فلسفی سائنسدان وائٹ ہیڈ کا کہنا ہے کہ تعلیم جو آج کل تین قسموں میں بٹی ہوئی ہے یعنی لبرل ، سائنٹفک اور ٹیکنیکل ان تینوں کو ایک اصول کے تحت ملا دینا ہی اصل تعلیم ہے ۔علم کی ایک قسم میں مہارت کے ساتھ ساتھ باقی دو قسموں میں بھی کچھ درک ضرور پیدا ہونا چاہیے تاکہ تعلیم جامع اور شخصیت و ذہنیت ہمہ رنگ ہوسکے ، یکرخی نہ رہ جائے ۔ جو بات وائٹ ہیڈ آج کہہ رہا ہے اس پرعمل تو انگریزوں کے تسلط سے پہلے برصغیر میں مسلمان صدیوں تک کرتے رہے ہیں مثلاً اٹھارویں صدی میں شاہ ولی اللہ کے مدرسۂ رحیمیہ میں طالب علموں کو یہ مضامین پڑھائے جاتے تھے : تفسیر ، حدیث ، فقہ ، صرف و نحو ، منطق ، فلسفہ علم کلام ، ہیئت ، ریاضی ، طب اور علوم باطنی ۔ نصاب تعلیم میں دینی ، عقلی اور سائنسی علوم کا جو امتزاج یہاں نظر آتا ہے اس کی ضرورت آج بھی ہمیں اتنی ہی ہے جتنی دو سو برس پہلے تھی ۔لیکن عملاً فی الحال یہ کیفیت ہے کہ ہمارے کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے تعلیم یافتہ افراد اپنے دین ، اپنی ثقافت اور اپنی تاریخ و روایات کا بہت ہی کم علم رکھتے ہیں جو نہ ہونے کے برابر ہے ۔دوسری طرف ہمارے دینی مدرسوں اور جامعات کے تعلیم یافتہ افراد طبیعی ، حیاتیاتی ، معاشرتی اور تکنیکی علوم سے نابلد ہوتے ہیں ۔ ان دونوں تعلیم یافتہ جماعتوں میں کوئی قدر مشترک نظر نہیں آتی ، حتیٰ کہ یہ لوگ ایک دوسرے کی بات ، ایک دوسرے کے خیالات اور ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھ بھی نہیں سکتے ۔یہ بُعد اس لیے پیدا ہو گیا ہے کہ مغرب سے متاثر ہو کر ہم نے دین اور دنیا کو الگ الگ خانوں میں بانٹ دیا ہے حالانکہ اسلام میں دین اور دنیا کی دوئی نہیں پائی جاتی ۔ جیسا کہ ابھی ذکر ہوا ، اسلام میں سائنس کی تعلیم حاصل کرنا ، سائنسی تحقیق و تفتیش میں مصروف ہونا ایک مذہبی فریضے اور عبادت کا درجہ رکھتا ہے ۔ہمارے اسلاف اسی لیے تفسیر ،حدیث ،

فقہ، ادب وغیرہ کے ساتھ ساتھ ریاضی، ہندسہ، ہیئت، طب جیسے مضامین بھی پڑھتے تھے۔ ہمیں بھی دینی اور دنیوی علوم کی تفریق مٹا کر اپنے طلبہ کو نہ صرف قرآن و حدیث اور سیرت و فقہ کی تعلیم دینی چاہیے بلکہ تاریخ، جغرافیہ، ادب اور طبیعی و عمرانی علوم کی تعلیم ساتھ ساتھ دینی چاہیے اور ایک خاص حد تک یہ امتزاجی تعلیم دینے کے بعد ہی انہیں اختصاصی یا پیشہ ورانہ یا ٹکنیکل تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دینی چاہیے۔

ہمارے نظام تعلیم کے لیے یہ بھی بڑی بنیادی بات ہے کہ اس کے نصابوں سے پاکستانی قومیت کا جذبہ بھی ترقی کرے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے یہاں ملّت اور قومیت میں کوئی تضاد وتخالف نہیں ہے، کیونکہ پاکستانی قومیت سب سے پہلے ان عقیدوں سے عبارت ہے جن کا مرکزی نکتہ اسلام اور اس کا دیا ہوا تصور حیات اور نظام زندگی ہی ہے، پھر دوسرا جزو وہ خطۂ ارض ہے جسے جغرافی طور پر پاکستان کہا جاتا ہے۔ ان دونوں عناصر میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ دونوں میں روح اور بدن کا تعلق ہے۔ پاکستانی قومیت کی روح یا اس کا باطن تو وہ تخیل یا نظریہ ہے جو اس کی تشکیل کا محرک ہوا مگر اس کا بدن وہ ملک ہے جس کی جغرافی حدیں مقرر ہیں اور جسے پاکستان کا نام دیا گیا ہے۔ جس طرح پاکستانی قومیت کے مرکزی عقیدے یعنی اسلامی تخیل کو محکم بنانا ضروری ہے اسی طرح اس تخیل کو اس کے جغرافی تخیل سے وابستہ رکھنا بھی ضروری ہے۔ جیساکہ ہم جانتے ہیں پاکستان اس تاریخی حقیقت کی بنیاد پر قائم ہوا کہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو مجموعی طور پر نہ کہ پختون، پنجابی، سندھی، بلوچی یا کشمیری کی حیثیت سے، اپنی تہذیبی وحدت، مشترکہ روایات، اور زبان و مذہب کو محفوظ و برقرار رکھنا ہے۔ قومی وحدت کہیے یا ملّی وحدت، پاکستان کے حوالے سے دونوں کا مطلب ایک ہی ہے۔ اس وحدت کو برقرار رکھنا، نہ صرف برقرار رکھنا بلکہ اسے قوی اور مستحکم کرنا ہماری بقا وترقی کے لیے از بس ضروری ہے۔ اس وحدت کو نقصان پہنچانے والی ہر تحریک، ہر میلان کا قلع قمع کیے بغیر ہم نہیں پنپ سکتے۔ بد قسمتی سے بعض سیاست دانوں اور دانشوروں نے اپنے خاص مقاصد حاصل کرنے کے لیے یا اپنے علاقے میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے قومی وحدت کے بجائے علاقائی ذہنیت و عصبیت پیدا کرنے میں بڑی سرگرمی دکھائی ہے اور اب بھی دکھا رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ لوگ اپنے اپنے علاقے کے مفادات کو مقدم سمجھنے لگے ہیں اور قوم و ملّت کی کلی حیثیت کو ثانوی درجہ دینے لگے ہیں۔ تعجب اور افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ علاقائیت کو ہوا دینے میں تعلیم یافتہ طبقہ پیش پیش ہے۔ چنانچہ ہمارے نصاب و نظام تعلیم میں ایسی اصلاح کی بھی ضرورت ہے کہ طلبہ کے ذہن میں قومی وحدت کا شعور

و احساس پروان چڑھے اور علاقائیت کے محدود تصور سے وہ اپنے آپ کو بچائیں - طلبہ کے نصاب میں ایسی چیزیں شامل کرنی چاہییں جن سے ان میں یہ احساس بیدار ہو کہ اگرچہ پاکستان کے مسلمان بہت سی نسلوں اور قبیلوں سے تعلق رکھتے ہیں اور مختلف زبانیں بولتے ہیں ، لیکن ان نسلی، قبائلی اور لسانی اختلافات کے باوجود ان سب کا شعور حیات و کائنات ، سب کا دین ، سب کی تاریخ اور ماضی کی یادیں ، سب کی اخلاقی اور نظریاتی قدریں ، سب کے فنون لطیفہ کے پس منظر اور مقاصد ، سب کی محبوب شخصیتیں اور روحانی و تخلیقی تحریک کے سرچشمے ایک ہیں ، سب کا ملک ایک ہے اور منزل بھی ایک ہے - ڈاکٹر سید عبداللہ کا یہ مشورہ نہایت صائب ہے کہ ابتدائی نصابی کتابوں میں مواد اس طرح مرتب کیا جانا چاہیے کہ پاکستان کے ہر خطے کے خصائص، روایات ، تاریخ اور تہذیب کے نقوش جو منعکس ہوں انہیں قومی نقوش کے طور پر پیش کیا جائے نہ کہ کسی مخصوص علاقے کی خاص چیز کہہ کر مثلاً جس طرح اقبال کو ہم پنجاب کا شاعر نہیں کہتے اسی طرح خوشحال خان اور عبدالرحمن بابا کو صوبۂ سرحد کا نہیں بلکہ پاکستان کے شاعر کہنا چاہیے - اسی طرح وارث شاہ اور سچل سرمست اور شاہ عبداللطیف کو پنجاب اور سندھ کے نہیں بلکہ پاکستان کے شاعر قرار دینا چاہیے - یہی رویہ صوفیا کے بارے میں بھی ہونا چاہیے اور تاریخی شخصیات کے بارے میں بھی تاکہ انہیں پورے پاکستان کے لوگ اپنی عظمتوں کی فہرست میں شامل کر لیں -

ہماری موجودہ تعلیم کا ایک نمایاں نقص یہ بھی ہے کہ اس کا تعلق ہمارے معاشرے اور معیشت سے بہت کم ہے - اگرچہ ہمارے کالجوں اور یونی ورسٹیوں سے ہزاروں کی تعداد میں نوجوان طلبہ و طالبات ڈگریاں لے کر نکلتے ہیں ، لیکن ان میں سے اکثر بیروزگار رہتے ہیں - صنعتی ، فنی ، سائنسی اور اقتصادی ترقی کے لیے ہمیں جن صلاحیتوں کے افراد کی ضرورت ہے وہ حسب ضرورت میسر نہیں - یہ اس وجہ سے کہ ہم نے نہ تو اپنی تعلیم کے لیے کوئی معقول منصوبہ بندی کی ہے اور نہ اپنی تعلیم کو اپنے معاشرے اور معیشت سے مربوط ہی کیا ہے - جب تک ہم اس طرف کما حقہ توجہ نہیں دیتے نہ تو تعلیم یافتہ بیروزگاری دور ہو سکتی ہے نہ صنعتی ، فنی ، تکنیکی اور اقتصادی ترقی کی رفتار تیز ہو سکتی ہے -

ہمارے قومی نظام تعلیم کی تشکیل میں ذریعۂ تعلیم کا سوال بھی بہت اہمیت رکھتا ہے - فرنگ کی محکومی کے زمانے میں تعلیم اور زندگی کے دوسرے کاروبار میں انگریزی کے استعمال کا جواز ایک حد تک موجود تھا ، لیکن آزاد مملکت پاکستان کی تشکیل کے بعد انگریزی پر اس قدر انحصار کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی - ہم ابھی تک تحصیل علم اور سرکاری کام اور روزمرہ

کے مشاغل میں ایک ایسی زبان سے کام لے رہے ہیں جو ہماری تہذیب و ثقافت ، ہماری روایات اور ہمارے دین سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی — انگریزی زبان کا جس وسیع پیمانے پر ہم استعمال کر رہے ہیں یہ استعمال ہمارے طالب علموں کے ذہن میں خود بخود یہ خیال راسخ کرتا ہے کہ روشنی صرف مغرب سے طلوع ہو سکتی ہے اور ہماری اپنی قوم کا دماغ صرف اندھیرے کا سرچشمہ ہے ۔اگر تعلیم محض معلومات کو طلبہ کے ذہنوں تک پہنچا دینے کا نام نہیں ہے بلکہ ان کے ذہنوں کو جلا بخشنے ، انہیں سوچنے کا صحیح اسلوب سکھانے ، ان میں ذوق نظر اور تنقیدی نگاہ پیدا کرنے اور انہیں فکری اجتہاد کے قابل بنانے کا نام ہے تو یہ مقاصد ہم اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتے جب تک ایک بدیسی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنائے رکھتے ہیں ۔اگر ہم محض مغرب کی نقالی اور خیرات خوری پر اکتفا نہیں کرنا چاہتے اور خود اپنے دماغ سے سوچنے اور فکری اجتہادات کرنے کی قابلیت پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنا ذریعۂ تعلیم بدلیں اور اپنی قومی و ثقافتی زبان میں سوچنے اور لکھنے پڑھنے کی عادت ڈالیں جو ہمیں اپنے تاریخی ، جغرافی ، معاشرتی ، ثقافتی اور دینی پس منظر اور سرمائے سے اس طرح دور نہیں لے جاتی جس طرح انگریزی لے جاتی ہے ۔ قومی وحدت کی تعمیر کے لیے افراد قوم کا ہم خیال و ہم احساس ہونا ضروری ہے اور اس کے لیے ہم زبان ہونا بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ یک زبانی قوم کی وحدت و سالمیت کے استحکام کا باعث ہوتی ہے ۔کسی مشترک زبان کا نہ ہونا قوم کی وحدت کے لیے ضعف کا باعث ہوتا ہے ۔خوش قسمتی سے ہم ایک مشترک زبان کے حامل ہیں جو سارے ملک میں عام طور پر سمجھی اور اکثر بولی جاتی ہے ۔ اس مشترک قومی زبان کو ترقی دینا بھی ہمارے نظام تعلیم کے مقاصد میں شامل ہونا چاہیے جس کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اسے محض ابتدائی درجوں میں نہیں بلکہ ہر سطح پر ذریعۂ تعلیم بنا دیا جائے ۔اردو اگر ادنا سے اعلا ہر سطح پر ذریعۂ تعلیم بن جائے تو ظاہر ہے کہ ہمارے طالب علموں کی اردو کی استعداد میں بہت اضافہ ہوجائے گا ۔ وہ زیادہ سہولت سے اردو لکھ پڑھ اور بول سکیں گے اور اردو میں سوچ سکیں گے ۔ان میں تخلیقی صلاحیت بیدار ہوگی اور وہ تقلیدی ذہن اور تقلیدی مزاج سے نجات پا جائیں گے جو انگریزی کے ذریعۂ تعلیم ہونے کی وجہ سے ان میں پیدا ہوگیا ہے ۔اردو میں استعداد بڑھ جانے سے طالب علموں کو یہ فائدہ بھی ہوگا کہ وہ اس وسیع دینی ذخیرے سے بآسانی استفادہ کرسکیں گے جو اردو میں موجود ہے اور عربی کے سوا دنیا کی کسی اور زبان میں موجود نہیں ۔ اس طرح اسلامی افکار و اقدار کو سمجھنے اور

انہیں جذب کرنے میں بھی انہیں سہولت ہو جائے گی -

جدید علوم و فنون اور صناعتوں سے واقفیت حاصل کرنے اور بین الاقوامی روابط قائم رکھنے کے لیے ہمیں انگریزی کی ضرورت یقیناً ہے اور ہمیں اس غرض کے لیے اپنے طالب علموں کو ثانوی زبان کے طور پر انگریزی ضرور سکھانی چاہیے، لیکن اسے ذریعۂ تعلیم کے طور پر جلد از جلد ترک کر دینا چاہیے - جو لوگ اپنی غلامانہ ذہنیت کی وجہ سے انگریزی کو بطور ذریعۂ تعلیم برقرار رکھنے کے حق میں ہیں وہ ہمیشہ یہی مغالطہ پیدا کرتے ہیں کہ انگریزی کو چھوڑ کر ہم ترقی یافتہ دنیا اور اس کے علوم و فنون سے کٹ جائیں گے اور ترقی نہیں کر سکیں گے - ان کی یہ بات اس صورت میں درست ہوگی اگر ہم انگریزی کو یکسر دیس نکالا دے دیں اور ثانوی زبان کے طور پر بھی طالب علموں کو نہ پڑھائیں - لیکن اگر ثانوی زبان کے طور پر انگریزی پڑھائی جاتی رہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ترقی یافتہ دنیا اور اس کے علوم و فنون اور صناعتوں اور تکنیکوں تک رسائی حاصل نہ کر سکیں - انگریزی پڑھنا اور انگریزی کے ذریعے سے پڑھنا دو بالکل الگ الگ باتیں ہیں - انہیں خلط ملط نہیں کرنا چاہیے -

تعلیم ـــ مسائل اور حل

جناب پروفیسر ظہور احمد اعوان

علم کیا ہے ۔ حقیقت کیا ہے ۔ علم الحقیقت کیا ہے ۔ علم ذات کے لیے ہے ۔ جماعت کے لیے ہے ۔ حیات کے لیے ہے ۔ کائنات کے لیے ہے ۔ رب شش جہات کے لیے ہے ۔ تعلیم کیا ہے ۔ تہذیب کیا ہے ـــ یہ سوالات انسانو. ذہنوں میں امڈتے رہتے ہیں ۔ جتنی باتیں اتنی راہیں ، جتنے فہم اتنے وہم ، جتنے ذہن اتنے زاویے ۔

تعلیم تلقین بھی ہے ، تسکین بھی ، تزئین بھی ہے ۔ وقت ، قدر اور فرد کے رشتے بنتے ٹوٹتے اور بدلتے رہتے ہیں ۔ حتمی تعریف و ترتیب قائم کرنا مشکل ہے ۔ علم نگاہوں کے طلسم کی شکست سے عبارت ہے ۔ حقائق تو ازل سے موجود ہیں اور ابد تک قائم رہیں گے ، پر ہماری نگاہوں پر تجاہل ، تغافل اور تساہل کے تہہ در تہہ نقاب پڑے ہوتے ہیں ۔ ہماری کوتاہ دستی ، کم نگہی اور کج فکری کے حجاب درمیان میں حائل ہوتے ہیں ۔ کائنات کی رگ و پے میں فطرت کے اصول پوری سائنسی واقعیت و نفاست کے ساتھ جاری و ساری ہیں ۔ ہمیں کچھ ایجاد نہیں کرنا ہے ۔ ہمیں تو اپنی جہالت کی چلمن اٹھاکر قلوب و اذہان پر سے فاصلوں کی گرد کو ہٹانا ہے ۔ ہماری بے علمی کی دیوار میں جہاں دراز پڑتی ہے اور حقیقت کی کرن اور ان کے رشتے نظر آجاتے ہیں تو ہم اسے اپنی دریافت اور علم کا نام دے لیتے ہیں ۔

بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم
اس زمین و آسمان کو بے کراں سمجھا تھا میں

علم کی حقیقت جو بھی ہو ، مگر یہ ایک بات یقینی ہے کہ علم ایک ہے ، جامع ہے ۔ اسکا کوئی رنگ ، نسل اور وطن نہیں ہے ۔ علم ناقابل تقسیم ہے ۔ اسے مشرق و مغرب ، قدیم و جدید ، بے کار و کارآمد کے خانوں میں ہم نے اپنی آسانی اور فریب کی خاطر بانٹ رکھا ہے ۔ علم کا منتہا فطرت کی منشا کے مطابق ہر شب کو سحر کرنا ہے ۔ تاریکی کا سینہ چیرکر صداقت کا سویرا ہویدا کرنا ہے ۔ شب کے لیے چراغ ، سفال سے ایاغ اور صحرا

کے مقابلے میں باغ اگانا ہے۔ کسی سے ڈرنے اور مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں ۔

مشرق سے ہو بے زار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارا ہے کہ ہر شب کو سحر کر

یہ کلید زریں ہے جسے ہم نے کھویا اور اغیار نے پالیا ہے ۔ ہمارے افکار و علوم پہ جگہ جگہ تعصب ، انانیت ، احساس کمتری کے تالے پڑے ہوئے ہیں اور چابی کھوگئی ہے ۔ ہم مستعار سوچوں کا ذکر کرتے ہیں مگر سوچیں تو کوئی سوچ مستعار نہیں ہوتی ۔ سب سوچیں اولاد آدمؑ کی مشترکہ میراث ہیں ۔ سوال سوچوں کے استطارے کا نہیں ۔ سوچوں کے استعمال کا ہے ۔ گناہ بندوق کا نہیں ۔ بندوق کے غلط استعمال کا ہوتا ہے۔ سوچنا یہ ہے کہ آیا ہم کسی نئی یا پرانی سوچ کو اپنی تہذیب و روایات علم و ادراک کے مزار کا چراغ بناتے ہیں یا جوت سے جوت جگا کر عمل در عمل اور رد عمل کے تخلیقی دردوں سے گزر کر نئے افکار کو جنم دیتے ہیں ۔

اگر اپنے نظریے کی صداقت پر ہمارا ایمان ہے اور ہمارا باطن اندر سے محکم ہے تو پھر سوچوں کے بازار میں اپنی سوچ پر پشیمانی اور معذرت کیوں ؟ بشری سطح پہ ہمارے انسانی ، حیوانی ، جبلّی ، نفسیاتی، تاریخی رشتے ایک ہیں ۔ ہماری اصل ، نسل اور فصل ایک ہے تو پھر لسانی اور جغرافیائی مغائرت کی بنا پر سوچوں کا استرداد کیوں ؟ علم جاننے کا نام ہے ۔ جو کچھ موجود ہے اس کا جاننا توعیب نہیں ۔ بات تب بگڑتی ہے جب معاملہ اطلاق و نفاذ کا آتا ہے ۔ ابلیس کا علم درست تھا ۔ اس کا عمل نادرست تھا ۔ یا پھر ڈونگیاں گلاں ۔ کون جانے ۔

اسے صبح ازل انکار کی جرأت ہوئی کیوں کر
مجھے معلوم کیا ، وہ رازداں تیرا ہے یا میرا

علم کی سب درجہ بندیاں ، موضوعاتی و معروضی نامزدگیاں ایک کل کے اجزا اور جزئیات ہیں ۔ خیر کے استحکام کے لیے شر کے علم اور شر سے بچنے کے لیے خیر کے علم کی ضرورت ہر وقت رہے گی ۔ ایک جزو کو پکڑ کر اس کو کل سمجھنا دلیل ہماری بے بصیرتی کی تو ہوسکتی ہے مگر اس سے جزو کل نہیں بن سکتا ۔ کل علم کا منبع و ماخذ ایک ہی علم کُل ذات واحد ہے ۔ سب سوتے وہیں سے پھوٹتے اور وہیں پر لوٹتے ہیں ۔ قطرے ، ندیاں ، چشمے ، جوئبار سب اپنے پتھریلے جغرافیوں میں چلتے ہیں ، ساگر تک پہنچنے کے متمنی ہیں ۔ دریا کا سہارا چاہیے ۔ دریا ، نہر اور بحر کے درمیان پل ہے ۔ دریا قطروں ، نہروں ، ندیوں کو مہا

ساگر کے سینے تک پہنچا دیتا ہے ۔ قطرہ فرد ہے ۔ دریا پیمبر ہے ۔ ساگر خدا ہے ۔ ساگر کا علم خورشید کی تپش ساگر سے اٹھاتی ہے۔ پھر پھوار کی صورت میں یہ علم آب جووں کے سینے میں اترتا ہے ۔ یہی علم لہر کے کند ہے اور منجدھار کی نیا میں سوار ہوکر پھر کلیت سے ہم آغوش ہونے کے لیے بحر سے ہم کنار ہوجاتا ہے ۔ یہ ریسائیکلنگ کا عمل جاری ہے ۔ ذہن کی سیپیاں منہ کھولے اپنی باری اور قسمت کی منتظر رہتی ہیں ۔ یہ کھیل کن فیکون اور بگ بینگ (BIG BANG) کے لمحوں سے رواں ہے ۔ کب تک جاری رہے گا ، کون جانے ۔ اصل سے وصل ہوگا تب حال کھلے گا ۔ تعلیم کا موضوع اتنا ہمہ جہت و ہمہ گیر ہے اور ہر کوئی اس کے بارے میں اس قدر جانتا ہے کہ اس موضوع پر بات کرنا اپنے لیے سبکی کا دروازہ کھولنا ہے ۔ مگر جو چیز جس قدر وسیع الاطراف ہوگی ، اس کی توجیہات کی اسی قدر بہتات ہوگی ۔ معاملہ تب بگڑتا ہے ۔ جب ہر فرد اپنی ہی طرف کو کل اطراف کہلوانے پر اصرار کرتا ہے۔ سب کو ٹھیک کہنا پڑتا ہے ۔ جس طرح ایک جج صاحب کے سامنے دو فریق پیش ہوئے ۔ ایک نے بات کی ۔ جج صاحب نے فرمایا تو ٹھیک کہتا ہے ۔ دوسرے نے بات کی ۔ جج نے کہا تو بھی ٹھیک کہتا ہے ۔ وکیل صاحب نے کہا جناب دونوں میں سے ایک کی بات ٹھیک ہوگی ۔ جج صاحب نے فرمایا تو بھی ٹھیک کہتا ہے ۔ اندھوں کی بستی میں ہاتھی آجائے تو جس کے ہاتھ میں جتنا ہاتھی آتا ہے ، وہ اس کو ہاتھی قرار دے کر کھیر کو ٹیڑھا کردیتا ہے ۔ چنانچہ علم و تعلیم کے میدان میں بھی طرح طرح کے لطیفے سامنے آتے ہیں ۔ افسانے کو حقیقت ، دیو مالا کو تاریخ ، جذبات کو تعقل ، روایت کو صداقت کہا جانے لگتا ہے ۔ منطقی تاویلوں کے سلوشن تو موجود ہوتے ہی ہیں ۔ یہ بات ہو تو پھر تحقیق و تدقیق اور تخلیق کے دروازے بند ہونے لگتے ہیں ۔ ریڈی میڈ مفروضوں کا راج قائم ہونے لگتا ہے ۔ زود یقینی کا مرض عام ہوجاتا ہے ۔ افکار پر سکوت اور اعمال پر جمود کا پہرہ بیٹھ جاتا ہے ۔

علم و تعلیم کے لیے پہلی شرط آزادئی فکر ہے ، کیونکہ جہان نو کی تعمیر افکار تازہ کی نمود سے ہوتی ہے ۔ سنگ و خشت کے جہاں لاکھ ابھر آئیں ، سچی حقیقتیں نظروں سے اوجھل رہتی ہیں ۔ افکار تازہ سے گریز پائی پسپائی کی دلیل ہے ۔ علم خیروشر اور حسن و قبح میں تمیز سکھاتا ہے ۔ فعل اور ترک فعل دونوں پر مساوی قدرت کا نام انسانیت ہے جو آزادئی فکر و عمل سے عبارت ہے ۔ کتاب نصاب پر چپکیاں لگانا خدا ، انسان اور کائنات کو تقسیم کرنا ہے ۔ یہ علم کی توہین ہے ۔ نظریوں کے معاندانہ تصادم سے انرجی پیدا ہوتی ہے جو مفاہمانہ توافق کی گاڑی

کو پر لگا دیتی ہے ۔ بانگ درا ہمالہ کے چقماق سے ٹکرا کر برق پا بالِ جبریل سے آراستہ ہوتی ہے ۔ پھر ضرب کلیم بن جاتی ہے ۔ اور انسانیت کے لیے پیام مشرق اور ارمغان حجاز بن کے طلوع ہوتی ہے ۔

عقل و دانش کی خریداری کے لیے آسائش کی ارزانی کے ساتھ آزمائش کی سرگرانی میں سے گزرنا پڑتا ہے ۔ یونانی فلسفی اسکائی لیس نے بجا کہا ہے کہ دانش کی منزل اذیت کی دھار پر سے گزر کر ملتی ہے۔ جو لوگ اپنے ماضی سے سبق نہیں سیکھتے انہیں ماضی کو دوبارہ گزارنا پڑتا ہے ۔ تاریخ انہی اقوام کے لیے اپنے آپ کو دھراتی ہے جو اس سے عبرت نہیں پکڑتے ۔ تعصب کی عینک اتار کر اچھی باتوں کو اپنی میراث کے طور پر اپنا لینا چاہیے ۔ تسلسل کی آبجو میں بہتے ماضی کے محاسن کو آج کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرکے طرز کہن کے معائب پر اڑنا چھوڑ دینا چاہیے ۔ ماضی کی راکھ میں سے تابندہ اخگر ہی چننے چاہیئیں جو مستقبل کے شعلوں کو اذن فروزانی بخش سکیں ۔

نظام الاخلاق سے مربوط ایک ہمارا بھی نظام تعلیم تھا ، جو فیضان نظر کی کرامت سے آداب فرزندی سکھاتا تھا ، جو کتابوں کے دفینے کے علم کے ساتھ کتاب گرکے سینے کے علم کا طلبگار تھا ، جو قلب کو گرما اور روح کو تڑپا سکتا تھا ۔ جو سجدہ بے منتِ سر کروا سکتا تھا ۔ بات سے بات نکلتی ہے ۔ مولانا روم رح اپنے مدرسے میں حوض کے کنارے کتاب پکڑے طلبہ کو درس دے رہے تھے ۔ ایک درویش نمودار ہوتے ہیں ۔ پوچھا کیا کررہے ہو ۔ کہا ، وہ کچھ کررہا ہوں جو تو نہیں جانتا ۔ درویش نے کتابیں اٹھا کر حوض میں ڈال دیں ۔ مولانا چیخ اٹھے ۔ فرمایا یہ کیا کیا ؟ درویش نے کہا وہ کچھ کیا جو تو نہیں جانتا ۔ پھر ہاتھ ڈال کر حوض میں سے خشک کتابیں نکال کر مولانا سے کہا کہ بس یہی تمہارا علم تھا ۔ اس کے بعد آگے آگے شمس تبریز تھے اور پیچھے پیچھے مولانا روم رح ۔

شریعت کے ساتھ طریقت شامل ہوجائے تو قلب مومن پگھل جاتا ہے ۔ پھر وہ منظر دیکھنے میں آتا ہے کہ تنگ گلی میں کتا سورہا ہے ۔ گزرنے کا راستہ نہیں ۔ مولانا روم رح ساری رات وہیں بیٹھ کر گزار دیتے ہیں تاکہ کتے کی نیند میں خلل نہ پڑے ۔ آدمیت احترام آدمی سے عبارت ہے جب احترام آدمی ذبح ہوجائے توانسانیت دم توڑ دیتی ہے۔ نظام الاخلاق میں قوت تھی تو نظام التعلیم میں بھی توانائی تھی ۔ سیاسی و معاشی عروج بھی حاصل تھا ۔ اخلاقی قوت کمزور پڑ جائے تو سیاسی زوال شروع ہوجاتا ہے ۔ اخلاق وتمدن پر ہماری گرفت ڈھیلی ہوئی تو اغیار نے ہمارے

سارے مورچوں پر قبضہ کرلیا ۔

مغربی تعلیم و تدریس کو ہمارے ہاں ایک گہری سازش کے تحت اعلا مقاصد کی قبا پہنا کر لایا گیا ۔ نو آبادیاتی نظام کی جڑوں کو مضبوط کرنے کے لیے مقامی تہذیب و تمدن ، تعلیم و ثقافت کو اندر سے کھوکھلا کرنا ضروری تھا ۔ چنانچہ سفید تعلیم سیاہ نیتوں کے ساتھ اصلاحات کے اسپ تازی پر سوار کراکے ہمارے تشخص کو روندنے کے لیے لائی گئی ۔ چونکہ ہمارا ایمان (CONVICTION) کمزور ہوگیا تھا ۔ اس لیے ہم اس پامالی کے آگے سپر انداز ہوگئے ۔ اگر ہماری (COMMITMENT) کھوکھلی نہ ہوتی تو پھر انگریزی تعلیم و تہذیب کا سارا زور بھی ہمارا بال بیکا نہ کر سکتا تھا ۔ چونکہ کمزور پر بیماری کا حملہ جلد ہوتا ہے اس لیے ہم نے ابتدائی مدافعت کے بعد ہی سارا میدان چھوڑ دیا ۔ یار لوگ تو بادشاہ لوگ تھے انہوں نے سب سے پہلے یہ کیا کہ ہمارے بڑوں کو بڑائی کی مسند سے اتار کر اپنے بڑوں کو وہاں بٹھایا ۔ شاہ ولی اللہ کی جگہ جارج برنارڈ شا اور شیخ سعدیؒ کی جگہ شیکسپئر کو لا بٹھلایا ۔ آگے کام آسان تھا ۔ ہماری نفسیاتی دنیا میں تحیر خیز انقلاب برپا ہوگیا ۔ ان کی بات سند بن گئی۔ آج تک یہ فضا قائم ہے ۔ " کالا خان " کی بات سننے کو ہم توہین خیال کرتے ہیں ، پر " مسٹر بلیک " کی بات ہمارے لیے اعزاز ہے۔ یہ مسمریزم اور نظر بندی سب کمزور نو آبادیاتی ممالک کی قسمت میں لکھی گئی ہے ۔ کتنا کچھ لکھا جائے ۔ کتنا ماتم کیا جائے :

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

جو لوگ اس بھرّے میں نہیں آئے ، وہ محمد علی جوہر ، محمد علی جناح ، علامہ مشرقی اور علامہ اقبال کہلائے ۔ ورنہ باقی ہم سب تشخص کے سراب میں اپنا آپ گم کئے ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں ۔ احترام کا معیار آدمیت کی جگہ اثاثے ، عہدے ، گریڈ بن گئے ہیں ۔ اکبر آلہ آبادی اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہیں ۔ چند نوجوان افسر نما چیزیں وہاں موجود تھیں۔انہیں پرانی وضع کے اکبر کو کہاں منہ لگانا تھا ۔ ایک اور صاحب آتے ہیں اور اکبر آلہ آبادی کا تعارف کرواتے ہیں کہ ان سے ملیے ، یہ ہیں ۔ ڈپٹی کمشنر کے والد (اکبر کے بیٹے ، عشرت حسین ، ڈپٹی کمشنر تھے)۔اب وہ لوگ ہیں کہ بچھے چلے جاتے ہیں ۔ اکبر نے کہا بچّو ! تمہارا قصور نہیں ۔ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کی محفل میں کہیں خدا آگیا ۔ انہوں نے نہیں پہچانا ۔ جب ان کو بتایا گیا کہ

یہ یسوع مسیح کے والد بزرگوار ہیں (نعوذ باللہ) تو سب احترام کرنے لگے - مغربی تہذیب و تمدن نے ہماری آنکھوں کو چند ہیاکر اندھا کردیا ہے - پھر ہم ان کی آنکھوں سے دیکھنے اور ان کے کانوں سے سننے لگتے ہیں :

محفل میری ساقی ان کا
آنکھیں میری باقی ان کا

تعلیم کوالٹی آف لائف (معیار حیات) بہتر بنانے کے لیے ہوتی ہے ، لیکن ہمارے لیے یہ کوانٹٹی اوف اسٹرائف (مقدار زیاں) کے اضافے کا باعث بنی - تہذیب آئی تکذیب کرگئی -

لاطینی امریکہ کے عظیم دانشور ماہر تعلیم پالوفرئیر نے اپنی تحریروں میں مغربی تعلیم و تہذیب کا تجزیہ بڑے حقیقت پسندانہ انداز میں کیا ہے - ان کا کہنا ہے کہ مغرب کے سیاسی و اقتصادی نظاموں کی طرح تعلیمی نظام بھی استحصال کا ایک دلاویز ہتھکنڈا ہے - تیسری دنیا کے اکثر ممالک میں حاکمانہ نظام تدریس رائج کیا گیا تاکہ محکوم اقوام کے اذہان سے آزادی، قلوب سے جذبہ ، افکار سے اپج ، خیالات سے جدت اور افراد سے تشخص چھین لیا جائے اور ان کی خود نگری کو سرنگوں کرکے ان کو اپنے پیچھے چلنے پر مجبور کیا جائے - غالب اقوام کا طریقہ واردات یہ ہے کہ وہ مغلوب اقوام میں اجنبی شعور (ALIEN CONSCIOUSNESS) کاشت کرتی ہیں - لاشعور میں اپنے غلبے کی بھرائی کی جاتی ہے - تحت الشعور میں اپنی فوقیت کے ستون اٹھائے جاتے ہیں - پھر شعور کی عمارت حسب منشا تیار ہوتی ہے حتیٰ کے مابعد الشعور (SUPER EGO) یا ضمیر تک میں ان کی برتری کی کار فرمائی جلوہ گر ہوتی ہے - پھر اپنے لگتے فرو مایہ (SUBHUMAN) اور ان کے نتھو خیرو فوق البشر (SUPER HUMAN) نظر آنے لگتے ہیں - محض انسان کا خانہ خالی اور خراب ہوجاتا ہے - اجنبی شعور اغیار کی عظمت کے دیو مالائی تصورات کو پروان چڑھاتا ہے - اس کا خاصہ یہ ہے کہ یہ افراد و اقوام میں مردنی ، بے حسی ، بے عملی پیدا کرنے کے لیے بے لچک ، پالتو رویے پیدا کرتا ہے - خواب غفلت میں سلا کر جاگنے کے سپنے دکھاتا ہے —— (ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں) تاکہ اصلی اصلاح و ترقی و آزادی کے حوصلے کند ہوجائیں اور صرف وہ ترقی و آزادی نظر آئے جسے اقوام غالب اپنی عینک سے دیکھنے کی اجازت بخشیں -

ترقی پسندانہ طریقۂ تدریس یہ ہے کہ ان مفروضوں (MYTHS) کو چیلنج کیا جائے - اسی صورت میں آزادی کے اصل سورج کے طلوع ہونے

کی امید رکھنی چاہیے ۔ اس ذہنی اسیری کا مقابلہ کرنے کے لیے مغلوب اقوام میں آزاد و خود مختار شعور (AUTONOMOUS CONSCIOUSNESS) کا اجاگر کرنا ضروری ہے جو تنقیدی فکر و نظر اور رویے کی پیداوار ہوتا ہے ۔ طاقت اور تعلیم ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں ۔

غالب اقوام یہ بات جانتی ہیں ۔ مغلوب اقوام کو یہ بات باور کروانی ہے ۔ اجنبی شعور کی پیداوار ، یہ تصور کہ چند اقوام ، افراد نسلیں اور رنگ ہی ترقی کے اجارہ دار ہیں ، غلط ہے ۔ تمام اقوام و ملل ، سعی پیہم ، محنت و دیانت سے ذہانت کی بند کلیوں کو پھول بناکر خوشحالی کا گلستان کھلا سکتی ہیں ۔ ترقی اسی وقت ممکن ہوسکتی ہے ، جب جمود کے خلاف جماعتی جہد ، جرأت سے جاری کی جائے ۔ وہ تعلیم جو مغلوب کو مغلوب ہی بنانے پر مصر ہو ، استحصالی ہے ایسی تمام تعلیم پروپگنڈا ہے جس میں بنے بنائے نظریات ذہنوں کے اندر اتار دیے جاتے ہیں ۔

غالب اقوام ، مغلوب اقوام کی خود داری کے غلبے کو ملبہ بناکر اپنے عروج کی داستان رقم کرتی ہیں ۔ ایسے طریقہ ہائے تعلیم استحصال کے آلات ہیں ۔ یہ تعلیم کا بینکنگ سسٹم ہے ۔ اس میں استاد جمع کروانے والا اور طالب علم جمع کرنے والا ہوتا ہے ۔ اجنبی شعور کے ڈالر طلبہ کے ذہن کے لاکر میں رکھے جاتے ہیں ۔ ایک چابی غالب بینکار کے پاس بہر طور رہتی ہے ۔ ذہن فکسڈ ڈیپازٹ بن جاتے ہیں ۔ استاد اعلامیے جاری کرتا ہے ۔ طالب علم مہر بلب ریسیور کو تھامے سکوت کے لمحے گنتا رہتا ہے ۔ یہ سسٹم طالب علم میں جمود کے ساکت رویوں کو جنم دیتا ہے ۔ طلبہ کے لیے قیل و قال چون و چرا کے لبوں پر مہر سکوت ثبت ہوتی ہے ۔ اسے کلچر آف سائیلنس میں پختہ کردیا جاتا ہے ۔ پھر بیمار جذبے پروان چڑھتے ہیں ۔ آزادی کے اصل تصور کا رنگ اڑنے سے پیشتر ہی زرد ہوجاتا ہے ۔ اس کے مقابلے میں خود مختار شعور سے مملو تعلیم ، آزادی کی علمبردار ہے ۔ اس میں تنقید ، تحقیق ، شک و شبہے ، خود انحصاری کے رویوں کی پرداخت کی جاتی ہے ۔ یہ دو رُویہ ٹریفک ہے جس میں مکالماتی رنگ غالب ہوتا ہے ۔ ربط علم ، ماحول سے متعلق اور کتاب و نصاب کے مطابق سوال و جواب کے پہیوں پر آگے بڑھتا ہے ۔ یہ تدریس تخلیقی عمل کی طرح ہوتی ہے جو ہوشمند ذمہ دارانہ شعور کے فروغ کا باعث بنتی ہے ۔ تیسری دینا کی تمام محروم اقوام کی نجات تعلیم کے اسی رویے میں پنہاں ہے ۔

خواندگی اور تعلیم میں بڑا فرق ہے ۔ خواندہ شخص ضروری نہیں کہ تعلیم

یافتہ بھی ہو اور تعلیم یافتہ شخص کے لیے ضروری نہیں وہ خواندہ بھی ہو۔ ہمارے ملک میں خواندگی کم ہے ،مگر تعلیم کم نہیں ۔ لفظوں کے ٹیپ ریکارڈر ڈگری کی پگڑیاں باندھ کر تعلیم یافتہ نہیں کہلا سکتے۔ پگڑی پر ایک لطیفہ یاد آرہا ہے ۔ " ایک دیہاتی کو ایک خط ملا ۔ وہ دوڑتا ہوا باہر گیا ۔ اسے ایک شخص بڑا سا پگڑ باندھے نظر آیا ۔ وہ خط لے کر اس کے پاس پہنچا کہ بھائی صاحب خط پڑھ دو ۔ اس نے کہا مجھے پڑھنا نہیں آتا۔ دیہاتی نے کہا کہ اتنا بڑا پگڑ باندھ رکھا ہے اور خط پڑھنا نہیں آتا ۔ اس نے پگڑ اتار کر دیہاتی کے سر پر رکھ دیا اور کہا کہ لے اب تو پڑھ۔"

جس طرح پگڑ باندھنے سے خواندگی میسر نہیں آسکتی ،اسی طرح خواندگی کا طوق ڈگری کی صورت میں گلے میں سجانے سے تہذیب و شائستگی کی سند نہیں ملتی ۔ ڈگری یہ تو بتا سکتی ہے کہ اس شخص نے اتنے لفظ پڑھے ہیں،مگر مبلغ اخلاق کا پتہ نہیں دے سکتی ۔ لفظوں کا بینک کھلنے سے علم کا اکاؤنٹ نہیں کھل جاتا ۔ لفظ علم کا اور علم اخلاق کا وسیلہ ہونے چاہیئیں ۔ اگر ایسا نہیں تو خواندگی کو علم کا متبادل قرار دینا خود فریبی نہیں تو اور کیا ہے ۔ خواندگی کا علم دیر میں دریافت ہوا ۔ اخلاق کا علم روز اول سے موجود ہے ۔ پہلے اخلاق آگے آگے چلتا تھا ، علم پیچھے پیچھے ۔ پھر اخلاق و علم ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے چلنے لگے ۔ اب یہ وقت آگیا ہے کہ دونوں میں ٹھن گئی ہے ۔ مروت و محبت کے باغیچے اجڑتے جارہے ہیں ۔ کردار کا فرشتہ گفتار کے چُلو میں ڈوب چکا ہے ۔ تعلیم سیرت کو صیقل کرنے کا نام ہے ۔ انکسار و عجز کی حیات اور نخوت و تبختر کی موت کا نام ہے ۔ علم جاننا ہے ۔ اخلاق عمل کرنا ہے ۔ مغربی تعلیم و تہذیب نے تن آسانیوں کے انبار تو لگا دیے ہیں ،علم الحواس کے ذریعے علم الاشیا کی تسخیر کرکے فرزندان ادم کے لیے ارضی جنتوں کے در کھول دیے ہیں ، مگر قیمت بڑی بھاری وصول کی ہے۔ اولاد آدم کے دلوں میں محبت کی ارزانی اور اخوت کی فراوانی کا بازار سرد کردیا ہے۔ تعلیم کا مقصد آدمیت کی تعمیر و تہذیب تھا ۔ اب بنی نوع انسان کی تباہی کا سامان پیدا کیا جارہا ہے ۔ اقوام عالم دفاعی و جنگی تعیشات پر جس قدر رقوم خرچ کررہی ہیں اس کا ہزارواں حصہ بھی تعلیم و صحت کے شعبوں پر سال میں خرچ نہیں کیا جاتا ۔ ایک اواکس طیارے کی قیمت ایک ملین ڈالر ہے اور تیسری دنیا کے ایک ملک نے حال ہی میں آٹھ اواکس خریدے ہیں۔ کیمیکل ہتھیار ، نیوٹرون بم اور دوسرے تباہ کن آلات فنا دریافت کئے جارہے ہیں ۔ موت کا رقص ابلیس مقتدر اقوام کے ذہنوں میں جاری ہے ۔ خوف خدا نہ رہے تو امن کی بتیاں گل ہوجاتی ہیں ۔ مادہ پرستی نے روحانیات کے دیے بجھا دیے ہیں ۔ روحانیات کے منکر نہ مانیں،مگر ایک اندر کی دنیا ،

باطن کی دنیا ، قلب کی دنیا ہوتی ضرور ہے - سکون قلب ایک چیز کا نام ہے - جسے اہل مغرب (PEACE OF MIND) اور اہل مشرق روحانی تسکین کے نام سے یاد کرتے ہیں - بات ایک ہی ہے - قرار کے لمحے چھن گئے ہیں - چیزوں کے انبار میں ہم سب نادار ہوگئے ہیں - " ھل من مزید " کی صدائیں اٹھ رہی ہیں - یہ جدید تہذیب کا المیہ ہے کہ امیر بنا کر غریب بناتی ہے - چارہ ڈال کر لاچار کرتی ہے - باہر کے قمقمے ہزار جھلملائیں ، اندر کی تجلیاں بجھ کر اندھی ہوگئی ہیں -

جدید تعلیم و تہذیب نے تسخیر فطرت کا سامان تو مہیا کردیا - مگر رخشِ نفس کی باگ و رکاب سے ہاتھ اٹھالیا - شکم پرستی ، جنس زدگی، ذہنی پراگندگی ، خود ناشناسی کا راجہ ہولی کھیلنے لگا - کارخانوں کی دیواریں بڑھ بڑھ کر اخلاق و کردار کے گلستانوں کی حدیں توڑنے لگیں - اخلاق باختگی کی اس موج کو ہم نے اپنا اوج مان لیا - سوال یہ ہے کہ مادی ارتقا اور سائنسی عروج، اخلاق و کردار کا زوال کیوں بن کر سامنے آرہا ہے - جدیدیت شخصی طور پر انسان کو گناہگار کیوں بنارہی ہے - تعلیم کے منہ میں اخلاق کی لگام کیوں نہیں ہے - وی سی آر سیاہ کار نیل فام فرائض ہی کیوں سرانجام دیتے نظر آتے ہیں - اسکے شائستہ مقاصد کے لیے استعمال کی راہ میں کونسی چیز مانع آتی ہے - کیا ہم اس مغربیت اور جدیدیت کو خریدنے تو نہیں نکلے ہیں جس سے مغرب خود بے زار ہورہا ہے - نظام میں بے خدائیت کا ماتم وہاں بھی ہونے لگتا ہے - حیا و وفا کی سسکیوں پر وہ بھی گریہ کناں نظر آرہے ہیں -

ہم بھی ٹوٹ رہے ہیں - مگر ایک چیز اب بھی ہمارے پاس ایسی ہے جس نے اس قعر مذلت میں پوری طرح غروب ہونے سے ہمیں روک رکھا ہے - اہل مغرب پراسرار مشرق سے یہی سوغات مانگتے ہیں - مگر ہم نہیں جانتے کہ اگر یہی حال رہا تو کب تک ہم اس تجلی کو شدائد کے سامنے دل کے آبگینوں میں چھپاکر رکھیں گے - ہوا کے سامنے یہ چراغ کب تک جلتا رہے گا - مئے خانہ مغرب کا دستور نوالا ہے - سائنس و ٹیکنالوجی ایک ہاتھ سے دے کر دوسرے ہاتھ سے محبت و مروت کی مٹھاس چھین لیتے ہیں -

اس المیے کا علاج ضرور دریافت کیا جائے کہ اخلاق کے محاذ پر پسپائی کیوں بڑھتی جارہی ہے - اس کا مداوانہ مغرب کے پاس ہے نہ ہماری سمجھ میں آتا ہے - مغربی تعلیم و تہذیب ایک پیکیج ڈیل کی صورت میں آتی ہے - پھر رویوں کا تغیر ناگزیر ہوجاتا ہے - اس پیکیج کے اندر تجارت و استیصال کی روح کارفرما ہوتی ہے - دینے والے کی برتری اور

لینے والے کی کمتری اس میں کوٹ کوٹ کو بھری ہوتی ہے - سیاسی بیداری کی عبا لے کر معاشی خود انحصاری کی قبا دے دی جاتی ہے - مقصد یہ ہے کہ پرکار دے کر تلوار لے لی جائے اور بندے کو سرکار کا اہل کار وفادار بنا دیا جائے - یہ نسخۂ تعلیم خاص آرڈر پر اقوام مشرق کے لیے بڑی محنت سے تیار کروایا گیا ہے -

کسی بھی دور کی تعلیم و تدریس فی نفسہ بری چیز نہیں ہوتی - جدید دور میں جدید باتیں ہونگی - سوال یہ ہے کہ تعلیم کی چھری سے کسی کا گلہ کاٹنا ہے یا اس سے تعمیر کا کام لینا ہے- مشرقی اقوام نے جب عروج غرب (PAX) BRITANICA) کے سامنے ہتھیار ڈالے تو اپنے نظاموں کی بساط کو فرسودگی کی سند عطا کرکے لپیٹ دیا - پھر قسمت کے ریکارڈ پر وقت کی سوئی رک کر شکست خوردگی کی رٹ لگانے لگی - غلط تشخیص کے بعد غلط علاج ہونے لگا - دوا نے کام چھوڑ دیا - دعاؤں کے پرکٹ گئے -

ہمارے ہاں تعلیم جدید نے ایک تاثر یہ قائم کیا کہ علم کی ابتدا اور انتہا انگریزی زبان ہے - سرسید احمد خان نے اس تصور تعلیم کو فروغ دیا - (موصوف اردو رسم الخط میں انگریزی فرمایا کرتے تھے) سارے جہاں کا علم ازبر ہو اور انگریزی نہ آتی ہو تو تعلیم یافتہ کہلانے کا شوق برصغیر میں کوئی نہ پالے - ایک لطیفہ یاد آرہا ہے- "ایک سردار جی کو برطانیہ عظمی کی ترقی کا راز دریافت کرنے لندن بھیجا گیا - موصوف کئی ہفتے لندن میں قیام کے بعد واپس لوٹے اور رپورٹ پیش کی - فرمایا اوجی وہاں تو چھوٹے بڑے مرد عورتیں سب ہی انگریزی بولتے ہئیں ، پھر ترقی کیسے نہیں کریں گے -" یہ ذہنی مرعوبیت و شکست کی علامت ہے - ہم نے یہاں اپنی مستقل حکمرانی کا اختیار اچھی انگریزی بولنے اور لکھنے والوں کو سونپ رکھا ہے- پاکستان کا اصل حکمران طبقہ اس کلاس سے تعلق رکھتا ہے جس کا اوڑھنا ، بچھونا انگریزی ماتا ہے - جس کے مبلغ علم وفکر سے اگر انگریزی صاحبہ کو منہا کردیا جائے تو باقی جو بچے گا وہ دوربین سے ہی شاید نظر آئے - ان کا سارا ستر اس غیر ملکی لنگوٹ نے چھپا رکھا ہے - ایک لطیفہ اور یاد آرہا ہے - "ایک رئیس زادے لنگوٹ کسے اپنے پائیں باغ میں غسل آفتابی فرمارہے تھے - ایک عالم کا ادھر سے گزر ہوا- ثروت زادے نے پوچھا کہ بتاؤ میری کل قیمت کیا ہوگی- عالم نے بتایا کہ 5 دینار- زردار نے کہا کہ یہ تو میری لنگوٹ کی قیمت ہے - عالم نے کہا میں نے بھی اس کی قیمت بتائی ہے - لنگوٹ کے بعد تم میں بچتا ہی کیا ہے -"

ہمارے خدا داد ملک میں ایک طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ جسے انگریزی نہیں آتی اسے کچھ نہیں آتا - اس کے فٹے منہ وہ جاہل گنوار - گاؤدی

ان کلچرڈ ہے ۔ انہی کا یہ کہنا ہے کہ یہاں سے انگریزی نکلی (تو ان کی جان نکلی) تو دنیا سے ہمارا رابطہ کٹ جائے گا ۔ بودی دلیل ملاحظہ فرمائیے ۔ گویا فرانس ، اٹلی ، جرمنی ، جاپان ، روس ، چین ، مشرقی یورپ کا رابطہ دنیا سے کٹا ہوا ہے ۔ روس اور ایران کے انقلابات اس بات کے مظہر ہیں کہ یہ سفید جھوٹ ہے ۔ اس سے بڑا جھوٹ یہ ہے کہ انگریزی کے بغیر سائنسی و صنعتی ترقی ممکن نہیں ۔ اس کا جواب تو روس چین ، جاپان والے دیں ۔ ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی ۔

یہ اقتصادی و سیاسی غلامی کے ہتھکنڈے ہیں ۔ زبان ان کی ، پالیسیاں ان کی ، خام مال ہمارا ملیں ان کی ۔ جھگڑے ان کے ، جنگیں ہماری ، خاک ان کی ، خون ہمارا ۔ جب زرعی ترقی کی ضرورت تھی ہمیں صنعتی ترقی کا مشورہ دیا گیا ۔ جب تکنیکی ترقی کی ضرورت محسوس ہوئی تو زرعی ترقی کی طرف راغب کیا جاتا ہے ۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے ۔

تعلیم کا سلسلہ ہمارے ہاں کچھ ہمیشہ سے ہی ٹیڑھا رہا ہے ۔ 14 فیصد خواندگی سے 1947 میں ملک کا آغاز ہوا ۔ اب 35 سال بعد 1982 میں یہ تناسب کہتے ہیں کہ 24 فیصد ہوگیا ہے ۔ گویا 35 سال میں صرف 10 فیصد ترقی ۔ اس سے بڑا ثبوت اس شعبے کی ناکامی کا اور کیا ہوسکتا ہے ۔ ہمارے شعبہ تعلیم نے کیا کچھ پیدا کیا ہے ۔ زیادہ پتہ نہیں مگر اتنا پتہ ہے کہ سارا شعبۂ تعلیم مل کر بھی ملکی تعلیم کی نظامت کو چلانے کے لیے اپنے اندر سے سیکرٹری تعلیم نہیں پیدا کرسکتا ۔ نتیجہ ظاہر ہے صومالیہ میں 10 سال قبل خواندگی کا تناسب 2 فیصد تھا جو اب بڑھ کر 60 فیصد ہوگیا ہے ۔ تنزانیہ میں اتنے ہی سال قبل یہ تناسب 10 فیصد تھا جو اب بڑھ کر 70 فیصد ہوگیا ہے ۔ ہم اپنے ملک کی تعلیمی ترقی کا مقابلہ اورکسی ملک سے کریں ۔ ہم نے اپنی ترجیحات کے تعین میں شاید شعبہ تعلیم کو سب سے اخر رکھا ہوا ہے ۔ یاد رہے سب سے آخر میں ۔ دنیا کے تمام ممالک میں پاکستان تعلیم پر اپنے جی این پی کا سب سے کم حصہ خرچ کرنے والا ملک ہے ۔ ہم اپنے ابلاغ عامہ کے دہانوں سے تعلیم پر سالانہ اربوں کھربوں روپے صرف کرنے کی تشہیری شماریات سنتے ہیں ۔ مگر یہ حقیقت اب کسی سے پوشیدہ نہیں کہ ہم اپنے جی این پی کا صرف ($1\frac{1}{2}$ فیصد) ، جی ہاں صرف ($1\frac{1}{2}$ فیصد) خرچ کررہے ہیں ۔ حالانکہ یونیسکو نے غریب ترین ممالک کے لیے بھی کم از کم 4 فیصد خرچ کرنے کو لازمی قرار دیا ہے ۔ جب ہماری اِن پُٹ (IN.PUT) یہ ہے تو پھر آؤٹ پٹ (OUTPUT) کیا ہوگی ۔ ایک شخص نے ایک پاؤ دہی خریدا اس میں مکھی نکل آئی ۔ وہ دوکاندار کے پاس شکایت لے کر گیا ۔ دکاندار نے کہا ، باؤجی دہی میں سے مکھی ہی نکلے گی ، ہاتھی نہیں نکلے گا ۔

آندھیاں ہوکر طوفان ہی کاٹے جاتے ہیں - بنیادی طور پر ہم تقریر باز لوگ ہیں - عمل کو ہم نے بے عملی کے پاس گروی رکھ دیا ہے - تعلیم پر اٹھنے والے اخراجات کو غیر پیداواری اخراجات سمجھا جاتا ہے - جس ہماں انسانی و افرادی قوت کے فروغ پر صرف ہونے والا سرمایہ غیرپیداواری مد سے آتا ہے - سڑکوں پر اخراجات پیداواری اور لڑکوں پر اخراجات غیر پیداواری - ڈاکٹر محبوب الحق جیسے ماہر اقتصادیات اپنے 5 نکاتی پروگرام میں شعبہ تعلیم سے تغافل پر اظہار تاسف کرچکے ہیں - تعلیم کے 50 فیصد مسائل کا حل صرف اس ایک نکتے کی تفسیر میں پنہاں ہے -

ہمارے ہاں تعلیمی پالیسی سازی عمومیت کار (GENERALISTS) غیر ماہرین تعلیم کے ہاتھوں متشکل ہونا قرار پائی ہے - تعلیم کار ایسی کمیٹیوں میں کہیں گھس بھی بیٹھے تو اس سے خوش آمدید کہلوانے توثیق کروانے ، رپورٹ کی نقل بنوانے کے اہم کام لیے جاتے ہیں - فیلڈ میں کام کرنے والے استاد سے تو کبھی پوچھا ہی نہیں جاتا کہ بتا تیری رضا کیا ہے -

یہی وجہ ہے کہ لاس اینجلز میں ہونے والے تجربات کو چیچو کی ملیاں اور پیرس میں ہونے والے واقعات کو پیر ودھائی میں نافذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے - چار سال قبل ایک کالج سرحد میں ایسی جگہ قائم کیا گیا جہاں کالج قائم کرنے اور ختم کرتے وقت تک محکمہ تعلیم کا نائب قاصد بھی نہیں گیا - کاغذوں پر کالج چلا اور کاغذوں میں بند ہوگیا - بیل گاڑی کے ماحول پر سپر سانک تکنیک نافذ کرنے کا آخر فائدہ کیا ؟ حقیقت اور تصور ایک دوسرے سے منہ موڑ کر بیٹھ جاتے ہیں - ہمارے ہمہ مقتدر پالیسی ساز تحقیق احوال کے نام پر جوائے رائیڈ کے لیے بھی امریکہ عظمیٰ اور کانٹیننٹ سے کم کسی ہمہ شمہ ملک کو جانا غیر تعلیمی فعل گردانتے ہیں - ہم پلہ ہمسایہ پسماندہ اقوام و ملک کے حقیقی گر اس رُوٹ تجربات کو گھاس ڈالنے کی رسم ہم نے شروع ہی نہیں کی - چنانچہ ہماری تعلیمی پالیسیاں خوشخط لفظوں اور ناقابل عمل عہد و پیمان کے بے دریچہ محلات ہوتی ہیں جن کی قالین پوش غلام گردشوں میں بےعملی کی روحیں گردش کرتی نظر آتی ہیں - یہ پالیسیاں بے ثمر عہد شکنیوں کے بوجھ تلے دب کر بوسیدگی کا جامہ پہن لیتی ہیں اور آسیب زدہ کھنڈرات میں منتقل ہوکر طاق نسیاں کی زینت بن کر گرد سے اٹی بیٹھی کرتی ہیں - یہ پالیسیاں طفلانہ مفروضوں ، غیر حقیقی شماریات اور غیر معروض حالات کی بیساکھیوں پر انتشار کی پھول بھلیوں میں حوادث سے سر ٹکراتی ، آخر عمل کی دہلیز پر آکر دم توڑ دیتی ہیں - قوم و ملک کو

ایک اور چرکا اور غربت کی گدڑی میں ایک اور پیوند لگتا ہے ۔ کسی اور مسیحا اور ایک نئی پالیسی کا انتظار بڑھ جاتا ہے۔ جب غلطیاں کرچکنے کے بعد (ٹرائل اور ایررز میں سے گزر کر) زخم بھرنے لگتے ہیں، تجمل کا نقشہ ابھرنے لگتا ہے تو ایک اور بلڈوزر آکر سب کچھ ہموار کر جاتا ہے ۔ چنانچہ دو عملی کے صد رنگ نظارے قدم قدم پر دیکھنے کو ملتے ہیں ۔

اب تک نہ ذریعہ تعلیم کا مسئلہ طے ہوسکا ہے نہ طریقہ امتحان پر اتفاق رائے ہوسکا ۔ غریبوں کی تعلیم، امیروں کی تعلیم، پرائیوٹ لوگوں کے لیے پبلک اسکول، پبلک کے لیے خیراتی اسکول، ٹاٹ والے اسکول، ٹھاٹھ والے اسکول ۔ مسجد اسکول محلہ اسکول یہ اسکول وہ اسکول ۔ تعلیم مشرق و مغرب کے خانوں میں بٹ گئی ۔ مشرق والے اپنے مورچوں میں ڈٹ بیٹھے اور مغربی تعلیم و افکار کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتے ۔ مغربی تعلیم والوں نے مشرقی تعلیم و نظریات کو ہیچ جانا ۔ دریا کے دو کناروں کی طرح یہ ایک دوسرے سے ملنے یا مدغم ہونے سے گریزاں نظر آتے ہیں کبھی یہ دھارے ایک دوسرے سے ملنے لگیں تو علامہ اقبال اور علامہ مشرقی جیسی شخصیتیں سامنے آنے لگیں ۔ قدیم و جدید اور مشرق و مغرب کی یہ سرد جنگ مسلم برصغیر میں افراد کی شخصی اور روحانی تکمیل کی راہ کا روڑہ بنی ہوئی ہے ۔ قلب و ذہن کے کتنے دریچے بند کے بند رہ جاتے ہیں اور (SELF-ACTUALIZATION) نہیں ہوپاتی ۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

جدید سائنسی تعلیم اور سچے اسلامی تصورات میں کوئی تصادم نہیں ہے ۔ اسلام نے واضح طور پر تسخیر کائنات کا حکم دیا ہے تاکہ خلافت الٰہیہ کا قیام عمل میں لایا جا سکے ۔ مگر مشرقی علم کی ایک انتہا سے نیچرل سائنسز سے برگشتگی کا اعلان ہوتا ہے حالانکہ دین و دنیا میں دوئی نہیں ہے ۔ قرآن خالق کا قول ہے تو کائنات اسکا فعل ہے۔ خالق کے قول و فعل میں تضاد و تفاوت کیوں کر ہوگا ۔ سائنس اور اسلام میں کوئی مغائرت نہیں، یہ تو ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں ۔ چنانچہ ایسے وسیع الطرف اقدامات کی ضرورت ہے کہ فکر و خیال کے روحانی و مکانی دھارے آپس میں مل جائیں ۔ پھر نیوٹرون بم بھی بنے گا ۔ مگر یہ اولاد آدم کے خلاف نہیں ۔ جہالت، غربت، بیماری، اور استحصالی نظاموں کے خلاف استعمال ہوگا ۔ انسان کے ہاتھوں انسان کی تذلیل اور تباہی کا سامان تلف ہوگا ۔ اس وقت مہلک جنگی سامان کی تیاری پر دنیا بھر میں 100 ارب ڈالر فی گھنٹہ صرف ہورہا ہے۔ جب کہ تعلیم و صحت پر خرچہ

ایک ملین ڈالر فی گھنٹہ سے بھی کم ہے - چاند پر زینہ لگ گیا ہے ، مگر کینسر کا مرض جوں کا توں ہے -

اپنے ملک کے تعلیمی مسائل کا حال کیا بیان کریں - عیاں را چہ بیاں - تعلم، متعلم، معلم سب کی حالت سب کے سامنے ہے - سب سرگراں و سرگرداں - غلط نظام کی تباہ کاریوں کے سب ستائے ہوئے ہیں - سرکاری پالیسیاں معروضی حقیقتوں سے دور سرد خانوں میں گرم جوشی سے تیار ہوتی ہیں - عمومیت کار تخصیص کاروں کی کرسیاں سنبھالے بیٹھے ہیں - لفظوں کی سریش (ارلڈائیٹ) سے جوڑے ہوئے منصوبے حقیقت کی گرم زمین پر قدم رکھتے ہیں تو آبلہ پائی ان کا استقبال کرتی ہے - سب کاغذ کے کھیل ہیں - اسٹیشنری کے ستونوں پر نظاموں کے اسلام آباد کھڑے غریب قوم کی سادہ لوحی پر خندہ زن ہیں - جس نظام میں کاغذ کے پرزے کی قیمت انسان سے زیادہ ہو ، وہاں لوگ کاغذ کے پرزوں کو منتہائے نظر نہ مانیں تو اور کریں بھی کیا - دیوانوں کی نہ بات کرے تو اور کرے دیوانہ کیا - کاغذ کی سند کے بغیر سونے کی مسند ملنے کا امکان تہ تیغ ہوجائے تو سارا عالم اس محور کے گرد کیونکر نہ گھومے گا - سند پہلے تعلیم بعد میں سہی - جلدی بھی کیا ہے - پڑھنے لکھنے کے لیے تو عمر پڑی ہے - لاکھوں کے ساون کو کیوں خراب کیا جائے - سند مل بھی جائے تو جب تک سفارش اور رشوت کے کنکشن نہ لگائے جائیں تو بات بننے سے انکار کردیتی ہے - مگر یہ سوئچ لگتے ہی چودہ کے علاوہ ایک آدھ اور طبق بھی روشن ہوجاتا ہے -

لوگ کہتے ہیں کہ طلبہ مجرم ہیں ، قصوروار ہیں ہیں ، مگر اس قدر نہیں ، جس قدر پراپگنڈا اپنی ناکامیوں کو چھپانے کی خاطر کیا جاتا ہے - حالات کے تند و تیز دریا میں خس و خاشاک کر بھی کیا سکتے ہیں - وقت کی باگیں اور طنابیں کسی اور کے ہاتھ میں ہیں - طلبہ روز و شب منافقتوں کا کھیل دیکھتے ہیں - فکر و عمل میں دوریاں ملاحظہ کرتے ہیں - راتوں رات امیر بننے کے عجوبے دن دہاڑے دیکھتے ہیں - سب سے زیادہ نصیحت کرنے والے سب سے زیادہ میاں فضیحت نظر آتے ہیں - قول و فعل کے مطلّقہ جوڑے روٹھے نظر آتے ہیں - طلبہ اس کھیل سے نالاں ہیں - ان نوجوانوں میں باغیانہ جذبات جوان ہونے لگتے ہیں - جب وہ اندر سے ٹوٹتے ہیں تو پھر باہر کی چیزیں ٹوٹنا شروع ہوجاتی ہیں - پھر بسیں بھی ٹوٹتی ہیں - شیشے بھی ٹوٹتے ہیں - طلبہ جمود و سکوت (STATUS QUO) کی قوتوں کو چیلنج کرنے والی بیسویں صدی کی ایک بڑی قوت ہیں ورنہ جمود کے آمرانہ اداروں کے سامنے مولہ صفت اکثریت تو آنکھ اٹھاکر دیکھنے کی جرأت نہیں رکھتی - یہ تو مکھی بھی نہیں اڑا

سکتی ، جنریشن گیپ یا کمیونی کیشن گیپ کا سلسلہ بھی موجود ہے ۔ طلبہ پرانی نسل کے تیس سال پہلے کے تجربات کو شیئر کرنے کے لیے تیار نہیں ۔ نہ اپنے تجربوں پر ان کی حاکمیت برداشت کرنے کو تیار ہیں چنانچہ کشمکش تو ہوگی ۔ سارا عالم شکست و ریخت کے عمل سے گزر رہا ہے ۔ ایک دنیا ختم ہورہی ہے ۔ دوسری دنیا بن کے نہیں دے رہی ہے ۔ تیسری دنیا معلق ہے ۔ ٹرانزیشن کا پَل اور پُل کچھ زیادہ ہی لمبا ہوگیا ہے ۔ گزشتہ 50 سال میں دنیا کی آبادی میں تین گنا دھماکہ خیز اضافہ ہوا ہے ۔ سائنس کے مادی عجوبات نے فکر و عمل میں تحیر افزا تلاطم کی بجلیاں بھردی ہیں ۔

سفر ، حرکت ، بے صبری اور پُش بٹن لاقراریت کا دور دورہ ہے ۔ رفتار سرعت اور تعجیل کا زمانہ ہے ۔ پرانی قدریں ماضی کے بے کواڑ ایوانوں میں مقفل ہوگئی ہیں ۔ نئی قدریں وقت کے بطن میں ابھی پرورش پا رہی ہیں ۔ تمدنی سطح پہ بہت بڑا انقلاب رونما ہوچکا ہے ۔ دنیا سمٹ کر ایک گھرانا بنتی جا رہی ہے ۔ ورلڈ کلچر (WELTAN - SCHAUUING) اور ورلڈ گورنمنٹ کی باتیں ہورہی ہیں ۔ ذرائع ابلاغ کی رسائی و حرکت نے طبیعاتی دوریاں مٹا دی ہیں ۔ انسانی اعضا و قوا نے انگڑائی لے کر وسعت و قوت کو سینے سے لگا لیا ہے ۔ ریڈیو ٹیلے فون انسانی قوت سماعت اور سینما ٹیلے ویژن قوت بصارت بن گئے ہیں ۔ ریل ، موٹر ، ٹانگیں اور جہاز راکٹ پَر بن گئے ہیں ۔ کمپیوٹر انسانی ذہن کا ہمزاد بن رہا ہے ۔ انسان مشین کا خالق بھی اور اس کا محتاج بھی بن گیا ہے ۔ اب مشین کہنی مار کر اسے اپنی اضافت (EXTENSION OF APPARATUS) سمجھ رہی ہے ۔ تعلیم کا کینوس وسیع ہوگیا ہے ۔

چنانچہ تعلیم گھر کے اندر بھی ہورہی ہے ، اسکول کے اندر بھی جاری ہے ۔ کوچہ و بازار میں بھی تعلیم کا بازار سجا ہے ۔ ذرائع ابلاغ کے دھانے بھی دن رات تعلم اگل رہے ہیں ۔ رسمی خواندگی کا عمل جزوقتی اور محدود ہے ۔ کلی تعلیم کا عمل غیر رسمی ، کل وقتی ، ہمہ گیر ، ہمہ جہت غیر مختتم پروسس ہے ۔ غیر رسمی تعلیم فضا میں ، ہوا میں گھل کر آنکھوں کانوں کے روشندانوں سے شعور میں اتر کر کیمیائی عمل سے راستے بنا رہی ہے ۔ اس اثر اندازی سے فرار ممکن نہیں ۔ یہ تو آوے ہی آوے ۔ یونیورسل ایجوکیشن کا انتظام بلا واسطہ طور پر ہورہا ہے ۔ یونیورسل خواندگی کا بندوبست حکومتی ادارے کرتے رہیں گے ۔ اگر سب تعلیمی ادارے بند بھی ہوجائیں تو بھی تعلیم کا ایک سلسلہ جاری رہے گا ۔ تعلیم کا پھیلاؤ اور گہرائی از خود ہو رہی ہے ۔ گہرائی اور تخصیص کا بندوبست

تعلیم کے مہتمم کریں ۔ مقدار بڑھتی ہے تو عارضی طور پر معیار گھٹتا ہے۔ اس سے دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیے ۔ ایک چیز ہوتی ہے ۔ AMBIVALENCE یا کل پرستی یا گلشن پرستی اقوام مشرق میں بہت کم ہے ۔ ہمارے رویوں میں LEAVE IT / TAKE IT (ادھر یا ادھر) کے انداز میں خاروں کے ساتھ گلوں کو اپنانے کی ریت نہیں ۔ ہم صرف گل پرست ہیں ۔ گلشن پرست نہیں ۔ ہمارے لیے ہمارے علاوہ دوسرا انسان فرشتہ ہوتا ہے یا شیطان ۔ مٹھاس کے ساتھ کچھ تلخیاں بھی لپٹی ہوتی ہیں ۔ ہم صرف مٹھاس مانگتے ہیں ۔ تعلیم و تدریس کے معاملے میں اس رویے نے بڑے بڑے گل کھلائے ہیں ۔ تعلیم مشرق و مغرب اچھے برے کے خانوں میں بٹ گئی ۔ مدح و ذم میں سُپر لیٹِو سے کم ہم بات کرنے کو تیار نہیں ۔ جو دل میں ہے وہ کہتے نہیں ۔ جو کہتے ہیں، وہ کرتے نہیں ، جو کرتے ہیں وہ کہتے نہیں ۔ زبان ، خلق ، نقارہ خدا پبلک اوپینیز (PUBLIC OPINION) اور خوف خدا پر اپنے کانوں کے دروازے ہم نے بند کردیے ہیں ۔ اصلاح ہو تو کیسے ؟

خالقِ کائنات نے یہ دھرتی ترتیب و توازن اور عدل و انصاف کے مطابق تخلیق کی ہے ۔ ہم سب انسانوں کو سماجی و معاشی انصاف مہیا کرکے اوپر سے اصلاح کا عمل شروع کریں تو بات اب بھی بن سکتی ہے ۔ بے ایمانی کا علاج دریافت کرلیا جائے تو محنت و ذہانت میں ہم کسی سے کم نہیں ۔ یہ بات نہ ہوتی تو ہمارے بھائی بند دوبئی جاکر محنتی اور امریکہ جاکر ذہین کیسے بن جاتے ۔ فرق صاف ظاہر ہے ۔ سوچ پر سے پہرے کا، جبر اور محنت پر سے بے قدری کا قہر اٹھ جائے تو بات سنور سکتی ہے ۔ جہدِ مسلسل ، دیانت و صداقت ، خلوص و ایمانداری کا نام اسلام ہے ۔

معاملات کی مسلمانی سب سے بڑی مسلمانی ہے ۔ ورنہ خالی خولی حادثاتی نام نہاد مسلمانی سچے اور پاک دین اسلام کے لیے کوئی اعزاز کی بات نہیں دعویٰ دلیل نہیں ہوتا ۔ شور شعور نہیں ہوتا ۔ نعرہ فن پارہ نہیں ہوسکتا ۔ گھاٹا عمل کا ہے۔ عمل کو بے دخل کرکے ہم تقریروں سے اصلاح احوال نہیں کرسکتے ۔ جس ملک میں ذہانت ، محنت، دیانت کے چیک کیش ہونا بند ہوجائیں وہ ملک خوشیوں کی راہ دیکھنا بند کردے گا ۔ ترقی آرام سے نہیں کام سے میسر آتی ہے ۔

آئیڈیالوجی جب کتابوں کے باہر تھی ، عمل جاری تھا ۔ پاکستان بن گیا ۔ پاکستان بن گیا ۔ آئیڈیالوجی کتابوں اور تقریروں میں اسیر ہوئی۔ پاکستان ٹوٹ گیا ۔ نظریے کا عقد عمل سے نہ ہو تو ارتقا بانجھ ہوجاتا

ہے ۔ عمل سے قوت پیدا ہوتی ہے اور قوت سے کائنات مسخر ہوتی ہے ۔

معیار تعلیم کے گرنے کی بات بھی عام ہے ۔ بے شک معیار گرچکا ہے ۔ اس کی وجوہ دہرانے کی ضرورت نہیں ۔ سب جانتے ہیں ۔ قدروں کے کھنڈر اور اعتبار کے انتشار میں معیار کو دھچکا لگنا ضروری ہے ۔ لوگ علاج بھی تجویز کرتے ہیں ۔ مگر تشخیص کی غلطی کی وجہ سے دوا نے کام چھوڑ دیا ۔ مرض بڑھتا گیا ۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ پورے معاشرتی ڈھانچے کو بدلا جائے ۔ اس کے بغیر تعلیم کے شعبے میں دور رس تبدیلیاں لانا ممکن نہیں ۔ یہ کام اپنے وقت پر ہوگا ۔ وقت کب آئے گا ۔ اس کے بارے میں جین ڈکسن ہی شاید کچھ بتا سکے ۔ ہم تو کچھ نہیں جانتے ۔ برائے شعر گفتن خوب است کے مصداق ہر نیم حکیم کے لیے ایک عدد PRESCRIPTION (نسخہ) لکھنا بھی ضروری ہے ۔ خطرہ جان نہ ہو تو ہم کچھ عرض کریں :

1۔ پاکستان میں یونیسکو کی سفارش کے مطابق جی این پی کا کم از کم 4 فیصد تعلیم پر خرچ کیا جائے ۔

2۔ تعلیمی پالیسی کی تشکیل و نفاذ کی کلی ذمہ داری ماہرین تعلیم کے سپرد کی جائے ۔ افسر شاہی کا عمل دخل یک قلم ختم کردیا جائے ۔

3۔ ذریعہ تعلیم کی دو رنگی کو ختم کیا جائے ۔ اگر انگریزی کو قائم رکھنا ہے تو پرائمری سے غریب امیر طلبہ کے لیے اسے لازمی قرار دیا جائے ۔

4۔ تعلیمی دو رنگی کو ختم کیا جائے ۔ ایک ہی طرح کا نصاب ، ماحول اور استاد سب اداروں کو مہیا کیا جائے ۔

5۔ اگر ذریعۂ تعلیم قومی زبان کو بنانا ہے تو انگریزی کا لزوم ختم کیا جائے ۔

6۔ سائنسی اصطلاحات کو جوں کا توں رکھ کر ہر سطح پر قومی زبان میں تدریس کا بندوبست ہو ۔

7۔ پرائمری کی سطح تک بچوں اور بچیوں کی تعلیم مخلوط کرکے خواتین اساتذہ کو اس پورے آپریشن کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے ۔

8۔ طلبہ پر زبانوں کا بوجھ کم کیا جائے ۔ زبانوں کی جگہ فلسفہ ، سوشیالوجی ، جغرافیہ ، آرکیالوجی اور دوسرے مضامین پڑھائے جائیں ۔

9۔ بے مقصد اعلا تعلیم کو محدود کرکے صرف اہل افراد کو اعلا تعلیم کے مواقع فراہم کئے جائیں ۔

10- ابتدائی فنکشنل خواندگی کے بعد پیشہ ورانہ تعلیم کو عام کیا جائے۔

11- سمعی اور بصری آلات کی سہولیات کو تعلیم کے عمل میں زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جائے۔

12- دیہی علاقوں کی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے دیہی تعلیم کا الگ انتظامی یونٹ قائم کیا جائے۔ زیادہ ترغیبات دے کر اساتذہ کو وہاں متعین کیا جائے۔

13- اساتذہ کی بھرتی کا اعلا اور سخت ترین معیار قائم کیا جائے۔ تاکہ اعلا تعلیم کے ساتھ اعلا اخلاق و کردار کے حامل افراد اس پیشے میں آسکیں۔ پرائمری استاد کی ملازمت کو زیادہ سے زیادہ پرکشش بنایا جائے۔

14- تمام تعلیمی اداروں کو اساتذہ کے لیے رہائشی (RESIDENTIAL) بنایا جائے۔

15- استاد کو محض سرکاری ملازم نہ سمجھا جائے۔ اگر اسے معاشرے کا باپ کہنا ہے تو صحیح معنوں میں باپ کا سلوک کیا جائے۔ اگر ایسا ممکن نہیں تو ملک بھر میں اس کو معمار قوم کہنے پر قانونی پابندی عائد کی جائے۔

معیار کی گراوٹ کے باب میں یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ کیڈٹ کالجوں اور دوسرے امیرکبیر تعلیمی اداروں میں تعلیمی نتائج کیوں خراب نہیں ہوتے۔ کیا وہاں پڑھنے اور پڑھانے والے فوق البشر ہوتے ہیں۔ یقیناً نہیں۔ البتہ ان اداروں کے حدود اربعہ میں ماحول کا جغرافیہ مختلف ہوتا ہے۔ صرف اس ایک ماڈل کو سامنے رکھیں تو معیار تعلیم کے نشیب و فراز کے اسباب و علل آنکھوں کے سامنے پھر جائیں گے۔ باتیں بنانے کے لیے سو باتیں بن جائیں گی۔ اعداد و شمار کے جدول ہزاروں بن جائیں گے۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے اپنے ملک کی تعلیم کا ایک نقشہ کھینچا ہے۔ وہ آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ اقتصادی لحاظ سے تو شاید تیسری یا چوتھی دنیا میں ہوں۔ مگر تعلیمی لحاظ سے ہماری دنیا کا کوئی نمبر ہی نہیں۔

عمر کے بچے جو اسکول جاتے ہیں	امیر ممالک	تیسری دنیا کے ممالک	پاکستان
7 سے 11 سال تک	98 فیصد	68 فیصد	23 فیصد
17 سے 18 سال تک	64 فیصد	39 فیصد	9 فیصد
18 سے 22 سال تک	46 فیصد	13 فیصد	3 فیصد

تعلیم کے سارے بکھیڑے میں معلم کو کہاں فِٹ کرنا ہے - کم از کم اپنے پیارے دیس میں یہ طے نہیں ہوسکا - کاغذوں کی کان اور کنکریٹ کی دکان تو سج گئی پر گوشت پوست کے انسان کا درمان دریافت نہ ہوا - صدیوں سے بجتے ہوئے ریکارڈ کی پھنسی ہوئی سوئی " معمار قوم ، معمار قوم " کی رٹ تو لگا رہی ہے ، اخلاقیات و روحانیت کا پرچم بھی سب کے ہاتھ سے لے کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا گیا ہے - چڑھ جا بیٹا سولی پر رام بھلی کرے گا پر صلیب کا نردبان تو ہونا چاہیے تھا - بادبان چھین کر منجدھار کے حوالے کرنا کس دیس کی ریت ہے - اسے کہا گیا کہ معمار قوم کے القاب و آداب کے نوالے بناکر خود بھی کھائے اور بچوں کے آگے بھی ڈالے - خطابات کے چھتر سے سَتر بھی ڈھانپے اور اس سے سر پرتنبو بھی تانے - بےرحم مادّی جبر کے سامنے مابعد الطبیعاتی صبر کا مطالبہ صرف اسی سے کیا جارہا ہے - کیا اب بھی کوئی اس حقیقت سے بے خبر ہوگا کہ ہمارے ملک میں مادّی ، مالی اور سماجی لحاظ سے معلم سب سے کم تر مخلوق سمجھا جاتا ہے - گھریلو نوکر سے بدتر - نوکر تو وہ تھا ہی جب سے اسے سرکاری نوکر بنایا گیا تب سے اچھے دن اس کی قسمت کے کیلنڈر سے نکل گئے ہیں - القاب و آداب کی رہی بات الگ - ان کی میگاٹن مقدار سے بھی حقیقت شمہ برابر نہیں بدل سکتی - افغانستان میں وزیر ریلوے مقرر ہونے سے وہاں ریلوے لائن تو نہیں بچھ سکتی - استاد کو موجودہ حالات میں معمار قوم کہنا ایسا ہی ہے جیسے اسے کسی بے سمندر ملک کے بحری بیڑے کا ایڈمرل قرار دیا جائے - جسے قابلِ رشک ہونا چاہیے تھا ، وہ قابلِ رحم ہوگیا - قدر اس کی کہیں کہیں ہوتی ہے - مگر وجوہات دوسری ہوتی ہیں - ترس کھاکر -

ایک واقعہ یاد آرہا ہے - ایک بہت بڑی دکان ہے - راقم سطور بھی کسی سلسلے میں وہاں موجود ہے - مالک اونچی مسند پر تشریف رکھتا ہے - اتنے میں ایک استاد نما چیز دکان میں داخل ہوتی ہے - مالک لپک کر اٹھتا ہے - جھکتا اور بچھتا جاتا ہے - شخص کے لیے ٹھنڈے گرم مشروبات کا دربار سج جاتا ہے - مالک کہتا ہے کہ اس شخص نے مجھ پر وہ احسان کیا ہے جسے میری سات پشتیں کبھی فراموش نہیں کرسکیں گی - آج میں اس وسیع و عریض کاروبار کا مالک اس شخص کی وجہ سے ہوں وہ شخص چلا جاتا ہے - میری آنکھیں استاد کے احترام و محبت کے اس منظر کو دیکھ کر نمناک ہوجاتی ہیں - اس دکاندار دوست سے دریافت کرتا ہوں اے شخص تو کس سیارے کی مخلوق ہے - کیا تو سب استادوں کا یوں ہی احترام کرتا ہے - وہ بولا - نہیں ، کیا بولا - اس نے کہا کہ یہ شخص واقعی میرا محسن ہے - اگر یہ شخص مجھے مار مار کر آٹھویں ہی

جماعت میں اسکول سے نہ نکالتا ، تو آج میرا بھی وہی حشر ہوتا جو اس کا اپنا ہو رہا ہے ۔"

میری آنکھیں دوسری مرتبہ نمناک ہوئیں ، پر اب کے نمی دوسری طرح کی تھی ۔

پاکستان میں اساتذہ کی تعداد ایک اندازے کے مطابق 5 لاکھ کے قریب ہے ۔ ان میں سے ساڑھے چار لاکھ کی ماہانہ تنخواہ پانچ سو روپے اور چھ سو روپے کے درمیان ہے ۔ کسی آئین سٹائن کو حساب لگانے کے لیے بلوائیں تاکہ وہ بتائے کہ اس حقیر معاوضے میں کیسے زندہ رہا جائے ۔ اس کے بال بچے کہاں جائیں ۔ ہاں ، یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس مورکھ نے شادی کیوں کی ۔ اس کمبخت کے بال بچے کیوں پیدا ہوئے ۔ اسے تو اکلا ہونا چاہیے ۔ نہ سر نہ پیر ۔ نہ ماں نہ باپ نہ بہن نہ بھائی ۔ پھر اخلاقیات کا پرچم اٹھائے ، سندوں کے کنٹھے گلے میں ڈالے ، خیرات کا کشکول ہاتھ میں لیے گلی گلی پھرتا رہے ۔ دن کو تین ٹانگوں کی کرسی پر بیٹھ کر تعلیم کا ستیاناس کرے اور رات کو ریلوے کے تھرڈ کلاس کے ویٹنگ روم میں جاکر سو رہے ۔ پھر سب کچھ اس کے لیے بہت ہے ۔ پر اس سے پہلے اس کے لیے عقلمندوں کی ایک جنت اس زمین سے اوپر اور آسمان سے ذرا نیچے بسائی جائے ۔ جہاں معاشرے و سماج سے دور یہ روحانیت کی مالا جپتا رہے ۔ بچے چاند گاڑیوں میں وہاں آسانی سے آجائیں گے ۔ ایسا نہیں ہوسکتا تو یہ کیسے ہو رہا ہے کہ پاکستان کی مجموعی قومی آمدنی کا صرف ڈیڑھ فیصد ، 5 لاکھ اساتذہ ، ان کے 20 لاکھ منحصرین ، 80 ہزار اسکولوں ، کالجوں ، ایک کروڑ طالبعلموں ، 10 کروڑ کتابوں پر صرف کرکے حاتم طائی کی قبر پر لات مارنے کا دعوا ہو رہا ہے ۔ کیا پانی میں مدھانی چلانے سے مکھن برآمد ہوتا ہے ۔ ہوتا ہوگا مگر پیشہ ور پالیسی بازوں کے ذہنوں کے مٹکوں میں ۔

نتیجہ کیا ہے ۔ عمارتیں برس رہی ہیں ۔ استاد ترس رہے ہیں ۔ استاد کا بھٹہ اور حوصلہ دونوں تھک ہار کر بیٹھ گئے ہیں ۔ شماریات کے پہاڑ تو پڑھے جاتے ہیں اربوں کھربوں کے ، مگر پہاڑ کے اندر چوہا بھی نہیں ۔ تعلیم پر ایک سال میں کل 7 ارب خرچ کرنے کا دعوا ہے ۔ مگر اس سے دگنی رقم 14 ارب تو صرف تربیلہ بند کی سالانہ مرمت پر خرچ ہوجاتی ہے ۔ اس سے تین گنا رقم ، 21 ارب سالانہ تو اسٹیل مل پر خرچ ہو رہی ہے ۔ اسکا علاج کس کے پاس ہے ؟ استاد کے پاس یا طالب علم کے پاس یا اس کے ماں باپ کے پاس ۔ کوئی تو جواب دے ۔ بقراط سقراط مرگئے ۔ حساب ہمیں نہیں آتا ۔ اس لیے لطیفوں سے کام

نکالتے ھیں - ایک نواب صاحب کو اپنے بالک کے لیے ایک عدد استاد کی ضرورت تھی - ایک استاد صاحب کو انٹرویو کے لیے طلب فرمایا گیا - استاد صاحب پرانی شیروانی کی شکنوں کو ٹھنڈی استری سے درست کرکے وھاں پہنچ گئے - تنخواہ کی بات ھوئی - کہا گیا - 50 رپے - استاد صاحب راضی ھوگئے - راضی ھونا ھی تھا - علم بیچنے آئے تھے فلم نہیں - چلتے چلتے استاد نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ! سائیں جو سائیس گھوڑے کی مالش کررھا ھے ، اس کی تنخواہ کیا ھے - جواب ملا 500 روپے - استاد صاحب نے نوکری کی امان پاکر عرض کی - حضور بندہ نواز اپنے لخت جگر کو 500 والا کام کیوں نہیں سکھلاتے - میں تو اسے 50 روپے کا آدمی بنا سکوں گا -

بات مذاق کی سہی - حقیقت کے برعکس نہیں -

انسپکٹر آف اسکولز والا لطیفہ تو آپ نے سنا ھوگا - بے چارے ایک دورے پہ ایک گاؤں پہنچے - راستے میں ایک ندی پڑتی ھے - ایک دیہاتی نے پوچھا کہ حضور آپ کون ھیں - مرغی کس کی ھے کے وزن پر انسپکٹر پر زور زیادہ پڑ گیا ھے - اسکولز کا ذکر دیہاتی کے کانوں تک نہ پہنچ سکا تھا - دیہاتی نے پولیس انسپکٹر جان کو اپنی پیٹھ سواری کے لیے حاضر کرکے ندی پار کرنا شروع کردیا - بیچ ندی کہیں دیہاتی نے تصدیق کے لیے دریافت کیا حضور آپ کس تھانے سے تشریف لائے ھیں - استاد صاحب نے کہا بھائی میں اسکولوں کا انسپکٹر ھوں ، تھانے والا نہیں - دیہاتی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ - ماسٹر صاحب کو پانی میں پٹک دیا - اور فرمایا ، کمبخت پہلے بتا دیتا ، تو کیا بگڑتا تھا -

قدردانی عالم بالا معلوم شد -

ھمارے ملک میں استاد وھی بنتا ھے جو باقی کچھ بننے سے باوجود سر توڑ کوشش کے قاصر رھتا ھے - پھر تھک ھار کر یتیموں کے مربی محکمے میں آگرتا ھے کہ اس سے نیچے تو کوئی محکمہ اور پیشہ نہیں رھتا - یقین کریں کہ اس شعبے میں مسترد شدہ ، ھارے ھوئے ، شکست خوردہ ناکام افراد کی اکثریت پناہ گیر ھوئی ھے - (MEDIOCRE = می ڈی آکر) تساھل کی جنت بسا بیٹھے ھیں - سُپر اسٹاروں کے جہاز تو خوش بخت محکموں پیشوں کے دبئی کو پرواز کرگئے ھیں - دنیا کی نظر میں سب سے اھم مگر ھماری نظر میں سب سے کم اھم محکمے کو نامراد ھاتھوں میں چھوڑتے اور پھر ان ھاتھوں کو مروڑنے سے پڑتال نہیں ھونگی تو کیا " حق للا لہ " کے ذکر ھوں گے - ترغیبات اور وسائل کے قحط زدہ اس صحرا میں کون قدم رکھنے کو تیار ھے - یہاں قدم رکھنے والے اپنے مستقبل

کو تاریکی کے ہاں گروی رکھ دیتے ہیں ۔ اپنی قسمت کا شیشہ چکنا چور کرکے اس کا خمیازہ قسطوں کی صورت میں ماہوار وصول کرنے کے لیے ان کو تیار رہنا ہوتا ہے۔مدتوں اسی تنخواہ پہ کام کرنا پڑتا ہے ۔ وہ شکر گزار ہوں ، جو ان کی یہ قیمت بھی لگی ۔ ارسطو کی قیمت سکندر کی نوکری کے سوا اور کیا تھی ۔ ہم جس نظام میں سانس لے رہے ہیں وہ تو گھوڑے کو کھلا کر موٹا کرنے کا قائل ہے تاکہ اس کی صحت مند لید سے پرندوں کی بھوک مرسکے ۔

یہاں ایک بکری کھوجائے تو اس کی بازیابی کے لیے چند اور بکریاں ذبح کرنی پڑتی ہیں ۔ یہاں تو بھی پاکستان اور میں بھی پاکستان کے روپے کا راج ہے ۔ اس دیس میں بے ایمانی کے سوا ہر چیز خالص ہے ۔ یہاں کبھی ایٹم بم بھی بنے گا تو وہ بھی پھٹنے والا نہ ہوگا ۔ اس کے بھی اصلی پرزے کسی کباڑی بازار میں فروخت ہوچکے ہوں گے ۔ اگر پاکستان کی یہی حالت ہے تو کرلی ترقی اس نے ۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ خود تو جوہری ہتھیار بناتے ہیں اور ہمیں " گوبر گیس " کے کنوؤں میں الجھایا جارہا ہے ۔ ادھر ہم ہیں کہ ماما جی کی عدالت کی طرح بھٹی بناتے اور ڈھاتے جاتے ہیں ۔ پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ تسلسل کی کڑیاں اور لڑیاں ہم نے توڑ کر تاریخ سے ناطہ کھودیا ہے ۔

الفاظ کے دریچوں سے ان کہی کہانیاں جھانک رہی ہیں ۔ قوم کا ہر فرد انہیں سن رہا ہے ،مگر عافیت نواز لب بستہ ہیں ۔ لمحوں کا قرض پلکوں سے رس رہا تھا ۔ اسے قرطاس کے دامن میں بھر کر دردمندوں کی اس محفل میں آگیا ہوں ۔

ریاست اسلامی کے لیے نظام تعلیم
صراط مستقیم کی تلاش

جناب میجر (ریٹائرڈ) ابن الحسن

اسلام میں علم ایک ایسی بنیادی ضرورت ہے جس کے بغیر فرد کا اس کتاب سے استفادہ ممکن نہیں ہے جو اللہ نے بندے کی ہدایت کے لیے نازل فرمائی اور جو اسلام کے دینی علم اور مسلمان کے ایمان و یقین کا سرچشمہ ہے۔اس نسخۂ کیمیا تک رسائی براہ راست لازم ہے ، اس کے بغیر مسلمان دینی اعتبار سے خود کفیل نہیں ہو سکتا اور وہ اعتماد اور آگہی حاصل ہونا اس کے لیے ممکن نہیں جس کے بغیر خود شناسی اور خدا شناسی کی اولین منزل تک بھی وہ نہیں پہنچ سکتا۔اسی وجہ سے وہ تمام معاشرے جو خود کو اسلامی کہتے ہیں اگر تعلیم سے نابلد ہیں یا جس قدر تعلیم سے نابلد ہیں اسی قدر اسلام سے دور ہیں اور فکری ، تہذیبی اور عملی اعتبار سے کمزور اور نااہل رہیں گے۔ چنانچہ تعلیم ہر مرد و زن پر لازم کی گئی ہے اور اسلامی ممالک کی حکومت اور معاشرے کا فعال اور صاحب اختیار طبقہ اللہ کو جواب دہ ہوگا کہ اس نے اپنے ہم قوموں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے میں کیوں کوتاہی کی ، قرآن سے کیوں دور رکھا اور دین کے علم سے کیوں بے بہرہ رہنے دیا ۔

اسلامی معاشرے میں تعلیم کا جو بھی نظام قائم کیا جائے گا ضروری ہوگا کہ اس کی ابتدائی تنظیم کی بنیادیں مندرجہ ذیل مقاصد کے حصول کے لیے فراہم کی جائیں ۔

۱ ۔ ایمانیات ۲ ۔ اخلاقیات	تہذیب اوصاف
۳ ۔ خود شناسی ۴ ۔ خدا شناسی	تہذیب فکر
۵ ۔ عبادات ۶ ۔ معاملات	تہذیب اطوار

اس ابتدائی تنظیم کا آغاز یوں تو ماں کی گود سے ہی ہوگا جس کے لیے خواتین کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ درکار ہوگی۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ تجربہ نے ثابت کیا ہے کہ صحیح خطوط پر تعلیم یافتہ خواتین مردوں کے مقابلے میں معاشرے کی تہذیب میں زیادہ مثبت اور فعال کردار ادا کرتی ہیں۔ ہونہار طلبہ بالعموم اپنی ماؤں کی تربیت، حسن اخلاق اور سلیقہ شعاری کا پرتو ہوتے ہیں۔ آج کی مصروف زندگی میں مغرب نے کاروبار دنیا میں عورت اور مرد کو مواقع فراہم کرنے کے لیے یہ سہولت پیدا کر دی ہے کہ بہت کم عمری میں ہی بچوں کے لیے نرسری وغیرہ کا طریقہ رائج کر دیا ہے تاکہ اپنی دینوی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے جو وقت درکار ہے اس میں والدین اپنے بچوں کو ان نوسری اور کنڈر گارٹن اسکولوں میں بےفکری سے چھوڑ سکیں۔ یہ سہولت اسلامی معاشرے میں پورے معاشرے کو فراہم کرنا ہوگی، یہ ایک مخصوص طبقے کو حاصل نہیں ہوگی بلکہ لازماً معاشرے کے ہر طبقے کے بچوں کو یکساں بنیادوں پر اور برابری کی سطح پر ان اداروں میں اپنی پہلی تربیت حاصل کرنا ہوگی تاکہ دینی، اخلاقی، تہذیبی اور فکری پرورش اور ترقی کے لیے یہ ادارے بچوں کو ایک نہایت خوشگوار اور صاف ستھرے ماحول میں تیار کر سکیں۔ ان اداروں کا تمام تر انتظام خواتین کے سپرد ہوگا۔ ایسی باصلاحیت، شفیق اور ہنر مند خواتین کے سپرد ہوگا جو بچوں کو دوران تعلیم والدین سے علاحدگی کو محسوس نہ ہونے دیں۔ اور جو بچوں کے ساتھ اسی احساس ذمہ داری اور دیانتداری کا رویہ اختیار کریں جو وہ اپنے بچوں کے ساتھ روا رکھنا چاہیں گی۔ اس طرح بچوں کی ابتدائی تعلیم کلیتاً خواتین کی تحویل میں ہوگی۔ اور یوں قوم کی خواتین کے لیے تربیت، تعلیم اور عمل کے لیے ایک ایسا میدان فراہم ہو جائے گا جس میں اعلا کارکردگی اور کسب معاش کے لیے باعزت اور منفعت بخش مواقع کے علاوہ اعلا مقصد بھی موجود ہوگا۔

ملک کے طول و عرض میں گاؤں گاؤں یہ نوسریاں اور کنڈر گارٹن اسکول موجود ہوں گے۔ ان کی عمارات صاف ستھری اور روشن ہوں گی۔ ان کے اندر فرنیچر معقول اور آرام دہ ہوگا۔ ان میں کھیل اور تعلیم کی ساری ضروری سہولتیں موجود ہوں گی۔ ان میں کام کرنے والی خواتین کو معقول معاوضہ دیا جائے گا تاکہ وہ احساس کمتری کا شکار نہ ہوں اور باوقار حیثیت قائم رکھنا ان کے لیے ممکن ہو سکے۔

اس تربیت سے نکل کر جب بچّہ اسکول کی عمر کو پہنچے گا تو اس کا دینی، ایمانی اور اخلاقی شعور کم از کم اتنا ضرور ہوگا کہ وہ ان علوم اور اس ماحول سے اپنا تعلق خود اعتمادی کے ساتھ قائم کر سکے گا جو مغرب کی غیر اسلامی یا لادینی فضا میں معرض وجود میں آئے ہیں اور جنہیں سائنس

اور ٹکنالوجی کے اس جدید دور میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ــــــ اسکولوں کے نصاب میں اسلامی تعلیمات ـ قرآن فہمی ـ اسلامی تہذیب اور فکری تاریخ اور سیرت نبویؐ کو جدید ترین اور موثر ترین انداز میں پوری توجہ سے داخل کیا جائے گا اور اس کی حیثیت کسی بھی علم کے مقابلے میں ثانوی نہیں ہوگی ـ عملی زندگی میں پابندیٔ صلوٰۃ ، مطالعہ قرآن اور شعائر اسلام کی پابندی جدید طرز معاشرت سے ہم آہنگ کی جائے گی تاکہ وہ روز مرہ کا ایسا حصہ بن جائے جو عام زندگی کا جزولاینفک ہو اور خصائل میں شامل ہو جائے ـ اوصاف حمیدہ قومی زندگی میں داخل ہو جائیں گے ، معیار کارکردگی خوب سے خوب تر ہوگا اور اس کے لیے از خود نوجوانوں میں شوق اور لگن پیدا ہوگی ـ مقصد تعلیم کسب معاش سے بدل کر تہذیب فکروشخصیت کر دیا جائے گا ـ

اسکولوں کے اساتذہ کی حیثیت بامعنٰی ہوگی ـ تعلیم کو ایک باعزت اور خوشگوار شعبہ معاشی اور معاشرتی طور پر بنایا جائے گا ـ مدرسوں اور درسگاہوں کی عمارات ، لائبریریوں، لیبارٹریوں کے وسائل اور کلاسوں اور کھیل کے میدانوں کی تنظیم اور دیکھ بھال توجہ کے ساتھ کی جائے گی اور اس میں کسی تنگدلی اور کنجوسی کا مظاہرہ حکومت کی طرف سے نہیں کیا جائے گا ـ اساتذہ کی دینی ، اخلاقی اور عملی زندگی کے معیار مقرر ہوں گے اور ان کی پابندی میں کسی مروت ، نومی یا مصلحت کی گنجائش نہ ہوگی ـ غیر معیاری حرکت اور ممنوع طرز عمل پر شعبۂ تعلیم سے اخراج فوری اور قطعی طور پر ممکن کر دیا جائے گا ـ معلمین ذی علم اور متقی ہوں گے ـ بےراہ روی اور لاابالی طرز عمل کو تعلیمی اداروں میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا ـ اس کے لیے قوانین ، نظام اوقات اور نصاب تعلیم وغیرہ کو اس طرح مربوط کر دیا جائے گا کہ معیاری استعداد اور کارکردگی ازخود قائم رہے گی اور اس سے انحراف ممکن نہیں رہے گا ـ

کالجوں اور یونیورسیٹوں میں تحقیق اور تصنیف کی طرف خصوصی توجہ دی جائے گی ـ اساتذہ کی تمام صلاحیتیں صرف درس و تدریس تک محدود نہ رہیں گی بلکہ ان کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ تحقیق اور تصنیف میں بھی متواتر مشغول رہیں ـ ایسے مواقع فراہم کیے جائیں گے کہ ان میں تحقیق و تصنیف کی تحریک پیدا ہو ـ یونیورسٹی کے اساتذہ معاشرے میں بہت ارفع مقام حاصل کر سکیں گے ـ ان کے اپنے مخصوص شعبہ علم کے ساتھ ان کی اخلاقی زندگی اور محاسن ان کے لیے ذریعہ توقیر و افتخار ہوں گے ـ

مدرسوں ، درسگاہوں ، یونیورسٹیوں کی عمارات اپنے علاقے کی سب سے شاندار اور پرکشش عمارات ہوں گی اور یہاں کا ماحول پر فضا اور

دلکش ہوگا - اسلام کے تصور نظافت ، طہارت اور خوش سلیقگی کی طرف بالخصوص توجہ دی جائے گی - نصاب تعلیم اس لحاظ سے مرتب کیا جائے گا کہ طلبہ تک علم اپنے مکمل اور معروضی انداز میں پہنچے - طلبہ کے تعلیمی ادوار میں ان کی ایمانی اور فکری تہذیب ایسی ہو سکے گی اور اخلاقی اور شعوری اعتبار سے ان کی شخصیت کو وہ اوصاف حاصل ہو سکیں گے کہ علم پر قدغن لگانے کی ضرورت نہ رہے گی - نقالی اور بھیڑ چال سے طلبہ محفوظ ہو جائیں گے اور زشت و خوب کی از خود پرکھ اور پہچان ان کے لیے مشکل نہ رہے گی -

دینی اور دنیوی علم کے ساتھ طلبہ کو عسکری تربیت بھی دی جائے گی تاکہ وہ اچھے با کردار مسلمان ہونے کے ساتھ کارآمد شہری اور محافظ دین و وطن بھی بن سکیں - ہر نوجوان عسکری تربیت حاصل کر کے پوری قوم کے شانہ بشانہ ملک کی سرحدوں کی حفاظت کا اہل ہوگا - اس طرح مکمل قومی دفاع کے ساتھ ساتھ قوم کی معاشی ، اقتصادی ، تعلیمی اور تہذیبی ترقی کے لیے وسائل بھی حاصل ہوسکیں گے - دفاع پر دوسری قومی ضروریات اور ترجیحات کو نظر انداز کر کے کثیر خرچ کی ضرورت باقی نہ رہے گی - اس قسم کی تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے ہی ایک با ایمان ، باعمل اور پر اعتماد معاشرہ تشکیل پا سکے گا - اس کے بغیر اسلامی معاشرہ کا احیا ممکن نہیں - اس احیا کے لیے ایک منصوبہ فوری قسم کا تشکیل دیا جائے گا اور ایک منصوبہ زیادہ مدت کا ہوگا - فوری منصوبہ پر ایک سال سے دو سال تک کی مدت میں پوری طرح عمل کر لیا جائے گا - پانچ سال کی مدت میں انشاءاللہ پورا معاشرہ اس نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کا پابند ہو جائے گا -

مندرجہ بالا خاکے کے مطابق تفصیلی اور جامع پروگرام مرتب کیا جا سکتا ہے - متدین ماہرین تعلیم اپنے علم اور مہارت کے مطابق اس میں رد و بدل کر سکتے ہیں - یہ مثالی خاکہ ایک مثالی تصور ، یعنی اسلام ، کو جاری و ساری اور قائم و رائج کرنے کے لیے ہے اس لیے مثالی اہداف و مقاصد ہی اس کے لیے مقرر کرنے پڑیں گے اور اس کے لیے جو عملی اقدام کیے جائیں گے وہ بھر پور ، پر خلوص اور بے جھجک انداز میں کرنے ضروری ہوں گے -

پاکستان کا نظام تعلیم
اسلامی بنانے کی طرف رہنمائی

جناب پروفیسر محمد اکرام الرحمان

تعلیم کا مفہوم و مقصد

کسی قوم کی ترقی کا راز اس قوم کے نظام تعلیم ، معیار تعلیم اور نصاب تعلیم پر منحصر ہے ۔ تاریخ عالم شاہد ہے کہ انہیں قوموں نے عروج حاصل کیا ہے جنہیں اپنی تہذیب و تمدن پر مباہات و افتخار رہا ہے ، اور جو علوم و فنون کی ترقی اور ترویج کے لیے مسلسل کوشاں رہی ہیں ، اور جنہوں نے اپنے اسلاف کے قابل قدر کارناموں اور اپنے ملّی ورثوں کو بھی مامون اور محفوظ رکھا ۔

پیغمبر اسلام آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے آمت مسلمہ کو ابتدا ہی سے حصول علم کی ترغیب دی ۔ علم کی فضیلت و برکات کا احساس دلایا اور علم و حکمت کو سب سے بڑی دولت قرار دیا ۔ اسلام میں تعلیم دینا اور تعلیم حاصل کرنا دونوں کار ثواب ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں بچوں کی تعلیم و تربیت کو ایک اہم اور دینی فریضہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس کام کی ذمہ داری والدین اور اساتذہ کے ساتھ پوری ملّت ، معاشرے اور مملکت پر عائد ہوتی ہے ۔ آج کی پیچیدہ دنیا کے مسائل کسی سے پوشیدہ نہیں ۔ ان مسائل اور مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تعلیم و تربیت کی اہمیت اور افادیت مزید بڑھ جاتی ہے ۔ تعلیم و تربیت قوم کی پسماندگی دور کرنے ، اس کی حیات و بقا اور ترقی کے لیے لازمی ہے ۔ اس سے قومیں بنتی اور بگڑتی ہیں ۔ ہر دور میں حالات ، روایات اور تمدنی حقائق کی بدولت ، تعلیم میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں جو تعلیم میں ایک محرک کا درجہ رکھتی ہیں ۔ تعلیم میں وقت کے تقاضوں کے مطابق ، نئے رجحانات کی طرف مائل ہونا لازمی امور ہیں ورنہ ترقی کی راہیں مسدود ہوکر رہ جاتی ہیں ۔ نظم تعلیم کو بہتر بنانے کے لئے جس قدر زیادہ کوششیں کی جاتی ہیں ، معیار تعلیم اس قدر بہتر ہوتا جاتا ہے جس سے قوم کی ترقی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ تعلیمی امور کی بجا آوری اور اس کے انتظام و انصرام کے لیے ایسے وسیع تجربات کے حامل اساتذہ کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ صرف تعلیمی نظم و نسق سے

واقف ہی نہ ہوں بلکہ وہ تعلیمی امور کو سمجھتے بھی ہوں ۔ ہر فرد کے ذہن میں تعلیم کا ایک مفہوم اور جداگانہ تصور ہوتا ہے ۔ یہاں تک کہ ماہرین تعلیم اور مفکرین تعلیم کے مابین بھی اس ضمن میں مختلف نوعیت کے اختلافات پائے جاتے ہیں ۔ یہ اختلافات نظریۂ حیات ، ماحول ،حالات، ضروریات ،حکمت عملیوں ، تعلیمی منصوبوں اور طریقہ ہائے تعلیم کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں ۔ کسی ملک میں مروّجہ نظام تعلیم،حالات اور واقعات کے تابع ہوتے ہیں،اس پر مذہبی اور سیاسی عقائد بھی اثر انداز ہوتے ہیں ۔ وسیع تر معانی میں اگر بیان کیا جائے تو تعلیم ، معاشرتی زندگی میں مسلسل تجدید کا نام ہے ۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعہ سے طالب علم کو ایک خاص قسم کی معاشرتی زندگی کی لذّت سے آشنا کرکے انہیں اس طرز زندگی کا سرگرم رکن اور محافظ بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے ۔ تعلیم ایک ایسا معاشرتی عمل بھی ہے جو نئی نسل کو معاشرے کے مشترکہ مقاصد اور اس کی مشترکہ خواہشات اور تمناؤں میں برابر کا شریک بنانے کا متمنی رہتا ہے ۔ انسان فطرتاً معاشرتی زندگی گزارنے پر مجبور ہے اور معاشرے میں رہ کر اپنے اعتقادات ، رسم و رواج اور دیگر دینوی مقاصد کی تکمیل بھی کرسکتا ہے ۔ ہر معاشرے کی اپنی روایات اورخصوصیات ہوتی ہیں جن کی آنے والی نسلیں محافظ ہوتی ہیں اور کچھ جانے والی نسل ، آنے والی نسل کو منتقل کرتی ہے ۔ اس کو بھی تعلیم ہی کہتے ہیں ۔

دنیا کے عظیم مفکر سقراط کے مطابق ،حقیقت کی تلاش کا نام علم یا تعلیم ہے ۔ افلاطون کہتا ہے کہ تعلیم فرد کی صلاحیتوں کو معلوم کرکے ان کا نشو و نما کرنے کا نام ہے ۔ ارسطو کے نزدیک تعلیم انسان کو خوشیوں اور مسرتوں سے ہمکنار کرنے کا نام ہے ۔ روسو نے تعلیم کی تعریف کچھ اس طرح کی ہے :

" تعلیم ایک عمل بالیدگی ہے ، زندگی کو پرمسرت ، ہم آہنگ ،متوازن اور کارآمد بنادیتی ہے ۔ "

مشہور مفکر کانٹ کے نزدیک تعلیم اس عمل کا نام ہے جو انسان کو حقیقتاً انسانیت سے مزین کرے ۔ انسانیت کا وصف عقل کی رہنمائی حاصل کرنا ہےجو صرف تعلیم کے ذریعہ سے حاصل کیا جاسکتی ہے ۔

تعلیم انسان کو زندہ رہنےاور جینے کا شعور سکھاتی ہے ۔ فرد کی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کے متوازن نشو و نما کی ذمہ دار ہوتی ہے ۔

دور جدید میں تعلیم کے تین نظریات بہت مقبول ہیں - پہلا اشتراکی نظام تعلیم ، دوسرا جمہوری نظام تعلیم اور تیسرا اسلامی نظام تعلیم ،پہلے اور دوسرے کو ہم مغربی نظام تعلیم اور تیسرے کو مشرقی نظام تعلیم کے نام سے موسوم کرسکتے ہیں - اشتراکیت ایک مادہ پرست نظام ہے جو اپنی مذہب دشمنی ، اخلاقی و روحانی قدروں کی بیخ کنی کے لیے مشہور ہے - اس نظام میں پورے معاشرے کو مادہ پرست کہا جاسکتا ہے - ملک کے طلبہ کی صلاحیتوں کو اس انداز سے پروان چڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ اپنی زندگی اجتماعی مقاصد پر قربان کردیں - روحانی اور اخلاقی اقدار کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی - فرد کو کسی قسم کی آزادی نہیں ہوتی - فرد مملکت کے لیے ہوتا ہے - مملکت فرد کے لیے نہیں ہوتی -

ملوکیت یا آمریت کے برعکس جمہوریت میں اقتدار اعلا عوام ہوتے ہیں جن کی کثرت آراء سے حکومتیں قائم ہوتی ہیں اور قوانین تشکیل پاتے ہیں ملک پر کسی فرد یا گروہ یا خاندان کی اجارہ داری نہیں ہوتی - عوام کے منتخب نمائندے حکومت چلاتے ہیں - جمہوریت کے علمبرداروں کے نزدیک تعلیم کا مقصد افراد کو مملکت کا اچھا شہری بنانا ہوتا ہے - جمہوری نظریۂ تعلیم کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم لازمی اورعمومی ہوتی ہے - طلبہ کی انفرادی خصوصیات اور ان کی صلاحیتوں کو ملحوظ رکھ کر ، انفرادی توجہ دی جاتی ہے تاکہ ہر شخص اپنی صلاحیتوں کے مطابق ترقی کرے -

معلم اور متعلم کی آزادی کا احترام کیا جاتا ہے - مذہب کو فرد کا نجی معاملہ سمجھا جاتا ہے ، لیکن جمہوری نظام میں کئی خامیاں بھی پائی جاتی ہیں - مثلاً مذہبی تعلیم کو نظر انداز کرکے قوم کا رشتہ مذہب اور اخلاق سے منقطع کردیا جاتا ہے - زندگی کے تمام شعبوں میں خصوصاً اجتماعی امور میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے بے نیاز ہوکر فلاح دارین کے کاموں سے شہری محروم ہوجاتے ہیں -

اسلامی نظریہ تعلیم

قرآن حکیم کے مطابق اصل تعلیم حقیقت سے واقفیت کے لیے ہے ، یعنی تعلیم اس وصف کا نام ہے کہ جو کچھ سیکھے اس کا اثر بھی قبول کرے اور یہ اثر فکری اور عملی دونوں قسم کا ہونا چاہیے - یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں انسانوں کو بار بار غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے اور علم

کی فضیلت اور اہمیت کے بارے میں بار بار مختلف اندازوں میں زور دیا گیا ہے - جب قرآن مجید نازل ہونا شروع ہوا تو سب سے پہلے وحی یہ آئی :

اقرا باسم ربک الّذی خلق ۝ پڑھو (اے نبی) اپنے رب کے نام کے ساتھ -

قرآن پاک کی ابتدا جس لفظ سے کی گئی وہ " اقرا " ہے جس کے معنی ہیں پڑھ - اگر ہم ایک نقطۂ نظر سے قرآن حکیم کا مطالعہ کریں تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ قرآن حکیم کے محبوب ترین موضوعات میں سے ایک موضوع حصول علم اور ترویج علم بھی ہے -

قرآن مجید میں جا بجا مختلف انداز میں حصول علم کی تاکید کی گئی ہے - حکم ربّانی ہے :

علم الانسان مالم یعلم ۝ انسان کو وہ علم دیا ہے جسے وہ نہیں جانتا تھا -

آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے ارشاد ربّانی کی عملی تفسیر جس انداز اور پیرائے میں فرمائی اس کا نمایاں پہلو درسگاہ " صفہ " کا قیام ہے عبادت گاہ کے ایک حصے کو علم کے لیے وقف کردینے کا یہ انداز اپنی ذات میں بڑا معنی خیز ہے اور اسلام میں علم کی اہمیت کو واضح کرنے میں مدد دیتا ہے - رسول پاک صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے علم کی اہمیت اور افادیت کو زیادہ اجاگر کیا - چنانچہ احادیث میں جا بجا علم کی فضیلت بیان کی گئی ہے اور امت مسلمہ کو تحصیل علم کی تاکید کی گئی ہے - آپ کے چند ارشادات ملاحظہ فرمائیں :

العلم ثمرۃ الایمان و مصباح الاسلام — علم ایمان کا پھل ہے اور اسلام کی روشنائی ہے -

اطلبوا العلم فانّ الطّالبین للدّنیا کثیراً — تم علم کو طلب کرو اور عقل کو ڈھونڈو کیونکہ دنیا کے ڈھونڈنے والے بکثرت ہیں -

لعلّم فانّ العلم زین لاھلہ و فضل و عنوان لکل المحامد — علم حاصل کرو کیونکہ علم اہل علم کے لیے زینت اور فضیلت ہے اور تمام خوبیوں کا عنوان ہے -

مندرجہ بالا احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلم

نے نہ صرف فضیلت علم بیان کی ہے بلکہ حصول علم پر بھی زور دیا ہے اور تدریس کو عبادت کا درجہ دیا ہے -

اسلام محض عبادات کا مجموعہ نہیں بلکہ دین فطرت ہے - دین ، مکمل ضابطہ کا دوسرا نام ہے اس لیے اسلامی نظام تعلیم ایک ایسا نظام ہے جو مسلمانوں کو متوازن زندگی گزارنے کے لیے تیار کرتا ہے - ایک مسلمان راہب نہیں بن سکتا ، اس کو معاشرے میں رہتے ہوئے زندگی کے روحانی پہلوؤں کو زندہ رکھنا ہوتا ہے - اسلام مادّی وسائل کو اخلاقی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنے کی تلقین کرتا ہے اور نہ اس کا تقاضا کرتا ہے کہ انسان مادّی زندگی میں اس قدر منہمک ہوجائے کہ روحانی اقدار کو ہی نظر انداز کردے -

افکار اکابر

اس سے پیشتر کہ ہم اسلامی نظام تعلیم پر بحث کریں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے چند اکابرین ، مفکرین اور ماہرین تعلیم کے خیالات و افکار کو بھی مختصر طور پر بیان کردیا جائے -

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے فرمایا "کہ علم پیغمبروں کی میراث ہے اور مال کافروں اور قارون کی" -

حضرت عمر فاروق رضؓ نے ارشاد فرمایا ، " طالب دنیا کو علم سکھانا ڈاکو کے ہاتھوں میں تلوار فروخت کرنا ہے " -

حضرت عثمان غنی رضؓ کا قول ہے ، " وہ علم بیکار ہے جس پر عمل نہ کیا جائے " -

حضرت علی رضؓ نے فرمایا ، " شرافت عقل و آداب سے ہے نہ کہ مال و نسبت سے " -

امام شافعی رحؒ کے مطابق ، " علم یا تعلیم اعمال صالح تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے " -

سرسید احمد خاں کے الفاظ میں ، "انسان میں جو اوصاف اعلا اور ماہرانہ صلاحیتیں ہیں ان کو منظر عام پر لانا تعلیم ہے " -

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں فرماتے ہیں ، " تعلیم ایک عمل ہے جس کے اجتماعی و انفرادی اثرات ہوتے ہیں - تعلیم کے اس مقصد کا حصول جب ہی ممکن ہے کہ جب معاشرے کو مقصدیت سے ہمکنار کرنے کی کوشش کی جائے " -

تعلیم کا اسلامی تصوّر

اشتراکی اور جمہوری نظریات کے برعکس اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے - قرآن کریم میں مسلمانوں کو علم حاصل کرنے کی بار بار تلقین کی گئی ہے - اسلام میں علم کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہے اور مومن کا علم حاصل کرنا ، اصل میں رضائے خداوندی کے حصول کی کوشش ہے - حصول علم کی تاکید قرآنی آیات ، احادیث نبوی اور علمائے دین کے اقوال سے ہوتی ہے -

(اسلام میں تعلیم کی غرض انسان کو خلافت ارضی کا اہل بنانا ہے - اس مقصد کے حصول کےلیے تعلیم ایسی ہونی چاہیے جو افراد کو علم بصیرت کی دولت سے مالا مال کردے یعنی انہیں زندگی کے ابدی و روحانی حقائق، سائنس کے بنیادی اور معاشرتی علوم کے بنیادی حقائق سمجھنے کے قابل بنائے اور افراد کو علم کے لیے آمادہ کرے، کیونکہ وہ روحانی حقائق کو سمجھ کر عبادت کی لذّت سے روشناس ہوسکتے ہیں - سائنسی حقائق کا علم ان کو فنی اور تکنیکی مہارتوں پر قدرت عطا کرتا ہے اور معاشرتی حقائق کو سمجھ کر وہ قوم کی خدمت پر آمادہ ہوسکتے ہیں -) اسلامی نظام تعلیم ، جمہوری قدروں کی حامل ہے - ہر شخص اپنی استعداد اور صلاحیتوں کے مطابق تعلیم حاصل کرسکتا ہے - اللّٰہ تعالیٰ نے انسان کو بےپناہ صلاحیتوں اور خوبیوں سے نوازا ہے اور اس کو تعلیم کے ذریعہ اپنی صلاحیتوں کو جلا بخشنے کی تلقین کی ہے - اسلامی نظریہ تعلیم بڑا لچکدار اور محرک ہے - نصاب تعلیم کو زمانے کے تقاضوں اور رجحانات کے مطابق ہونا چاہیے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ تعلیم کے ذریعہ سے اپنی تہذیب و ثقافت کی اشاعت کریں اور اپنی روایات کو استحکام بخشیں - اسلامی نظام تعلیم ہمیں اپنے مذہبی اور ثقافتی مقاصد کے حصول میں مدد دے سکتا ہے - اسلامی نظام تعلیم میں عقائد اور ارکان اسلام ، فرد کے حقوق و فرائض ، اعلا قدریں مثلاً ہمدردی ، اخوت ، رواداری ، مساوات ، جسمانی و روحانی تعلیم اور ایسے علوم و فنون شامل ہیں جن سے رزق حلال حاصل کیا جاسکتا ہے -
/عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اسلام سائنس کے خلاف ہے - یہ سراسر غلط اور لاعلمی پر منحصر ہے - اسلام تو خود مشاہدات ، تحقیقات اور تجربات کے ذریعہ سے تسخیر کائنات کا راستہ دکھاتا ہے -
قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے :

وسخر لکم مافی السمٰوٰت ومافی الارض جمیعا منه ۞ ان فی ذلک لایٰت لقوم یتفکرون ۞

(الجاثیہ : 13)

اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے
سب کو اپنے (حکم) سے تمہارے کام پر لگا دیا ۔ جو لوگ
غور کرتے ہیں ان کے لیے (قدرت خدا کی) نشانیاں ہیں ۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے، لیکن آپ نے سب باتوں سے بڑھ کر حصول علم ہی کی تاکید فرمائی ہے اور اس کی طلب ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض قرار دی ہے ۔ ہمارے اسلاف نے اس راہ پر گامزن ہوکر ، علم و حکمت میں ایسی بے مثال ترقی کی اور اپنی تحقیقات ، معلومات اور تجربات کے ذریعہ سے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے جس کو تاریخ انسانی کبھی فراموش نہیں کرسکتی ۔

اسلامی تعلیم کا مدّعا یہ ہے کہ علم و بصیرت کو عملی زندگی کی بنیاد بنایا جائے اور نئی نسل کو ایسی عادات و اطوار و مہارتیں سکھائی جائیں جو زندگی کی بنیادی حقیقتوں سے مطابقت رکھتی ہوں ۔ ذہنی تعلیم کے ساتھ ساتھ پیشہ ورانہ تعلیم بھی ضروری ہے ۔ معاشرتی علوم کے بنیادی حقائق بتانے کی ضرورت ہے تاکہ بچے اور نوجوان ، قوم کی خدمت کو اپنا شعار بنانے پر آمادہ ہوجائیں ۔ اسلام کے نزدیک ، علم کے لیے عمل ضروری قرار دیا گیا ہے ۔ اسلامی تعلیم کا مقصد یہ بھی ہے کہ مسلمان بچوں اور نوجوانوں کے دلوں میں خدائے بزرگ و برتر کے لیے محبت و احترام کے جذبات پیدا کرے اور ہر مسلمان کو رضائے الہی کا طالب بنا دے اسلام فکری انقلاب کی پہلی تحریک ہے جس نے اپنے پیش رو فکری تحریکوں کی تمام اخلاقی قدروں کو اپنایا ۔

علم کے فہم و تدبر میں اضافہ کرکے صالح جذبات اور راست فکر کے درمیان توازن پیدا کیا ۔ اسلام ہر مسلمان کو تحصیل علم کے لیے کوشاں رہنے کی ہدایت کرتا ہے ۔ اسلام کا مقصد انسان کو انفرادی اور اجتماعی حیثیتوں سے راہ مستقیم پر چلانا ہے ۔ قرآن پاک اور احادیث ہر مسلمان کے لیے شمع ہدایت ہیں ۔ زندگی کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں ان سرچشموں سے فیضیاب نہ ہوسکیں ۔

موجودہ نظام تعلیم

پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے ، اس کے قیام کا مقصد اسلامی طرز زندگی کو اپنانا تھا ۔ پاکستان کو وجود میں آئے ہوئے 37 سال ہوچکے ہیں، لیکن ہم نے اپنا نظام تعلیم تقریباً انہیں خطوط پر استوار کیا ہے جو

ہمیں دور غلامی کی یادگار کے طور پر ورثے میں ملا تھا ۔ دنیا کی کئی نو آزاد قومیں جنھوں نے آزادی ہمارے بعد حاصل کی نئے دور کے تقاضوں کو مدّنظر رکھتے ہوئے ، اپنی جہد مسلسل ، عزم اور مخلصانہ کوششوں سے نہ صرف سیاسی اور معاشی استحکام حاصل کرنے میں کامیاب ہوئیں بلکہ اپنے دیرینہ اور فرسودہ نظام تعلیم کو یکسر تبدیل کرکے جدید طرز تعلیم پر عمل پیرا ہوکر نئے سائنسی رجحانات کی طرف مائل ہوئیں اور بہت کم عرصے میں ترقی کے میدان میں آگے نکل گئیں اور معاشی طور پر بھی خود کفیل ہوگئیں ۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ اتنی مدت گزر جانے کے بعد بھی ہم اپنے نظام تعلیم اور اس کے نصب العین کے متعلق کوئی موزوں راہ متعین نہ کرسکے ۔ پاکستان کی ترقی اور بقا کے لیے ضروری ہے کہ ہمارا نظام تعلیم ایسا ہونا چاہیے جو ملک و ملّت کے فروغ اور استحکام میں ممدو معاون ہو ۔

چونکہ ہمارا نظریہ حیات اسلامی ہے لہذا ہمارا نظام تعلیم بھی اس کے مطابق ہونا چاہیے ۔ فی الوقت ابتدائی ، ثانوی ، اعلا ثانوی ، کالجوں یونیورسیٹیوں اور پیشہ ورانہ اور فنّی درسگاہوں میں رائج ہمارا نظام تعلیم ایسا نہیں ہے جو طلبہ کو اسلامی طرز زندگی اپنانے کی طرف مائل کرسکے یا ان میں وہ خوبیاں اور اوصاف پیدا کرسکے جو ایک اسلامی مملکت کے طلبہ میں موجود ہونی چاہیے ۔ موجودہ نصاب تعلیم ، دور جدید کے تقاضوں کو پورا نہیں کرسکتا ۔ تعلیم کی مختلف سطحوں میں ، باہمی ربط و تسلسل کا فقدان ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جب بچہ اسکول سے کالج میں قدم رکھتا ہے تو اس کو اسکول اور کالج کے ماحول ، معیار تعلیم اور طریقۂ تعلیم میں نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے ۔ طلبہ کو ان کی ذہانت ، صلاحیت اور رجحان کے مطابق تعلیم نہیں دلائی جاتی بلکہ تعلیم صرف تعلیم کے لیے دی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبہ ابتدا ہی سے ، مستقبل کے لیے اپنی راہیں متعین کرنے سے قاصر رہتے ہیں ۔ تعلیم دلانے میں صرف طلبہ کے والدین کی مرضی اور سوچ کا عمل دخل ہوتا ہے ، مثلاً آج کل طلبہ کی ذہنی صلاحیت کو مد نظر رکھے ہوئے بغیر عموماً ان کو سائنس کی اعلا تعلیم دلانے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ وہ انجینر یا ڈاکٹر یا ماہرین سائنس و فنیات بن جائیں ۔ طلبہ ثانوی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انٹرمیڈیٹ سائنس میں داخلہ لیتے ہیں تو دو سال میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب وہ امتحان دیتے ہیں تو انٹرمیڈیٹ سائنس کے امتحان میں ان میں سے صرف پچاس فیصد کامیاب ہوتے ہیں ۔ کیا یہ قومی ضیاع نہیں ہے ؟

ہمارا نظام تعلیم ایسا ہونا چاہیے جو اسلامی نظریات و تصورات کو تمام مضامین میں منعکس کرے کیونکہ اسلامی تعلیمات ہماری صحیح منزل ہے اور یہی ہمیں ترقی کی جانب لے جاسکتی ہے - اور ہم دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کی صف میں باعزّت مقام حاصل کرسکتے ہیں - اسلامی تعلیم کی طرف سے غفلت برتنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہم ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں - ہمارے ذہن ابھی تک غلامی کی زنجیروں سے جکڑے ہوئے ہیں - ہم اسلامی تعلیمات کو چھوڑ کر اور اپنے ادب ، تہذیب اور تمدن سے منہ موڑ کر دوسروں کی اندھی تقلید کررہے ہیں جس کا انجام یہ ہے کہ دن بدن ہمارا پورا معاشرہ انحطاط پذیر ہورہا ہے -

موجودہ نظام تعلیم کو اسلامی کس طرح بنایا جائے - چند تجاویز

1- موجودہ نظام تعلیم کی خرابی یہ ہے کہ یہ صرف حصول رزق کی کلید فراہم کرتی ہے ، اچھا انسان بنانے کی صفت سے عاری ہے -

2- پاکستان جب سے بنا ہے ، نظام تعلیم غور و فکر اور تنقید و تنقیح کا موضوع ہے - یہ نظام دو عنوانات کے تحت غور و فکر کا موضوع رہا ہے - ایک یہ کہ تعلیم کا موجودہ ڈھانچہ (طریقہ تدریس اور طریقہ امتحانات وغیرہ) برقرار رکھا جائے یا اسے تبدیل کردیا جائے ؟ دوسرا یہ کہ تعلیم کی نظریاتی اساس کیا ہو - 1961 کی شریف کمیشن رپورٹ ، 1964 کی حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ ، 1969 کی نورخاں کمیٹی رپورٹ اور 1972 کی تعلیمی پالیسی اس غور و فکر کی غماز ہے -

3- تعلیمی ڈھانچے کی تبدیلی کے ضمن میں عام میلان اس طرف پایا جاتا ہے کہ برطانوی طرز تعلیم کے ڈھانچے کو ترک کرکے امریکی ڈھانچے کو اختیار کیا جائے - چنانچہ عملاً ملک کی تقریباً تمام یونیورسٹیوں میں گزشتہ چھے سالوں سے اس کو اختیار کرلیا گیا ہے -

4- نظریاتی اساس تبدیل کرنے کے معاملے میں کسی قسم کی کوئی قابل ذکر پیش رفت نہیں ہوسکی - وجہ اس کی ، جو محولہ بالا تمام تعلیمی رپورٹوں سے مترشح ہوتی ہے ، یہ ہے کہ اس مسئلے میں ہمارے ارباب تعلیم کے ذہن میں یہ بات واضح نہیں ہے کہ اگر اسلام کو تعلیم کی نظریاتی اساس بنایا جائے تو اس کی عملی شکل کیا ہو اور اس کی روشنی میں نصابی کتابوں میں کس قسم کی

تبدیلیاں لائی جائیں ؟ اس معاملے میں ان کا ذہن اس سے زیادہ سوچنے سے عاری رہا کہ اسلامیات کو نصاب میں شامل کردیا جائے اور بس - چنانچہ ایسا ہی کیا گیا - حالانکہ اسلامی نظام تعلیم کوئی ایسی گنجلک اور پیچیدہ اصلاح نہیں ہے جس کا مفہوم قابل فہم نہ ہو - اسلامی نظام تعلیم سے مراد ایسی تعلیم ہے جو :

الف - انسان کو عقیدے اور کردار کے اعتبار سے مسلمان بنائے اور جو

ب - ہر شخص کو اپنے اپنے شعبۂ زندگی میں اسلام کی تعلیم کے مطابق مسائل حل کرنے کی تدبیر بتلائے - معیشت میں ، سیاست میں ، عمرانیات میں ، بین الاقوامی امور میں وغیرہ وغیرہ - اس ضمن میں عملی طور پر کیے جانے والے ضروری اقدامات یہ ہیں :

5- ابتدائی جماعتوں سے لیکر یونیورسٹی یا کالج کی سطح تک جس طرح ہم زبان دانی کی تعلیم کو ضروری سمجھتے ہیں اسی طرح سے اسلام کی بنیادی تعلیم کو ضروری سمجھا جائے- بنیادی تعلیم سے مراد اسلام کے ایسے امور کی تعلیم ہے جو عقیدے ، اخلاق اور کردار سے متعلق ہوں - یعنی قرآن ، حدیث اور سیرت نبوی ؐ کی تعلیم - اس تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ طالب علم کا بحیثیت مسلمان عقیدہ درست اور راسخ ہو اور اسلام کی اخلاقی تعلیمات سے وہ اتنا واقف ہوجائے کہ اس کے مطابق اپنی زندگی استوار کرسکے -

6- سماجی علوم میں سے ہر طالب کے شعبے میں نصابی کتابوں میں اس نوع کی تبدیلیاں کی جائیں کہ متعلقہ علوم میں مسلمان اہل قلم نے اسلام کی روشنی میں انہیں جس حد تک مدّون کیا ہے اسے نصاب میں سمو لیا جائے - مثال کے طور پر سیاسیات میں مختلف مسلمان اہل قلم نے ،اسلام کی روشنی میں بہت کچھ لکھا ہے اور اقتدار اعلا ، تقسیم اختیارات ، قانون سازی اور بنیادی حقوق وغیرہ کے بارے میں اسلام کے نظریات پیش کیے ہیں انہیں سیاسیات کے نصاب میں سمو لیا جائے - اس طرح سے دیگر سماجی علوم میں اسی نوع کا کام کیا جائے -

7 - الف - نصاب کی مکمل تبدیلی اس وقت عمل میں آسکے گی جب ہر سماجی علم کی اسلام کی روشنی میں مکمل طور پر

تدوین نو ہو جائے - تدوین نو کا یہ کام با قاعدہ طور پر شروع کردیا جائے - یہ کام یونیورسٹیوں کے اہتمام میں ہو - چند برسوں کے اندر اندر اسے مکمل کرلیا جائے اور نصاب کو اس کی روشنی میں از سر نو تیار کیا جائے تاکہ طلبہ جب فارغ التحصیل ہوکر متعلقہ شعبہ زندگی میں داخل ہوں تو اسلام کی روشنی میں مسائل حل کرسکیں -

ب - موجودہ نصاب میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مزید اصلاحات کی جائیں تاکہ وہ پاکستان کے قیام کی اور اسلامی تہذیب و تمدن کی آئینہ دار ہوں - اس کام کے لیے خاص طور پر ایک کمیٹی مقرر کی جائے - ساتھ ہی غیر مسلموں کو بھی اپنی مذہبی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دی جائے -

8 - اساتذہ کی تربیت گاہوں میں اسلامیات کو ایک لازمی مضمون قرار دیا جائے تاکہ تربیت یافتہ اساتذہ مسلمان بچوں کو اسلامی تعلیم صحیح طور پر دے سکیں -

9 - اعلا تعلیم کے لیے یونیورسٹیاں ایسا انتظام کریں کہ جو مذہب میں ڈگری لے کر نکلیں وہ مذہبی معاملات میں خاص مقام رکھتے ہوں اور دنیا کی دوسری یونیورسٹیوں کے طلبہ کے معیار سے کسی طرح کم نہ ہوں -

10 - تمام مذاہب کا تقابلی مطالعہ کیا جائے اور اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں قرآن اور حدیث کی اشاعت کی جائے - تحقیقاتی کاموں پر زیادہ توجہ دی جائے -

11 - سماجی علوم کے بعد جہاں تک مادی علوم کا تعلق ہے اس کا نظریات سے بظاہر کوئی تعلق نظر نہیں آتا - مثال کے طور پر انجینرنگ کا یا طب ودوا سازی کا یا طبیعیات و کیمیا اور حیاتیات کا - مگر فی الحقیقت ان علوم کے نشو ونما وپرداخت میں بھی نظریہ کارفرما ہوتا ہے - مثال کے طور پر جدید حیاتیات کی پوری عمارت نظریہ ارتقاء پر استوار کی گئی ہے جو دراصل تکذیب خدا کا نظریہ ہے - اسی طرح جدید فلکیات بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر انکار خدا کے نظریہ پر قائم ہے - یا ادویہ سازی کی پوری صنعت ، اسلام کے عقیدے سے گریزاں ہے - لہذا نظریاتی تبدیلی کے محتاج یہ علوم بھی ہیں - ہاں یہ ضرور ہے کہ ان علوم میں ہم آنے والے بہت طویل عرصے تک کوئی تبدیلی لانے کے لائق نہ ہوسکیں گے -

اس کام کے لیے ہمیں اسوقت کا انتظار کرنا پڑے گا جب ہم اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے ان ماہرین کی ہمسری کے لائق ہوسکیں جنہوں نے ان علوم کو مدون کیا ہے ۔

12 ۔ ابتدائی جماعتوں سے لےکر ، ڈگری جماعتوں تک لسانیات یعنی انگریزی اور اردو وغیرہ اور تاریخ و معاشرتی علوم کی درسی کتابوں کا تفصیلاً ایک تنقیدی جائزہ لیا جائے اور اس میں جو باتیں اسلام یا مسلمانوں کے مسلمہ فرقوں کی تعلیمات کے منافی ہوں یا جو پاکستان یا نظریہ پاکستان کے منافی ہوں یا جو علاقائی قومیت کی غماز ہوں ، انہیں درسی کتابوں سے حذف کردیا جائے ۔

13 ۔ اسلام کی تعلیمات شامل نصاب کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اسے علیحدہ مضمون کی حیثیت سے نصاب میں داخل کیا جائے بلکہ ایسا بھی کیا جا سکتا ہے کہ لسانیات کی کتابوں میں اسلامی تعلیمات کو سمو دیا جائے ۔

14 ۔ اسلامیات کو علیحدہ مضمون کی حیثیت سے شامل کرنے کی صورت میں بھی لسانیات کی کتابیں اس امر کی محتاج ہیں کہ ان کے اسباق کو تبدیل کیا جائے بالخصوص انگریزی کی کتابوں کی تصنیف نو ضروری ہے ،کیونکہ اس زبان کی کتابوں میں جن مصنفین کے رشحات قلم کو یا جن موضوعات کو شامل کیا گیا ہے وہ پاکستانی معاشرت اور پاکستانی بچوں کے لیے بالکل اجنبی ہیں ۔ اجنبی موضوعات کو داخل نصاب کرنے سے لڑکوں کو نہ تو انگریزی زبان آتی ہے اور نہ نفس مضمون کوئی فائدہ پہنچاتا ہے ۔

15 ۔ تبدیلی کا جس قدر محتاج نظام تعلیم ہے اسی قدر حاجت مندی اس امر کی ہے کہ طالبات کے لیے ایک جداگانہ نصاب مدون کیا جائے ۔ جداگانہ نصاب اس حقیقت کی روشنی میں وضع کیا جائے کہ دنیا میں ہر جگہ عملی زندگی میں عورت کا دائرہ کار مردوں کے دائرہ کار سے علاحدہ ہے ۔ عورتوں کا دائرہ کار گھر ہے اور مردوں کا بیرون گھر ۔ مسلم معاشرے میں سماجی اعتبار سے بھی مردوں اور عورتوں کے دائرہ کار جدا جدا ہیں ۔ مگر اس حقیقت کے باوجود طالبات کو وہی نصاب پڑھایا جاتا ہے جو مردوں کے لیے ان کے بیرون گھر فرائض کی بجا آوری کے لیے وضع کیا گیا ہے ۔ لہذا ایسی تعلیم طالبات کے لیے بمشکل کوئی عملی قدر و قیمت رکھتی ہے ۔ طالبات کے لیے اس کی جگہ پر ایسا نصاب مرتب ہونا چاہیے جو ان کے اپنے دائرہ کار کے لیے سود مند ہو ۔

16- ایسا کرنے سے مخلوط تعلیم کا بھی از خود خاتمہ ھوجائےگا جیسے کسی اور طریقے پر ختم کرنا آسان نہیں -

17- اسلامی تعلیم کوزندگی کے قریب لانے کی کوشش کی جائے - سائنسی تحقیقات کو مذھب سے مربوط کیا جائے - اسلامی اصولوں کو سمجھ کر ، معاشرے کے بدلتے ھوئے تقاضوں سےھم آھنگ کیا جائے - اسلام کی بنیادی قدروں اور جدید سائنس میں ربط پیدا کیا جائے -

18- تعلیم کے شعبے میں گزشتہ تین دھائیوں میں چھوٹی بڑی بہت سی تبدیلیاں کی گئیں اور آئندہ کی تبدیلیوں کے لیے بھی ھم آرزو مند ھیں - مگر اس شعبے میں ایک اھم کام کی طرف آج تک توجہ نہیں دی گئی وہ اساتذہ کی تعلیم و تربیت کا کام ھے - ھم تعلیم کے شعبے میں جو تبدیلیاں لانا چاھتے ھیں انھیں روبہ عمل لانے کے لیے ضروری ھے کہ اساتذہ میں ذھنی آمادگی اور ان میں اس کام کی صلاحیت پیدا کی جائے - اس کام کی طرف چونکہ ھمیشہ غفلت برتی گئی اس لیے تعلیم کی اصلاح کے لیے اب تک جتنے کچھ اقدامات کئے گئے وہ سب کے سب ناکام رھے - سمسٹر سسٹم اس کی وجہ سے ناکام ھورھا ھے - داخلی تخمین (INTERNAL EVALUATION) کا نظام ان ھی کے ھاتھوں ناکام ھوا - برطانوی طریقۂ تدریس اور طریقۂ امتحانات کے خلاف ان ھی کے رویے کی وجہ سے بیزاری پیدا ھوئی - کمرۂ امتحانات میں نقل کے رجحان میں افزودگی بھی بڑی حد تک ان ھی کے تغافل پسندی کی وجہ سے دیکھنے آرھی ھے - نظم و ضبط کے مسائل میں روز افزوں اضافہ بھی ایک حد تک ان کی ھی بے توجہی کی وجہ سے پیدا ھورھا ھے - تعلیم و تدریس سے اساتذہ کا تعلق محض تنخواہ دار ملازم کی حیثیت سے رہ گیا ھے، معلم کی حیثیت سے نہیں -

اس لیے تعلیم کے شعبے میں جس قسم کی تبدیلی بھی ھم لانا چاھتے ھیں اس سے پہلے اساتذہ کی تعلیم و تربیت کا ایک کورس ھونا چاھیے - تدریس کے لیے صرف ڈگری کو ان کے لیے کافی نہ سمجھا جائے - اس سے مراد یہ ھے کہ تعلیم کے شعبہ میں کسی بھی قسم کی تبدیلی لانے میں اساتذہ کی قلب ماھیت کو اولین اھمیت دی جائے اس کے بغیر کسی قسم کی کوئی اصلاح عمل میں نہ آسکے گی اور نہ کامیاب ھوگی -

THE NEED FOR EDUCATIONAL REORGANIZATION, AND INTRODUCTION OF UNIVERSAL, FREE, COMPULSORY PRIMARY EDUCATION AS AN ISLAMIC IDEAL

By

DR. N. A. BALOCH

In its organizational structure as also in its administrative policies, the present system of education in Pakistan is essentially a continuation of the colonial system of the pre-independence era. It continues to use imported models and methods. The teacher in the system is the weakest link: policies governing the recruitment and training of teachers have no relevance to the role they are expected to play in educating the rising generations in an ideological society. Except for the few vocational objectives that have come to the fore-front in post-independence educational planning, the system is not geared to any clear goals of a truely 'national system' of education, not to speak of an 'Islamic System'. The addition of compulsory courses in 'Islamiyāt' or 'Pakistan Studies', though highly commendable, cannot convert the century-old secular system of the colonial period into an Islamic System.

Of all the imbalances in the present system, the one which can be pin-pointed as the most serious of all is the neglect of the elementary stage of education. Firstly, this neglect is one of the worst features of the colonial system that has lingered on thus far, and secondly, it negates the very spirit and ideal of a truly Islamic system of education. These observations in order to be properly appreciated need some elaboration.

The Neglect: a legacy of the Colonial System

The educational policies followed during the colonial period are

too well-known to need any detailed comment. Despite all the official arguments on record, it cannot be denied that the colonial administrator was not here to educate the subject people. In particular, he was least interested in educating the masses.

With the 'educational policy minutes' recorded by Macaulay on the 2nd of February 1835 and the final educational frame-work laid down by the 'Wood's Despatch' of 1854, the historical and socio-cultural foundations of the then existing Indo-Muslim system of education of which the primary education constituted the main base were rejected. It was laid down as a matter of policy that while spreading the new Western education, attempts of Government were to be "restricted to the extension of higher education to the upper classes of society who had leisure for study and whose culture could filter down to the masses".[1]

This distinction between the higher or upper classes and the masses which was implicit in colonial policies continued to operate *in favour of* "higher forms" of education and *against* the advancement of elementary education. In their report in 1929, the Hartog Committee still treated elementary education distinctively as "mass education" and the system of secondary and higher education as "education for the directing classes... designed to produce competent and trust-worthy representatives and officials".[2] Even as late as 1944, the most forward looking colonial agency, viz. the Central Advisory Board of Education had observed that while primary education was meant for the masses, the "chief purpose of higher education (inclusive of high schools) is to form an elite".[3]

As a result of this thinking, the colonial system of education was not built *upwards* on a sound base of 'Primary Education', but was extended *downwards* from the top-roof of university and college education. In due course, High Schools were established as a lower appendage of college education. By the time the colonial rule came to an end, the primary stage remained torn apart from the 'upper integrated system'. By 1944, the Central Advisory Board of Education had officially admitted that the system of education did not "provide the foundations on which an effective structure could be erected; and in fact much of the present rambling edifice will have to be scraped in order that something better may be substituted".[4] But then it was too late for the colonial administrator because he had to leave in 1947. Such an 'inverted system',

suspended from the top-pegs of 'university' and 'college' with its truncated bottom of 'primary education', was indeed a marvel of the educational structure of the colonial period. But the greater marvel is that we have continued to use this 'inverted model' to this day, being self-complimentary at the same time that we have now a 'national system' of education in Pakistan!

Secondly, though the colonial Government had admitted the State's responsibility for promoting primary education, it never assumed full responsibility for educating the entire population. In 1912, when a bill was introduced in the Central Legislature by the non-official member Mr. G.K. Gokhale, which was also strongly supported by (the Quaid-i-Azam) Mr. Muhammad Ali Jinnah, providing for a "gradual introduction of the principle of compulsion into the elementary education system of the country", it was opposed by the majority of official members and was subsequently killed at the Committee stage. It was after a lapse of almost one century, ever since the colonial system was first introduced, that the Central Advisory Board of Education (1944) for the first time recommended that "a system of universal, compulsory and free education for all boys and girls between the ages of 6 and 14 should be introduced as speedily as possible though in view of the practical difficulty of recruiting the requisite supply of trained teachers it may not be possible to complete it in less than 40 years".[5] Thus, had the colonial rule continued on the introduction of compulsory education upto the age level of 14 would have been ostensibly completed throughout the Subcontinent during the current year (1984).

Subsequently, the first Pakistan Educational Conference summoned speedily at the behest of the Quaid-i-Azam at Karachi in 1947 (November 27 — December 1) had emphasised that illiteracy in Pakistan must be wiped out by means of universal, free and compulsory education as well as through a wide extension of adult education. As regards the minimum period of compulsion, the Conference had unanimously resolved that "free and compulsory primary education be introduced for a period of five years which gradually be raised to eight years".[6]

This important resolution, however, remained on paper and was never seriously taken up for implementation subsequently.

Compulsory education: the most significant feature of Islamic System

The principle of compulsory education for all is writ large in the Quranic injunction *'IQRA'* (READ)[7] and in the consequent emphasis by the Holy Prophet (may peace be upon him) to the effect that "Acquisition of knowledge is obligatory on every *muslim*"[8] (i.e. every believer, man or woman, child, youth or the aged). This was fully understood and accepted by the early Islamic community, and it did not take long before universal, free, compulsory primary education became a recognized feature of the Islamic educational system. Though the obligation to learn and teach was recognized as a matter of faith and accepted voluntarily, the great educator Abu al-Hasan Ali al-Qābisi (d. 403 A.H./1012 A.C.) of Spain also derived specific juridical sanction *(al-hukm al-fiqhi)* for compulsory education: it was a *compulsion for the sake of faith* since the child was necessarily to be instructed in Qur'an and Islam.[9]

The great teachers who had pioneered the development of Islamic education, considered 'childhood' as the most important period in life for promoting effective personal development of the young learner, and, therefore, they termed this stage of instruction as *Ta'līm al-Atfāl* or *Ta'līm al-Sibyān* (lit. 'Education of Children'), that is 'Childhood Education' instead of 'primary' or 'elementary'. All attention was, therefore, centered first on *educating the growing child.* This led to the development of a common community school, the 'children's school'. Thus, a unique institution of childhood education emerged for the first time in the educational history of mankind. It became a universal feature of Islamic system of education in all climes and countries. Called *Kuttāb* in the Middle East, this community school became widely known as *Maktab* in Iran, Central Asia and the South-Asian Subcontinent; in the Far-East it came to be called by different names in the different regions — such as *Pasantren* in Java, *Panjantren* in Madura, *Pondok* in the Sunadanese speaking Western Java, and *Surau* in Central Sumatra.

This is not the occasion to elaborate upon this development. Suffice it to say that a study of the educational viewpoints of the early Muslim scholars and teachers shows that they considered

'Childhood Education' of fundamental importance from the point of strengthening the foundation of faith, inculcating Islamic values and guiding the personal growth and development of the child as a committed member of the Islamic community. As such, Childhood Education became the foundational base for higher Islamic Education. Therefore, historically speaking, there can be no system of Islamic education unless it has the strong foundational base of Childhood Education.

A National Tragedy

The foregoing discussion should indicate the two-fold failure of the present system: the failure to recognize the importance of the primary stage of education as the foundational base for the whole system so that it is assigned the necessary priority and the weightage in terms of organization and financial support, and the failure to recognize and guarantee the *Islamic right* to education to the Pakistani child in the light of the Quranic injunction *to read* and the emphasis by the Holy Prophet (may peace be upon him) *that acquisition of knowledge is obligatory*. Despite all the lessons from history, from contemporary compulsions, or from UNESCO's recommendations, the fact remains that more than 50% of the children of school-going age are not in schools in the Islamic Republic of Pakistan. The situation is serious enough to warrant immediate attention. Unless it is seen as a 'national tragedy', and made a 'national concern', the present situation will continue to be prolonged and the child will continue to be wronged as before. Even the important resolution of the First Pakistan Educational Conference which was called at the behest of the Quaid-i-Azam providing for the introduction of compulsory education in the country has remained ignored to this day.

Educational policies and procedures followed at different levels (local, departmental or ministerial) for purpose of planning, financing and implementing, though impressive as first pronounced, usually tend to perpetuate status quo: at best the decades-old frame is partly stiched but never overhauled or changed.

A serious thinking needs to be done at national level to save the situation and reorganize the present disorganized system. It will be a great day if a new plan for national education envisages

a strong base of universal free compulsory Childhood Education, which is followed by a preparatory stage for entry into the world of work through a net-work of vocational schools enabling the growing child to become *ūli al-aīdī wa al-absār* (capable of using their 'hands' and 'eyes' effectively) and to learn to seek livelihood through lawful earning *(rizq halāl)*. The subsequent stage may consist of higher Institutes which are open to the more gifted ones for intensive study and specialized training in order to build up professional competence in those specific areas of knowledge and work in which such a competence is actually needed.

As far back as 1944, the colonial educator had admitted that so far as the Educational System was concerned much of its "present rambling edifice will have to be scraped in order that something better may be substituted". Since then things have gone from bad to worse. It is high time to think whether the nation can afford to build and maintain the most costly antidated, and now unproductive super-structure of colleges and universities for the few favoured ones, when hundreds and thousands of the nation's children have no facility even to learn to read and write. The question may be asked as to what national goals is our present 'higher education' serving, when colleges and universities have become centres of 'muscle power' rather than of any 'mental growth and development'?

Need for planned action

A policy decision needs to be taken without any further delay to reorganise the present system and particularly to develop the primary stage into the foundational base on which must rest any further super-structure, and out of which must grow any further programmes of instruction. But for this change, the nation will continue to suffer the present disorganized system with its weak and truncated sector of primary education; the annual bulk of out-of-school children will continue to swell the ranks of illiterate adults and literacy figures will always remain low putting Pakistan in the sphere of illiterate societies.

Firm commitment, wise planning and concerted action are called for to achieve the all-important goal of universal, free, compulsory primary education. There can be no dearth of excuses and arguments to delay action. The blue books of the colonial

period are full of 'convincing' arguments against embarking upon any plan for mass education. Paucity of funds has always been the most effective of such arguments. But the question is: shall we invest in human development through education so that every child who is born in Pakistan is guaranteed the right to minimum necessary education, or shall we prefer to invest in steel, textile and cement production? In an educationally backward country of the third world, such as Pakistan, where the human problem is more critical, the choice becomes more challenging. No *patriotic* planner will prefer to divert funds elsewhere at the expense of national education, because an illiterate society will always remain vulnerable to internal disruption and external aggression, besides being a formidable obstacle to socio-economic development.

A thorough re-organization of the present educational system is long overdue and can be delayed only at a great national loss. The process of re-organization may well begin with the achievement of the important initial goal as laid down by the First Pakistan Educational Conference in 1947, that is, "free and compulsory primary education be introduced for a period of five years which gradually be raised to eight years". The total period during which this goal is to be achieved has to be fixed and funds committed for its achievement. Even more important are the policies and procedure which are to be followed for purpose of implementation. Among any other important steps to be taken, the following considerations will be crucial to the successful achievement of the results.

(a) The programme of universal free compulsory 'Childhood Education' has to be initiated and carried out *through close community cooperation*, beginning from 'the village' as a unit in the vast rural areas and the 'mohalla' as a unit in the urban areas. The mere 'official administrative' approach is not likely to succeed.

(b) To begin with, the main requirements such as teachers, teaching materials and school buildings will have to be met modestly. Instead of the so-called 'qualified' teacher, 'committed' teacher will have to be sought for from all sections of society including the retired personnel; only the minimum necessary teaching-learning aids will have to be used, the oral pupil-teacher communication being assigned utmost importance in the instructional process; and the local community,

shall be required to provide for modest accommodation for the school, which in exceptional cases may even be a hut or an open space under a shady tree. Thus, introduction and extension of the programme shall not be delayed on the pretext of the non-availability of 'qualified' teachers, 'standard' text books or 'proper' school buildings.

(c) For sometime to come, the foundational stage of 'Childhood Education' will, in effect, remain as the 'terminal stage of education' for most of the youth. As this will be the only schooling opportunity readily available to them, special curriculum goals will have to be defined which shall be self-satisfying rather than subservient to the requirements of any subsequent stage. Obviously, these goals shall not be confined to the 3Rs only, viz. reading, writing and calculating skills. The whole personal development of the growing child in terms of beliefs, values, attitudes, responsible social behaviour, patriotism and dignity of work and labour, shall be the main objective of the national Childhood Education.

(d) The teacher's role shall be all-important throughout this period. Therefore, due recognition shall be accorded to the teacher. The prospective teachers for this foundational stage shall be recruited early in the class-rooms, prepared well in advance, and selected and maintained satisfactorily so that they are able to contribute their best to this important stage of 'Childhood Education'. Personal excellence and an abiding interest to teach the child, rather than mere intellectual attainment, shall be the main criteria for the teacher's final selection. 'Teacher accountability' shall be an essential feature of the new educational reorganization.

Notes and References

1. The then Governor General Lord Auckland's observation while confirming the new educational policies.
2. The Auxiliary Committee (headed by Hartog) of the Indian Statutory Commission: *Interim Report: Review of Growth of Education in British India*, published by His Majesty's Stationary Office, London, September, 1929, pp. 526—27.

3. Central Advisory Board of Education: *Report on the Post-War Educational Development in India*, fourth edition, Bureau of Education, India, New Delhi, 1944, p. 15.

4. Central Advisory Board of Educators: *Report on the Post-War Educational Development in India, op. cit.*, p. 2.

5. *Ibid.*, p. 12.

6. *Proceedings of the Pakistan Educational Conference:* Government of Pakistan, Ministry of the Interior (Education Division), Karachi, 1948, Resolution No. 16 (i), p. 45.

7. The Holy Quran, Surah AL-ALAQ, verse 1.

8. *Sahih* of al-Bukhari *(Kitab al-'Ilm).*

9. Al-Qābisi, Abu al-Hasan Ali b. Muhammad: *al-Risālah al-Mufassilah li Ahwāl al-Muta'allimīn wa Ahkam al-Muta'allimīn* (the text of this treatise is appended to Dr. Ahmad Fuad al-Ahwānī's book *al-Tarbiyyah fi al-Islam au al-T'alīm fi Rā'yi al-Qabisi,* Cairo, 1955).

دینی تعلیم اور عصری تقاضے

جناب پروفیسر ڈاکٹر مشیر الحق

دینی تعلیم کا مطلب ہے دین اور مسائل دین کی تعلیم ، جو کچھ اور نہیں تو مفتی کفایت اللہ مرحوم کی تعلیم الاسلام یا مولانا تھانوی کی بہشتی زیور ہی کو باقاعدگی کے ساتھ پڑھنے اور پڑھانے سے حاصل ہوسکتی ہے - اتنی ضروری تعلیم دیکھا جائے تو اس کا حصول امت کے ہر فرد کے لیے لازمی ہے - لیکن یہاں ہم جس دینی تعلیم سے بحث کررہے ہیں، اس کا مطلب ہے کتاب و سنت سے گہری واقفیت، اور فقہ اسلامی کی مکمل فہم و بصیرت، جسے حاصل کرنے کے لیے طلبہ کو عموما ابتدائی تعلیم کے بعد اپنی عمر کے بارہ پندرہ برس دینی تعلیم کی درسگاہوں میں گزارتے پڑتے ہیں - اس طرح ایک طالب علم کہیں چوبیس پچیس برس کی عمر میں عالم بن پاتا ہے -

آج برصغیر ہندو پاک میں تعلیم گاہیں " دینی " اور " دنیاوی " دو الگ الگ خانوں میں بٹی ہوئی ہیں - لیکن مسلمانوں کے سیاسی دور عروج میں طریق تعلیم اور نصاب تعلیم ان دو الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں تھا- اس وقت صرف ایک ہی قسم کی تعلیم گاہیں ہوتی تھیں جنہیں "مدرسہ" کہا جاتا تھا - لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ مدرسہ کے ہر فارغ التحصیل کا شمار از خود طبقۂ علما میں ہونے لگے - علما عام طور سے ان لوگوں کو کہا جاتا تھا جو مدرسے کی اعلا تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد درس وتدریس کی ذمہ داریاں سنبھالتے تھے یا حکومت کے شعبہ ہائے امور مذہبی و عدلیہ میں قاضی ، مفتی ، امام ، خطیب وغیرہ کی حیثیت سے ملازمت کرلیتے تھے- بقیہ لوگ جو تکمیل کے بعد کوئی دوسرا پیشہ اختیار کرلیتے تھے ، انہیں ان کے پیشوں کی نسبت سے پہچانا جاتا تھا - غرض کہ اس وقت علما اور غیر علما میں مابہ الامتیاز شے نفس تعلیم نہیں بلکہ تعلیم کے بعد والی زندگی ہوتی تھی -

انیسویں صدی کے شروع ہوتے ہوتے ایسٹ انڈیا کمپنی کی برکت سے ہندستان میں مدرسوں کے بالمقابل ایسے تعلیمی ادارے بھی وجود میں آنے لگے جنہیں ہم آج کی اصطلاح میں اسکول اور کالج کہتے ہیں - یہ

درسگاہیں عموماً کسی نہ کسی عیسائی مشن کی نگرانی میں چلتی تھیں۔ مشن کے اسکول اگرچہ ترقی کی راہ پر تیزی کے ساتھ گامزن تھے تاہم کم از کم نصف صدی تک مدرسوں کی اہمیت میں کمی نہیں آنے پائی کیونکہ اس وقت تک ان مدرسوں کے فارغین کو بھی سرکاری ملازمتوں کے لیے پورے طور سے اہل سمجھا جاتا تھا۔ 1857 کے بعد حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ ہندستان کی برطانوی حکومت نے " اسکولوں " کے مقابلے میں "مدرسوں" کو نظر انداز کرنا شروع کردیا اور رفتہ رفتہ حالات میں اس حد تک تبدیلی آگئی کہ مدرسوں کے فارغ التحصیل طلبہ کے لیے سرکاری ملازمتوں میں معزز عہدے حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے برابر ہوگیا۔ برطانوی حکومت نے مسلمانوں کے قدیم طرز تعلیم کی نہ صرف یہ کہ حوصلہ افزائی نہیں کی بلکہ وہ ان کی راہ میں روڑے اٹکانے کی پالیسی پر عمل کرتی رہی ۔ ان حالات کے پیش نظر ہندستان کے مسلمانوں کو یہ اندازہ لگانے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ انہیں اپنی دینی تعلیم کے لیے حکومت پر انحصار نہیں کرنا چاہیے اور اگر وہ اپنی نئی نسل کو دائرہ اسلام کے اندر رکھنا چاہتے ہوں تو انہیں مدرسوں کو چلانے کے لیے خود اپنے وسائل پر بھروسا کرنا چاہیے ۔ لہٰذا انہوں نے آئندہ پیش آنے والے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس بات کا فیصلہ کیا کہ اپنے بچوں کی مذہبی تعلیم کی غرض سے وہ اپنے ذاتی اور خود مختار مدرسے قائم کرینگے ۔ اس لیے ان اداروں کے انتظامی امور میں سرکاری مداخلت کے پیش نظر انہوں نے سرکاری امداد کو ایک طرح سے اپنے اوپر حرام قرار دے لیا ۔

مندرجہ بالا خطوط پر ہندستان میں قائم ہونے والا ، بلکہ دیکھا جائے تو پوری دنیا میں قائم ہونے والا سب سے پہلا مدرسہ دیوبند کا دارالعلوم تھا جو 1865 میں وجود میں آیا ۔ اور اس کا نام اس کے ایک بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی کے نام پر مدرسہ قاسم العلوم رکھا گیا ، لیکن اب وہ دارالعلوم دیوبند کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے ۔ بانیان دارالعلوم دیوبند کے ذہن میں شروع ہی سے یہ تجویز تھی کہ پورے ملک میں نہیں تو کم از کم شمالی ہندستان میں ایسے مدارس کا ایک جال سا بچھا دیا جائے جو دارالعلوم دیوبند سے الحاق رکھتے ہوں ۔ اس خیال کے تحت 1865 ہی میں سہارن پور میں مدرسہ مظاہر العلوم کا اور 1878 میں مراد آباد میں مدرسہ قاسم العلوم کا قیام عمل میں آیا ۔ یہاں یہ بات واضح کردینی ضروری ہے کہ جس مفہوم میں ہم آج کل کالجوں اور اسکولوں کے بارے میں الحاق کا لفظ بولتے ہیں، اس مفہوم میں مذکورہ بالا دونوں مدرسے یا ان کے بعد قائم ہونے والے مدرسے دارالعلوم دیوبند سے نہ آج ملحق ہیں اور نہ کبھی پہلے تھے ۔ حقیقت یہ ہے کہ آج بھی

اگرچہ ہندستان کے کم و بیش تمام دینی مدارس تقریباً ایک ہی قسم کا نصاب تعلیم پڑھاتے ہیں، لیکن وہ اپنے تعلیمی یا انتظامی معاملات میں کسی مرکزی ہئیت تعلیمی کے ماتحت نہیں ہوتے -

آج ہندستان کا ـــ اور اگر میری معلومات صحیح ہیں تو پاکستان کا بھی ـــ ہر مدرسہ اپنے طلبہ اور اساتذہ کی تعداد ، اپنی تعلیمی کارگزاریوں اور اپنے سالانہ بجٹ کا لحاظ کیے بغیر اپنے کو علوم اسلامیہ کی یونیورسٹی نہیں تو کم از کم کالج ضرور ہی سمجھتا ہے - ملک کے تمام دینی مدارس خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے ، نصاب اور طریق تعلیم و تربیت میں یکسانیت کے باوجود ، اپنی اپنی جگہ پر آزاد ہوتے ہیں - ان کے بڑے حکومت سے امداد نہیں لیتے ، اور چھوٹوں کو ملتی نہیں ، چونکہ ان کی زندگی کا دار ومدار مسلمانوں کے دیے ہوئے منقولہ اور غیر منقولہ عطیات اور چندوں پر ہوتا ہے ، اس لیے یہ تمام مدارس کسی نہ کسی نام سے انتہائی دینی تعلیم کا نصاب اپنے یہاں ضرور رکھتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر انہیں قوم سے معتدبہ چندہ نہیں مل سکتا - نتیجتاً جس علاقے میں صرف دو ایک ثانوی مرحلے تک کے مدرسوں سے کام چل سکتا ہے وہاں بلا ضرورت درجنوں چھوٹے بڑے مدرسے قائم ہوتے ہیں اور ایک طرح سے قومی دولت کے ضائع کرنے کا سبب بنتے ہیں -

برصغیر میں مسلمانوں کی سیاسی بالادستی ختم ہوجانے کے بعد جب ملک کی سرکاری تعلیم گاہوں کے بالمقابل اس زمانے کے صاحب بصیرت علما نے حکومت سے بے تعلق آزاد دینی مدارس کے قیام کا تصور پیش کیا تھا تو ان کے نزدیک بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ دینی اور دنیاوی امور میں مسلمانوں کی رہنمائی کرنے والے لوگ مہیا کیے جائیں - دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ دینی مدارس ایک طرح سے "مسلم قیادت" کی تربیت گاہوں کی حیثیت سے شروع کیے گئے تھے - دینی تعلیم کے مدارس کے قیام کی اس بنیادی غرض و غایت کو ذہن میں رکھتے ہوئے اگر ہم یہ سوال کریں کہ کیا ہمارے موجودہ مدارس اس مقصد کو پورا کررہے ہیں تو جواب غالباً بہت زیادہ خوش آیند نہ ہوگا - ایسا کیوں ہے ، اس کی تفصیل میں یہاں نہیں جایا جاسکتا ، لیکن ہے یہ امر واقعہ کی ہماری دینی تعلیم کے نظام میں کہیں نہ کہیں کوئی ایسی جھول آگئی ہے جس کی وجہ سے چول پر چول نہیں بیٹھ پاتی - الزام ہم خواہ نصاب کے سر دیں ، خواہ نظام کے سر ، نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ہمارے بزرگوں نے "قائدگری" کے جو کارخانے قائم کیے تھے ان سے "فرمائشی مال" ضرورت کے مطابق باہر نہیں آرہا ہے - ستم بالائے ستم یہ ہے کہ دوسرے شعبہ ہائے زندگی کی طرح ہمارے

مدارس بھی " انخلائے ذہن "(BRAIN DRAIN) کی مصیبت کا شکار ہوچکے ہیں ، اور اس معاملے میں صورت حال یہ ہے کہ جو مدرسہ جتنا زیادہ اہم ہے اسے اتنا ہی زیادہ مصیبت کا سامنا ہے ۔

چونکہ ہندستان کی ہئیت تعلیمی میں دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کو سرکاری طور پر " سند یافتہ " نہیں سمجھا جاتا اس لیے سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان پر بالعموم بند ہوتے ہیں ۔ پرائیوٹ فرموں اور صنعتی اداروں میں جگہ حاصل کرنے کے لیے جس صلاحیت اور تربیت کی ضرورت ہے وہ ان میں ہوتی نہیں ۔ اس طرح ہوتا یہ ہے کہ کچھ دنوں کی کشاکش روزگار کے بعد ان میں سے کچھ لوگ تو ملک کی چند گنی چنی اہم اور وقیع دینی درسگاہوں میں ناقابل ذکر مشاہروں پر درس و تدریس کی خدمت انجام دینے لگتے ہیں ، کچھ لوگوں کو ملک میں خود رو پودوں کی طرح اگے ہوئے نام نہاد دینی مدارس میں جگہ مل جاتی ہے ۔ کچھ لوگ مسجدوں میں امامت شروع کردیتے ہیں ، جہاں وہ امامت کے ساتھ ساتھ محلے کے بچوں کو قرآن شریف اور ابتدائی دینیات کی تعلیم بھی دیتے ہیں اور فقیروں کے بھیس میں تماشائے اہل کرم بھی دیکھتے ہیں ۔ کچھ لوگ طبابت کا پیشہ اختیار کرنے کی غرض سے طبیہ کالجوں میں داخلے لیتے ہیں اگر چہ اب طبیہ کالجوں میں داخلہ ملنا بھی کچھ آسان نہیں رہ گیا ہے کیونکہ ان کالجوں میں بھی اب سائنس اور جدید علم العلاج پر ضرورت سے کچھ زیادہ ہی زور دیا جانے لگا ہے ۔ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو خود ایک مدرسہ قائم کرکے بیٹھ جاتے ہیں ۔ جیسا کہ میں نے ابھی بتایا ۔ چونکہ دینی مدارس کے لیے الحاق کا کوئی سوال نہیں ہے ، اور نہ ہی حکومت کے محکمۂ تعلیم سے مدرسے کھولنے کے لیے کبھی اجازت لینے کی ضرورت پڑتی ہے، اس لیے ہر وہ شخص مدرسہ کھول سکتا ہے جس میں لوگوں کی جیبوں سے پیسہ نکلوا لینے کی صلاحیت ہو ۔

یہ تھیں وہ چند صورتیں ، جنہیں ابھی کچھ دنوں پہلے تک دینی مدارس کے طلبہ تکمیل تعلیم کے بعد اپناتے تھے ۔ ان میں سے آمدنی کے لحاظ سے کوئی صورت بھی ایسی نہیں ہے جسے ہم معیاری اور مثالی کہہ سکیں ۔ لیکن اس کے باوجود ان تمام صورتوں میں عالم کی اپنی حیثیت باقی رہ جاتی تھی ۔ لیکن اب کچھ دنوں سے ایک نئی صورت حال کا سامنا ہے ۔ اگر ہم مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کو ان کی ذہانت اور صلاحیت کی بنیاد پر مختلف خانوں میں بانٹ کر یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ یہ لوگ تکمیل تعلیم کے بعد کدھر کا رخ کرتے ہیں تو ہمیں تین سطحیں نظر آئیں گی ۔ ارباب مدارس میری اس

بات کی تائید کریں گے کہ ان کے فارغین میں سے اوپری سطح کے لڑکے مدرسہ کے ساتھ ساتھ ملک کو بھی خیرباد کہہ دیتے ہیں - عرب ممالک کی خیر ہو کہ اب دینی مدارس کے اچھے طلبہ کو وہاں پر معقول وظائف مل جاتے ہیں اور وہ اپنی پڑھی ہوئی چیزوں کو دو ایک برس وہاں کے اساتذہ کے سامنے دہرا لینے کے معاوضہ میں گرانقدر مشاہروں پر ادھر ادھر چلے جاتے ہیں - اس کے بعد "عالم" کی حیثیت سے اگر ان کا وجود باقی رہ بھی جائے — جس کا یقین کم ہی ہے - تو بھی ان کے اپنے ملک کے لوگ ان کی صلاحیتوں سے محروم ہوجاتے ہیں اور اس طرح مستقبل کے قائد سے ہمارا رشتہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جاتا ہے۔

دوسری سطح پر وہ ذہین طلبہ نظر آتے ہیں جو تکمیل کے بعد مکہ اور مدینہ کی یونیورسٹیوں میں تو جگہ نہیں پاتے، لیکن خود ان کے اپنے ملک کی بعض یونیورسٹیاں انہیں خوش آمدید کہتی ہیں - ہندستان میں بعض یونیورسٹیاں ایسی ہیں — اور پاکستان میں تو غالباً سب ہی ہونگی جو گنے چنے دینی مدارس کی سندوں کو جامعاتی تعلیم کے لیے تسلیم کرتی ہیں - یونیورسٹیوں میں جس قسم کے طلبہ آتے ہیں ان کے مقابلے میں دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ اپنی نمایاں شخصیت کے باعث تقریباً ہر میدان میں آگے آجاتے ہیں - اس طرح اگرچہ یونیورسٹیوں کی فضا میں آہستہ آہستہ ایک خوشگوار تبدیلی تو آسکتی ہے بشرطیکہ ایسے طلبہ کان نمک میں جاکر نمک نہ بن جانے کا تہیہ کرلیں، لیکن دینی مدارس کی تہی دامنی میں روز بروز اضافہ ہوتے جانے کا امکان قوی تر ہوتا جاتا ہے - بہرحال یہ طلبہ بھی جدید درسگاہوں میں آجانے کے بعد صاحب علم تو رہتے ہیں، لیکن ان کی عالم کی حیثیت باقی نہیں رہ پاتی -

اوپر کی دونوں سطحوں کے ہٹ جانے کے بعد تیسری سطح پر جو طالب علم بچتے ہیں — اور انہیں میں ہماری اکثریت ان لوگوں کی ہوتی ہے جو ملک یا ملک کے باہر کی یونیورسٹیوں میں اپنی جگہ بنا پاتے — یہی وہ لوگ ہیں جو مسند عالمیت پر متمکن ہوتے ہیں اور انہیں کے ہاتھوں میں دینی قیادت ہوتی ہے - یہی لوگ دینی مدارس میں اپنے اساتذہ کی خالی جگہوں کو پُر کرتے ہیں اور یہی لوگ مستقبل کے قائد بنانے کا فریضہ انجام دیتے ہیں -

انخلائے ذہن کی مصیبت سے تو پوری دنیا دوچار ہے، اس کا علاج دینی مدارس کے پاس ہے نہ دنیاوی مدارس کے پاس - یہ تو ایک ایسی مصیبت ہے جس پر صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں - لیکن اندرون ملک جو

انخلائے ذہن ہورہا ہے اس کو روکنے کے لیے ارباب مدارس کو آج نہیں تو کل غور کرنا پڑے گا ۔ اور یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ خود اپنے نصاب اورنظام تعلیم کو ایسا بنایا جائے کہ اس کی تکمیل کے بعد طالب علم کو کسی دوسرے ادارے کا رخ کرنے کی ضرورت نہ پڑے ، یا پھر ماضی کے ورثے کو متاع عزیز سمجھ کر اس طرح کلیجے سے لگائے رہا جائے کہ مستقبل سے رشتہ ہی کٹ جائے ۔ موجودہ صورت میں مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے تمام چھوٹے بڑے مدارس کی ایک فہرست تیار کی جائے ، پھر دینی تعلیم کو منظم کرنے کے لیے مدارس کی ایک ہئیت مرکزی قائم کی جائے جس سے ہر مدرسے کا الحاق ضروری ہو۔ تمام عطیات اور چندے براہ راست مدارس کو دینے کے بجائے اس ہئیت مرکزی کو دیے جائیں ۔ عمومی چندوں اور عطیات کے علاوہ اس ہئیت مرکزی کی آمدنی کا ایک دوسرا بڑا ذریعہ مسلم اوقاف کو بنایا جاسکتا ہے ۔ تمام ریاستی اور مرکزی وقف بورڈوں کی آمدنی کا ایک حصہ اس ہئیت مرکزی کے لیے نامزد کرایا جانا چاہیے ۔ اس طرح تمام رقوم کو یکجا کرلینے کے بعد یہ ہئیت مرکزی اپنے ممبر مدرسوں میں طلبہ کی تعداد اور ان کی دوسری ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے سالانہ گرانٹ کی شکل میں رقم تقسیم کرے اور اس کے حسابات کی جانچ پڑتال کرتی رہے ۔

اس کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ تمام مدرسوں کی نئی درجہ بندی کی جائے ۔ کچھ مدرسے صرف ابتدائی دینی تعلیم کے ہوں ۔ کچھ ثانوی تعلیم کے مرحلہ تک کے مدرسے ہوں ۔ پورے ملک میں اعلا تعلیم کے مدارس صرف چند ایک ہونے چاہییں ۔ ہر لڑکے کو اس کے رجحان کا خیال کیے بغیر آنکھیں بند کرکے اعلا تعلیم کے مدرسوں میں داخلہ نہ دیا جائے ۔ ابتدائی دینی تعلیم کے بعد جن طلبہ کے بارے میں اندازہ ہو کہ ان میں "عالمیت" کا بار اٹھانے کی صلاحیت ہے، انہیں ثانوی مدارس میں داخلہ دیا جائے ، بقیہ کو ان کے رجحان کا اندازہ کرکے صنعتی علوم یا سماجی علوم کے مدارس میں داخلہ لینے کے لیے کہا جائے ۔ دینی تعلیم کے ثانوی مدارس سے فارغ ہونے کے بعد طلبہ کا ایک بار پھر جائزہ لیا جائے ۔ جو طالب علم اعلا دینی تعلیم کے مدارس میں جگہ دیے جانے کے قابل نہ ہوں انہیں اسی مرحلے پر روک دیا جائے ۔ ثانوی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کے سپرد مسجدوں کی امامت کی جائے ۔ کیونکہ اس مرحلے پر پہنچ جانے کے بعد وہ ان تمام ضروری مسائل سے کما حقہ واقفیت حاصل کرچکے ہونگے جن کی ضرورت انہیں بحیثیت امام کے پڑے گی ۔ یہ امام صرف پنج وقتہ نمازوں کے ہی امام نہ ہونگے بلکہ اپنے محلہ کی دینی اور تعلیمی زندگی کے بھی نگراں ہونگے ۔ ان کی تنخواہوں کے شریفانہ

گریڈ ہوں اور تنخواہ محلوں کے چودھریوں کے ہاتھوں سے ملنے کے بجائے براہ راست ہئیت مرکزی سے ملے تاکہ ان کی عزت نفس باقی رہ سکے اور ہر مقتدی اپنے کو اماموں کا امام نہ سمجھے۔

ثانوی مرحلے کے بعد جو طالب علم اعلا تعلیم کے مدرسوں میں بھیجے جائیں ان کے لیے ایک ایسا نصاب ہو جو دین کے تمام ضروری علوم پر حاوی ہو۔ دینی علوم کے ساتھ ساتھ ضروری دنیاوی علوم کی مبادیات اور خاص طور سے ملک اور بیرون ملک کی دو ایک اہم زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہو۔ طلبہ کو جدید طریق تحقیق سے آگاہ کرایا جائے۔ ایسے مواقع مہیا کیے جائیں کہ وہ مستشرقین کے کارناموں سے براہ راست واقفیت حاصل کرسکیں۔ اس سلسلے میں ایسے کورس رائج کیے جائیں جن کی مدد سے اعلا تعلیم کے مدارس کے طلبہ مستشرقین کو کم از کم انگریزی میں تو ضرور ہی براہ راست پڑھ سکیں اور خود سے کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔

اس مرحلے پر " تقابلی فقہ اسلامی " کے مطالعے پر بھی زور دیا جائے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ایک فقہی مسلک سے تعلق رکھنے والے عالم کو دوسرے فقہی مسلک سے براہ راست واقفیت نہیں ہوتی۔ اپنے مسلک کے علاوہ دوسرے مسلکوں سے انہیں صرف اسی قدر واقفیت ہوتی ہے جتنی اپنی مسلک کی بالا دستی کے ثبوت کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ہونا یہ چاہیے کہ عالم کی نظر دوسرے فقہی مسلکوں پر بھی اتنی ہی گہری ہو جتنی کہ خود اس کے اپنے مسلک پر ہونی چاہیئے دوسرے مسالک کا مطالعہ اس غرض سے نہ کیا جائے کہ اس پر اپنے مسلک کی بالادستی ثابت کرنی ہے، بلکہ اس خیال سے مطالعہ کرنا چاہیے کہ مجتہد کے لیے دوسرے فقہی مسالک کا علم بھی بہت ضروری ہے۔ تقابلی مطالعے کے سلسلے میں کسی زمانے میں یہ عام غلط فہمی تھی کہ اس میں دو مسلکوں کا باہمی مقابلہ کیا جاتا ہے اور اس طرح اونچ نیچ کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ یہ خیال غلط ہے۔ صحیح تقابلی مطالعہ یہ ہے کہ طالب علم دوسروں کے مسلک کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات ذہن میں رکھے کہ اگر وہ خود اس مسلک سے تعلق رکھتا ہوتا تو اس کا نقطۂ نظر مسائلِ زیر بحث میں کیا ہوتا۔ دراصل تقابلی مطالعہ اگر ایک طرف علم کا مطالعہ ہے تو دوسری طرف ان اشخاص کی نفسیات کا بھی مطالعہ ہے جن کا اس مسلک سے تعلق ہوتا ہے۔

غرضیکہ اگر ہم اس پوری بحث کو سمیٹنا چاہیں تو مختصراً کہہ سکتے ہیں کہ:

1۔ مختلف تعلیمی مرحلوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے دینی مدارس کی

درجہ بندی کی جائے اور انہیں ابتدائی ، ثانوی اور اعلا تعلیم کے مراکز میں تقسیم کیا جائے ۔

2۔ ایک ایسی ہئیت مرکزی قائم کی جائے جس سے تمام مدارس کا الحاق ضروری ہو ۔

3۔ مدارس کو انفرادی طور پر چندہ دینے کے بجائے تمام عطیات ہئیت مرکزی کو دیے جائیں اور وہاں سے مدارس کو گرانٹ کے طور پر ضروری امداد دی جائے ۔

4۔ عصری تقاضوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے نصاب تعلیم کو خود کفیل بنایا جائے ۔ طلبہ کو انگریزی اور کم از کم کسی ایک علاقائی زبان سے اچھی طرح واقف کرایا جائے۔

5۔ اعلا درجات میں طلبہ کو تقابلی فقہ اسلامی سے روشناس کرایا جائے ۔

اس سب کے باوجود خدا کی ذات پر بھروسہ رکھا جائے کہ اس کی مدد کے بغیر ہم صرف ہوائی باتیں ہی کرسکتے ہیں ۔ انجام اس کے ہاتھ میں ہے ۔

دینی مدارس اور کالجوں، یونیورسٹیوں کے نصاب اسلامیات کا موازنہ

جناب پروفیسر محمد اسماعیل سیٹھی

علم بہت بڑی دولت اور بنی آدم کے لیے تمام مخلوقات پر فضیلت کا باعث ہے - علم ہی پر قوموں کے مزاج اور کردار کی تشکیل اور ترقی کا دارومدار ہوتا ہے- اسی لیے ہر قوم علم کی ترویج و اشاعت پر اپنی صلاحیتیں صرف کرتی ہے مسلمان ایک نظریاتی قوم ہیں اس کا نظریہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری اور رضا کا حصول ، اور کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری ہے - اور اس نظریہ کی بنیاد پر اسلامی معاشرے اور اسلامی نظام حیات کی تشکیل کی گئی ہے جس کی ایک شاخ "اسلامی نظام تعلیم" ہے- بلکہ یہ اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے بنیاد کا درجہ رکھتی ہے - اس تعلیم کے بدولت وہ افراد پیدا ہوتے ہیں جو اسلامی اخلاق و کردار اور اسلامی ذہن کے حامل ہوتے ہیں پھر وہی لوگ دوسرے افراد کی مذکورہٗ بالا نظریہ کے تحت تعلیم و تربیت کا بیڑا اٹھاتے ہیں اور یوں معاشرے کی طرف سے عائد شدہ دین و دنیا کی بھلائی سے متعلق ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے ہیں حضرت انس رضؓ نے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

التفقه فی الدّین حق علی کل مسلم الاتعلموا و علّموا وتفقهوا ولا تموتوا جهالاً -

اسلامی نظام تعلیم کا اولین مقصد یہ ہے کہ اپنے خاص علم و فن میں مہارت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ایک مسلمان بچہ ایک صالح اور باکردار مسلمان بھی رہے ، جس کا قلب تقویٰ ، خوف خدا اور انسانیت کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبات سے معمور ہو - ضروریات دین اور اسلام کے عقائد کا کامل علم رکھتا ہو ، اور دین کا صحیح معنوں میں داعی ہو - پھر خواہ وہ تاجر رہے یا معلّم ، ملازم پیشہ رہے یا زراعت پیشہ -

علم دین اس لیے حاصل کرنا بھی لازمی ہے کہ اس کے ذریعہ سے حضرت انسان کو اپنی اصل تک رسائی ہوسکتی ہے اور اپنے خالق کی رضا حاصل کرنے کا راستہ معلوم ہوجاتا ہے-

نظام تعلیم کی نشر و اشاعت اور ترویج کے لیے ہر دور میں اس دور کے تقاضوں کے مطابق درسگاہوں اور تعلیم و تعلّم کا سلسلہ قائم رہا ہے جس کی مسلسل ایک تاریخ ہے ، اس کی خدمات ہیں اور اس تعلیم و تعلّم کے سلسلے کے چشمہ فیض سے ہر دور کے لوگ سیراب ہوتے رہے ہیں۔ تا قیامت ان کا فیض جاری رہے گا -

برصغیر میں جب انگریز حکمرانوں نے اپنے قدم جمانے چاہے تو انہوں نے دوسرے اقدامات کے علاوہ لارڈ میکالے کی تجویز پر یہاں کے نظام تعلیم کو بھی بدل دینا چاہا - جس کا خاص اثر مسلمانوں کے قائم نظام تعلیم پر پڑا ، کیونکہ انگریز حکمرانوں کے نظام تعلیم کا کم از کم مقصد مسلمانوں کے دلوں سے دین اور دین کے شعائر کے وقار کو ختم کرکے دنیاوی مقاصد کے حصول کے ذرائع مہیا کرنا تھا - اور یہی ان کی اعلان کردہ پالیسی تھی- اور اسلامی ذہن تبدیل کرنے میں وہ اپنی توقع کے مطابق کامیاب رہے - برصغیر کے مسلمان رہنما اور علما نے دینی مدارس کی موجودہ صورت کی بنا ڈالی اور جگہ جگہ قرآن و سنت کی تعلیم کی درسگاہیں قائم کیں -

دینی مدارس کا نظام تعلیم

کسی بھی نظام تعلیم کا مفہوم نہایت وسعت کا حامل ہوتا ہے اس میں نصاب تعلیم ، طلبہ کی تربیت ، علمی و اخلاقی لحاظ سے ان کی نگرانی مقصودی علوم کی تدریس پر خصوصی توجہ ، طلبہ کے ذہنی تربیت کے ذرائع کا حصول اور ان کی علمی استعداد کے اضافے کے لیے ترغیب و ترہیب کے وسائل کا استعمال ، معلّم و مدرس کی خصوصیات ، طریقہ تدریس ، اوقات تدریس و مطالعہ ، امتحانات کا نظام اور کتب خانوں کا قیام شامل ہے -

عمومی لحاظ سے نظام تعلیم کو زیر بحث لانے سے قبل (کیونکہ نظام تعلیم میں اکثر چیزوں کا تعلق انتظامی امور سے ہے جن میں وقت کے تقاضوں کے مطابق ہر دور میں تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے) یہ بات ذہن نشین رہے کہ دینی مدارس کے قیام کا مقصد دینی تعلیم کے ذریعہ سے بندے کو اس کے خالق سے متعارف کرانا اور انسانی شعور کو تربیت دے کر اس سطح پر لانا کہ وہ خالق و مالک کو جان سکے اور اس کے ساتھ وہ تعلق قائم رکھے جو حقیقت کے لحاظ سے مطلوب ہے -

برصغیر پاک و ہند میں قائم مدارس کا سلسلہ عوامی مالی تعاون کی بنیاد پر چل رہا تھا اور اس لیے انہوں نے اپنے نظام کو حکومتوں کی مداخلت سے آزاد رکھا - یہ درسگاہیں صرف علم کی درسگاہیں نہیں تھیں

بلکہ عملی اور اخلاقی خانقاھیں بھی تھیں - معاشی ترقی اور دنیوی منافع
کا حصول ان کے پیش نظر نہیں تھا بلکہ ان کی توجہ اس طرف تھی کہ
دعوت و تبلیغ کے ذریعہ سے اپنے ہر ہر قول و عمل کے ذریعہ سے طلبہ کو
ایک مثالی با کردار مسلمان بنائیں اور انہیں صحیح علم کی دولت سے مالا
مال کریں -

اسی مقصد عظیم کے حصول کی خاطر وہ تمام درج بالا انتظامات بروئے
کار لائے جاتے تھے طلبہ کو ہر قسم کی آسائش کے انتظامات عوامی چندے
سے کرائے جاتے تھے - خوراک و رہائش ، روشنی اور کتب کا اہتمام مدرسے
کی طرف سے ہوتا تھا - کوئی بھی ایسی سرگرمی جو طلب علم کے حصول
کے شوق اور جذبہ کے خلاف ہوتی اس پر قدغن لگائی جاتی تھی - اس کے
مقابلے میں وہ ذرائع و وسائل اختیار کیے جاتے تھے جس سے طالب علم
کی حصول علم میں دلچسپی پیدا ہوتی اور وہ زیادہ سے زیادہ اپنے شوق کی
تکمیل کا ذریعہ علم کے حصول کو گردانتے تھے -

مدارس کے نظام تعلیم میں استاد و شاگرد کا جو قلبی تعلق ہوتا تھا
اس کو برقرار رکھنے اور اس میں پختگی پیدا کرنے کے جو جو شواہد
سامنے آتے تھے ، ان کے پیش نظر یہ بات بجا طور پر کہی جا سکتی ہے کہ
اس نظام کی کامیابی کی اصل وجہ یہی تعلق تھا - کسی احاطہ یا خاص
بلڈنگ کا نام نہیں ، بلکہ مدرسہ دراصل استاد و شاگرد کا وہ رشتہ ہے جو
ایک بار قائم ہو جائے تو زمانے کی باد مخالف اور مرور ایام اس میں کسی
قسم کا رخنہ نہ ڈال سکے - خواہ یہ رشتہ کسی سایہ دار درخت کے نیچے
قائم ہوا خواہ کسی چبوترے پر -

مختصر یہ کہ کسی بھی نظام کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ اس کے اثرات
سے لگایا جاتا ہے - یہی مدارس تھے جن میں چٹائی پر بیٹھ کر اور روکھا
سوکھا کھا کر پڑھنے والوں میں عظیم محدثین پیدا ہوئے ، مفسرین پیدا
ہوئے یہی دینی ادارے تھے جن میں مناظر ، ادیب ، خطیب اور مصنفین
کی تربیت ہوئی ، جن کی خدمات کا تمام مسلمان برملا اعتراف کرتے ہیں -
قوم کے رہنما اور مجاہدین یہاں تیار ہوئے جنہوں نے ہر دور میں دین کی برتری
قائم رکھنے کے لیے قربانیاں دیں - برصغیر پاک و ہند میں آج کل جو دینی
جذبہ پایا جاتا ہے اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ یہ دینی مدارس کے
قیام و نظام کی وجہ سے ہے - قرآن و احادیث کے علوم کے غلغلے انہی مدارس
سے بلند ہوئے - زمین کے چپے چپے میں قال اللہ اور قال الرسول ؐ کی
صدائیں انہی مدارس نے لگائیں -

دینی مدارس کا وجود خواہ وہ کسی حیثیت سے بھی ہوں اور رہیں گے

بہرحال غنیمت ہے ، لیکن نہایت افسوس ہے کہ اب وہ شمع علوم مصطفوی ، چراغ سحری ہے ۔ اب بعض دینی مدارس میں روحانی تسکین کے وہ ذرائع مہیا نہیں ۔ اب وہ اخلاص کی دولت سے محروم ہوتے جارہے ہیں۔ اکثر درسگاہوں کی حالت یہ ہے کہ اصل مقصد سے چشم پوشی اور پہلو تہی اختیار کی جارہی ہے ۔ خدمت دین کا جذبہ اب قصہ پارینہ بن چکا ہے ، اساتذہ اور طلبہ کے درمیان وہ مخلصانہ اور بے غرضانہ تعلق غبار آلود ہوچکا ہے اور صرف رسمی سارہ گیا ہے ۔ جب استاد کو طلبہ کی تعلیمی استعداد بڑھانے ہی کی کوئی فکر نہیں ہے تو وہ ان کے اعمال و اخلاق کی طرف کیا توجہ دے گا ! سیاست کی بیماری نے بہت سے دینی مدارس کے نظام تعلیم و تربیت کو تہہ و بالا کردیا ہے ۔ منتظمین ، اساتذہ اور طلبہ سابقہ دینی و علمی جذبہ نہ ہونے کی وجہ سے ذہنی تفرق و انتشار کا شکار ہیں ۔ اب یہ ادارے رجال کار پیدا کرنے سے بانجھ ہوچکے ہیں ۔ اب نہ دینی خدمت کے جذبہ کا لگاؤ رکھنے والے پیدا ہوتے ہیں اور نہ ملکی و ملی سطح پر رہنمائی کے اوصاف کے حامل افراد نکلتے ہیں ۔ اب نہ وہ محدث و مفسر بنتے ہیں اور نہ مدرس و مصنف ۔ علمی لحاظ سے تو وہ ابتری کا شکار ہی رہے ہیں عملی لحاظ سے بھی اکثر کے متعلقین کورے ہیں ۔ اب نہ وہ پہلے جیسا اخلاقی تربیت کا انتظام ہے اور نہ روحانی تربیت کی طرف توجہ دی جاتی ہے ۔ جب مدرسین اور منتظمین خود عملی لحاظ سے تہی دامن ہیں تو وہ دوسروں کی تربیت کس بنیاد پر کرسکتے ہیں اور ان سے کیا توقع رکھی جاسکتی ہے ۔ جو خود تربیت یافتہ نہیں وہ دوسروں کی کیا تربیت کرسکیں گے ، جو خود تعلیم کے مقصد کے حصول میں مخلص نہیں ان کی سرگرمیوں سے معاشرے پر کیا مفید اثرات مرتب ہونگے !

ملک میں قائم دینی مدارس میں ربط قائم کرنے کی کوشش کی جارہی ہیں جو ابھی تک پوری طرح بار آور ثابت نہیں ہوسکی ہیں۔ اکثر مدارس میں اصول و ضوابط کا لحاظ نہیں رکھا جاتا ۔ مہتمم اپنے آپ کو خود مختار سمجھتا ہے وہ کسی کے سامنے اپنے آپ کو جوابدہ نہیں سمجھتا ۔ بعض مدارس کی سرپرستی ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو علم کی ضرورت تعلیم و تدریس کی ضروریات اور مدرس و طلبہ کے مقام و ضروریات سے نابلد ہوتے ہیں ۔ مدرسین کو کوئی تحفظ حاصل نہیں ۔ قابل قابل مدرس جو مہتمم حضرات کی مرضی کا لحاظ اور ان کی خوشامد نہیں کرتے اسکولوں میں یا ذاتی کاروبار میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے ہیں اور یوں اپنی ذاتی انا کی خاطر ایک علمی متاع کو ضائع کردیا جاتا ہے ۔

باوجود ان خامیوں اور کوتاہیوں کے پھر بھی نا امید نہیں ہونا چاہیے ۔ اس میں نظام تعلیم کا قصور نہیں ، افراد کا ہے ۔ جب حصول

علم کے مقاصد بدل گئے اور حقیر چیزوں کو مطمح نظر گردانا گیا تو یقینی بات ہے اس کا نتیجہ بھی اسی شکل میں نمودار ہوتا ۔ اگر مخلصانہ کوششیں کی جائیں اور ایک مربوط نظام کے تحت مدارس دینیہ کے نظام کو مرتب کرکے اس کی کڑی نگرانی کی جائے اور حصول علم میں حائل تمام رکاوٹوں کو دور کردیا جائے ، مدرسین اور طلبہ میں دین کا صحیح جذبہ بیدار کیا جائے ۔ مہتممین و منتظمین کو طے شدہ ضوابط کا پابند کرایا جائے اور مدرسین کوتحفظ دیا جائےتو یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ :

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

دینی مدارس کا نصاب تعلیم

دینی مدارس میں رائج نصاب جس کو عام طور پر " درس نظامی " کہا جاتا ہے مولانا نظام الدین سہالوی (المتوفی 1747) کا مرتب کردہ ہے جو بہت بڑے عالم ، فاضل اور بزرگ تھے ۔ اس نصاب کا اصل مقصد قرآن و حدیث اور ان کے متعلقہ علوم میں مطالعے کی استعداد پیدا کرنا تھا ، یعنی طالب علم کو اس مرتب نظام کےتحت وہ وہ علوم پڑھائے جائیں کہ آگے چل کر وہ اپنے مطالعے سے علوم مقصودہ میں رسوخ پیدا کرسکے اور اس کے مطالعے میں گہرائی ہو۔ بعض علوم کی تدریس کو موقوف علیہ کے درجہ میں رکھا گیا ہے ، جیسے علم نحو ،صرف ، منطق ، فلسفہ ،حکمت وغیرہ ۔ اور بعض علوم کو اس دور کے تقاضوں کے مطابق شامل کردیا گیا تھا جیسے قدیم علم الکلام وغیرہ ۔ اس نصاب کی افادیت میں کوئی شک نہیں ۔ اس کے اثرات بھی اظہر من الشمس ہیں ۔ برصغیر پاک و ہند میں جو مشاہیر شخصیات پیدا ہوئیں انہوں نے دینی علوم کے ادارے قائم کیے ، علوم قرآن و حدیث کو فروغ دیا ، وہ اس درس نظامی کے فارغ التحصیل تھے ۔

کافی عرصے سے بعض حلقوں کی جانب سے نصاب تعلیم میں ترمیم و اضافہ کا مسئلہ زیر بحث رہا ہے اور شدت سے اس کی ضرورت کا احساس دلایا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ عصر حاضر کے پیدا شدہ نت نئے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے موجودہ نصاب ناکافی ہے ۔

جہاں تک درس نظامی میں ترمیم کی بات ہے اس سے قبل ایک بات ذہن میں رہے کہ اصل قصور نصاب کا نہیں ہوتا ، بلکہ تعلیم و تدریس کے اسلوب کا ہوتا ہے ۔ نصاب جو بھی ہے اگر طرز تعلیم و تربیت اور طریقہ تدریس کی اصلاح ہوجائے تو یہ نقائص محسوس نہ ہوں ۔

بات یہ نہیں کہ درس نظامی ناکافی ہے یا صحیح استعداد پیدا نہیں کرسکتا ، بلکہ جدید سائنسی علوم اور عالمی معلومات میں مزید رسوخ حاصل کرنے کی ضرورت ہے، یعنی جدید دور کے تقاضوں کے مطابق اس میں ترمیم کی ضرورت ہے - ہر دور میں دینی مدارس کے نصاب میں ترمیمیں ہوچکی ہیں اور موجودہ دور کے بعض علما نے اس کا شدت سے احساس کرکے اس میں ترامیم کرنے کی تجاویز پیش کی ہیں - زمانہ جب بدل گیا ، خیالات بدل گئے ، قوم کی نفسیات بدل گئیں ، جدید ترقی کے دور میں سائنس نے طبیعیات اور اقتصادیات میں نئی راہیں دریافت کیں ، نئے نئے فقہی مسائل کی صورتیں نمودار ہوئیں ، اموال تجارت کے حمل و نقل اور بینکوں کے نظام نے پیچیدہ پیچیدہ مسائل کی صورتیں پیدا کیں تو ان کو زیر بحث لانا اور طے شدہ اصول کے مطابق ان کے احکامات دریافت کرکے قوم کو اس سے آگاہ کرنے کی ضرورت کو سمجھانا بھی اسی نصاب کو پورا کرنا ہے -

دین کے اہم عقائد پر بعض لوگوں نے عقلی جہت سے اعتراض کرنے شروع کردیئے ہیں جس سے ناواقف اور بے سمجھ لوگوں کے خیالات کو تبدیل کیا جاتا ہے - اس کے لیے جدید "علم کلام" کی ضرورت ہے - درس نظامی میں معقولات کو کافی اہمیت دی جاتی ہے قدیم فلسفہ و حکمت اور منطق کی کتب رفتہ رفتہ اس حد تک بڑھا دی گئی ہیں کہ علوم اسلامیہ مقصودہ اس کے نیچے دب کر رہ گئی ہیں - جبکہ معقولات کی تعلیم میں ہم دنیا سے صدیوں پیچھے ہیں - یہ ایسے علوم ہیں کہ رفتار زمانہ نے علمی تجربات و مشاہدات کے ذریعہ سے قدیم نظریات کو باطل قرار دیا ہے اور اب ان کی علمی اہمیت و افادیت ختم ہوچکی ہے - جہاں تک اس کے علمی ورثہ کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ یہ مسلمان ماہرین معقولات کی اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق ایک بہترین کوشش ہے اور اس حد تک اس کو محفوظ رکھنا اشد ضروری ہے لیکن عہد حاضر میں سائنس نے جو تجربات و مشاہدات دنیا کے سامنے پیش کئے ہیں اور انہیں تجربات کی وجہ سے پرانے طے شدہ انسانی ذہن و دماغ کے اختراعی اصولوں کہ توڑ کر نئے قواعد کی بنیاد ڈالی ہے، ان کی تعلیم اور متعلقہ معلومات سے واقفیت ضروری امر ہے -

درس نظامی میں بعض ایسی کتابیں بھی شامل کی گئی ہیں جن میں لفظی مباحث کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور زیادہ زور لفظی مباحث پر دیا جاتا ہے - جو افادیت سے خالی ہے - اصل مقصد کو لفظی پیچیدگیوں میں اس طرح الجھا دیا جاتا ہے کہ طالب علم اس کو نہیں سمجھ پاتا بلکہ اکثر و بیشتر اساتذہ کرام کی نظروں سے بھی اصل

مقصد غائب رہتا ہے - پھر اس نصاب کو اتنا طویل کردیا گیا ہے کہ اس سے ایک عام شخص استفادہ نہیں کرسکتا - دس سالہ نصاب کے لیے آج کی مصروف زندگی میں اتنا وقت صرف کرنا ہر ایک کے بس میں نہیں - علما کو چاہیے کہ وہ اس میں اختصار کوملحوظ رکھتے ہوئے اس کو مرتب کریں اور نہایت ضروری کتب کو شامل کرکے ایک ایسا نصاب تشکیل دیں جس سے عام لکھا پڑھا استفادہ کر سکے اور اس میں قرآن و حدیث کے مطالعہ کا رسوخ بھی پیدا ہوسکے - حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا تجویز کردہ نصاب جو کہ " ضمان التکمیل فی زمان التعجیل " کے نام سے موسوم ہے، نہایت مناسب ہے - ہمیشہ کے لیے درسی کتب کا انتخاب اس نقطہ نظر کے لحاظ سے نہیں کیا جاتا کہ وہ تمام علوم پرمحیط ہو اور کسی اور کتاب کے مطالعے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی جائے - بلکہ ان کتابوں کو منتخب کیا جاتا ہے- کہ جن کو سبقاً سبقاً پڑھ لینے سے پڑھنےوالے کو اس علم کے ساتھ مناسبت پیدا ہوجائےاور وہ اس فن کی اصطلاحات سےواقف ہوتاکہ اس علم کی دوسری کتابیں مطالعہ کرنے میں وہ کسی رہنمائی کا محتاج نہ ہو -

معاشیات ، اقتصادیات ، جدید طبیعیات کو نصاب میں شامل کیا جائے - معلومات جدیدہ کی طرف توجہ دلائی جائے - سائنس کے جدید انکشافات کو زیر بحث لایا جائے - بینکنگ اور سامان کے نقل و حمل کے متعلقہ مسائل کو علیحدہ مضمون کا درجہ دیا جائے -

ضمنی طور پر یہاں ایک بات کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں - وہ یہ کہ جدید سائنسی انکشافات نے اسلام کے عقائد اور بعض اہم اصول دین کو عام لوگوں کے اقرب الی الفہم کردیا ہے - اسلام اور سائنس میں کوئی تضاد نہیں - سائنس نے اسلام کے دلائل میں مزید قوت پیدا کردی ہے - یہ پاپائیت کا پروپیگنڈہ ہے کہ مذہب اور سائنس میں آپس میں تضاد ہے - اس کے پیروکاروں نےاس مفروضے کو خوب ہوا دے کر بعض مسلمانوں کو بھی متاثر کردیا ہے -

اس ضرورت کا بھی تقاضا ہے کہ نصاب میں اس کو بطور مضمون شامل کردیا جائے -

ایک اہم اور ضروری امر یہ بھی ہے کہ دینی مدارس کے نصاب میں شروع دن سے یہ کمی شدت سے محسوس کی جارہی ہے کہ تحریر کی طرف طلبہ کو توجہ نہیں دی جاتی ، جبکہ آج کل دور تحریر کا ہے ، قلم کا زمانہ ہے - دین کے مخالف فتنوں نے ہمیشہ قلم کو استعمال کیا ہے اور اس طریقے سے انہوں نے اپنے خیالات لوگوں تک پہنچائے ہیں - ان کے توڑ کے لیے ضروری ہے کہ دینی مدارس کے نصاب میں یہ بات خاص طورپر ملحوظ رہے کہ تحریرمیں ملکہ

پیدا کرنا ضروری ہوگا ۔ طلبہ کو مختلف موضوعات پر لکھنے کے لیے مقالات دیے جائیں اور اس کو امتحانات میں ایک اہم اور ایک لازمی مضمون کا درجہ دیا جائے جس میں کامیابی ضروری ہو ۔

دینی مدارس اور کالجوں ، یونیورسٹیوں کے نصاب اسلامیات کا موازنہ

دینی مدارس کا نظام اور نصاب تعلیم اور ان کے مقاصد کے متعلق تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ دینی مدارس کے قیام کا مقصد ہی روز اوّل سے اسلامیات کی تعلیمات اور اس کے مطابق عملی و اخلاقی تربیت ہے جبکہ کالجز اور یونیورسٹیز میں اسلامیات کی تعلیم کا مقصد بجائے مذہبی فریضہ کے دنیوی اغراض کے حصول کا سہل طریقہ خیال کیا جاتا ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مقاصد میں اتنے عظیم تفاوت سے دونوں درسگاہوں کے نصاب کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے ۔

اسلامیات کے نصاب میں تفسیری اور احادیثی علوم کو مرکزی اہمیت ہونی چاہیے ۔ کالجوں میں بی ۔ اے کی سطح پر چند مختصر سورتوں کے لفظی ترجموں اور یونیورسٹی کی سطح پر ایم ۔ اے کے درجے میں دو تین پاروں کے ترجمے سے اصل مقصد حاصل نہیں کیا جاسکتا ۔ عصری درسگاہوں میں اسلامیات کے متعلقہ معلومات تو پڑھاتے جاتے ہیں، لیکن جس کو علم کہا جاتا ہے جو ایک ملکہ راسخہ ہوتا ہے جس سے فروعات کا استنباط کیا جاتا ہے، وہ پیدا نہیں کیا جاتا ۔ صرف ایک سرسری مضمون ہے جس میں زیادہ تر زور تاریخ پر دیا جاتا ہے ۔ اور اسلامی تاریخ کو اسلامیات کا ایک اہم جزو قرار دیا گیا ہے ۔ اسلامی تاریخ کی افادیت سے انکار ممکن نہیں، لیکن وہ ایک مستقل موضوع ہے ، اسلامی علوم کے ساتھ اس کو شامل نہیں کیا جاسکتا ۔

دینی مدارس کے اساتذہ کے حوالہ اسی علم کے کتب کی تدریس کی جاتی ہے جس میں ان کو کافی دسترس حاصل ہے ، اور عمیق مطالعہ اور متعلقہ علم میں کافی تجربہ کا حامل ہو ۔ جبکہ کالج اور یونیورسٹی میں اس سلسلے میں اساتذہ کرام کی علمی استعداد اور تدریس کی صلاحیت سے تہی دانی کا عام طور پر مشاہدہ ہوتا رہتا ہے ۔ اگر طالب علم غیرنصابی سرگرمیوں کی وجہ سے عدم دلچسپی کا شکار ہے تو اساتذہ کرام میں وہ دل سوزی اور جان گدازی کے اوصاف ناپید ہیں جو ایک استاد کا طرۂ امتیاز ہوتا تھا ۔

یہ قصور اور کوتاہی اساتذہ کرام یا طلبہ کی نہیں بلکہ اس نظام کی ہے جس کے تحت اس ملک میں نظام تعلیم کو دو حصوں میں تقسیم کردیا

گیا ہے اور دونوں کے درمیان ایک ایسی خلیج حائل کردی گئی ہے کہ ایک دوسرے کے قریب آنے کے بجائے وہ ایک دوسرے سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔طرفہ تماشا یہ کہ مضرت رساں سمجھنے کے باوجود ہٹایا نہیں جاتا اور نہ کسی کو یہ توفیق ہوتی ہے کہ اس کو ہٹانے کی فکر کرے ۔ اس نے اہل علم حضرات کے دو طبقوں کو جنم دیا ہے ۔ دینی مدارس میں پروان چڑھنے والا نوجوان جدید معلومات سے محروم ہے ، اور اسے اس محرومی تک کا احساس نہیں ، وہ قدیم ریاضی سے تو واقف ہے، لیکن جدید ریاضی کے نظریات تک سے بے خبر ہے ۔ علم طبیعیات کے فیثا غوری نظریات کا تو وہ قائل ہے ،لیکن جدید تجربات و مشاہدات نے قدیم نظریات کی جس طرح تردید کی ہے اور ان کا ابطال کیا ہے اس سے وہ نابلد ہے ۔ ادوار سابقہ میں پیدا شدہ فتنوں کی گمراہیوں اور ان کے دلائل کی تردید کرنا تو وہ جانتا ہے ، لیکن جدید دور کی فکری گمراہیوں سے ناواقف ہے ۔

دوسری طرف کالج کا نوجوان دین کی تمام بنیادی ضروریات کے علم اور ان کی ضرورت و اہمیت سے محروم ہے اسے اسلامی عقائد ، اعمال ،کردار اور تاریخ کا پورا علم نہیں ۔ اسے اسلامیات کی برائے نام تعلیم دی جاتی ہے ان کے اکثر اساتذہ اسلامی تعلیم و تربیت اور اسلامی روایات سے برگشتہ ہوتے ہیں ، تو ایسے نظام سے بہتری کی کیا توقع رکھی جاسکتی ہے ؟

ہونا تو یہ چاہیے کہ کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر جو بھی علم یا فن پڑھایا جائے ، کوشش یہ کی جائے کہ اس میں اسلامی نظریات کو اجاگر کیا جائے ۔ مثلاً معاشیات کا جو مضمون آج کل عصری درسگاہوں میں پڑھایا جاتا ہے وہاں سرمایہ داری ، سود ، اور سوشلزم و کمیونزم کے ذکر سے تو کتابیں بھری نظر آتی ہیں اور ایک پروفیسر بھی انہیں لگے بندھے موضوعات سے بحث کرتا ہے ، جبکہ اسلامی معاشیات کو معاشیات کے مضمون تک سے خارج کردیا گیا ہے اور طلبہ کو یہ تک بتانا گوارا نہیں کیا جاتا کہ اسلام بھی ایک معاشی نظام رکھتا ہے ۔ یہی حال دوسرے مضامین کا ہے ۔ تو چاہیے یہ کہ ہر مضمون کو جب پڑھایا جائے تو اس میں اسلامی رنگ غالب ہو ۔ تب کہیں وہ افراد پیدا ہوں جو ستاروں پر کمندیں ڈال سکیں اور اقبال کے " مرد مومن " کے صفات کے حامل ہوں ۔

دو نظام ہائے تعلیم کی موجودگی کے اثرات و نتائج

گزشتہ زمانے میں مسلمانوں نے اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم کی بھی ترویج کی ، لیکن مرور ایآم کے ساتھ مغربی تعلیمات کے زیر اثر SECULAR اور دینی معلومات کے الگ الگ شعبے بن گئے ۔

تعلیم کے الگ الگ شعبوں میں بٹ جانے سے اسلامی تہذیب و ثقافت کو نقصان یہ ہوا کہ طلبہ کا دائرہ نگاہ محدود ہوگیا اور وہ ایک محدود استعداد حاصل کرنے کے اہل رہ گئے ۔ دنیاوی امور میں ان کا حصہ بہت کم رہ گیا اور معاشی میدان میں وہ دوسروں کے مقابلے میں پیچھے رہ گئے ۔

اسلامی علم کی تقسیم نہیں کی جاسکتی ، کوئی علم بھی اسلام کے خلاف نہیں کہا جاسکتا ، جب تک طلبہ دوسرے مذاہب اور سائنسی علوم کا مطالعہ نہ کریں ، وہ اسلامی نظریات کی نشرو اشاعت میں دقت محسوس کریں گے ۔

غیر مسلم اقوام کو اسلام سے روشناس کرانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انہیں استدلال و براہین کے ساتھ اسلام کی عظمت اور اس کے ہمہ گیر آفاقی اور لازوال اقدار سے آگاہ کیا جائے اور ایک راسخ عقیدہ طلبہ کے اذہان میں پیدا کیا جائے تاکہ وہ دوسرے نظریات کا کما حقہ جواب دے سکیں اور ان کا اپنا ایمان بھی قوی رہے ۔ اسلام کے خلاف نظریات رکھنے والے استدلال ، مشاہدات اور تجربات سے سائنسی علوم کو پیش کرتے ہیں ۔ ان کے مقابلے میں اسلامی نظریات بھی جہاں تک بھی ممکن ہو براز مقصدیت (OBJECTIVITY) اور سائنسی طور طریقۂ سے پیش کرنی چاہیں ۔ لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کی اساس اللہ تعالیٰ ، پیغمبروں ، یوم آخرت اور ایمان بالغیب رکھنے پر ہے جن کو تجربہ گاہوں ، اور دلائل و براہین سے ثابت کرنا ممکن نہیں ۔ اسی طرح سائنسی علوم کی تحقیقات اور نظریات بھی مستقل حقیقت (TRUTH) نہیں ہیں ، بلکہ وقت اور تجربوں سے بدلتی رہتی ہیں ۔ آج ایک چیز کو حقیقت سمجھتے ہیں تو کل دوسری چیز کو ایسا کیوں ہے ؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی عقل محدود ہے اور عقل سے ماورا ، باتوں کو سمجھنے سے قاصر ہے ۔

بعض لوگ یہ چاہتے ہیں کہ دینی مدارس کے نصاب میں دوسرے علوم بھی شامل کردیے جائیں تاکہ فارغ التحصیل طلبہ کو روزگار کے مواقع مل سکیں ۔ ایک حد تک یہ نظریہ صحیح ہے لیکن دوسری جانب یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ دوسرے علوم کے حاصل کرنے کے بعد کتنے سند یافتہ اصحاب بے روزگار پھر رہے ہیں ۔ اگر دوسرے علوم میں متخصصین (SPECIALISTS) پیدا کیے جارہے ہیں ۔ تو دینی علوم کے متخصصین کیوں نہ ہوں ، ان علوم کی اہمیت دوسرے علوم سے کسی طور پر کم نہیں ہے ۔ اور بعض اساتذہ یہ سمجھتے ہیں کہ دونوں علوم کے یکجا کرنے سے

سے وہ تخصیص (SPECIALIZATION) ختم ہوجائیگی جو علوم دین اسلام کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے لازمی ہے اورعالم اسلام میں اتحاد ویگانگت پیدا کرنے کا واحد ذریعہ ہے - بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ الگ الگ حصوں میں زندگی کو تقسیم نہیں کیا جاسکتا ، اسلام زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے - جسمانی ، معاشرتی ، اقتصادی ، سیاسی ثقافتی اور روحانی تمام شعبوں پر مشتمل ہےاس لیے دینی علوم کے ساتھ ساتھ ہر طالبعلم کو دوسرے علوم بھی سیکھنے چاہییں- اس سے ایک مکمل شخصیت ابھرتی ہے - دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ اخراجات تعلیم میں کمی ہوسکتی ہے جو الگ الگ درسگاہوں کےقائم کرنے پر ہوتی ہے- ایک وقت ایسا گزر چکا ہے کہ جب فقہاےاسلام نہ صرف دینی علوم سے بلکہ ادب ،قانون طب اور نجوم میں بھی کافی دسترس رکھتے تھے اورکوئی بھی علم ان کی نظر میں غیر اسلامی نہیں تھا ، ظاہرھے کہ جب تک کوئی غیر مسلموں کے عقائد اور ان کےعلوم سے واقف نہ ہو ان پرتنقید کیسےکرسکتا ہے-اور گمراہوں کو کیسے راہ مستقیم پر لاسکتا ہے !

قرآن پاک میں جہاں ایمان بالغیب کی تاکید کی گئی ہے وہاں مشاہدات اور استدلال پر بھی زور دیا گیا ہے - لیکن اگر صرف استدلال اور تجربات پرھی زور دیا جائے تو اعتقاد بالغیب قائم نہیں رہ سکتا ، اور ہر بات مادی نظریات سے دیکھی جائے گی - ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے ضرورت اس امر کی ہے کہ دینی مدارس کےنصاب پر نظر ثانی کی جائے اور کچھ بنیادی علوم شامل کئے جائیں - مثلاً جنرل سائنس ، تاریخ ، اقتصادیات -

اسی طرح یونیورسٹیوں میں بنیادی اسلامی تعلیمات شامل نصاب کرنی چاہییں تاکہ فارغ التحصیل طلبہ صرفسیکولر اقدار کے حامل ہی نہ ہوں اور اصل مقصد تخلیق سےبےخبر بھی‌نہ ہوں - ارشاد باری تعالیٰ ہے :

" وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون " عبادت ہی مقصود تخلیق ہے اور جب تک ایمان اور راسخ عقیدہ پیدا نہ ہو انسان اس مقصد تخلیق کو پورا نہیں کرسکتا - اس کے لیے دینی تعلیم کی از حد ضرورت ہے - یونیورسٹیوں میں اخلاقی بے راہروی ، جنگ وجدال ، ہڑتالوں کی مثالیں ہمارے سامنےہیں - اس کی ایک بنیادی وجہ یہی سیکولر تعلیم اور مغربی اقدار ہیں - اس کے برعکس دینی مدارس میں نہ کبھی ہڑتال نہ جنگ و فساد اور نہ ہی اخلاقی بے راہروی نظر آتی ہے - باوجود اس امر کے کہ دینی مدارس کےاساتذہ کی تنخواہیں بہت کم ہیں طلبہ کے لیے ہوسٹل وغیرہ کی سہولتیں ناپید ہیں - اوقات تعلیم مقابلۃً زیادہ

ھیں -

دینی مدارس کے فارغ التحصیل۔	ایم -اے اسلامیات کے سند یافتہ
1- قرآن و حدیث اور دیگر متعلقہ مقصودی علوم کے سمجھنے کے لیے عربی گریمر اور اس کے متعلقات پڑھانے کو دینی مدارس میں کافی اھمیت دی جاتی ھے۔ پانچ ابتدائی سالوں میں مسلسل علم نحو ، علم صرف اور علم اشتقاق کی کتابیں پڑھائی جاتی ھیں - ان کتابوں میں مندرج اصول و قواعد کا باقاعدہ عملی اجرا کرایا جاتا ھے - تاکہ عربی ادب میں خوب مہارت حاصل ھوسکے - اس کی وجہ سے دینی مدارس کے فارغ التحصیل اپنے متعلقہ علوم میں کافی دسترس کے مالک ھوتے ھیں- ان کے مطالعے میں وسعت پائی جاتی ھے اور فکر میں رسوخ ھوتا ھے -	1- یونیورسٹیوں میں عام طور پر ایم -اے -اسلامیات کا کورس دو سالوں پر مشتمل ھوتا ھے ان دو سالوں میں صرف ایک پیریڈ گریمر کے پڑھانے کا رکھا جاتا ھے -اور وہ صرف گریمر کے ایک مختصر رسالہ کی پڑھائی تک محدود ھوتا ھے۔اس کے اصول و ضوابط کے عملی اجرا کا نہ تو لحاظ رکھا جاتا ھے -اور نہ ھی اس کی افادیت کی طرف توجہ مبذول کرائی جاتی ھے۔ اکثر طلبہ ماضی اور مضارع کے صیغوں میں فرق کرنے سے قاصر ھوتے ھیں چہ جائیکہ کہ وہ تعلیلات اور صرفی ونحوی قوانین کا اجرا کرکے کسی مستعمل لفظ کا اصل تک معلوم کرسکیں - ڈگری تو ان کو مل جاتی ھے اور دینی معلومات میں بھی یقیناً اضافہ محسوس ھوتا ھوگا، لیکن دینی علوم میں رسوخ مطالعہ کی وسعت اور فکر کی پختگی سے وہ کوسوں دور ھوتے ھیں -
2- دینی مدارس میں جو علوم پڑھائے جاتے ھیں - ان تمام علوم کے مبادی ، اصول ،قواعد و ضوابط اور قوانین سے آگاہی	2- یہاں حدیث و فقہ کے چند ابواب کے پڑھانے پر اکتفاء کیا جاتا ھے۔تفسیر میں چند سورتوں کے بعض حصوں کی

دلانی مقصود ہوتی ہے ۔
مقصودی علوم (تفسیر ،حدیث فقہ) کے کتابوں سے قبل ان کے اصول پڑھائے جاتے ہیں ۔ جس کی وجہ سے طالب علم میں ایک ملکہ راسخہ پیدا ہوتا ہے ، جس سے وہ جزئیات کا استنباط ، صحیح و موضوع میں فرق و امتیاز کرنے کے قابل ہوتا ہے ۔

تفسیر شامل نصاب ہے ۔
اصول فقہ ، اصول حدیث اور اصول تفسیر کی کتابیں اور ان علوم کی اصطلاحات کے متعلق کتب ، مطول کتب کے طور پر شامل نصاب کیے گئے ہیں ۔

3۔ دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کا علوم کے حصول کا اصل مقصد قرآن و حدیث کا سمجھنا اور سمجھانا اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی ہوتی ہے ۔

3۔ ایم ۔ اے اسلامیات کرنے والوں کا مقصد اولین سرکاری ملازمت کا حصول ہوتا ہے جس کا منتہا دولت کمانا ہے ۔

4۔ مدارس دینیہ شروع دن سے آج تک اپنے مقاصد کی تکمیل میں کامیاب ثابت ہوئے ہیں ، نیک صالح اور باکردار مسلمان تیار کرنے میں دینی مدارس کا وافر حصہ ہے ۔ مصنف ، ادیب ، خطیب اور مجاہد دینی مدارس سے نکلے ہیں ۔ دینی مدارس کا فارغ التحصیل ایک اسلامی معاشرے کی اصلاح میں ایک موثر کردار شمار ہوتا ہے۔

4۔ یونیورسٹیاں ، اپنے قیام کے روز اول سے اگر ان کا مقصد ملازم پیشہ افراد تیار کرنا ہے تو کسی قدر کامیاب ہیں۔ ورنہ دوسرے کسی پہلو سے اسلام کے لیے صحیح طور پر مفید افراد پیدا کرنے سے وہ قاصر ہیں ۔

5۔ دینی مدارس کے طلبہ کی باقاعدہ علمی اور اخلاقی تربیت کی جاتی ہے ۔ تعلیمی اوقات کے دوران بھی اور دارالاقامہ میں بھی ان کے سارے معمولات اساتذہ کرام کی نگرانی میں ہوتے ہیں ۔ اس لیے وہاں سے فارغ التحصیل اگر

5۔ یہاں صرف تعلیم کا انتظام تو ہے جب کہ علمی اور اخلاقی لحاظ سے ان کی کوئی نگرانی نہیں کی جاتی ۔ حتیٰ کہ اساتذہ سے ان کا کسی قدر جو تعلق ہوتا ہے وہ صرف درسگاہ اور تعلیمی اوقات

عالم ہے تو اپنے علم پر عمل کرنے والا بھی ہے ۔

تک محدود ہوتا ہے جس کی وجہ سے ایم ۔ اے اسلامیات عملی لحاظ سے کورے ہوتے ہیں ۔

6۔ دینی مدارس کے فارغ التحصیل علما جہاں علم کے حصول کے مقاصد کے حصول میں کامیاب ہیں تو تقریباً نوے فی صد برسر روزگار بھی ہوتے ہیں ۔ وہ ہر قسم کی دینی ، ملکی ، قومی اور سماجی خدمت انجام دے رہے ہیں ۔

6۔ یونیورسٹیوں کے ایم ۔ اے اسلامیات کی سند کے حامل افراد اگر ایک طرف دینی علوم سے کما حقہ بہرہ ور نہیں تو ان کی اکثریت تقریباً ستر فی صد روزگار کی تلاش میں سرگرداں پھرتی ہے ۔ مختلف دفاتر اور اداروں کی خاک چھانتی ہے ۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے گھر بار ، خاندان اور ملک و قوم پر ایک بار گراں ہوتے ہیں ۔

پاکستان کا موجودہ نظام اور نصاب تعلیم

جناب پروفیسر عبدالمنان

ہمدرد پاکستان کے زیر اہتمام اس چوتھے مذاکرۂ ملّی تعلیمات نبوی میں ملک و ملّت کے مسائل کے پیش نظر تعلیم ملّی کا تذکرہ فکر و نظر اور وسیع معلومات کا حامل ہے۔ اس میں میرے لیے جس عنوان کا تعین کیا گیا ہے وہ " پاکستان کا موجودہ نظام اور نصاب تعلیم — ایک محاکمہ " ہے۔ یہ موضوع تقاضا کرتا ہے کہ یہ جائزہ تعلیمات نبوی ؐ کے نقطۂ نظر سے لیا جائے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی مملکت معرض وجود میں آتی ہے تو اس کی بنیاد جغرافیائی وحدتوں ، وہاں کے رہنے والوں کے رنگ ، نسل ، زبان اور ان کی مخصوص روایات اور ان کی تہذیب اور تمدن پر قائم ہوتی ہے۔ اور جس بنیاد زیست پر بھی وہ ملک چل رہا ہو اسکی بقا کے لیے اس کے باشندوں کی عام ترقی و خوشحالی کے جذبات ، دیگر طور طریقے اور نظام تعلیم و تربیت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اور مخصوص تمدن ، روایات اور طور طریقوں کو پیش نظر رکھ کر مملکت کے لیے جادۂ راہ متعین کیا جاتا ہے۔

پاکستان خوش قسمتی سے وہ ملک ہے جس کی تشکیل جغرافیائی حدود ، طبقات ، زبان اور رنگ و نسل پر نہیں رکھی گئی ہے بلکہ یہ خالصتاً ایک ایسی وحدتِ نظر پر قائم ہوا ہے جس کی اساس دینِ فطرت ہے اور جس کی بنیاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبال یوں نشاندہی کرتے ہیں۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

اور اس راہ کو پانے کے لیے دوسری جگہ حضرت علامہ صاحب قوم کی یوں راہنمائی فرماتے ہیں:

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش
براہ دیگراں رفتن عذاب است

گر از دست تو کارِ نادر آید
گنا ہے ہم اگر باشد ثواب است

برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کے وقت جہاں اس کے باشندوں کے درمیان رسم و رواج ، رہن سہن ، رنگ و نسل ، زبان ، لباس ، خوراک ، اٹھنے بیٹھنے اور سلام و کلام کے طریقوں میں بنیادی فرق تھا وہاں اللہ کے فضل سے مسلمان من حیث القوم ایک صحیح قیادت کے زیر سایہ ایک پلیٹ فارم پر جمع بھی ہوگئے اور اسلامی ضابطۂ حیات کو اپنانے کے خیال سے ایک علاحدہ مملکت بنانے کے لیے آگے بڑھے ۔ ان کا نعرہ تھا، " پاکستان کا مطلب کیا ! لا الہ الاّ اللہ محمد الرّسول اللہ " ۔ الحمد اللہ کہ ہمیں ایک ایسا خطۂ زمین مل گیا جہاں ہم بہ سہولت اسلامی اقدار اور روایات کے مطابق زندگی گزار سکتے ہیں ۔ مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی جداگانہ ریاست حاصل ہوجائے جہاں ہم دین فطرت کے مطابق عمل پیرا ہوسکیں اور آزادی سے سوچ سکیں اور کام کرسکیں ، جہاں نظام ملی کی بنیاد شریعت اسلامی ہو اور اس طرح سے مسلمانوں کی نہ صرف سیاسی و اقتصادی زندگی سدھر سکے بلکہ ان کی اخلاقی زندگی بھی درست ہوسکے ۔

قیام پاکستان سے قبل غیر ملکیوں نے جو نظام تعلیم نافذ کیا تھا وہ ان کے اپنے مفادات کے پیش نظر تشکیل دیا گیا تھا ۔ وہ اپنی خدمت کے لیے ہم میں ایسے " بابو " لوگ پیدا کرنا چاہتے تھے جو ان کی انتظامیہ چلانے کے لیے نچلے درجہ کی اسامیوں پُر تعینات کیے جاسکیں ۔ غلامی کے اس دور میں ایک لمبے عرصے کے لیے غیر ملکی طرز تعلیم کی وجہ سے مسلمانوں میں سائنسدان پیدا نہ ہوسکے البتہ انگریزوں کے آخری زمانے میں انگلیوں پر گنے جانے والے چند ایسے باشعور آدمی پیدا ہوسکے جو غیر ملکیوں کی عادات و اطوار سے آشنا اور دامے درمے سخنے قدمے ، قوم کی راہنمائی کے لیے کمر بستہ تھے ۔ ان میں محمد علی جوہر اور قائد اعظم محمد علی جناح کے اسمائے گرامی سرفہرست ہیں ان کے علاوہ علامہ اقبال نے حدی خوان کا کام سر انجام دیا ۔ ایک زمانہ تھا جب فارسی زبان دفتری زبان تھی اس زبان سے ہماری تاریخ و ثقافت اور دین و مذہب کی ترویج و اشاعت کا کام بڑی خوبی سے انجام دیا گیا تھا ۔ مگر مسلمانوں کی تہذیب کو ملیا میٹ کرنے کے لیے سرے سے فارسی زبان کو ختم کردیا گیا اور اس طرح سے ہماری تاریخ اور مذہبی شعائر کا تحریری قیمتی اثاثہ طاق نسیان کا شکار ہوگیا ۔ وطن عزیز میں مشہور مقامات پر جو بھی لائبریریاں موجود ہیں اور جن میں فارسی کی گراں قدر تصنیفات

محفوظ ہیں اب وہ سب بیکار اور بوسیدہ ہوتی جارہی ہیں،کیونکہ اب فارسی سمجھنے والے یا تو بالکل ختم ہوچکے ہیں اور اگر تھوڑے بہت رہ بھی گئے ہیں تو ختم ہورہے ہیں - فارسی کے ساتھ " اردو " کو بھی مسخ کرنے میں غیر ملکیوں نےکوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی پھر قبل از تقسیم ہندوؤں نے " وارد ھا سکیم " اور دوسری ایسی ہی زہریلی تحریکوں کے ذریعے سے اسے بالکل ہی برباد کرنے میں سر دھڑ کی بازی لگادی -

دنیا کےہر معاشرہ میں علم اور ذریعہ تعلیم کےلیے قومی زبان کے استعمال کی اہمیت اور ضرورت کو تسلیم کیا جاتارہا ہے اور ہر قوم نے اپنی ترقی کے لیے علم کی اشاعت اور اسے رواج دینے کی انتہائی کوشش جاری رکھی ہے - تخلیق آدم کے وقت آدم کو علم کی بنا پر فرشتوں پر فضلیت عطا کی گئی تھی اور اسلام علم کو بنیادی اور اوّلین ضرورت سمجھتا ہے۔ چوں کہ اسلام کے اوّلین مخاطبین اہل عرب تھے ، لہذا ان کی آسانی کے لیے قرآن کی زبان عربی ہے جو موقع و محل کے مناسبت سے اسی وقت ضروری بھی تھا - علم کی فضیلت کی تصدیق کے طور پر اللّٰہ تعالٰی نے غار حرا میں پہلی وحی اتاری - تو اس کا اوّل حکم تھا، " اقرا " "(اے محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم) پڑھ - اپنے رب کے نام سے جس نے (ساری مخلوقات اور کائنات) کو پیدا کیا اور رب تیرا بہت کریم ہے جس نے علم عطا کیا قلم کے ساتھ (تحریری صورت میں) " - دوسری جگہ زیادہ علم کی دعا مانگنے کی ترغیب دلائی، " میرے آقا میرے علم میں اضافہ فرما " - ایک جگہ حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ کی زبان سے یہ دعا منگوائی گئی کہ " اے اللّٰہ تعالٰی ، اس امت (مسلمان) کے لیے ایک نبی بھیج جو انہیں علم اور دانائی کی تعلیم دے " -

علم کی اس اہمیت کے پیش نظر اللّٰہ تعالٰی نے انبیا و رسل کو معلّم بنا کر بھیجا اور تعلیم و تربیت کو ان کا اوّلین فریضہ ٹھہرایا - آپ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے اپنے بارے میں خود فرمایا ہے ،" انی بعثت معلماً "، میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں - آں حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی پوری پیغمبرانہ زندگی علم و عمل کا نمونہ رہی ہے - ان کی تعلیم ایسی جامع تھی جو انسان کی ہر شعبۂ زندگی میں راہنمائی کرتی ہے - ایک کامیاب معلّم کے لیے زیور تعلیم سے آراستہ ہونا بنیادی ضرورت ہے-حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی زندگی سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ تدریس و تعلیم کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ صرف لیکچر دیا جائے ، خواہ طالب علم کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آئے بلکہ صحیح تدریس یہ ہے کہ اپنی بات ہر ممکنہ طریقے سے

اس طرح سمجھائی جائے کہ متعلم کی سمجھ میں آجائے ۔ دوسرے یہ کہ علم سے خود بھی فائدہ اٹھایا جائے اور جس چیز کا علم ہو اس پر عمل کیا جائے ۔ اگر علم سے انسان کی تہذیب و تربیت میں کچھ مدد نہ ملے اور اس کے کردار پر اس کا کوئی نمایاں اثر نہ ہو تو ایسے علم کا حصول بے فائدہ ہے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ایسے علم کے حصول کی حوصلہ شکنی کرتا ہے جو بے مقصد اور محض کسبِ معاش کی خاطر ہو اور اس امر کی تاکید کرتا ہے کہ تعلیم کا اصلی مقصد تہذیبِ اخلاق اور تربیتِ کردار ہے ۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کو ایسا اعلا مقام دیا ہے کہ اس کا حصول مرد اور عورت دونوں کے لیے یکساں طور پر لازم قرار دیا ۔ فرمایا، " طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة "، یعنی طلب علم مسلمان اور عورت دونوں پر فرض ہے ۔ مدینہ منورہ میں آتے ہی آپ نے جو سب سے پہلا کام کیا وہ مسجد نبوی کی تعمیر تھی اور اس عمارت کے ایک حصے میں چبوترہ اور سائبان لگوایا جسے عربی میں " صفہ " کہتے ہیں ۔ یہ ایک اقامتی درسگاہ تھی جہاں ایسے اساتذہ مقرر کیے گئے تھے جن کے ذمے وہاں کے لوگوں کو سکھانا پڑھانا تھا ۔ ان اساتذہ میں عبداللہ بن سعد بن العاص اور عبادہ بن الصامت جیسے لوگ بھی مقرر تھے ۔ ہجرت سے قبل آپ نے کاتبوں کو مقرر فرمایا تھا جن کا کام یہ تھا کہ جیسے جیسے وحی نازل ہوتی رہے اسے ضبط تحریر میں لایا جائے ۔ صفہ کے علاوہ مدینہ میں نو مساجد اور دار القرا تھے جو علمی درسگاہوں کے طور پر استعمال ہوتے تھے ۔ آپ نے ہفتہ میں ایک روز اس لیے مقرر کیا تھا کہ آپ اس روز عورتوں کے خصوصی اجتماعات میں تشریف لے جاتے اور ان کو تعلیم دیتے ۔

آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معلمین کے فرائض کے ضمن میں ارشاد فرمایا ہے کہ معلم کے لیے ضروری ہے کہ وہ جو کچھ علم رکھتا ہو اسے دوسروں تک پہنچانے میں بخل سے کام نہ لے ۔ آپ خود بھی اس پر عمل پیرا تھے ۔ ہماری بد قسمتی سے آج کل علم تجارتی طور پر مارکیٹ میں بیچا جاتا ہے اور سر عام طلبہ سے ٹیوشن کے نام سے سینکڑوں روپے بٹورے جاتے ہیں ۔ علم کے فیض کے چشمے خشک ہوتے جا رہے ہیں ۔ علم اگر برتا نہ جائے تو پھر ایسے علم کا کیا فائدہ ! اگر علم انسان میں فرائضِ علم کی تحریک پیدا نہ کرسکے تو ایسا علم بیکار ہے ۔ جو شخص علم کے نام پر دنیا طلب کرے اللہ تعالیٰ اس کے دل کو اندھا کردیتا ہے ۔ علم محنت سے آتا ہے اور اس کے لیے لگن کی ضرورت ہے ۔ علم کا شوق

آدمی کو زندگی بھر طالب علم بنائے رکھتا ہے ۔

بنیادی طور پر ہمارا موجودہ نظام تعلیم جو انگریز سامراج کی مخصوص ذہنیت پر تشکیل دیا گیا ہے اس کی ابتدا ہی اس مقصد سے کی گئی تھی کہ مسلمان قوم کی ذہنیت میں پستی پیدا ہو اور وہ پھر سے تازہ دم ہوکر سر نہ اٹھا سکے ۔ ویسے ہم جانتے ہیں تعلیم کا بدیہی مقصد اپنی حقیقت اور خدا کی پہچان ہے ۔ تعلیم جو مذہب سے بیگانہ بناتی ہے وہ محض تضیع اوقات ہے ۔ کیا خوب علامہ اقبال نے فرمایا :

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں ، محفلِ انجم بھی نہیں

معیار تعلیم گر جانے کی دوسری اہم وجہ مخلوط تعلیم ہے جس کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ مرد اور عورت صلاحیتوں کے لحاظ سے برابر ہیں اور پھر وہ کام جو مرد کرسکتا ہے وہ عورت بھی کرسکتی ہے حالانکہ اپنی ساخت و پرداخت کے بنا پر دونوں کو مختلف قسم کے فرائض انجام دینے کے لیے پیدا کیا گیا ہے ۔ ضروری تو یہ تھا کہ ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام ان کی مزاجی اور جسمانی کیفیتوں کو سامنے رکھ کر کیا جاتا، لیکن ہو یہ رہا ہے کہ انہیں ایک ہی رسی میں باندھ کر ھانکا جا رہا ہے ۔ آج کل کا ذریعہ تعلیم طلبہ و طالبات کی توجہ اسلامی تعلیم سے ہٹانے کا ایک بہت بڑا سبب ہے ۔ مخلوط کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طالب علم (طلبہ و طالبات دونوں) کا مقصد اپنے جنسِ مخالف کی توجہ کا مرکز بننا ہوتا ہے اور تعلیم جس ذہنی یکسوئی کا مطالبہ کرتی ہے وہ ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتی ہے ۔ ضروری یہ ہے کہ طلبہ و طالبات کے لیے علاحدہ علاحدہ تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں ۔ کتنے ہی خاندان ہیں جو مخلوط تعلیمی اداروں میں لڑکیوں کو بھیجنا پسند نہیں کرتے اور ان کی تعلیم بہت بڑے پیمانے پر متاثر ہورہی ہے ۔ پاکستان میں معاشرتی استحکام کے نقطہ نظر سے ضروری ہے کہ عورتوں کی ناخواندگی دور کی جائے اور ان کے لیے جلد از جلد علاحدہ تعلیمی ادارے وسیع پیمانے پر کھولے جائیں ۔ عورت اور مرد کی مزاجی کیفیت بالکل الگ الگ ہے اور ایک مناسب نظام تعلیم میں اس بات کا خاص خیال رکھنا ازحد ضروری ہے کہ عورتوں کی تعلیم و تربیت ان کی فطری جسمانی اور مزاجی کیفیت کے عین مطابق ہو ۔ خواتین یونیورسٹیوں کا قیام از بس ضروری ہے، لیکن اس ضمن میں جو تجویز پیش کی گئی ہے وہ ھنوز سرخ فیتے کے اثر سے آزاد نہیں ہوسکی ۔ عورتوں کے لیے علمی تدبیر ، خانہ داری ، اسلامی علوم ، علم صحت کا پڑھانا ایک ضرورت ہے تاکہ وہ اپنے عمومی فرائض خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں ۔

اس ضمن میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے انتظامات کا ذکر بھی ضروری ہے ۔ ان کے رجحانِ طبع کا خیال رکھنا ضروری ہے ۔ گھر کا ماحول ، والدین اور بھائی بہنوں کا علمی اور تعلیمی معیار ان بچوں کی صلاحیتوں پر خوشگوار اثر ڈالتا ہے ۔ مغربی ممالک میں چھوٹے بچوں کے لیے خوش رنگ و خوش نما تصویری کتابیں پورے اہتمام کے ساتھ تیار کی جاتی ہیں ۔

ہمارے ہاں جو پبلک اسکول آئے دن کھل رہے ہیں ، ان میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے اور ان اسکولوں میں طلبہ کو کتابیں مہیا ضرور کی جاتی ہیں مگر وہاں بڑی بڑی فیسوں ، لباس اور کتاب کاپیوں پر جو خرچ آتا ہے وہ عام آدمی کی دسترس سے باہر ہے ۔ مخصوص گھرانوں کے بچے ان میں داخلہ لے سکتے ہیں ۔ ان کے مقابلے میں سرکاری پرائمری ، مڈل سکول اور ہائی سکول ایسے ہیں جن کا تعلیمی معیار بہت پست ہے اور اس طرح سے تعلیم طبقاتی مسئلہ بنتی جا رہی ہے جو اسلامی طرز تعلیم کے سراسر منافی ہے ۔

اسکول جانے والے بچے کے لیے اسکول جاتے وقت ناشتے کے لیے پیسے دینا اور انہیں بازار کی ناقابل اعتبار اشیا کھانے کا موقع فراہم کرنا، بچوں کی صحت کے لیے نقصان دہ اور ضرر رساں ہے ۔ بد قسمتی سے ہمارے بچے اس کا شکار ہیں ۔ بچوں کو اسکول جاتے وقت گھر کی تیار چیزیں دینی چاہئیں تاکہ ہضم و نظم بہتر طور پر عمل میں آسکے ۔ نظام تعلیم کے تحت جس میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ 1985 میں ذریعہ تعلیم اردو زبان بن جائے گی، سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر پبلک اسکول جو کمرشل ادارے بن رہے ہیں اور جن کی زبان انگریزی ، طرز تعلیم کی ہے ان کو دھڑا دھڑ کھولنے کی کیا ضرورت ہے ۔

الغرض ہمیں طریق تعلیم مغربی فکر کے خطوط پر نہیں بلکہ آسان اسلامی سوچ کے مطابق تشکیل دینا چاہیے ۔ اس میں یہ خیال رکھنا ضروری ٹھہرتا ہے کہ بچوں کو بھاری بھرکم کتابوں کے بوجھ تلے لادنا نہیں چاہیے اور تعلیم کو بچوں ، بڑوں اور مرد و عورت کے لیے عام فہم بنانا ضروری ہے ، جو ان کی سمجھ میں آسانی سے آسکے اور ان کی قابلیتوں کو جلا بخش سکے ۔ تعلیم دوسروں تک پہنچانے کا مقصد پیسے کمانا نہ ہو بلکہ اس میں قوم کو درست طور پر چلانے کی نیت کارفرما ہو ۔ معلم، کردار ساز ہو اور طالب علم کا مقصدِ حیات ہی حصولِ علم ، اور دوسری آلائشوں سے اپنے کو بچائے رکھنا ہو ۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اساتذہ ، طلبہ و طالبات علم کے میدان میں اپنے لیے اپنے ہادیِ برحق اور معلمِ اعظم کے مثالی کردار کو نمونہ بنائیں اور اگر ایسا

کیا گیا تو ہمارے بہت سے تعلیمی مسائل حل ہوجائیں گے ۔ اساتذہ میں ذمہ داری کا احساس ہوگا اور طلبہ اپنے اساتذہ کا احترام کرنا سیکھیں گے ۔

بخود خزیدہ و محکم چوں کوہساراں زی
چو خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بے باک است

اقبال

پاکستان کا فرسودہ نظامِ تعلیم

جناب پروفیسر ڈاکٹر سردار احمد خان

مسلم ہندستان میں تعلیم کا بندوبست مقامی حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس طرح کیا گیا تھا کہ وہ ساری دنیائے اسلام کے مروجہ بندوبست تعلیم سے ہم آہنگ رہے۔ نصاب تعلیم کی تیاری میں علمائے اسلام کے اجتماعی فلسفہ تعلیم کی روح کو جاری و ساری رکھنے پر پوری توجہ دی جاتی تھی۔ اس طرح عالم اسلام کی درس گاہوں کے بندوبست تعلیم اور نصاب میں کامل یکسانیت بھی موجود تھی اور تقریباً معیار بھی ایک جیسا تھا طالب علموں کو اس طرح زیور علم سے آراستہ کیا جاتا تھا کہ وہ دینی اور اخلاقی اعتبار سے مثالی انسان ثابت ہوں اور اپنے دور کے تقاضوں اور ضروریات سے بھی عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

تقریباً سولہویں صدی عیسوی سے ہم نے تحقیق وجستجو سے جی چرانا شروع کیا اور رفتہ رفتہ سائنسی علوم کو اپنے نصاب سے خارج کردیا۔

انگریزوں نے اپنے دور حکومت میں تعلیم کا بندوبست اپنی سیاسی مصلحتوں سے کیا۔ یہ تعلیم روزی کمانے کا ذریعہ تو بنی، لیکن دینی اور اخلاقی قدروں کو پامال کرگئی۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا آسان ہوجاتا ہے کہ بندوبست تعلیم وہی سود مند ہوتا ہے جس میں دینی اور دنیاوی علوم کی تدریس ہموار اور متوازن انداز میں فراہم کی جائے اور طالب علموں کی مرحلہ وار ذہنی اور فکری تربیت کا اہتمام کیا جائے۔ یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ مسلم قوم کا مزاج اور اس کی ضروریات دوسری قوموں سے مختلف ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ غلط انداز فکر کے باعث دوسروں کے نظریات کو قبول کرلیا جائے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ تقلید ہم کو نہ راس آئی ہے اور نہ کبھی راس آئے گی۔ تجربہ شاہد ہے کہ انگریزوں کے وضع کردہ نصاب تعلیم کو بر صغیر کی دوسری قوموں نے بے چوں و چرا قبول کرلیا تھا، لیکن ہمارے اسلاف نے اس سے اتفاق نہیں کیا اور اس کی مضرتوں کے ازالے کے لیے اسلامی تعلیم کے بنیادی اصولوں سے مدد لیتے رہے۔

آزادی کے بعد تعلیم مادی منافع کے حصول کا ذریعہ سمجھی جانے لگی۔ دولت مند طبقے نے غیر ملکی درس گاہوں کا رخ کیا یا اپنے بچوں کے لیے مخصوص قسم کی درس گاہیں قائم کرلیں۔ کوئی شک نہیں کہ ان درس گاہوں کا معیار تعلیم مروجہ نصاب تعلیم کے دائرے میں رہتے ہوئے اچھا ہے،

ڈسپلین قابل تعریف ہے ۔نہایت سلیقے سے تعلیم پر توجہ دی جاتی ہے ۔ اس کے برعکس وہ ادارے جہاں کے اخراجات کم ہیں اور جن میں اکثریت اوسط درجے کے طلبہ کی ہے نہ وہاں معیار تعلیم اچھا ہے اور نہ نظم و ضبط پایا جاتا ہے ۔اگر صاحب حیثیت طبقہ اپنے بچوں کو معیاری تعلیم دلاکر اعلا مناصب پر فائز کرانا چاہتا ہے تو یاد رکھنا چاہیے کہ چند پڑھے لکھے بے شمار ان پڑھ اور غیر منظم اکثریت کو قابو میں نہیں رکھ سکتے۔ قوم کے مفاد میں ہے کہ ہر فرد کی تعلیم و تربیت کا یکساں معیار ہو ورنہ معاشرے میں شدید خلفشار برپا ہوگا ۔جس کے آثار ظاہر ہونے لگے ہیں۔ اسلامی معاشرے میں مراعات یافتہ طبقے کا کوئی تصور نہیں ہے لہذا تعلیم جیسے اہم مسئلے میں دوہرا معیار امیروں اور غریبوں دونوں کے لئے تباہ کن ثابت ہوگا ۔ایک بہترین امت کی تشکیل کے لیے قرآن پاک میں جو طریقہ کار بیان کیا گیا ہے یقیناً پاکستان میں ایک کامیاب تعلیمی پالیسی کی بنیاد بن سکتا ہے ۔سورہ البقرہ کی ۱۲۹ آیت میں اللہ پاک حضرت ابراہیم اورحضرت اسمعٰیل کی دعا کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں :—

یتلوا علیھم ایتک و یعلمھم الکتب و الحکمۃ و یزکیھم

(جو آپ کی آیات پڑھ کر سنائے ۔کتاب اور روحانی بصیرت کی تعلیم دے اور پاکیزہ بنائے)

اس آیت کریمہ سے مندرجہ ذیل تعلیمی اصول وضع ہوتے ہیں :

۱ ۔ملت کا یکساں معیار تعلیم ہونا چاہیے
۲ ۔ہر فرد کی زندگی احکام الٰہی کی تابع ہو
۳ ۔ہر فرد اسلام کا نمائندہ اور مبلغ ہو
۴۔انفرادی اور اجتماعی طور سے اعلا صلاحیتوں کو بیدار کیا جائے
۵ ۔تعلیم کے ساتھ تربیت بھی ہو اور سیرت و کردار کو بہترین سانچے میں ڈھالا جائے ۔

ماضی میں ان اصولوں پر عمل کرنے کی وجہ سے ملت مسلمہ اسلام کی نمائندہ اور مبلغ بنی،احکام الٰہی کی تابع ہوئی اور احکام الٰہی کو بجالانے کے ذوق و شوق نے دیگر فنون اور حرفتوں کو وسعت دینے پر متوجہ کیا،سائنس اور ٹیکنالوجی میں حیرت انگیز طور پر ترقی کی۔گویا کتاب الٰہی کو بنیاد بناکر تدریسی عمل وضع کیا جائے تو دنیاوی علوم از خود وجود میں آتے ہیں اور یہ نوع انسانی کی بھلائی کا سبب بنتے ہیں ۔

آزادی کے بعد ہم کو دو قسم کے طرز تعلیم سے واسطہ پڑا

۱۔مذہبی طرز تعلیم

۲ ۔مغربی لادینی تعلیم

مذہبی طرز تعلیم جدید علوم سے نا بلد ۔مغربی لادینی طرز تعلیم

دینی علوم سے بے بہرہ - دونوں یک رخے ، دونوں بے اثر - قیام پاکستان سے لے کر آج تک بہت سی تعلیمی پالیسیاں بنیں، لیکن سب بے اثر ثابت ہوئیں نئی نسل علم و ہنر سے دُور جہلِ خرد میں مخمور ، ہاتھوں میں ڈگریاں لیے سر گشتہ و برگشتہ افتاں و خیزاں نامعلوم منزل کی طرف رواں ہے نہایت ضروری ہے کہ کم سے کم وقت میں کارآمد اور سود مند تعلیم کا بند وبست کیا جائے نہایت عجز و نیاز، خلوص و دردمندی کے ساتھ آپ جیسے صاحبان علم و دانش کے سامنے چند تجاویز پیش کرنے کی جسارت اس توقع اور استدعا کے ساتھ کروں گا کہ آپ اپنی بصیرت و بصارت ، فطانت و ذہانت سے ان کو اور مفید بنائیں اور مطالعہ کریں کہ اگر ملک و قوم کی بقا مطلوب ہے تو جلد از جلد ان سفارشات پر عمل کیا جائے -

بند وبست تعلیم

۱ - مرکزی اور صوبائی وزارت تعلیم کہنہ مشق اساتذہ کو تفویض کرنا چاہیے -

۲ - مرکزی اور صوبائی محکمہ تعلیم کے انتظامی شعبے میں مدرسین کو متعین کیا جائے -

۳ - ہر درس گاہ کو خواہ پرائمری ہو ، ثانوی ہو ، کالج ہو یا یونیورسٹی ایک تعلیمی اکائی قرار دیا جائے اور اس کے سربراہ کو مکمل خود مختار اور ازاد ماحول فراہم کیا جائے - وہ اپنی درس گاہ کے تمام مسائل حل کرنے پر قادر ہو اور افسران بالا سے کم سے کم رجوع کرنا پڑے - سربراہ کی بے دست و پائی سے تعلیمی اور انتظامی مسائل پیدا ہوتے ہیں - طلبہ میں شورش اور بے چینی پیدا ہوتی ہے - با اختیار سربراہ پیدا شدہ مسئلہ کو بر وقت حل کرکے ادارہ کے معیار کو بلند کرسکتا ہے - سر براہ کا یہ فرض ہے کہ وہ مقامی آبادی کو درس گاہ کی امداد پر آمادہ کرے تاکہ تعلیم کا سارا بار حکومت پر نہ پڑے - ہر سربراہ سکریٹری تعلیم کو جوابدہ ہوگا - درمیان کے جو تمام صیغے ہیں ان کو ختم کردینا چاہیے - سربراہ کی صلاحیت کا اندازہ اس کی درس گاہ کے معیار اور سالانہ نتائج سے کیا جائے گا - با صلاحیت سربراہ کی بہتر طور حوصلہ افزائی ضروری ہے - اسلامی نظام تعلیم میں صدر مدرس کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے اس کو وسیع اختیارات دیے گئے ہیں - اس سے درس گاہ کا تقدس برقرار رہتا ہے - اساتذہ کے وقار میں اضافہ ہوتا ہے -

اساتذہ کا انتخاب

یاد رکھنا چاہیے کہ اچھے سے اچھا نصاب تعلیم بے اثر ثابت ہوگا اگر اساتذہ موزوں اور مناسب نہ ہوں - بد ترین سے بد ترین نصاب تعلیم کی مضرتیں زائل ہوجائیں گی اگر لائق اساتذہ دستیاب ہوجائیں - تدریس کا ملکہ عطیۂ الٰہی ہے ، اس لیے ان کا انتخاب ، شخصیت ، سیرت و کردار ، علم و تجربہ اور تدریس سے فطری شغف کی بنا پر کرنا چاہیے - ہم نے پرائمری ، ثانوی ، کالج اور یونیورسٹی کے اساتذہ کے درمیان تفریق

پیدا کررکھی ہے جس کے باعث اساتذہ میں معاشی اور سماجی اعتبار سے کمتر اور برتر کا ناپسندیدہ تصور پیدا ہوگیا ہے ۔ خاص طور سے پرائمری اساتذہ کو نہ ہم نے کوئی مقام دیا ہے اور نہ مرتبہ حالانکہ قومی تعلیم میں سب سے زیادہ جانکاہی ان ہی کو کرنا پڑتی ہے ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر استاد کی کم سے کم تعلیمی سند ماسٹر ڈگری مقرر کی جائے ۔ اس کا ابتدائی تقرر پرائمری سطح سے کیا جائے اور بر بنائے لیاقت و تجربہ کالج اور یونیورسٹی کی سطح تک ترقی کے مراحل طے کرے ۔ براہ راست تقرریوں کا سلسلہ ختم ہونا چاہیے ۔ درس گاہ کے سربراہ کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ وہ اعلا صلاحیت والے افراد کو اپنی درس گاہ میں شامل کرسکے ۔

ہر استاد کے لیے لازمی ہے کہ وہ اپنے شعبہ سے متعلق تخلیقی اور تحقیقی کام کرے ۔ اس کی ترقی کا انحصار اس کی تدریسی اور تخلیقی صلاحیت پر ہونا چاہیے ۔ برا ماننے کی بات نہیں، اس وقت اضافی کام کرنا تو کجا اساتذہ روز مرہ کے تدریسی فرائض ادا کرنے سے بھی پہلو تہی کرتے ہیں ۔

اساتذہ کی تربیت

ہمارے ملک میں پرائمری اور ثانوی درس گاہوں کے اساتذہ کے لیے پیشہ ورانہ اسناد کا حصول لازمی ہے ، جبکہ کالج اور یونیورسٹی میں صرف ماسٹر ڈگری کافی سمجھی جاتی ہے ۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پیشہ وارانہ ڈگریاں ہی افضلیت اور لیاقت کی علامت ہیں تو کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر بھی تربیت یافتہ افراد کو مقرر کرنا چاہیے ۔ اور اگر کالج یا یونیورسٹی میں محض ڈگری یافتہ افراد پڑھا سکتے ہیں تو پرائمری اور ثانوی درس گاہوں کے اساتذہ کی دستاروں میں تربیت یافتہ ہونے کا طرہ لگانا کیوں ضروری ہے ۔ یہ اساتذہ زندگی بھر پرائمری یا ثانوی سطح پر کام کرتے رہتے ہیں، اعلا صلاحیت اور تدریسی ملکہ ہونے کے باوجود ان کے لیے ترقی کے تمام راستے مسدود ہیں ۔

جہاں تک ٹریننگ اسکولوں اور کالجوں کا تعلق ہے، ان پر کثیر سرمایہ صرف ہوتا ہے، لیکن ان کی کارکردگی انتہائی ناقص ہے ۔ جو کورس مروج ہے وہ مضحکہ خیز ، بے معنی ، بے مقصد اور یورپ کی اندھی تقلید ہے ۔ پورے یقین و اعتماد سے کہا جاسکتا ہے کہ تربیت یافتہ افراد سے کہیں بہتر طریقہ سے نا تربیت یافتہ افراد کام کرتے ہیں ۔ نہ ہمارا مزاج ہے ، نہ ہمارے حالات ہیں اور نہ ہمارے وسائل ہیں کہ مغربی ممالک کے تربیتی طریقۂ تدریس کو نافذ کرسکیں ۔ ان تربیتی اداروں کو اگر تحقیقی مراکز میں تبدیل کردیا جائے تو بہتر نتائج نکل سکتے ہیں ۔

نصاب تعلیم کی تیاری

نصاب تعلیم مرتب کرتے وقت علوم کے ارتقائی پہلو کو تفصیل سے بیان کیا جائے اور قرآن پاک اور احادیث کی روشنی میں ان علوم کی وضاحت کرنا چاہیے ۔اس بات کی تصریح کرنا چاہیے کہ مسلمانوں نے ان علوم و فنون کو کتنی ترقی دی اور کیا کیا ایجادات ، اختراعات اور انکشافات کیے ــــ
اسکے بعد مغربی مفکرین کے جدید تصورات اور نظریات کا لادینی تصورات سے موازنہ کرکے دلوں میں راسخ کردینا چاہیے کہ اسلامی تصورات بہر نوع لادینی نظریات سے درست ، قابل عمل اور کارآمد و مفید ہیں ۔اس وقت نصاب تعلیم کے تعین اور اشاعت کے ادارے پہلی جماعت سے لے کر بارھویں جماعت تک کے نصاب مرتب کرکے شائع کرتے ہیں ۔مروجہ درسی کتب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ موضوعات اور اسباق کے مندرجات کے مابین کوئی ارتباط موجود نہیں ہے ۔ضخیم کتابوں کی بھر مار اور ورک بکوں کی بہتات ہے ۔ منظور نظر افراد نصاب مرتب کرتے ہیں جس میں نہ قومی امنگوں کی آئینہ داری ہے اور نہ مقصدیت ۔ضروری ہے کہ کتابوں کی تیاری کھلے مقابلہ کے ذریعہ ہو ۔یہ بات ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اس وقت اگر نصاب پرائمری کا بنتا ہے تو اسکے مرتبین ثانوی ، کالجوں بلکہ یونیورسٹی کی سطح کے اساتذہ ہوتے ہیں۔ یہ اگر ایک طرف پرائمری کی سطح کے استادوں کی توہین اور حق تلفی ہے تو دوسری طرف ان اساتذہ کی بے جا مداخلت ہے جو پرائمری کی سطح کی تعلیم سے تعلق نہیں رکھتے ۔ہر سطح کے اساتذہ کو اپنے دائرے میں رہ کر نصاب مرتب کرنے کا موقع ملنا چاہیے ۔اس طرح جو نصاب تیار ہوگا وہ عملی دشواریوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے تیار کیا جائے گا ۔نصاب کی تیاری میں تمام ملک کے اساتذہ کو شریک کرنا چاہیے اور اہل الرائے افراد بہترین نصابی کتاب کا انتخاب کریں ۔اس سے اساتذہ کی فکری اور تخلیقی صلاحیتیں اجاگر ہوں گی اور ان کو اعزاز حاصل ہوگا ۔مالی فوائد حاصل ہوں گے ۔مفید صحتمند اور موزوں نصاب بنے گا ۔تاجروں اور اشاعتی اداروں کے مابین گٹھ جوڑ نہ ہوسکے گا ۔معیاری کتابیں وقت پر میسر آئیں گی ۔
نصاب تعلیم پورے ملک کے لئے ایک جیسا ہو اور ہر پانچ سال کے بعد وقت کی ضرورت کے تحت نصاب پر نظر ثانی کی جائے اور مناسب اضافے کئیے جائیں ۔ اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ سائنسی مضامین میں نظری تدریس سے پہلے عملی تدریس کا اہتمام ہو ۔تاکہ طالب علم اس لائق ہوں کہ بات سمجھ سکیں اور تخلیقی صلاحیت کو بروئے کار لاسکیں ۔

مرحلہ وار مدت تعلیم اور نصاب

پرائمری تعلیم کا مرحلہ

ہر بچے کو زیادہ سے زیادہ پانچ سال کی عمر میں اسکول میں داخل

ہوجانا چاہیے اور زیادہ سے زیادہ دس سال کی عمر میں پرائمری تعلیم کا مرحلہ سر کرلینا چاہیے ۔

نصاب

۱ ۔ قومی زبان : قومی زبان کی تدریس کے لیے جو کتابیں مرتب کی جائیں ان میں درجہ بدرجہ رسول پاک صم کی پیدائش سے وصال تک کی تاریخ آسان طریقہ سے مکمل کرادی جائے ۔
۲ ۔ علاقائی زبان : آداب زندگی ۔ مذہبی ، علاقائی معلومات پر مبنی اسباق ۔
۳ ۔ قرآن پاک : جماعت وار قرآن پاک کا مکمل ناظرہ اور تیسویں پارے کا آخری نصف حفظ کرادیا جائے ۔
۴ ۔ اسلامی تعلیم : وضو ، اذان ، نماز ، امامت ، نماز جنازہ ، غسل میت نکاح اور ارکان اسلام اوز عقاید سے مکمل آگاہی اور عملی تربیت ۔
۵ ۔ خوش خطی اور ڈرائنگ ۔
۶ حساب
۷ ۔ عسکری تعلیم : عسکری قواعد ، ورزش میں مکمل مہارت ۔
۸ ۔ سماجی بہبود : اسکول کی صفائی کلاس کی ترئین ، باغبانی ، شجر کاری ۔
۹ ۔ کھیل :

توقع کی جاتی ہے کہ پرائمری سطح عبور کرنے کے بعد بچہ قومی اور علاقائی زبانیں لکھ پڑھ اور بول سکے گا ۔ اسی سطح سے ان بچوں کا انتخاب کیا جاسکتا ہے جو قرأت سیکھنا اور قرآن پاک حفظ کرنا چاہتے ہوں ۔ ان بچوں کو ساری مدت تعلیم تک خصوصی وظائف ملنا چاہیے اور تعلیم کے تمام اخراجات درسگاہ کے فنڈ سے ادا کئے جائیں ۔

ثانوی تعلیم کا مرحلہ

ہر بچہ کو زیادہ سے زیادہ سولہ سال کی عمر میں ثانوی سطح عبور کرلینا چاہیے ۔

نصاب :

لازمی مضامین

۱ ۔ قومی زبان : درجہ بدرجہ خلفائے راشدین کی تاریخ مکمل ہوجانا چاہیے ۔
۲ ۔ انگریزی زبان : ان کتابوں کے اسباق مشاہیر اسلام ۔ اسلامی تصورقومیت و اخلاق اور پاکستان تحریک پر مبنی ہونا چاہیے ۔

۳ ۔اسلامی تعلیم : تفسیر:قومی زبان میں ترجمہ کلام پاک
حدیث : قومی زبان میں مذہب ، عبادات اور معاملات پر مبنی احادیث کی تدریس
فقہ : قومی زبان میں معاشرتی ، اخلاقی اور خانگی مسائل کی تدریس۔

۴ ۔ ریاضی : آسان

۵ ۔ جغرافیہ : درجہ بدرجہ ملکی اور عالمی ۔

۶ ۔عسکری تعلیم : قواعد ۔سول ڈیفنس کی مکمل تربیت ۔نرسنگ۔ ابتدائی طبی امداد۔

۷ ۔سماجی بہبود : درس گاہ کی صفائی اور مرمت میں عملی شرکت ۔ شجر کاری ۔باغبانی۔

۸ ۔ کھیل :

اختیاری مضامین

۱ ۔سائنسی علوم کی مشاہداتی اور عملی تدریس اور پھر نظری تدریس۔
۲ ۔فنون
۳ ۔تجارت
۴ ۔پیشہ ورانہ تعلیم
۵ ۔حفظ کلام پاک / قرأت

ڈگری سطح کی تعلیم کا مرحلہ

پاکستان میں شرح اوسط عمر زیادہ سے زیادہ پینتالیس سال ہے لہذا حصول تعلیم پر عمر کا بڑا حصہ صرف کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی چنانچہ اعلا ثانوی تعلیم کے مروجہ مرحلے کے دو سالوں کو ثانوی اور ڈگری کی تعلیم کی مدت میں ضم کرنا پڑےگا ۔کیونکہ میٹرک (ثانوی) اور انٹر (اعلی ثانوی) کے معیار میں کوئی خاص فرق نہیں ہے ، چنانچہ ہر طالب علم کو زیادہ سے زیادہ اٹھارہ سال کی عمر میں ڈگری کی سطح عبور کرلینا چاہیے ۔

نصاب

لازمی مضامین :

۱ ۔انگریزی زبان : سیرت و کردار کی تشکیل اور انگریزی ادب سے روشناس ہونے میں مدد دینے والے اسباق ۔

۲ ۔اسلامی تعلیم : تفسیر:قومی زبان میں کلام پاک کا ترجمہ اور تشریح۔
حدیث: قومی زبان میں معاشرتی ، اخلاقی اور سیاسی موضوعات پر مبنی احادیث کی تشریح۔

فقه : قوانین اسلامی کی تدریس اور تشریح۔
۳ ۔ عسکری تعلیم : دوسری دفاعی صف کے معیار کی تعلیم اور تربیت۔
۴ ۔ سماجی بہبود : قومی ترقیاتی کاموں میں عملی خدمت ۔ حادثات اور آفات میں عملی خدمات ۔
۵ ۔ کھیل

اختیاری مضامین

۱ ۔ کل سائنس علوم، پہلے مشاہداتی اور عملی تدریس پھر نظری تدریس
۲ ۔ جملہ فنون
۳ ۔ تجارت
۴ ۔ پیشہ ورانہ تعلیم

ماسٹر ڈگری

دو سال کا یہ کورس زیادہ سے زیادہ بیس سال کی عمر میں مکمل ہوجانا چاہیے ۔

مضامین

۱ ۔ کل سائنس مضامین	ایم ایس سی
۲ ۔ کل فنون و ادبیات	ایم ۔ اے
۳ ۔ تجارت	ایم کام

۴ ۔ عسکری تعلیم : دوسری دفاعی صف کے معیار کی تعلیم اور تربیت
۵ ۔ سماجی بہبود : قومی ترقیاتی کاموں میں عملی خدمات
۶ ۔ کھیل

ثانوی اور اعلا ثانوی تعلیمی بورڈ

میٹرک اور انٹر کے امتحانات لینے والے بورڈ محض رجسٹریشن دفاتر کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ یہاں کی ملازمتیں ناجائز مالی منفعتوں کا بڑا ذریعہ ہیں ۔ قومی تعلیم کی فروغ میں ان اداروں کا کوئی حصہ نہیں جب کہ یونیورسٹیاں جو فروغ علم کے سب سے بڑے ادارے ہیں، مالی بحران سے دوچار رہتے ہیں ۔ لہذا امتحانات یونیورسٹیوں کے ذریعہ لیے جائیں۔ اس سے معیار بہتر ہوگا اور یونیورسٹیوں کی آمدنی میں اضافہ ہوگا ۔

امتحانات

تمام ملک کا نصاب تعلیم اور معیار تعلیم یکساں ہونا چاہیے ۔ پورے ملک میں امتحانات موسم بہار کے آخر یعنی اپریل کے مہینے میں ہوجانا چاہیے ۔ پرچے اس طرح بنائے جائیں کہ نقل کرنے کی کم سے کم گنجائش ہو ۔ اگر اساتذہ محنت سے پڑھائیں اور طلبہ کی سیرت اور کردار کی تعمیر پر محنت

کی جائے تو نقل کی لعنت از خود ختم ہوجائے گی ۔ضمنی امتحانات کا سلسلہ بند کیا جائے تاکہ طلبہ مطالعہ پر توجہ دیں ۔اس وقت ہر سال ہزاروں طالب علم ڈگریاں لے کر ملازمتوں کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں اور پاکستان جیسے چھوٹے ملک کے لیے بےروزگاری کا مسئلہ شدت اختیار کرتا جارہا ہے ۔

نجی طور پر امتحان دینے کی سہولت ہونا چاہیے تاکہ غیر مستقل طالب علم اور وہ طالب علم جو مقررہ مدت میں امتحان پاس نہ کرسکیں پرائیوٹ طور پر امتحانات میں شریک ہوسکیں ۔ان پرائیوٹ امیدواروں کے امتحانات لینے کاکام علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کے ذمہ کردینا بہتر ہوگا۔ اس طرح دوسری یونیورسٹیوں کا بار کم ہوجائے گا اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی علمی اور اقتصادی حالت بہتر ہوجائے گی ۔

طلبہ کے مسائل

آزادی کے بعد سے لے کر اب تک غلط تعلیم اور عدم تربیت کے باعث طلبہ کا منفی رجحان اتنا قوی ہوچکا ہے کہ اس وقت ہماری درسگاہیں ہنگامہ و فساد کی آماجگاہ بن گئی ہیں ۔سیاستدان اور با اقتدار افراد طلبہ کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں ۔رجعت پسند طبقہ یہ پسند نہیں کرتا کہ ان کے علاقے میں تعلیم پھیلے اور ان کی موروثی حیثیت ختم ہو جائے۔ یہ عناصر طرح طرح کی ترغیبات سے کام لے کر طالب علموں کو اپنا آلہ کار بناکر تعلیمی ترقی میں رخنہ اندازی کرتے ہیں ۔چند نام نہاد طالب علم طلبہ برادری کے سرغنہ بن جاتے ہیں اور درسگاہوں میں من مانی کاروائیاں کرتے ہیں۔اگر ان گنتی کے چند طالب علموں سے نجات حاصل کرلی جائے تو درسگاہوں سے لاقانونیت کا خاتمہ ہوسکتا ہے ۔اس بات سے کوئی اختلاف نہیں کرے گا کہ ہرکام کے لیے ایک وقت مقرر ہے،اگر اس مقررہ وقت میں وہ کام نہ کیا جائے تو وقت گزر جاتا ہے ۔طالب علمی کا زمانہ بہت مختصر اور محدود ہے۔ دوران تعلیم طالب علموں کو صرف تعلیم سے سروکار رکھنا چاہیے۔درسگاہیں تعلیم اور سیرت کردار کی نشو نما کے مراکز ہیں اور ان مراکز میں کسی دوسری سرگرمی دکھانے کی گنجائش نہیں ہے ۔تعلیم حاصل کرنے کے بعد طالب علم اپنی پسند کے مشغلہ کو اختیار کرسکتے ہیں ۔لہٰذا تعلیمی ضابطہ میں تصریح کردی جائے :

۱ ۔دوران تعلیم طلبہ صرف تعلیم سے غرض رکھیں گے ۔
۲ ۔سیاسی پارٹیاں طلبہ کو آلہ کار نہیں بنائیں گی ۔
۳ ۔طلبہ کی کوئی تنظیم نہیں ہوگی ۔
۴ ۔درسگاہوں میں طلبہ یونین کا مروجہ طریقہ ختم کردیا جائے گا ۔

البتہ نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لیے مختلف

مضامین اور شعبوں پر مبنی سوسائیٹیاں بنائی جاسکتی ہیں ۔ ہر اس فرد کو درس گاہ سے خارج کردیا جائے گا جس کا رویہ ناپسندیدہ محسوس کیا جائیگا ۔ ان افراد کو اگر پڑھنے کا شوق ہے تو پرائیویٹ طور پر تعلیم جاری رکھ سکتے ہیں ۔چونکہ ایک با اختیار صدر مدرس کا تصور پیش کیا گیا ہے اس لیے توقع کی جاتی ہے کہ وہ طلبہ کی فوری طور پر ضروریات پوری کرسکے گا اور طالبعلموں میں بے چینی پیدا نہیں ہوگی ۔اسی کے ساتھ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ طلبہ کو شورش پر اکسانے میں اساتذہ کا ہاتھ بھی ہوتا ہے ۔ضروری ہے کہ اساتذہ صرف تدریس سے تعلق رکھیں بہ صورت دیگر تعلیم کے پیشے سے ایسے افراد کو خارج کرنا ضروری ہوگا جو اس کے تقدس کو برقرار نہ رکھ سکیں۔

تخصیصی درس گاہیں :

عام خیال ہے کہ کالج یا یونیورسٹی تمام مضامین کی تدریس کی سہولت فراہم کرے،خواہ طالب علموں کی تعداد کسی خاص مضمون میں برائے نام ہو ۔ یہ قومی دولت کو ضائع کرنے کے مترادف ہے ۔مناسب یہ ہے کہ درس گاہوں میں تخصیصی تدریس کا بندوبست طلبہ کی تعداد اور سہولتوں کی فراہمی کی بنیاد پر کیا جائے ۔اس سے معیار بلند ہوگا اور دولت کا زیاں نہ ہوگا ۔البتہ ان طالب علموں کی امداد کرنا چاہیے جو دور دراز کے علاقوں سے داخلہ لینے آتے ہیں ۔ طلبہ کو دی جانے والی یہ امدادی رقم ہرگز اس رقم سے زیادہ نہ ہوگی جو مختلف یونیورسٹیوں کے فالتو شعبوں پر خرچ ہورہی ہے۔

مالی مسائل :

دعوا کیا جاتا ہے کہ ہر سال تعلیم کی مد میں زیادہ سے زیادہ رقوم مختص کی جاتی ہیں،لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تعلیم پر جو رقوم خرچ ہوتی ہیں وہ ہرگز ہرگز بار آور نہیں ہوتی ہیں۔درس گاہیں تعمیر ہورہی ہیں۔ اساتذہ کو ملازمتیں مل رہی ہیں،لیکن قومی تعلیم کی ترقی کا گراف نیچے کی طرف آرہا ہے۔اس ترقیِ معکوس کا ازالہ ضروری ہے ۔مفت تعلیم کا تصور مفت خوری کی طرف مائل کرتا ہے ۔لہٰذا تعلیمی فیسوں میں معقول حد تک اضافہ کرکے بہتر سہولتیں فراہم کی جاسکتی ہیں ۔اس وقت کوئی بچہ ٹیوشن پڑھے بغیر امتحان پاس نہیں کرسکتا۔اگر درس گاہوں میں بہتر تدریس ہو تو ٹیوشن کی ضرورت باقی نہ رہے گی اور والدین فیسوں کے اضافے کو بہ خوشی قبول کرلیں گے ۔مفت تعلیم فراہم کرنے پر فخر کرنا نادانی کی بات ہے۔جو چیز مفت ہاتھ آجاتی ہے اس کی قدر و قیمت جاتی رہتی ہے ملک میں معمولی تعلیمی ٹیکس لگایا جاسکتا ہے ۔نجی تعلیمی ادارے قائم کرنے کی ترغیب دی جاسکتی ہے۔ صاحب ثروت طبقہ کو تعلیم کے فروغ میں حصہ لینے پر آمادہ کیا جاسکتا ہے۔ اگر کوئی شخص تعلیم پر کوئی رقم صرف کرے تو اس رقم کی دوگنی رقم پر انکم ٹیکس

کی چھوٹ کے فارمولے کے ذریعہ سے ترغیب دی جاسکتی ہے ۔

نظام تعلیم جیسے وسیع اور بسیط مسئلے پر یہ چند کلمات اور نکات پیش خدمت ہیں اگر ایمانداری ، اخلاص ، استقامت ، عزم و حوصلہ سے ان کو بروئے کار لایا جائے تو بہتر نتائج برآمد ہوسکتے ہیں ۔ ہمیں حقیقتوں کے تلخ گھونٹ پینا پڑیں گے اور مصلحتوں کے خارزاروں سے جیب و دامن پارہ پارہ کرکے منزل مراد پر آنا پڑے گا۔

تصریحات

۱ ۔ اسلامی تعلیم : اس مضمون کا مقصد یہ ہے کہ ہر فرد دین کی پوری معلومات رکھتا ہو اور مذہبی امور کو سر انجام دے سکتا ہوکسی مذہبی معاملہ میں علما سے رجوع کرنے کی ضرورت نہ رہے اور اس کے اندر صحیح اسلامی شعور بیدار ہوسکے ۔

۲ ۔ زبانوں کی تدریس :

اس وقت خواہی نہ خواہی تین زبانوں کا بوجھ طلبہ پر پڑرہا ہے ۔ اس بوجھ کو کم کرنے کی یہی صورت ہے کہ پرائمری تک قومی اور علاقائی زبان سکھائی جائے ۔ ثانوی سطح سے ڈگری کی سطح تک قومی اور انگریزی زبان پڑھائی جائے ۔

زبانیں سکھانے کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اس زبان پر کامل عبور ہو ۔ اس وقت ہم زبان سکھانے کی بجائے اس کا ادب پڑھاتے ہیں ۔ مناسب یہ ہے کہ زبانوں کی تدریس کے سلسلہ میں اس امر کو ملحوظ رکھا جائے کہ ان کے توسط سے تاریخ اسلام، مشاہیر اسلام، اخلاقیات ، مذہبی جذبہ اور تحریک پاکستان سے آگاہی حاصل ہو ۔ ہمارے ہاں ایک رجحان پیوند کاری کا ہے مثال کے طور پر جب ہوش آیا کہ قوم تحریک پاکستان سے ناآشنا ہے تو مطالعۂ پاکستان کے نام سے ایک مضمون رائج کردیا گیا ۔ پھر خیال آیا کہ دینیات بھی ضروری ہے تو ایک فلسفہ آمیز کتاب دینیات کے نام سے رائج کردی۔ یہ دونوں مضمون لازمی قرار پائے ،لیکن ان کی کیا افادیت ہے وہ مطالعہ سے ظاہر ہوجاتی ہے۔ وہ طالب علم جو پہلے ہی بہت سے مضامین کے بوجھ تلے دبے ہیں ان پر مزید دو مضامین اس طرح لاد دیئے گئے کہ اس سے ان کی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوسکا ۔

یاد رکھنا چاہیے کہ قومیت کا شعور مطالعہ پاکستان بحیثیت ایک مضمون رائج کرنے سے نہیں ہوگا بلکہ مطالعۂ اسلام سے ہوگا ،کیونکہ مطالعۂ اسلام ہی کے ذریعہ پاکستان وجود میں آیا ہے ۔ ہم کو اسلام کے نظریہ قومیت اور وطنیت کوابھارنا ہوگا ۔ اسی طرح پاکستان کا تحفظ ہو سکےگا۔ زمین کی پوجا کرنے والے زمین کا رزق بن جاتے ہیں ۔ طالب علموں کا وقت بچانے اور غیر ضروری مضامین سے بچنے کے لیے مفید موضوعات کوقومی زبان، علاقائی زبان اور انگریزی زبان کی معرفت دل نشین کرایا جاسکتا ہے ۔

۳ ۔ تاریخ اور جغرافیہ :

ان دونوں مضامین میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور بد قسمتی سے دونوں مضامین تقریباً خارج از نصاب ہیں ۔ اور جو جغرافیہ سے نابلد ہو اس کی حالت ایسی ہے کہ دنیا میں رہ کر دنیا سے بے خبر ہو ۔ تاریخ سے واقفیت علاقائی ، قومی اورانگریزی زبانوں کے وسیلے سے کرائ ۔ چاہیے کہ تاریخ پر بھی عبور ہو اور تینوں زبانیں بھی سیکھ لی جائیں ۔ جغرافیہ ثانوی سطح پر اس طرح رائج کیا جائے کہ تمام دنیا کے بارے میں معلومات فراہم ہوجائیں ۔

۴ ۔ عسکری تعلیم :

قومیں وہی زندہ رہتی ہیں جن کی تربیت کا اعلا بندوبست ہو غیر منظم اورافرا تفری میں مبتلا قومیں حادثات کا شکار ہو کر اپنا وجود کھو دیتی ہیں ۔ اپنی نئی نسل کو منظم اور فعال بنانے کے لیے عسکری تعلیم دینا ضروری ہے ۔ عسکری تعلیم اور تربیت مرحلہ وار طریقہ سے اس معیاد کی ہو کہ ہنگامی صورت حال میں قوم کا ہر فرد ملک کا تحفظ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس کا مرحلہ وار منصوبہ اس طرح بنایا جاسکتا ہے ۔

۱ ۔ پرائمری سطح تک ورزش فوجی قواعد اور مروجہ ڈرل ۔

۲ ۔ ثانوی سطح تک سول ڈیفنس کی مکمل تربیت ۔ ابتدائی طبی امداد اور نرسنگ ۔

یونیورسٹی کی سطح تک عسکری تعلیم اس انداز سے دی جائے کہ بوقت ضرورت ہر فرد دوسری دفاعی لائن میں کام کرنے کا اہل ہو ۔

۵ ۔ سماجی بہبود :

یاد رکھئے جب ہم کسی چیز کو بنانے پر محنت صرف کرتے تو اس کی حفاظت بھی کرتے ہیں اور اسکو خراب نہیں ہونے دیتے ۔

بنی بنائی چیزیں مل جائیں توان کی قدر نہیں ہوتی۔طلبہ میں توڑ پھوڑ کا رجحان اس وجہسے پیدا ہوا ہے کہ ان کو بنی بنائی چیزیں ملی ہیں ۔لہذا اگر طالب علموں سے سماجی بہبود کا کام لیا جائے تو ان میں خدمت کا جذبہ بھی پیدا ہوگا اور توڑ پھوڑ کی عادت بھی ختم ہوجائے گی ۔
تعطیلات کے نام پر تقریباً دو ماہ ہم ضائع کردیتے ہیں ۔ مناسب یہ ہے کہ ان دو مہینوں میں قومی ترقیاتی منصوبوں میں افرادی قوت فراہم کرنے کے لئے اساتذہ کی نگرانی میں سماجی بہبود کے دستے بنائے جائیں جو اپنے علاقوں کے ترقیاتی منصوبوں میں کام کریں ۔سماجی بہبود کےذیل میں مندرجہ ذیل شعبے آسکتے ہیں ۔

۱ ۔آفات میں سماجی خدمات کی فراہمی
۲ ۔ سڑکوں کی تعمیر
۳۔ نہری نظام کی درستی
۴۔ شجر کاری
۵۔ دیہات سدھار
۶۔ علاقہ کی صفائی
۷۔ تعلیم بالغان
۸۔ معذوروں اور بیماروں کی خدمت
۹۔ درس گاہوں کی مرمت ، تعمیر ۔صفائی

۶ ۔عمارتوں کی فراہمی :

تمام پرائمری سطح کے طالب علموں کی تدریس مساجد میں کرنا چاہیے ، اوقات کار اس طرح ہوں کہ کم سے کم ایک نماز دوران تدریس ادا کی جاسکے ۔لڑکیوں کی تدریس کے لیے عمارتیں استعمال کی جاسکتی ہیں مزید عمارتین درکار ہوں تو طلبہ کے زیر استعمال عمارات طالبات کو دے دی جائیں اور طلبہ مساجد میں تحصیل علم کریں ۔

۷ ۔پیشہ ورانہ تعلیم کی درس گاہیں

فی الوقت ان درس گاہوں میں داخلہ سائنس کے اعلا ثانوی امتحان پاس کرنے کے بعد ملتا ہے ۔مجوزہ صورت مین ڈگری بی ایس سی کے بعد داخلہ ملےگا ۔پیشہ ورانہ شعبوں کے نصاب میں بھی مناسب ردوبدل کرکے مفید بنایا جاسکتا ہے۔

۸۔ تحقیق اور تخصیص مدارج

حالات اور وسائل کے لحاظ سے بعض جامعات کو تحقیقی مدارج کے لئے مخصوص کردینا چاہئے ۔ یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کی معرفت ایک خبر نامہ کا اجرا ہونا چاہیے جس میں تعلیم سے متعلق معلومات فراہم کی جائیں خاص طور سے یہ بتایا جائے کہ کون کون سے شعبوں میں افراد کی کمی ہے ۔ اور کونسی جامعہ میں کس مضمون میں تحقیق اور تخصیص مدارج کی سہولت موجود ہے ۔ تحقیق اور تخصیص کام کرنے والوں کو آزادی حاصل ہونا چاہیے کہ جس جامعہ سے چاہیں کام شروع کرسکیں ۔

پاکستان کی ثانوی جماعتوں کا نصاب تعلیم
ناقدانہ نظر

جناب پروفیسر ظفر حسین خان

ہر قوم کا ایک مخصوص نظریہ ہوتا ہے جس کے تحت وہ زندگی گزارتی ہے ۔ اس کو ہم " نظریۂ حیات " کے نام سے بھی پکارتے ہیں ۔ نظریۂ حیات کو مدنظر رکھ کر ہی اس قوم یا ملک کے افراد کے لیے نظام تعلیم مرتب کیا جاتا ہے ۔ اس کو ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ مقاصد تعلیم کا تعین نظریہ حیات کے تابع ہوتا ہے ۔ ان تعلیمی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے جو تعلیمی لائحہ عمل تیار کیا جاتا ہے اس کو نصاب تعلیم کہتے ہیں ۔

نصاب کی تدوین ہر ملک کا بنیادی تعلیمی مسئلہ ہوتا ہے ۔ پاکستان کی بدقسمتی یہ ہے کہ جہاں اور بہت سی برائیاں انگریزوں سے ورثے میں ملی ہیں ان میں ایک نظام تعلیم بھی ہے ۔ قیام پاکستان کے بعد سے ہمارے ملک میں انگریزوں کے تیار کردہ نظام تعلیم کے تحت ہی ہماری درسگاہوں میں تعلیمی عمل جاری و ساری ہے، اگرچہ اسے بدلنے کی بارہا کوششیں کی گئیں وقتاً فوقتاً تعلیمی کمیشن مقرر ہوتے رہے، لیکن مقام افسوس ہے کہ آج تک ہمارا نصاب تعلیم پرانی ڈگر پر ہی چل رہا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مقاصد حاصل نہ ہوسکے جن کے لیے پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا ۔

موجودہ ثانوی نصاب تعلیم کا تجزیہ کرنے سے پیشتر ہم کو پاکستان کے ثانوی نصاب کے ارتقا کو بھی مدنظر رکھنا ہے ، کیونکہ مذکورہ نصاب میں اب تک جو تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے اس کی نوعیت اور اس کی رفتار کا صحیح اندازہ کیے بغیر ہم موجودہ نصاب تعلیم کی صحیح سمت مقرر نہیں کرسکتے اور نہ ہی آئندہ کے لیے کوئی انقلابی قدم اٹھا سکتے ہیں ۔ اس اہم ترین موضوع کو منتخب کرنے کا مقصد یہی ہے کہ ہم ماضی و حال کی روشنی میں مستقبل کے لیے راہ عمل کا تعین کرسکیں ۔

پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے جہاں وہ جن بے شمار مسائل سے دوچار ہے ان میں سے تعلیم بھی ایک مسئلہ ہے ۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ کسی ملک کی معاشی اور اقتصادی ترقی کا دارومدار تعلیمی ترقی پر ہوتا ہے ۔ جن قومیں مثلاً جاپان ، امریکہ ، جرمنی ، روس ، انگلستان ، چین اور کنیڈا وغیرہ نے جو ترقی کا خواب دیکھا وہ تعلیم کے ذریعہ ہی شرمندہ تعبیر ہوا ۔ تعلیم

کے علاوہ جو مما لک کسی اور ذریعہ سے ترقی کرنے کی کوشش کرتے ھیں وہ کبھی اپنے مقصد میں کامیاب و کامران نہیں ھوتے - ان حقائق کی روشنی میں ترقی پذیر ممالک کےلیے یہ ضروری ھے کہ وہ اپنے نظام تعلیم کی بنیاد قومی امنگوں اور ضروریات پر رکھیں، جس میں نظریہ حیات کو مرکزی حیثیت حاصل ھو -

پاکستان ایک نظریاتی مملکت ھے - اسلام ھمارا نظریۂ حیات ھے - اسلام نے علم کی اھمیت و افادیت پر جتنا زور دیا ھے وہ محتاج بیان نہیں - اسلام میں تعلیم دینا اور تعلیم لینا دونوں ھی کار ثواب ھیں - اس سلسلے میں قرآن کریم اور احادیث شریف سے لاتعداد مثالیں پیش کی جا سکتی ھیں جن کو ھم بوجہ طوالت نظر انداز کر رھے ھیں - مختصراً ھر مسلمان مرد اور عورت پر طلب علم کو فرض قرار دیا گیا ھے -

اسلام نے علم کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول قرار دیا ھے اور اس طرح ایک مومن کا علم حاصل کرنا اصل میں رضائے خداوندی کے حصول کی کوشش ھے - اسلام میں تعلیم کی غرض انسان کو خلافت ارضی کا اھل بنانا ھے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے تعلیم ایسی ھونی چاھیے جو افراد کو علم و بصیرت کی دولت سے نواز کر انھیں زندگی کے ابدی اور روحانی حقائق سے روشناس کرادے - اتنا ھی نہیں بلکہ سائنس اور معاشرتی علوم کے بنیادی حقائق کو سمجھنے کےبھی قابل بنادے اور افراد کو علم کے لیے آمادہ کرے تاکہ وہ روحانی حقائق کو سمجھ کر عبادت کی لذت سے روشناس ھوسکیں۔ سائنس حقائق کا علم ان کو فنی اور تکنیکی مہارتوں پر قدرت عطا کرتا ھے - اور معاشرتی حقائق کو سمجھ کر وہ قوم کی خدمت پر بآسانی آمادہ ھوسکتے ھیں۔ تعلیم فرد میں ایسے جذبات پیدا کرے کہ وہ رضائے الٰہی کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار رھے۔

اس بحث سے بخوبی ظاھر ھے کہ اسلام میں دین اور دنیا دونوں طرح کے علوم کے حصول پر زور دیا گیا ھے - اسلامی نظام تعلیم میں عقائد ارکان اسلام ، فرد کے حقوق و فرائض ، اعلا اخلاقی اقدار کی شمولیت کے علاوہ ایسے علوم بھی شامل ھیں جن سے روزی کماکر انسان دنیاوی زندگی بہتر طریقوں سے گزار سکتا ھے - یعنی اسلامی تعلیم انسان کو دینی و دنیاوی دونوں زندگیوں کے لیے تیار کرتی ھے -

پاکستانی نظام تعلیم کا سب سے اھم مسئلہ یہ ھے کہ ھم اپنی نوجوان نسل کو کس راہ پر لے جا رھے ھیں ؟ بین الاقوامی سیاسی کشمکش جدید سائنسی ترقی ، پسماندہ ممالک پر ترقی یافتہ ممالک کی اجارہ داری وغیرہ نے غریب یا ترقی پذیر ممالک کو بہت متاثر کیا ھے جس کے اثرات

ہماری نوجوان نسل پر بھی پڑرہے ہیں ۔ اس وقت ایسے نظام تعلیم کی ضرورت ہے جو مذکورہ بالا اثرات سے ہمارے بچوں کو محفوظ رکھ سکے ، یعنی تعلیم ایسی ہو جس کے ذریعہ سے بچوں میں اسلامی جذبہ پیدا ہوسکے ، جوان کو عمل کی طرف گامزن کرے ۔ لیکن ہمارا نظام تعلیم صرف نظری تعلیم پر مشتمل ہے ۔ اسلام "عالم باعمل" کے نظریہ کا خالق ہے ۔ لیکن جو تعلیم ہم بچوں کو دے رہے ہیں اس کا عمل سے کوئی واسطہ نہیں نوجوان نسل کے دل اسلامی جذبہ سے خالی ہیں ۔ عمل سے فرار ان کی عادت بن چکی ہے ۔ زندگی کے مسائل سے عدم دلچسپی ان کی فطرت میں شامل ہوگئی ہے ۔ ان میں نہ کردار کی بلندی باقی ہے اور نہ ترقی کا ولولہ ۔ یہی وجوہات ہیں کہ پاکستان سے محبت کا جذبہ بھی دن بدن معدوم ہوتا جارہا ہے ۔ پاکستان کی محبت کا جذبہ اگر سرد پڑگیا تو اس کی ذمہ داری کس پر ہے ؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہمارے ماہرین تعلیم ، قومی رہنماؤں، علما اور مصلحین کے لیے لمحۂ فکر ہے ۔ پوری قوم اس کا جواب جاننے کے لیے بے قرار ہے ۔ مشرقی پاکستان کی علاحدگی ملک کے باقی ماندہ حصوں میں علاقائی تعصب اور بیرونی نظریات کی پاکستان میں آمد سے ہم چشم پوشی نہیں کرسکتے ۔ ہم کو یہ معلوم کرنا ہے کہ ان پیدا شدہ حالات کی جڑیں ہمارے نظام تعلیم میں تو موجود نہیں ہیں ۔ ہم کو یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ ہماری کمزور اقتصادیات کو کس طرح ترقی دی جاسکتی ہے ۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ہم کو اس بات کا بھی پتہ لگانا ہوگا کہ معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کا سدباب کیوں کر ممکن ہے ۔ ملک سے بےروزگاری کو کس طرح دور کیا جاسکتا ہے ، اور قوم کو سچا مومن اوراچھا پاکستانی کس طرح بنایا جاسکتا ہے ۔ ان امور کو مدنظر رکھ کر ہمیں موجودہ ثانوی جماعتوں کے نصاب کا تجزیہ کرنا ہوگا ۔

یہ روز روشن کی طرح عیاں حقیقت ہے کہ پاکستان کا قیام ایک خاص نظرئیے کے تحت عمل میں آیا ہے اور وہ نظریہ ہے "اسلام" تو ہم کو چاہیے تھا کہ قیام پاکستان کے بعد فوری طور پر تعلیم پر توجہ دیتے اورانگریز کی تشکیل کردہ نظام تعلیم کو خیر باد کہہ کر اس کی جگہ نظریاتی تعلیم کا اہتمام کرتے ، لیکن مقام افسوس ہے کہ آج پاکستان قائم ہوئے تقریباً 37 سال ہوچکے ہیں ۔ اور آج تک ہم نے اس طرف عملاً توجہ نہیں دی ۔ نتیجہ ظاہر کہ ہم وہ مقاصد حاصل نہیں کرسکے جن کے لیے پاکستان وجود میں آیا تھا ۔ اگر پاکستان میں سیکولر نظام تعلیم رائج کرنا تھا تو یہ مقصد متحدہ ہندوستان میں بھی حاصل ہوسکتا تھا ۔

ہمارے آباو اجداد نے ایک علاحدہ وطن کے لیے جو قربانیاں دیں ان کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ اپنی ثقافت اور اسلامی اقدار کا تحفظ چاہتے

تھے ، کیوں کہ ان کو معلوم تھا کہ ہندو اکثریت والے ملک میں یہ ناممکن تھا کہ وہ آزادی سے اپنے مذہب پر عمل پیرا ہوسکیں اور اپنی زندگیوں کو اسلامی نظریۂ حیات کے مطابق گزار سکیں انہیں ایسے خطہ زمین کی ضرورت تھی جو ہندوؤں کے دستبرد سے آزاد ہو - جہاں وہ آزادی کے ساتھ اپنے مذہب اور اپنی ثقافت و تہذیب کے مطابق زندگی گزارسکیں - ہم نے خطہ زمین تو حاصل کرلیا لیکن خطہ زمین ہی ہمارا نصب العین نہ تھا - اس کے بعد چاہیے تو یہ تھا کہ اس ملک میں اسلامی نظام رائج ہوتا ، بچوں کو اسلامی تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کیا جاتا اور ساتھ ہی ساتھ ایسی تعلیم دی جاتی کہ ان میں جذبہ حب وطن پیدا ہوتا ، ان کی سیرت و کردار میں نکھار آتا ، وہ سچے پاکستانی ہونے کے ساتھ ساتھ سچے مسلمان بھی بن کر تعلیمی درسگاہوں سے نکلتے - ایسا اس وقت ممکن تھا کہ نصاب تعلیم کی تدوین میں اسلامی نظریۂ حیات اور نظریہ پاکستان کو مدنظر رکھا جاتا - لیکن افسوس کہ آج تک کئی مرتبہ نصاب تعلیم میں تبدیلیاں ہونے کے باوجود بھی ہم مطلوبہ مقاصد حاصل کرنے سے قاصر ہی رہے - قائد اعظم اور شہید ملت کے بعد حکومت کی باگ ڈور جن لوگوں کے ہاتھ میں آئی وہ نظریۂ پاکستان کا نعرہ تو لگاتے رہے - لیکن حقیقتاً انہوں نے نظریۂ پاکستان سے وفاداری نہ کی - اور سیاسی الجھنوں کا شکار رہے جن کا تذکرہ بے محل ہے - اس سیاسی کشمکش کا اثر نظام تعلیم پر بھی پڑا اور اس طرح ہر سیاسی تبدیلی کے ساتھ اگرچہ نظام تعلیم میں بھی تبدیلیاں کی گئیں ، اتنا ہی نہیں بلکہ نصاب کی تدوین و ترمیم بھی ہوتی رہی ، لیکن کسی نے بھی اساس یعنی نظریہ پاکستان کو مدنظر رکھ کر نصاب تعلیم مرتب نہیں کیا - اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک میں نوجوان طلبہ و طالبات نظریۂ پاکستان سے بے بہرہ رہ گئے اور ہر طرف سے علاقائی نعرے بلند ہونے لگے - نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے وطن عزیز کے اپنے ہاتھوں سے ٹکڑے کردیے -

مشرقی پاکستان کی علاحدگی کے بعد ہمیں اس سے سبق لینا چاہیے تھا اور اپنے نظام تعلیم کی خرابیوں پر غور کرنا چاہیے تھا ، لیکن ہم نے اس سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا - روز اول کی طرح ایک طبقہ کی آواز آج بھی یہی ہے کہ ہمارا نصاب اسلامی اقدار اور ثقافت کا ترجمان نہیں ہے - اس کے برخلاف ایک گروہ کہتا ہے کہ دور جدید جمہوریت کا زمانہ ہے جس میں آزادی فکر ہر فرد کا حق ہوتا ہے - کسی خاص نظریۂ تعلیم سے ہم کو اپنے طلبہ کے علم اور فکر و نظر کو محدود نہیں کرنا چاہیے کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام میں بہت سے مکاتب فکر ہیں ، اور نظریاتی تعلیم کا اہتمام کرتے وقت ہر طبقے کے نظریات کو نصاب میں شامل نہیں کیا

جلسکتا ۔ اسی طرح اور بھی بہت سے ملک دشمن نظریات کی اشاعت ہورہی ہے ۔ جن سے ہماری نوجوان نسل لسانی اور علاقائی وفاداریوں کا دم بھرنے لگی اور " جئے سندھ " اور " آزاد پختونستان " کے نعرے لگا رہی ہے ۔ غیروں کے نظریات سے وہ اس قدر متاثر ہے کہ وہ پاکستان نواز بننے کے بجائے امریکہ نواز ، برطانیہ نواز ، چین نواز اور روس نواز بننے میں فخرمحسوس کرتی ہے۔ اس سے ان کے ذہنی انتشار کا پتہ چلتا ہے ۔ اس انتشار سے قومی بقا اور سالمیت کو سخت خطرہ ہے ۔ اگر ہم نظریہ پاکستان کو اپنے نصاب کی اساس بناتے تو صورت حال اس کے برعکس ہوتی ۔

کافی وقت برباد کرنے کے بعد ہم نے نصاب میں اسلامیات اور تاریخ اسلام کو شامل کیا ہے جو محض رسمی ہے ۔ اس نصاب سے طلبہ کی زندگی کے روزمرہ کے مسائل کا کوئی حل نہیں نکلتا ۔ ان کے ذہنوں میں ابھرنے والے سوالات جوں کے توں رہتے ہیں ۔ ہمارا نصاب تعلیم ان کے جوابات فراہم نہیں کرتا ۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ صرف وہ مواد نصاب میں شامل کیا جاتا جو پاکستان کے کسی نہ کسی قومی مقصد کے حصول میں مددگار ثابت ہوتا ۔

ہمیں پاکستان کی مختصر مگر دردناک و عبرت ناک تاریخ سے سبق حاصل کرنا چاہیے ، اور اپنے انداز فکر کو بدلنا چاہیے۔ ہمیں روائتی تعلیم سے ہٹ کر اپنے بچوں کو وہ تعلیم دینی چاہیے جو نظریۂ اسلام اور نظریۂ پاکستان سے مربوط ہو ، اور اس کے لیے ہمیں اپنے نصاب تعلیم کو بدلنا چاہیے ۔ اس سے ان عوامل کو خارج کردینا چاہیے جو نظریۂ پاکستان کی نفی کرتے ہیں اور ایسے موضوعات و عنوانات کو شامل کرنا چاہیے جو نظریۂ پاکستان سے ہم آہنگ ہوں یعنی ہمارے نصاب تعلیم کی اساس ہی نظریہ پاکستان ہونی چاہیے ۔

اگرکسی قوم یا ملک کے بارے میں یہ معلوم کرنا ہوکہ اس ملک کے رہنما یا اکابر شہریوں کا کیسا بنانا چاہتے ہیں۔ اور ملک کے مستقبل کے بارے میں ان کے کیا نظریات ہیں تو ان کا جواب اس ملک کے نظام تعلیم یا نصاب تعلیم سے مل جاتا ہے۔ نصاب تعلیم قوم کے مقاصد کا آئینہ ہوتا ہے اور نظام تعلیم میں سب سے زیادہ اہمیت اس کی ہوتی ہے ۔

جیساکہ تحریر کیا جا چکا ہے کہ ہر قوم کا ایک مخصوص نظریۂ حیات ہوتا ہے جس کو مدنظر رکھ کر ایک قوم اپنے مقاصد حیات کا تعین کرتی ہے۔ جب مقصد حیات کا تعین ہوجاتا ہے تو اس مقصد حیات کو مد نظر رکھ کر مقاصد تعلیم مقرر کیے جاتے ہیں۔ مقاصد تعلیم کا تعین کردینا بذات خود کوئی اہمیت نہیں رکھتا ۔ اصل مسئلہ مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ ان تعلیمی مقاصد

کے لیے جو لائحہ عمل یا طریقہ کار اختیار کیا جاتا ھے اس کو نصاب کہتے ھیں - یعنی نصاب منزل مقصد تک پہنچانے کے ذریعے کا نام ھے اس کی اس طرح مزید وضاحت کی جا سکتی ھے -

مقاصد ← مقاصد تعلیم ← نصاب تعلیم ← فرد یا طالب علم

اس تشریح کے بعد ھم کہہ سکتے ھیں کہ نصاب ایک ایسا جامع و واضح تعلیمی منصوبہ ھے جس کے تحت اساتذہ طلبہ کو تعلیم و تربیت دیتے ھیں نصاب چند مضامین یا عنوانات کا مجموعہ نہیں ھوتا بلکہ تعلیمی اداروں کے داخلی و خارجی تقاضوں کی آسودگی کا بھی ضامن و معاون ھوتا ھے - یہی وجہ ھے کہ آج نصاب میں اسکول کی داخلی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ بیرونی سرگرمیوں کو بھی شامل کیا جاتا ھے -

نصاب کے تین تصورات

- قدیم تصور نصاب
- جدید تصور نصاب
- اسلامی تصور نصاب

طوالت کی وجہ سے ھم ان کی تشریح کو نظر انداز کر رھے ھیں، لیکن اتنا عرض کر دینا ضروری خیال کرتے ھیں کہ مدرسے کے ماحول میں ان سرگرمیوں کو شامل ھونا چاھیے -

1۔ مطالعہ کا پروگرام : اس میں وہ لازمی و اختیاری مضامین شامل ھوتے ھیں جو دوران تعلیمی سال طلبہ کو پڑھائے جاتے ھیں مثلاً زبان ، مطالعۂ پاکستان ، مطشیات اور سائنس وغیرہ

2۔ سرگرمیوں کا پروگرام : اس میں طلبہ کی انجمنیں ، ثقافتی و ادبی جلسے ، مقابلے اور کلب وغیرہ -

3۔ رھنمائی کا پروگرام : اس میں طلبہ کی ان کے انفرادی مسائل میں رھنمائی کی جاتی ھے یعنی ان کو مستقبل میں کیا کرنا ھے -

ان نکات سے ظاھر ھے کہ نصاب ان سرگرمیوں کے مجموعے کا نام ھے جو مدرسے کی کوشش سے وجود میں آتی ھیں - خواہ یہ سرگرمیاں کمرۂ جماعت میں ھوں ، کھیل کے میدان میں یا مدرسے سے باھر -

تاریخ تعلیم کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جس طرح علم و ادب اور دیگر فنون کا گہوارہ یونانی مفکرین کے خیالات و افکار ہیں اسی طرح تعلیم و تدریس کی شمع بھی سب سے پیشتر یونان میں ہی روشن ہوئی اور ہر ملک و قوم نے ان ہی کے افکار و خیالات کو اساس بناکر اپنی تعلیم و تربیت کی عمارت کی تعمیر و تشکیل کی ۔ یونانیوں میں سقراط ، افلاطون اور ارسطو ایسے مفکرین و ماہرین تعلیم گزرے ہیں ، جن پر سیر حاصل بحث اس مختصر مقالہ میں نہیں کی جاسکتی ۔

یونانیوں سے شمع محفل روم میں پہنچی ہے اور وہاں سے یورپ میں روسو ، پستالوزی، ہربرٹ اسپنسر وغیرہ نے نصاب تعلیم پر بہت کچھ لکھا۔ امریکہ میں جان ڈوئی جس کے نام سے ہر تعلیم یافتہ شخص واقف ہے ۔ لیکن مقالے کے اختصار کی خاطر ہم ان کے افکار و خیالات کو بھی نظر انداز کرنے پر مجبور ہیں ۔

ہندستان میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ یوں تو خلفائے راشدین رضا کے دور میں ہی شروع ہوگیا تھا ، لیکن اصل میں ان کا دور حکومت محمد بن قاسم کی سندھ میں آمد سے شروع ہوتا ہے جو مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی معزولی پر ختم ہوتا ہے ۔ اس دور کے نظام تعلیم کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ برصغیر میں تعلیم کا مرکز دین اسلام ہی رہا اور تمام تعلیمی سرگرمیاں اسی کے گرد گھومتی رہیں ۔ مسلمان جہاں بھی گئے انہوں نے مساجد تعمیر کیں اور ساتھ مکتب بھی قائم کیے ، جن میں بچوں کو قرآن پاک ناظرہ اور حفظ دونوں طریقوں سے پڑھایا جاتا تھا ۔ ان مکاتب کے علاوہ برصغیر میں اور تعلیمی ادارے بھی قائم ہوئے جن کو مدرسہ کے نام سے پکارا جاتا تھا ۔ مدارس میں دینی اور دنیاوی دونوں طرح کی تعلیم دی جاتی تھی ۔ یہ مدارس سلاطین اور امرا کی مالی امداد پر چلتے تھے جن میں قرآن ، فقہ ، تفسیر ، عربی ، فارسی ، منطق ، طبیعیات ، علم ہندسہ اور جغرافیہ وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی ۔

مغلوں کا دور حکومت ہندستان کا سنہری دور کہلاتا ہے ۔ اس دور میں نصاب تعلیم دینی اور دنیاوی دونوں اقسام کے مضامین پر مشتمل تھا۔ علمی اور ذہنی تعلیم کے ساتھ ساتھ فنی اور دستکاری کی تربیت کا بھی معقول انتظام تھا ۔ طلبہ دور دور سے تحصیل علوم کے لیے آتے تھے جن کی رہائش ، خور و نوش کا بھی معقول انتظام تھا ۔ معیار تعلیم بلند اور اعلا تھا مدرسوں میں دینی علوم قرآن پاک ، فقہ ، تفسیر ، حدیث کے علاوہ دنیاوی علوم فلسفہ، منطق ، خطابت ، ادب ، ریاضی ، تاریخ ، طب ، سنگتراشی اور فلکیات وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی ۔

انگریز برصغیر میں تاجر بن کر آئے اور تاجدار بن گئے ۔ اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد انہوں نے مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کو تباہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اوراس مقصد میں کامیابی کے لیے انہوں نے تعلیم کو آلہ کار بنایا۔ چنانچہ مشنری اسکول کھلنے شروع ہوگئے ۔ انگریزوں نے رفتہ رفتہ مشرقی علوم کو یکسر ختم کردیا ۔ انگریزوں کے زمانے میں مختلف چارٹر کمیٹیاں بنیں اور رپورٹیں تیار ہوئیں جن میں سے خاص خاص یہ ہیں ۔

1۔ چارٹر 1813 2۔ لارڈ میکالے رپورٹ 3۔ 1854 کاوڈ کا مراسلہ
4۔ ہنٹر کمیشن 1882 5۔ ہارٹوگ کمیٹی 1929
6۔ سارجنٹ رپورٹ 1944

ان تمام رپورٹوں کا اصل مقصد مسلمانوں کو تباہ و برباد کردینا تھا ۔ یہ میکالے ہی کا اثر ہے کہ آج تک ہم ذہنی غلامی سے آزاد نہیں ہوئے ہیں ۔ مسلمانوں میں جو قومی درد کے حامل تھے انہوں نے مختلف قومی تحریکوں کو جنم دیا جن کا مقصد مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگانا تھا ۔ ان میں سے خاص خاص یہ ہیں

1۔ تحریک علی گڑھ 2۔ دارالعلوم دیوبند 3 ۔ ندوۃ العلما لکھنو
4۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ 5 ۔ سندھ مدرسۃ الاسلام وغیرہ ۔

اگرچہ مندرجہ بالا تمام رپورٹوں نے نصاب تعلیم پر دل کھول کر بحث کی ہے جن میں تعلیم کے نقائص اور ان کو دورکرنے کی سفارشات بھی پیش کی گئی ہیں ، لیکن افسوس کے ساتھ لکھنا پڑرہا ہے کہ چونکہ انگریز مسلمانوں سے مخلص نہیں تھے ، اس لیے انہوں نے کاغذ پر تو ایسی اسکیمیں بنائیں کہ جن کو پڑھ کر ان کو داد دینے کو دل چاہتا ہے لیکن عملی میدان میں انہوں نے کچھ بھی نہیں کیا ۔ ہم نے ان رپورٹوں کی صرف نشان دہی کردی ہے جو کافی ہے ۔

جیسا کہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ پاکستان 27 ۔ رمضان المبارک بروز جمعہ مطابق 14 ۔ اگست 1947 کو عالم وجود میں آیا ۔ پاکستان کے قیام کا مقصد اسلامی ثقافت کی آب یاری ، اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی نظام زندگی کی بقا اور ان کی اشاعت و تبلیغ ہے ۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے تعلیم پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے ۔ بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح نے ایک کانفرنس بلائی جس کا پہلا اجلاس 27 نومبر 1947 کو کراچی میں ہوا ۔ اس میں نصاب تعلیم کو اسلامی قدروں اور جدید تقاضوں کے مطابق مرتب کرنے کی سفارش کی گئی ۔ اس قسم کی کانفرنسیں پاکستان کے دیگر شہروں میں بھی ہوئیں ، لیکن ان

کی سفارشات پر عمل نہ ہوسکا ۔ قیام پاکستان کے بعد اس نئی مملکت کو لاتعداد مسائل کا سامنا کرنا پڑا ۔ قائد اعظم کی وفات اور قائد ملت کی شہادت کے بعد ملک میں سیاسی کبڈی شروع ہوگئی اور 27 ۔ اکتوبر 1958 کو ملک میں فوجی انقلاب آیا اور اس طرح محمد ایوب خان نے اقتدار پر قبضہ کرلیا ۔

عنان حکومت پر قبضہ کے بعد فوجی حکومت نے ملک کے نظام تعلیم کا از سرنو جائزہ لینے کے لیے 30 ۔ دسمبر 1958 کو تعلیمی کمیشن مقرر کیا ۔ جس کے سربراہ جناب ایس ۔ ایم شریف تھے ۔ اس کمیشن نے پورے نظام تعلیم کا جائزہ لے کر سفارشات پیش کیں ۔ کمیشن نے ثانوی تعلیم کے بارے میں بھی تفصیل سے بحث کی ۔ کمیشن نے ثانوی تعلیم کے مقاصد کا بھی تعین کیا ۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے اکتالیس نصابی کمیٹیاں بھی تشکیل دی گئیں ۔ ان کمیٹیوں نے نصاب کی تدوین و تشکیل کے لیے کچھ اصول بھی مرتب کیے جن کو بوجہ طوالت نظر انداز کررہے ہیں ۔

قومی تعلیمی کمیشن 1959

نصابی مضامین : نصاب میں شامل مضامین کو دوحصوں میں تقسیم کیا گیا:

1۔ بنیادی مضامین کا ایک گروپ جو تمام امیدواروں کے لیے لازمی ہے ۔
2۔ اختیاری مضامین جن کو چھے گروپوں میں تقسیم کیا گیا ہے ہر طالب علم اختیاری مضامین کا صرف ایک گروپ لے سکتا ہے ۔

لازمی مضامین :

1۔ اردو یا بنگالی 2۔ انگریزی 3 ۔ معاشرتی علوم 4۔ جنرل ریاضی 5۔ جنرل سائنس 6۔ اسلامیات

اختیاری مضامین

1۔ انسانی علوم : 1 ۔ ریاضی 2۔ خانگی حساب 3 ۔ تاریخ
4 ۔ جغرافیہ 5۔ اسلامی علوم 6 ۔ آرٹ
7 ۔ جیومیٹریکل یا ٹیکنیکل ڈرائنگ 8 ۔ عربی
9 ۔ یونانی 10۔ عبرانی 11 ۔ لاطینی
12 ۔ پالی 13۔ فارسی 14 ۔ سنسکرت
15 ۔ اعلا بنگالی 16۔ اعلا انگریزی 17 ۔ چینی
18 ۔ انگریزی 19۔ فرانسیسی 20 ۔ جرمن
21 ۔ گجراتی 22۔ ھندی 23 ۔ جاپانی
24۔ پنجابی 25۔ پشتو 26 ۔ سندھی

27- ھسپانوی 28- ترکی 29- روسی 30- شہریت
31- معاشیات 32- موسیقی 33- ابتدائی گھریلومعاشیات

2- سائنسی علوم : 1- ریاضی 2- کیمیا 3- طبیعیات 4- علم الحیات
5- فزیالوجی یا حفظانِ صحت 6- ھندسی اور ٹیکنیکل ڈرائنگ 7- جغرافیہ

3- تجارتی علوم : 1- کاروباری طریقے اور خط و کتابت 2- تجارتی جغرافیہ
3- حساب اور بہی کھاتہ 4- ٹائپ اور شارٹ ھینڈ

4- صنعتی علوم : 1- ریاضی 2- طبیعیات 3- کیمیا 4- دھات کا کام
5- لکڑی کا کام 6- بجلی کا عملی کام
7- برتن سازی 8- چمڑے کا کام 9- آرائشی فنون اور دستکاریاں 10- کپڑا بننا 11- کپڑا سینا
12- معماری 13- ھندسی اور ٹیکنیکل ڈرائنگ
14- بانس اور بید سے چیزیں بنانا 15- مٹھائیاں بنانا۔

5- گھریلو معاشیات : 1- کیمیا 2- طبیعیات 3- علم الحیات 4- خوراک اور زراعت 5- کپڑے سینا 6- امور خانہ داری
7- خانگی انتظام۔

6- زراعتی علوم : 1- کیمیا 2- طبیعیات 3- زراعت 4- مٹی کا کام 5- علم الحیات 6- حیوانوں کی پرورش 7- پھلوں کی کاشت
8- باغبانی 9- ماھی گیری 10- ریاضی

نور خاں تعلیمی پالیسی 1970

1969 میں عوام نے دور ایوبی کے خلاف زبردست تحریک چلائی۔ ایوب خاں نے مجبور ھوکر اقتدار مسلح افواج کےکمانڈر انچیف جنرل یحیی خاں کے حوالے کردیا۔ جنرل یحیی خاں نےبھی ائیر مارشل نور خاں کی سرکردگی میں ایک کمیشن مقرر کیا تاکہ وہ ملک کے تعلیمی معاملات کا جائزہ لے کر حکومت کو رپورٹ پیش کرے۔

نورخاں کمیشن نے ثانوی تعلیم کو بامقصد بنانے کے لیے نصاب میں تبدیلیاں کیں۔ اس بات پر خاص توجہ دی گئی کہ ایسے عنوانات کو نصاب میں شامل کیا جائے جن سے طلبہ کی عملی قوتیں فروغ پاسکیں۔ اسلامیات کو لازمی مضمون قرار دیا گیا۔ ثانوی نصاب میں اس بات کی

کوشش کی گئی کہ طلبہ اس سطح پر ایک پیشہ ورانہ مضمون کا ضرور انتخاب کریں ۔

اس کمیشن کے تحت عمل جاری تھا کہ پاکستان ایک زبردست سانحہ سے دوچار ہوا جس کے نتیجے میں ملک آدھا رہ گیا ۔ یحیٰی خان مسند اقتدار پیپلز پارٹی کے سربراہ ذوالفقار علی بھٹو کے حوالے کرکے الگ ہوگئے

تعلیمی پالیسی 80 ۔ 1972

نئی حکومت کو چاہیے تو یہ تھا کہ نورخان پالیسی کو اپناتی، لیکن اس نے عبدالحفیظ پیرزادہ کی سرکردگی میں نیا کمیشن مقرر کیا ۔ جس نے کافی غور و فکر کے بعد سفارشات پیش کیں جن کو حکومت وقت نے منظور کرلیا اور اس طرح 15 ۔ مارچ 1972 سے یہ نافذ کردی گئی ۔

مقاصد کے حصول کے لیے نصاب کی تدوین و ترتیب کا کام شروع ہوا ۔ نئے نصاب میں نہ صرف نئے ٹیکنیکل مضامین کا اضافہ کیا گیا بلکہ ہر مضمون کے نصاب میں نئے موضوعات و عنوانات کا بھی اضافہ کیا گیا ریاضی میں طلبہ کو سیٹ سسٹم سے روشناس کرایا گیا ۔ معاشرتی علوم کا نام بدل کر مطالعہ پاکستان رکھا گیا ۔

ثانوی نصاب میں کئی مخصوص گروپ بنائے گئے آرٹس، اور کامرس کو ملاکر جنرل گروپ کا نام دیا گیا ۔ اور اس گروپ کے طلبہ کے لیے بھی پیشہ ورانہ مضامین رکھے گئے ۔ ایجوکیشن کو سرفہرست رکھا گیا ۔ اس کے علاوہ نرسنگ فرسٹ ایڈ ، فوٹو گرافی ، صحت ، جسمانی تعلیم ، اور گھریلو صنعت وغیرہ کو نصاب میں شامل کیا گیا ۔ سائنس گروپ میں ریاضی ، حیاتیات اور طبیعیات کو خاص اہمیت دی گئی پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے برقیات ، آٹو الیکٹرسٹی ، نل سازی ، گھریلو استعمال کی برقی اشیاء ۔ ڈیری فارمنگ پولٹری فارمنگ ، سبزی کی کاشت ، ریشم سازی ، فصلوں اور مویشیوں کی افزائش ، شارٹ ہینڈ ، ٹائپ رائٹنگ ، انشورنس اور دلالی، فوڈ پروڈکشن اور غذائی اشیا کی حفاظت وغیرہ کو نصاب میں شامل کیا گیا ۔

اس پالیسی کے تحت اساتذہ کے کئی سمینار اور ورک شاپ کیے گئے ۔ تاکہ اساتذہ نصاب تعلیم پر اپنے خیالات کا اظہار کرسکیں اور اس میں جو خامیاں ہیں ان کو دور کرنے کے لیے سفارشات بھی کرسکیں ۔

تعلیمی پالیسی 1979

قیام پاکستان سے لے کر آج تک پاکستان میں سیاسی استحکام نہیں ہوا

یہی وجہ ہے کہ اس مختصر عرصے میں وطن عزیز کئی بار سیاسی افراتفری کا شکار ہوا ۔ 1976 میں الیکشن میں دھاندلیوں کے خلاف ملک میں اس وقت کی حکومت کے خلاف جوزبردست تحریک چلائی گئی اس کی مثال مشکل سے ملے گی ۔ اقتدار کے نشے نے جنونی کیفیت اختیار کرلی تھی ۔ ان حالات میں فوج کو پھر میدان میں آنا پڑا چنانچہ موجودہ حکومت کے سربراہ جنرل محمد ضیاءالحق نے 5 ۔ جولائی 1977 کو عنان حکومت سنبھالتے ہی قوم سے وعدہ کیا کہ ملک میں اسلامی نظام نافذ کیا جائے گا ۔ جس کے لیے انہوں کچھ عملی اقدامات بھی کیے ہیں۔تعلیمی خامیوں کو دور کرنے کےلیے اکتوبر 1978 میں نئی پالیسی کا اعلان کیا گیا ۔ نصاب سازی کے رہنما اصولوں کا تعین کیا گیا ۔ ابھی اس پالیسی پر کچھ کہنا قبل ازوقت ہے کیونکہ تجرباتی منازل سے گزر رہی ہے ۔

نصاب تعلیم کا جائزہ

مذکورہ بالا موضوع کے دائرہ کار کا تعین کرنے سے پیشتر یہ عرض کردینا بھی ضروری ہے کہ اس مقالہ کی نوعیت تاریخی ہے جس میں نصاب کا ارتقائی جائزہ بھی تفصیلاً پیش کرنا چاہیے تھا ۔ لیکن بوجہ طوالت ہم نے صرف سرخیوں کو ہی سپرد قلم کیا ہے ۔ جہاں تک حصہ دوم کا تعلق ہے یعنی جس میں ثانوی جماعتوں کے موجودہ نصاب تعلیم کا تحقیقی تجزیہ کرنا تھا ، اس کےلیے متعلقہ افراد سے معلومات حاصل کی گئی ہیں۔ نصاب کا تعلق اساتذہ ، طلبہ اور والدین سے زیادہ اور کسی سے نہیں ہوسکتا۔ پورے پاکستان کے اساتذہ سے رائے لینا ہمارے لیے ناممکن تھا۔ لہذا صرف کراچی کے ایک سو پچاس مختلف مدارس کے اساتذہ سے رائے لی گئی ہے ۔ یہاں یہ عرض کردینا بے محل نہ ہوگا کہ تقریباً پورے پاکستان میں نصاب تعلیم کم و بیش یکساں ہی ہے ۔

اساتذہ کےلیے سوال نامہ تیار کیا گیا (جو آخر میں دیا گیا ہے)ارادہ تھا کہ طلبہ اور والدین کے لیے بھی الگ الگ سوال نامے تیار کیے جائیں گے ، اور ان کی بھی رائے لی جائے گی ۔ لیکن وقت اور وسائل کی قیود نے ان کی اجازت نہیں دی ۔

جیسا کہ تحریر کیا جاچکا ہے کہ یہ مقالہ تحقیقی ، تاریخی و توضیحی نوعیت کا ہے جس میں تاریخی مواد کے حصول کےلیے تاریخی دستاویزات، سرکاری کتب اور رپورٹوں سے مدد لی گئی ہے ۔ موجودہ نصاب کے بارے میں اساتذہ کے خیالات وافکار کو ہی بنیاد بنایا گیا ہے، کیونکہ نصاب تعلیم کا براہ راست تعلق اساتذہ اور طلبہ سے ہی ہوتا ہے ۔ قلت وقت کی وجہ

سے طلبہ سے معلومات فراہم نہیں کی جا سکیں۔ اساتذہ سے معلومات حاصل کرنے کے لیے ایک سوال نامہ مرتب کیا گیا ۔ یہ سوال نامہ مفروضے کے مختلف پہلوؤں کو مد نظر رکھ کر مرتب کیا گیا جس کو کراچی کے تیس ثانوی مدارس کے ایک سو پچاس اساتذہ سے بھروایا گیا ۔ راقم نے یہ سوال نامہ اپنی موجودگی میں پر کرایا جس کی وجہ سے ان کی تعداد میں کوئی کمی و بیشی نہیں ہوئی ۔ سوالات سے حاصل کردہ معلومات کو جدولی شکل میں پیش کیا جارہا ہے ۔

جدول نمبر 1

کیا موجودہ ثانوی نصاب تعلیم اسلامی اقدار کی عکاسی کرتا ہے ؟

جوابات کی کیفیت	تعداد	فی صد
ہاں	32	21.33
نہیں	118	78.67
میزان	150	100

اس گوشوارے کے مطابق مقررہ تعداد میں سے تقریباً 22 فی صد اساتذہ نے موجودہ نصاب تعلیم کو اسلامی اقدار کا عکاس بتایا ہے ۔ جب کہ تقریباً 79 فی صد اساتذہ کا جواب نفی میں ہے ۔ ان اعداد و شمار سے صاف ظاہر ہے کہ ہمارا موجودہ نصاب تعلیم اسلامی اقدار کی عکاسی نہیں کرتا۔ راقم کا بھی یہی خیال ہے۔

جہاں تک اسلامی اقدار کی اہمیت کا سوال ہے تو اس ضمن میں اتنا عرض کردینا کافی ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اور جو ملک اسلام کے نام پر بنایا گیا ہو اس ملک کے نظام تعلیم یا نصاب تعلیم میں اسلامی اقدار کی شمولیت ضروری ہے ۔ تعلیم ہی وہ آلہ ہے جس کے ذریعہ قوم کے نظریات و خیالات میں تبدیلی لائی جاسکتی ہے ۔ اگر ہمیں اپنی نئی نسل کو مسلمان بنانا ہے تو اس کی واحد صورت یہی ہے کہ ہمارے نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کی اساس اسلامی اقدار پر ہو ۔

یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اسلام کا نعرہ تو ہر آنے والی حکومت نے لگایا اور نظام تعلیم کو بھی اسلامی اصولوں کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی حکومت نے بھی صدق دل سے ایسا کرنے کی کوشش نہیں کی ۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہمارے بچے انگریزوں کے چھوڑے ہوئے نظام تعلیم کے تحت تعلیم حاصل کررہے

ہیں جن کی اپنی کوئی منزل نہیں ہے ۔

جـــدول نـمبر2

کیا ہمارے موجودہ ثانوی نصاب تعلیم میں قومی ثقافت کو مدنظر رکھا گیا ہے ؟

جوابات کی کیفیت	تـعداد	فی صد
ہاں	25	16ء67
نہیں	125	83ء33
میزان	150	100

اس جدول کے مطابق تقریباً ۱۷ فی صد اساتذہ نے موجودہ نصاب تعلیم کو قومی ثقافت کا مظہر قرار دیا ہے جب کہ 83 فی صد نے اس کی نفی کی ہے جو اس کا واضح ثبوت ہے کہ ہمارا ثانوی نصاب تعلیم ہماری ثقافت کا آئنیہ دار نہیں ۔ یہی میرا بھی خیال ہے ۔

نصاب تعلیم میں ثقافتی عنصر کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ۔ جہاں تک اس کی اہمیت و افادیت کا تعلق ہے تو یہ کہنا بےجا نہ ہوگا کہ انسان کی زندگی محض جسمانی بقا کا ہی نام نہیں ہے بلکہ وہ اس مخصوص طرز زندگی یا ثقافت کو بھی محفوظ رکھنا چاہتا ہے جو اس کو ورثے میں ملی ہے اگر ایک طرف انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی نسل کا تسلسل برقرار رہے تو دوسری طرف اس کی یہ بھی تمنا ہوتی ہے کہ جو ولولے ، امنگیں ، امیدیں اور غم اس کے دل میں موجزن ہیں وہ اس کی اولاد کے سینوں میں بھی موجود ہوں ۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اگر وہ اپنا ثقافتی ورثہ اپنی نسل میں منتقل کرنے سے قاصر رہا تو وہ تباہ و برباد ہوجائے گا ۔ ثقافت کو ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل کرنے کا کام تعلیم کے ذریعہ سے کیا جاتا ہے اور اس کے لیے ایسا نصاب مرتب کیا جاتا ہے جو ثقافتی اقدار کا آئینہ دار ہوتا ہے ۔

اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ہماری ثقافت ہڑپہ اور موئن جودارو کے کھنڈرات نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد اسلامی طرز زندگی ہے جس میں مذہبی و معاشرتی اقدار ، رسم و رواج ، آداب و اخلاق ، طور طریقے ، رہن سہن اور زبان وغیرہ کو خاص اہمیت حاصل ہے ۔ اگر ہم ان عناصر کو مدنظر رکھ کرغور کریں تو معلوم ہوگا کہ اساتذہ کرام کا فیصلہ بالکل صحیح ہے یعنی ہمارا موجودہ نصاب تعلیم ہماری قومی ثقافت کا ترجمان نہیں ہے ۔

جـــدول نـمبر 3

کیا ھمارا موجودہ نصاب تعلیم نظریۂ پاکستان کا ترجمان ھے ؟

جوابات کی کیفیت	تعداد	فی صد
ھـاں	34	22ء67
نہیں	116	77ء33
میزان	150	100

اس جدول کے تحت اساتذہ کی مقررہ تعداد میں سے تقریباً 23 فیصد نےموجودہ ثانوی نصاب تعلیم کو نظریہ پاکستان سے ہم آھنگ قرار دیا ھے جبکہ 77 فی صد کا جواب نفی میں ھے ۔ نظریہ پاکستان کیا ھے ؟ دراصل یہ نظریہ اسلام کا ھی دوسرا نام ھےجس کا مطلب خداوند کریم اوراس کے آخری نبی حضرت محمد مصطفٰے صلّی اللّٰہ علیہ وسلم کے احکامات کےمطابق زندگی گزارنا ھے۔اس کو ھم اس طرح بھی کہہ سکتےھیں کہ دین اسلام کا عملی نفاذ ، اسلامی معاشرے کا احیاء ، برصغیر کے مسلمانوں کی معاشی و علمی ترقی ، وطن سے محبت اور تحفظ کا جذبہ ، اتحاد و یگانگت نظریہ پاکستان کے اھم عناصر ھیں ۔

نظریۂ پاکستان کی مندرجہ بالا تشریح کے بعد ان عناصر پر غور کریں اور ثانوی نصاب میں شامل موضوعات وعنوانات کا جائزہ لیں تو اساتذہ کی رائے کو مزید تقویت حاصل ھوتی ھے کہ ھمارا موجودہ نصاب نظریہ پاکستان کا ترجمان نہیں ھے آج کے نوجوان اسلامی نظام کے بجائے کمیونزم اورسوشلزم کی طرف مائل نظر آتے ھیں ۔ وہ پاکستانی کہلانے کے بجائے بلوچ ، پٹھان پنجابی ، سندھی اور مہاجر کہلانے میں فخر محسوس کرتے ھیں ۔ ان میں جذبہ حب وطن کا فقدان ھے۔ اس کے بجائے وہ علاقائی تعصب کا شکار ھیں، وہ ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح دیتے ھیں ۔ آج کا طالبعلم روس نواز امریکہ نواز ، چین نواز کہلانے میں فخر محسوس کرتا ھے ، پاکستان نواز بننے میں اس کو شرم آتی ھے ۔ اسی صورت میں اساتذہ کرام کا فیصلہ حقیقت پر مبنی ھے کہ موجودہ نصاب نظریۂ پاکستان کی ترجمانی نہیں کرتا ۔

جـــدول نـمبر 4

کیا موجودہ ثانوی نصاب تعلیم ھماری ملکی و قومی ضروریات کی تکمیل میں معاون و مددگار ھے ؟

جوابات کی کیفیت	تعداد	فی صد
ہاں	19	12ء67
نہیں	131	87ء33
میزان	150	100

ان اعداد و شمار کے مطابق تقریباً 13 فی صد اساتذہ نے موجودہ نصاب تعلیم کو قومی و ملکی ضروریات کا آئینہ دار قرار دیا ہے جب کہ تقریباً 87فیصد اساتذہ نے نفی میں رائے پیش کی ہے -

ہمارے ملکی و قومی تقاضے یا ضروریات کیا ہیں ؟ ملک کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت ، قومی اتحاد ویگانگت اور حب وطن کا جذبہ پیدا کرنا - جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کا حصول ہمارے ملک کی اہم ترین ضروریات ہیں۔ان تقاضوں کی تشفی کے لیے نصاب میں ایسے موضوعات وعنوانات ہونے چاہییں جو قوم کے بچوں میں پاکستانی قومیت کا شعور پیدا کریں - ان میں وفاداری و جانبازی کا جذبہ پیدا ہو تاکہ ملک کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کریں - نصاب میں جدید سائنس علوم اور ٹیکنالوجی کو اس قدر اہمیت دی جائے تاکہ ملک کو زیادہ سے زیادہ ترقی دی جا سکے -

جب ہم مندرجہ بالا امور پر غور کرتے ہیں تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ہمارے ثانوی مدارس کے نصاب کی تدوین و ترتیب کرتے وقت مذکورہ عوامل کو مدنظر نہیں رکھا گیا ،کیونکہ آج ہمارے ذہنوں میں نہ تو متحدہ قومیت کا تصور ہے اور نہ ہی حب وطن کا جذبہ ہے - اتحاد و یگانگت کے بجائے آئے دن نوجوان طلبہ تعلیمی اداروں میں جس طرح دست و گریباں رہتے ہیں وہ اس بات کی دلیل ہے کہ موجودہ تعلیم سے وہ مقاصد حاصل نہیں ہورہے ہیں جن کا حصول وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔یہی وجہ ہے کہ اساتذہ کرام کی اکثریت نے موجودہ نصاب کو قومی و ملکی تقاضوں کے خلاف قرار دیا ہے-

جدول نمبر 5

کیا ہمارا نصاب تعلیم ہمارے ماحول سے ہم آہنگ ہے ؟

جوابات کی کیفیت	تعداد	فی صد
ہاں	26	17ء33
نہیں	124	82ء67
میزان	150	100

اس جدول کے مطابق اساتذہ کی مقررہ تعداد میں سے تقریباً 17 فیصد نے یہ رائے پیش کی ہے کہ موجودہ ثانوی نصاب تعلیم ہمارے ماحول سے ہم آہنگ ہے جب کہ 83 فی صد کی رائے یہ ہے کہ یہ ہمارے ماحول سے مربوط نہیں ہے -

جہاں تک نصاب کا ماحول سے ہم آہنگی کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ تمام ماہرین تعلیم اس بات سے متفق ہیں کہ نصاب کو بچے کے ماحول سے ہم آہنگ ہونا چاہیے، کیونکہ بچہ دوسرے ماحول یا حالات کو سمجھنے کے بجائے اپنے ماحول سے جلد واقفیت حاصل کرلیتا ہے - ماحول میں معاشرتی اور طبعی ماحول دونوں شامل ہوتے ہیں ہمارے یہاں قیام پاکستان کے شروع میں جو نصاب تعلیم مرتب کیا گیا وہ تو مکمل مغربی معاشرے کے عکاس کرتا تھا - بعد میں جو ردوبدل ہوا اور نصاب تعلیم کو ماحول سے ہم آہنگ کرنے کی سفارشات کی گئی ہیں ان پر عمل برائے نام ہی ہوا ہے جیسا کہ جدول سے ظاہر کہ اساتذہ کی اکثریت کا خیال یہی ہے کہ ہمارا نصاب تعلیم ماحول سے مطابقت نہیں رکھتا -

جدول نمبر 6

کیا ثانوی نصاب میں نفسیاتی تقاضوں کی تکمیل کی کوشش کی گئی ہے ؟

جوابات کی کیفیت	تعداد	فی صد
ہاں	35ء	23ء33
نہیں	115	76ء67
میزان	150	100

اساتذہ کی مقررہ تعداد میں سے تقریباً 23 فی صد اساتذہ نے موجودہ نصاب کو نفسیاتی رجحان کا عکاس بتایا ہے جب کہ تقریباً 77 فی صد اساتذہ نے رائے دی ہے کہ موجودہ نصاب میں ایسا نہیں ہے -

نصاب میں نفسیاتی رجحان سے مراد یہ ہے کہ نصاب میں شامل مضامین موضوعات اور عنوانات کو طلبہ کی خواہشات ، میلانات اور دلچسپیوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیے - نصاب میں یہ رجحان بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ بقول ہل گرڈ تعلیم خوشی کا معاملہ ہے جس میں معلومات طلبہ پر زبردستی نہیں ٹھونسی جا سکتیں، پستالوزی کا بھی یہی خیال ہے - حقیقت یوں ہے یہ کہ دور جدید میں یہ کوئی مسئلہ نہیں کہ بچے کو کیا پڑھانا ہے ؟ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ بچہ پڑھنا کیا چاہتا ہے - اگر ہم نصاب سازی کے دوران بچے کی عمر ، اس کی ذہنی صلاحیت اور اس کی ذہنی

خواہشات کو مدنظر رکھیں گے تو ایسا نصاب بچے کے لیے سود مند ہوگا۔ اس کے برعکس اگر ہم نے بچے پر اس کی ذہنی استعداد اور صلاحیت سے زیادہ یا مشکل مواد یا موضوعات کو شامل نصاب کرلیا یا ہم نے غیر دلچسپ مضامین بچے پر مسلط کرنے چاہے تو اس کے نتائج خراب ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں نصاب میں نفسیات کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ہمارے ثانوی مدارس کے اساتذہ نفسیاتی رجحان کی اہمیت سے واقف نہیں ہیں۔ اساتذہ کی اکثریت، یعنی 77 فی صد کا موجودہ نصاب تعلیم کو غیر نفسیاتی قرار دینا اس بات کی دلیل ہے کہ ہمارے ثانوی نصاب تعلیم کی تدوین میں طلبہ کی ذہنی صلاحیتوں، استعداد، دلچسپوں رجحان طبع، عمر اور ماحول کا بالکل خیال نہیں رکھا گیا ہے۔

جدول نمبر 7

کیا ہمارا ثانوی نصاب جمہوری اقدار پیدا کرتا ہے ؟

جوابات کی کیفیت	تعداد	فی صد
ہاں	46	30ء67
نہیں	104	69ء33
میزان	150	100

دور جدید جمہوریت کا زمانہ ہے۔ اسلام بھی جمہوری مذہب ہے، لیکن جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارا نصاب طلبہ میں جمہوری اقدار پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ اس سلسلے میں تقریباً 31 فی صد اساتذہ نے اثبات میں اور تقریباً 69 فی صد نے نفی میں رائے دی ہے۔ سب سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ جمہوری رجحان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تعلیمی اداروں کو سیاسی اکھاڑے بنا دیا جائے بلکہ تعلیم میں جمہوریت سے مراد یہ ہے کہ تعلیمی سرگرمیوں میں طلبہ حصہ لینے کے لیے آزاد ہوں۔ مضامین کے انتخاب میں ان پر کوئی پابندی نہ ہو۔ ہر طالب کو اپنی صلاحیتوں کے نشو و نما کے مواقع فراہم ہوں۔ تمام طلبہ کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے تاکہ وہ اپنے نصب العین کا آزادانہ تعین کرسکیں۔

اس وضاحت سے ظاہر ہے کہ نصاب سازی میں جمہوری رجحان کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ دور جدید کے عظیم مفکر اور ماہر تعلیم جان ڈوئی نے اس رجحان کی بہت زیادہ حمایت کی ہے۔ اس کے خیال میں جمہوری اقدار کو شامل کیے بغیر ہم بچوں کی شخصیت کا مکمل نشو و نما نہیں کرسکتے۔ نصاب کی اس خصوصیت کو مدنظر رکھتے ہوئے جب ہم اپنے

ثانوی نصاب کا تجزیہ کرتے ھیں تو اساتذہ کا فیصلہ ھمارے حق میں جاتا ھے یعنی ھمارے نصاب میں نہ تو اتنے اختیاری مضامین رکھے گئے ھیں کہ ھر طالب علم اپنی مرضی کے مطابق ان کا انتخاب کرسکے، نہ ھی مضامین کے انتخاب میں وہ آزاد ھے ۔ اس کے علاوہ نصابی سرگرمیوں میں طلبہ کی شراکت کے مواقع بھی نہیں آتے لہذا ان حقائق کی روشنی میں یہ رائے کہ موجودہ نصاب جمہوری اقدار پیدا کرنے سے قاصر ھے بالکل درست ھے ۔

جدول نمبر 8

کیا موجودہ ثانوی نصاب تعلیم میں سائنس اور ٹیکنالوجی کو اھمیت دی گئی ھے ؟

جوابات کی کیفیت	تعداد	فی صد
ھاں	17	11
نہیں	133	89
میزان	150	100

مندرجہ بالا اعداد و شمار کے مطابق 89 فی صد اساتذہ نے ہم سے اتفاق کیا ھے یعنی ھمارے ثانوی نصاب تعلیم میں سائنس اور ٹیکنالوجی کو خاص اھمیت نہیں دی گئی ھے ۔ حقیقت یہ ھے کہ دورجدید سائنس اور ٹیکنالوجی کا زمانہ ھے ۔ جاپان ، امریکہ ، جرمنی ، روس ، چین اور انگلستان وغیرہ نے اس میدان میں جو ترقی کی وہ محتاج بیان نہیں ھے ۔ دنیا میں آج جتنی ترقی ھوئی ھے اور نئی نئی ایجادات سامنے آرھی ھیں یہ سب سائنس اور ٹیکنالوجی کا ھی کمال ھے ۔

سائنس اور ٹیکنالوجی سے استفادہ کرنے کیے لیے ضروری ھے کہ نصاب تعلیم میں سائنس اور ٹیکنالوجی کو اولیت دی جائے ۔ جن ممالک نے اپنے نصاب میں سائنس اور تکنیکی مضامین کو شامل کیا ھے وہ آج دنیا کی رھبری کررھے ھیں اس کی واضح مثال روس کا نصاب تعلیم ھے جہاں جماعت ششم سے لے کر دسویں تک تقریباً نصف وقت صرف سائنس اور ریاضی کی تدریس پر صرف کیا جاتا ھے ۔ اس طرح برطانیہ اور امریکہ کے مدارس میں بھی سائنس ، ریاضی اور عملی فنون پر شدت سے زور دیا جاتا ھے ۔

پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ھے ۔ ایک پس ماندہ ملک کے لیے ضروری ھے کہ وھاں پر سائنس اور ٹیکنالوجی پر خاص توجہ دی جائے تاکہ اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرکے ملک کی پس ماندگی کو دور کیا جاسکے ۔ پاکستان کی 37 سالہ تاریخ اس بات کی گواہ ھے کہ کسی دور میں بھی

اس امر پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا کہ ملک کو کس طرح ترقی دی جائے بلکہ یہاں پر ہمیشہ کرسی اقتدار کےلیے ہی کشمکش ہوتی رہی اور صاحب اقتدار طبقے کی تمام تر توجہ اقتدار پر ہی مرکوز رہی - نظام تعلیم میں سائنسی علوم اور جدید ٹیکنالوجی پر کبھی خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی - یہی وجہ ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل افراد اپنی ڈگریاں اور سرٹیفکیٹ کا پلندہ اٹھائے پھرتے ہیں ، لیکن ان کو کوئی نہیں پوچھتا - دوسری طرف حالات یہ ہیں کہ ملک میں سائنس داں ، انجینیر ، ڈاکٹر اور پیشہ ورانہ مہارت رکھنے والے افراد کی سخت ضرورت ہے جو لوگ بمشکل تمام ان مضامین میں ڈگریاں حاصل کرتے ہیں وہ ملک سے باہر چلے جاتے ہیں ہم کو چاہیے کہ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اپنے تعلیمی اداروں میں سائنسی اور تکنیکی علوم و فنون کا کوئی با مقصد پروگرام تیار کریں تاکہ اس قعر مذلت سے نکل کر ہم بھی دنیا کی ترقی یافتہ قوموں میں شامل ہوسکیں -

ہم کو خوشی ہے کہ ہماری رائے سے اساتذہ کی اکثریت اتفاق کرتی ہے یعنی ثانوی نصاب تعلیم میں سائنس اور ٹیکنالوجی کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی گئی ہے -

جدول نمبر 9

تعلیم کا مقصد معاشرتی شعور پیدا کرنا بھی ہے - کیا ثانوی نصاب تعلیم اس خوبی کو پیدا کرتا ہے ؟

جوابات کی کیفیت	تعداد	فی صد
ہاں	39	26
نہیں	111	74
میزان	150	100

مندرجہ بالا جدول سے ظاہر ہے کہ 26 فی صد اساتذہ نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ہمارا ثانوی نصاب تعلیم طلبہ میں معاشرتی شعور پیدا کرنے میں مددگار ہے جب کہ 74 فی صد اساتذہ نے ہم سے اتفاق کرتے ہوئے جواب نفی میں دیا ہے -

تمام ماہرین تعلیم کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ تعلیم کا یہ بھی مقصد ہے کہ وہ فرد میں معاشرتی شعور پیدا کرے تاکہ وہ معاشرے میں مطابقت حاصل کرسکے - انسان ایک سماجی حیوان ہے جو معاشرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا - جب وہ معاشرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تو اس کی ایسی تعلیم

و تربیت ہونی چاہیے کہ وہ معاشرے میں باوقار زندگی گزار سکے اور معاشرے کےلیے کار آمد ثابت ہوسکے ۔ اس مقصد کی تکمیل کےلیے تعلیمی اداروں کا وجود ہوا اور ان پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی کہ وہ اپنے یہاں ان سرگرمیوں کا بھی اہتمام کریں جن سے مستقبل میں طلبہ کا واسطہ پڑے گا ۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے نصاب میں ان معاشرتی اقدار کو شامل کیا جاتا ہے جن سے معاشرتی شعور پیدا ہوتا ہے ۔

اساتذہ کرام نے جو رائے دی ہے اس کی خاص وجہ یہ ہےکہ ہمارا نصاب زیادہ تر نظری ہے ۔ اس میں معاشرتی یا عملی سرگرمیوں پر بہت ہی کم توجہ دی گئی ہے ۔ دوسرے نصاب میں جو موضوعات اور عنوانات شامل ہیں ان کا زندگی سے تعلق برائے نام ہی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طالب علم مدرسہ سے نکل کر عدم مطابقت کا شکار ہوجاتا ہے ۔

جدول نمبر 10

کیا ثانوی نصاب تعلیم میں عملی سرگرمیوں پر بھی توجہ دی گئی ہے ؟

جوابات کی کیفیت	تعداد	فی صد
ہاں	35	23 ء 33
نہیں	115	76 ء 67
میزان	150	100

رائے دھندگان کی مقررہ تعداد میں سے تقریباً 23 فی صد اساتذہ نے مثبت رائے کا اظہار کیا ہے جب کہ تقریباً 77 فی صد نے نفی میں رائے دے کر خاکسار سے اتفاق کیا ہے ۔

دور جدید میں تعلیم بذریعہ عمل کی اہمیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے ۔ دنیا کے بیشتر ممالک کے نصابات تعلیم میں یہ رجحان اتنا شدید ہے کہ بعض مضامین عملی بن کر ہی رہ گئے ہیں ۔ مشہور زمانہ مفکر تعلیم جان ڈوئی کہتا ہےکہ تعلیم اسی وقت مثبت اور پائیدار اقدار سے ہم آہنگ ہوتی ہے جب طلبہ کی عملی قوتیں بروئے کار لائی جاتی ہیں ۔ وہ مزید کہتا ہے کہ کسی شے کی حقیقت اس وقت تک ناقابل قبول ہے جب تک وہ عملی نہ ہو ۔ اس عملی رجحان سے ایک طرف تعلیم بچوں کی خود حاصل کردہ کوششوں کا نتیجہ ہوتی ہےاور دوسری طرف ان کی عملی قوتیں بھی فروغ پاتی ہیں ۔ اس لیے نصاب میں عملی سرگرمیوں کو شامل کرنا ضروری ہے ۔

جان ڈوئی کے بیان کردہ خیالات دور جدید کے عین مطابق ہیں ۔ نصاب میں صرف نظریاتی مضامین یا موضوعات اس وقت تک فائدہ مند نہیں ہوسکتے جب تک ان کا عمل سے رشتہ نہ ہو ۔ ماہرین تعلیم کا خیال ہے کہ اکثر طلبہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد محض اس لیے ناکارہ زندگی بسر کرتے ہیں کہ انہوں نے دوران تعلیم عملی تربیت حاصل نہیں کی ۔

پاکستان میں تعلیم یافتہ طبقہ بے روزگاری کا شکار ہے ۔ پریشانی اور بیکاری سے ان کی شخصیت ناکارہ ہوتی جارہی ہے ۔ وہ حیاتیاتی تقاضوں کی تکمیل کے لیے بھی پریشان ہیں ، یہی وجہ ہے کہ صوبہ سندھ میں اکثر طلبہ ڈاکوں میں حصہ لے رہے ہیں ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم میں اسلامی اصول " علم باعمل " کا اصول اپنایا جائے ۔

جدول نمبر 11

کیا ملکی ترقی کے لیے پیشہ ورانہ تعلیم ضروری ہے ؟

جوابات کی کیفیت	تعداد	فی صد
ہاں	150	100
نہیں	×	×
میزان	150	100

جدول نمبر 11 کے مطابق صد فی صد اساتذہ نے اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ پاکستان کی ترقی کے لیے پیشہ ورانہ تعلیم ضروری ہے ۔ اساتذہ کی اتنی بڑی تعداد کا ہم سے متفق ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ آج وہی ملک ترقی کرسکتا ہے جہاں پیشہ ورانہ عملی تعلیم کا اہتمام ہو ۔ آج ترقی پذیر ممالک میں بے روزگاری ، غربت و افلاس کی وجہ ہی یہ ہے کہ ان ممالک میں ہنر مند افراد کی قلت ہے ۔ پاکستان بھی ایک ترقی پذیر ملک ہے اس کی زمین قدرتی وسائل سے بھرپور ہے ۔ صنعتی ترقی کے وافر مواقع ہیں ۔ زمین زرخیز ہے ، لیکن ان عوامل سے استفادہ کرنے کے لیے ہمیں ماہرین یا ہنر مند افراد کی ضرورت ہے جن کی ہمارے یہاں کمی ہے ۔ آج ہم کسی شعبے میں بھی خود کفیل نہیں ہیں ۔ قدرتی وسائل کی تلاش کے لیے امریکہ ، روس ، برطانیہ ، جاپان ، چین اور کنیڈا وغیرہ کو ٹھیکے دیے جاتے ہیں ۔ اس کے لیے ہم کو کثیر زرمبادلہ خرچ کرنا پڑتا ہے ۔ اگر ہنر مند افراد ہمارے یہاں ہوں تو ہمیں دیگر ممالک کا محتاج بننے کی کیا ضرورت ہے ۔ پاکستان کی افرادی قوت غیر ہنر مند ہونے کی وجہ سے ملک میں زبردست بے روزگاری پھیلی ہوئی ہے

جس نے ہماری معیشت کو ہلا کر رکھ دیا ہے ۔ اس معاشی عدم استحکام اور غربت و افلاس کے اثرات ملک کے سیاسی حالات پر بھی پڑتے ہیں ۔ تاریخ عالم شاہد ہے کہ جہاں معاشی عدم استحکام یا غربت و افلاس اور بےروزگاری کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے وہاں سیاسی ابتری بھی ہوتی ہے لہٰذا معاشی استحکام کےلیے ضروری ہے کہ ایسی تعلیم کا انتظام کیا جائے یا ایسے ادارے قائم کیے جائیں جن میں زیادہ سے زیادہ عملی کام سکھائے جائیں تاکہ طلبہ تعلیم فارغ ہونےکے بعد کسی پیشےسے منسلک ہو کر پرسکون زندگی گزار سکیں ۔

جدول نمبر 12

کیا آپ اپنے مضمون کو دوران سال ختم کرلیتےہیں ؟

جوابات کی کیفیت	تعداد	فی صد
ہاں	63	42
نہیں	87	58
میزان	150	100

مندرجہ بالا اعداد و شمار کے مطابق 42 فی صد اساتذہ نے دعوا کیا ہے کہ وہ دوران سال اپنے مخصوص مضمون کے نصاب کو مکمل کرلیتے ہیں جب کہ 58 فی صد نے معذوری ظاہرکی ہے ۔ راقم بھی ان میں ہی شامل ہے ۔

ہمارا موجودہ نصاب بچوں کو پڑھانے کے لیے نہیں بلکہ غیروں کو دکھانے کےلیے مرتب کیا جاتا ہے ۔ تدوین نصاب کے وقت اس امر کومدنظر رکھنا چاہیے کہ نصاب بخوبی اور آسانی سے ختم ہوسکے ۔ اگر آپ ثانوی جماعت کےکسی مضمون کے نصاب پر نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ ایک سال تو کیا دو سال میں بھی ختم نہیں ہوسکتا ۔ مثلاً مطالعۂ پاکستان کا نصاب دیکھیے مشکل سے پانچ ماہ تدریس کےلیے ملتے ہیں،لیکن نصاب بنانے والوں نےکوئی عنوان ایسا نہیں ہے جو اس میں شامل نہ کیا ہو ۔ اکثر موضوعات اور عنوانات ایسےہوتےہیں جن کو معلمین بھی سمجھنے سے قاصر ہوتےہیں ۔

42 فی صد اساتذہ نے جو نصاب کی تکمیل کا دعوا کیا ہے اس کا تعلق ان کی ذات سے تو درست ہوسکتا ہے،لیکن بچوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا ۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہےکہ نصاب میں مضمون

اتنا ھی رکھا جائے جتنا وقت مقررہ میں بآسانی پڑھایا جاسکے ۔

جــــدول نــمــبر 13

کیا آپ کےمضمون کی نصابی کتاب طلبہ کی ذھنی صلاحیت کے مــطابق ھے ؟

جوابات کی کیفیت	تعداد	فی صد
ھاں	31	20ء67
نہیں	119	79ء33
میزان	150	100

مندرجہ بالا تجزیہ سے ظاھر ھےکہ ھماری نصابی کتب میں شامل نفس مضمون یا مواد طلبہ کی ذھنی صلاحیت سے مطابقت نہیں رکھتا ۔ پاکستان میں نصابی کتب کی تیاری کا جو طریقہ ھے وہ ناقص ھے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ، لیکن اتنا عرض کردینا ضروری ھے کہ متعلقہ اداروں میں اقربا پروری اور رشوت ستانی کا زور ھے ۔ قابل ، لائق اور محنتی اساتذہ کوکتاب لکھنے کا موقع نہیں ملتا ۔ اس کے برعکس نا اھل افراد کا انتخاب کرلیا جاتا ھے جن میں اتنی صلاحیت ھی نہیں ھوتی کہ وہ مخصوص ذھنی استعداد رکھنے والے طلبہ کےلیے کتاب لکھ سکیں ۔ لہذا جب کتاب طلبہ کےھاتھوں میں آتی ھے اور وہ اس کا مطالعہ کرتےھیں تو اس کو سمجھنے سے قاصر رھتے ھیں جس سےان کی دلچسپی اس مضمون سے ختم ھوجاتی ھے۔انہیں اسباب کی بنا پر 79 فی صد اساتذہ نےھم سے اتفاق کرتے ھوئے رائے دی ھے کہ نصابی کتب میں شامل موضوعات یا مواد طلبہ کی ذھنی صلاحیت کے مطابق نہیں ھوتا ۔

جــــدول نــمــبر 14

کیا نصاب کی تکمیل کےلیے اسکول میں آپ کو ضروری سہولتیں حاصل ھیں ؟

جوابات کی کیفیت	تعداد	فی صد
ھاں	38	25ء33
نہیں	112	74ء67
میزان	150	100

اس جدول کے مطابق تقریباً 75 فی صد اساتذہ نے ہم سے اتفاق کرتے ہوئے یہ رائے دی ہے کہ پاکستان کے ثانوی مدارس میں نصاب کی تکمیل کے لیے اساتذہ کو ضروری آسانیاں میسر نہیں ہیں جب کہ 25 فی صد نے اس کے حق میں رائے دی ہے۔

اگر ہم مندرجہ بالا تجزیے پر غور کریں اور ثانوی مدارس کی موجودہ حالت کو مد نظر رکھیں تو اساتذہ کی رائے حقیقت پر مبنی نظر آتی ہے ہم نے جن تیس اسکولوں کا سروے کیا ان میں صرف دو یا تین اسکول ایسے تھے جن میں اساتذہ اور طلبہ کے لیے فرنیچر موجود تھا۔ ورنہ زیادہ تر اسکولوں میں طلبہ تو دری پر بیٹھے تھے یا فرنیچر کی کمی کے باعث کچھ طلبہ سیٹوں پر بیٹھے تھے جب کہ بہت سے دیوار کے سہارے کھڑے تھے۔ جن طلبہ کو بیٹھنے کے لیے جگہ میسر نہ ہو بھلا وہ ذہنی طور پر تعلیم کے لیے کیسے تیار ہوسکتے ہیں! تعلیم کی طرف راغب کرنے کے لیے طلبہ کا پرسکون ہونا ضروری ہے۔ علاوہ ازیں نفس مضمون کو دلچسپ بنانے کے لیے امدادی اشیا کے استعمال کو موجودہ دور میں ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔ اشیائے امدادی نصاب کی تکمیل میں نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔ لیکن قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ جس ملک میں بچوں کے بیٹھنے کے لیے فرنیچر میسر نہ ہو وہاں باقی چیزیں ثانوی حیثیت کی حامل ہوجاتی ہیں۔

ہمارے تربیتی اداروں میں طلبہ کو مختلف قسم کی چیزیں سکھائی جاتی ہیں۔ مثلاً تدریس کے جدید اصول، اشیائے امدادی کا استعمال، اصول و قواعد وغیرہ، لیکن افسوس سے لکھنا پڑرہا ہے کہ اسکولوں میں ان میں سے کسی کا بھی استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ جس کے لاتعداد اسباب ہیں۔ ہم بوجہ طوالت ان کو نظر انداز کررہے ہیں۔

جدول نمبر 15

آپ کے خیال میں پاکستان میں ذریعہ تعلیم کون سی زبان ہونی چاہیے؟

ذریعہ تعلیم	تعداد	فی صد
اردو	138	92
انگریزی	7	4ء67
علاقائی	5	3ء33
میزان	150	100

مندرجہ بالا اعداد و شمار کے مطابق 92 فی صد اساتذہ نے ثانوی مدارس میں قومی زبان یعنی اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے پر زور دیا ہے جب

کہ تقریباً 5 فی صد نے انگریزی کو یہ مقام دینے کی سفارش کی ہے اور صرف 3 فی صد اساتذہ نے مقامی زبان کے حق میں رائے دی ہے -

جہاں تک قومی زبان کی اہمیت و افادیت کا سوال ہے ، دنیا کا کوئی بھی ملک ایسا نہیں ہے جس کی کوئی قومی زبان نہ ہو ، کیونکہ زبان غیر میں ملک و قوم کبھی ترقی نہیں کیا کرتے - ہم کو آزادی حاصل کیے ہوئے بقریباً 37 سال ہوچکے ہیں ، لیکن آج تک ہم پسماندگی کے بھنور میں پھنسے ہوئے ہیں - اس کے برعکس چین ہم سے دو سال بعد آزاد ہوا - لیکن اس کی ترقی محتاج بیان نہیں ہے - جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہاں پر ان کی اپنی زبان ہی ذریعہ تعلیم ہے - آج چین نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں جو حیرت انگیز ترقی کی ہے ، اس کی اہم وجہ یہی ہے -

زبان غیر کے مقابلے میں قومی زبان میں بچے نفس مضمون کو بآسانی سمجھ لیتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ وہ اس میں دلچسپی بھی لیتے ہیں جس سے ان کی ذہنی اور فکری صلاحیتوں میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا ہے ، لیکن اگر ایک بچہ کو انگریزی میں تعلیم دی جائے گی تو اس کا زیادہ تر وقت اس زبان کے سیکھنے اور سمجھنے میں ہی صرف ہوگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ نصاب کے دیگر مضامین پر توجہ نہیں دے سکے گا - اس لیے اس کی مزید تعلیمی ترقی رک جائے گی ، اور اس طرح ایک قابل اور ذہین بچہ غیر ملکی زبان کا شکار ہوکر مزید تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہ جائے گا - اتنا ہی نہیں بلکہ اس کی ذہنی و فکری صلاحتیں بھی معدوم ہوجائیں گی جو ملک و قوم کا نقصان ہے -

افسوس کے ساتھ تحریر کرنا پڑرہا ہے کہ اگرچہ آزادی حاصل کیے ہوئے عرصہ گزر چکا ہے لیکن زبان کا معاملہ ہنوز باقی ہے - جو حکومت بھی برسر اقتدار آتی ہے وہ وعدے تو بہت کرتی ہے ، لیکن عملاً کچھ نہیں کرتی - اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو اس زبان کے مسئلے نے بھی مشرقی پاکستان کو الگ کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے - بہر حال دنیا کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اگر ہم کو ترقی کرنی ہے تو ہم کو قومی زبان کو اس کا جائز مقام دینا پڑے گا - ہمارے خیال کی اساتذہ کی اکثریت نے حمایت کی ہے جس سے اس کی اہمیت اور افادیت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے -

جدول نمبر 16

کیا پاکستان میں نصاب ساز اداروں کی تدوین سے آپ مطمئن ہیں ؟

جوابات کی کیفیت	تعداد	فی صد
ھاں	37	24ء67
نہیں	113	75ء33
میزان	150	100

پاکستان میں نصاب سازی کےلیے قومی اور صوبائی سطحوں پر نصاب سازاداروں کو قائم کیا گیا ہے جن کا مقصد یہ ہے کہ وہ مخصوص تعلیمی مقاصد کو مدنظر رکھ کر ہر سطح کے لیے نصاب سازی کریں - یہ کام ملک کے قابل ترین اور ماہر ترین اساتذہ سے لینا چاہیے تھا ،لیکن عملاً ایسا نہیں ہےاور یہی وجہ ہے کہ یہ ادارے اپنےکام میں بری طرح ناکام ہوگئے ہیں - اس ناکامی کی تفصیل میں میں جانا نہیں چاہتا ، لیکن صرف اتنا بتادینا کافی ہے کہ اس کی بنیادی وجوہات ، محکمہ تعلیم کی لاپروائی ،متعلقہ حکام کی اقربا پروری اور رشوت ستانی وغیرہ ہے- پاکستان میں جہاں بہت سی برائیاں جنم لے رہی ہیں ، ان میں سے یہ بھی ایک ہے کہ اگر کسی کو کسی ادارےکی سربراہی مل جاتی ہے تو وہ اس محکمےکو اپنی ملکیت سمجھنے لگتا ہے- اہلیت اور قابلیت کی پاکستان میں کوئی قدر نہیں - یہی حالت ان نصاب ساز اداروں کی بھی ہے- ہر ذمہ دار فرد نےاپنےعزیز و اقارب کو ان اداروں میں لگانے کی کوشش کی - جس کے نتیجے میں نصاب سازی کا کام ان لوگوں کے سپرد کیا گیا جو خود نصاب کے لفظ سے بھی واقف نہیں تھے- نتیجہ ظاہر ہے ! مندرجہ بالا سطور میں ان اداروں کی کارکردگی کا مختصراً جائزہ پیش کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ ان اداروں کی کارکردگی اطمینان بخش نہیں ہے - جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ اساتذہ کی اکثریت یعنی 75 فی صد نے ہم سے اتفاق کیا ہے -

جدول نمبر 17

کیا موجودہ ثانوی نصاب طلبہ میں جذبہ حب وطن پیدا کرتا ہے ؟

جوابات کی کیفیت	تعداد	فی صد
ھاں	13	8ء67
نہیں	137	91ء33
میزان	150	100

مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور موجودہ پاکستان کے بعض علاقوں میں تعصب اور متعصبانہ نعروں کی گونج اس بات کی شاہد ہے کہ ہم اپنی نوجوان

نسل کو وطن کی محبت کے جذبے سے سرشار کرنے سے قاصر رہے ہیں - آج بھی نوجوان امریکہ نواز ، برطانیہ نواز ، روس نواز اور چین نواز بننے میں فخر محسوس کرتے ہیں - لیکن مقام افسوس ہے کہ پاکستان نواز بننے کو کوئی تیار نہیں - اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہمارے تعلیمی ادارے بیرونی نظریات کے پرچار میں نمایاں کردار ادا کررہے ہیں -

ہم نوجوان نسل میں وفاداری اور حب وطن جیسے جذبات پیدا کرنے میں کیوں ناکام رہے ؟ یہ ایک سوال ہے جس پر ہر شہری کو سوچنا چاہیے میری رائے میں اس کا سبب ہمارا ناقص نظام تعلیم ہے - ہم نے اپنے نظام تعلیم کو اسلامی اقدار اور قومی ثقافت سے ہم آہنگ نہیں ہونے دیا - نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری نوجوان نسل اپنی اسلامی اقدار اور ثقافت سے بیگانہ ہوتی چلی جارہی ہے لارڈ میکالے نے کہا تھا کہ اگر کسی قوم کو تباہ کرنا ہے تو اس کی زبان اور ثقافت کو تباہ کردیا جائے - قوم خود بخود تباہ و برباد ہوجائے گی - انگریزوں نے ایسا ہی کیا - آج بھی اگرچہ ہم جسمانی طور پر آزاد ہیں، لیکن دماغی طور پر غلام ہی ہیں - ایسی صورت میں وطن کے تحفظ ، وحدت و ہم آہنگی اور حب وطن جیسے جذبات کیسے پروان چڑھ سکتے ہیں -

تقریباً 91 فی صد اساتذہ نے ہم سے اتفاق کیا ہے کہ موجودہ نصاب نوجوان نسل میں جذبہ حب وطن پیدا کرنے سے قاصر ہے -

جدول نمبر 18

کیا ہمارا ثانوی نصاب تعلیم ہمارے کردار کی تشکیل میں مددگار ثابت ہوتا ہے ؟

جوابات کی کیفیت	تعداد	فی صد
ہاں	17	11ء33
نہیں	133	88ء67
میزان	150	100

تقریباً 89 فی صد اساتذہ نے ہم سے اتفاق کیا ہے - یعنی ان کے خیال میں بھی موجودہ نصاب تعلیم ہمارے کردار کی تشکیل میں مددگار نہیں ہوتا جب کہ ایک معمولی تعداد یعنی 11 فی صد نے اس کے حق میں رائے دی ہے - اس تجزیے سے یہ بات پائے ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ہمارے نصاب میں اسلام کی اخلاقی و معاشرتی اقدار کو جگہ نہیں دی گئی ہے

جو کردار سازی کا سب سے اہم وسیلہ ہے۔

تعلیم کا مقصد یہی نہیں ہوتا کہ ایک فرد کو لکھنا اور پڑھنا ہی آجائے بلکہ اس کا اصل مقصد تشکیل کردار ہے۔ امام غزالی رح نے بھی تعلیم کا یہی مقصد بتایا ہے کردار سازی میں نصاب تعلیم کا اہم کردار ہوتا ہے تعلیم ہی کے ذریعے ہم فرد کو اس کے حقوق و فرائض سے روشناس کرتے ہیں اور پھر اس سے امید کرتے ہیں کہ وہ عملی زندگی میں ان سے استفادہ کرے گا۔ لیکن مقام افسوس ہے کہ ہمارا موجودہ نصاب فرد کے کردار کی تشکیل میں بری طرح ناکام ہوا ہے ۔ جہاں ہم یہ امید کرتے ہیں کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہمارے نوجوان میں اوصاف حمیدہ مثلاً دیانت داری ، عزت نفس ، ہمدردی و خلوص اور جذبہ خدمت جیسے اوصاف پیدا ہوں گے وہاں اس کے برعکس یہ ثابت ہوچکا ہے کہ آج کا تعلیم یافتہ نوجوان ان تمام اوصاف سے عاری ہے جن کی معاشرے کو ضرورت ہے ، اتنا ہی نہیں بلکہ آج کل وہ سنگین جرائم میں ملوث نظر آتا ہے ۔

جدول نمبر 19

کیا موجودہ ثانوی نصاب تعلیم بچوں کے ہمہ گیر نشو و نما میں مددگار ثابت ہوتا ہے ؟

جوابات کی کیفیت	تعداد	فی صد
ہاں	23	15 ء 33
نہیں	127	84 ء 67
میزان	150	100

موجودہ دور میں تعلیم کا مقصد فرد کی ہمہ گیر نشو و نما کرنا ہے ۔ جس میں ذہنی ، جذباتی ، معاشرتی اور جسمانی غرض کہ ہر طرح کی نشو و نما آجاتی ہے۔ زندگی کے یہ تمام شعبے ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتے ہیں ۔ اگر ان میں کسی کو بھی نظر انداز کردیا جائے گا تو ہمہ گیر تربیت کا مقصد ہی ختم ہوجائے گا ۔ بعض ماہرین تعلیم نے ان میں جسمانی نشو و نما کو سب سے اہم قرار دیا ہے کیونکہ صحت مند جسم میں ہی صحت مند دماغ ہوسکتا ہے جب کہ کچھ ماہرین تعلیم نے ذہنی نشو و نما کو اولیت دی ہے ۔ بہرحال یہ ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے۔

پاکستان کے مدارس میں ہمہ گیر نشو و نما پر مطلق توجہ نہیں دی جاتی ۔ جس کے لاتعداد اسباب ہیں مثلاً طلبہ کی تعداد کا زیادہ ہونا،

مدارس میں سہولتوں کا فقدان ، اساتذہ کی تدریس سے لاپروائی مدارس کا دوشفٹوں میں ہونا ، نصاب تعلیم زیادہ ہونا ، وقت کی قلت وغیرہ وغیرہ ۔

موجودہ نصاب کی تدوین میں جسمانی ، ذہنی اور دماغی نشو و نما پر مطلق توجہ نہیں دی گئی ہے جس کا ثبوت مندرجہ بالا گوشوارے سے بخوبی مل سکتا ہے جس میں تقریباً 85 فی صد اساتذہ نے ہم سے اتفاق کیا ہے یعنی موجودہ ثانوی نصاب میں ہمہ گیر نشو و نما پر مطلق توجہ نہیں دی گئی ہے ۔

جدول نمبر 20

اگر پاکستان میں نصاب سے فائدہ حاصل کرنا ہے تو اس کی تدوین کے کیا مقاصد ہونے چاہیں ؟

اساتذہ کرام نے اس سوال کا کھل کر جواب دیا ہے اور پاکستان کے نظریاتی ، سماجی ، ثقافتی اور اقتصادی تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جوابات دیئے ۔ ان مقاصد کو یک جاکرنے کے بعد ہر مقصد کے لیے جن اساتذہ نے یکساں رائے دی ان کی مجموعی تعداد درج ذیل گوشوارے میں پیش کی جارہی ہے۔

نمبر شمار	نصاب کے اہم ترین مقاصد	
1 ۔	اسلامی نظریہ حیات کے مطابق زندگی گزارنا	121/150
2 ۔	فنی ۔ سائنس اور پیشہ ورانہ تعلیم کا حصول	127/ 150
3 ۔	حب وطن اور پاکستانی قومیت کا جذبہ پیدا کرنا ۔	131/ 150
4 ۔	قومی ثقافت اور تہذیب کا عکاس ہونا	119/ 150
5 ۔	ملکی و قومی تقاضوں کی تکمیل کرنا	108/ 150
6 ۔	معاشرتی قدروں سے ہم آہنگی	93/ 150
7 ۔	اخلاق و کردار کی تعمیر و تشکیل	83/ 150
8 ۔	ہمہ گیر نشو و نما کرنا	52/ 150
9 ۔	اسلاف کے کارناموں سے آگاہ کرنا	49/ 150
10 ۔	طلبہ کی ذہنی استعداد اور صلاحیت کے مطابق نصاب کی تیاری	37/ 150

نصاب تعلیم مقاصد تعلیم کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے ۔ اساتذہ

نے جن مقاصد میں ہم سے صد فی صد اتفاق کیا ہے ان میں سب سے زیادہ زور اسلامی نظریہ حیات اور سائنس اور فنی تعلیم کے حصول پر دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی نظریہ حیات کو اساس بنا کر اگر نصاب کی تدوین و تشکیل کی جائے تو یقیناً وہ مقاصد حاصل ہوسکتے ہیں جن کے لیے پاکستان کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اسلامی طرزِ زندگی شخصیت کے جملہ پہلوؤں کے بہترین نشو و نما کا باعث بن سکتی ہے۔ سائنس اور فنی تعلیم کا حصول ملک کی معاشی ترقی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور موجودہ دور میں وہی قوم ترقی کرسکتی ہے جو سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کررہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اساتذہ کی اکثریت نے مندرجہ بالا دونوں مقاصد پر زور دیا ہے جس سے ان میں بیداری اور ملک و قوم سے محبت کا پتہ چلتا ہے۔

سوال نامہ برائے اساتذہ ثانوی مدارس :

نوٹ : آپ جس جواب کے حق میں ہیں اس کے سامنے کسے خالی خانے میں ( ) نشان لگائیں :

1 ۔ کیا آپ ثانوی نصاب تعلیم سے مطمئن ہیں ؟ ہاں ( ) نہیں ( )

2 ۔ کیا ہمارا نصاب تعلیم ہماری اسلامی اقدار کی عکاسی کرتا ہے ؟ ہاں ( ) نہیں ( )

3 ۔ کیا ہمارے نصاب تعلیم میں قومی ثقافت کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے ؟ ہاں ( ) نہیں ( )

4 ۔ کیا ہمارا نصاب تعلیم نظریہ پاکستان سے مربوط ہے ؟ ہاں ( ) نہیں ( )

5 ۔ کیا موجودہ نصاب تعلیم ہماری ملکی اور قومی ضروریات کی تکمیل کرتا ہے ؟ ہاں ( ) نہیں ( )

6 ۔ کیا ہمارا نصاب تعلیم ہمارے ماحول سے ہم آہنگ ہے ؟ ہاں ( ) نہیں ( )

7 ۔ کیا موجودہ نصاب تعلیم میں نفسیاتی رجحان کو مدنظر رکھا گیا ہے ؟ ہاں ( ) نہیں ( )

8 ۔ کیا ہمارا نصاب تعلیم جمہوری اقدار پیدا کرتا ہے ؟ ہاں ( ) نہیں ( )

9 - کیا ہمارا نصاب تعلیم طلبہ میں معاشرتی شعور پیدا کرتا ہے ؟ ہاں ( ) نہیں ( )

10- کیا ثانوی نصاب تعلیم میں عملی سرگرمیوں پر بھی توجہ دی گئی ہے ؟ ہاں ( ) نہیں ( )

11- کیا ملک کی ترقی کے لیے پیشہ ورانہ تعلیم ضروری ہے ؟ ہاں ( ) نہیں ( )

12- جو مضمون پڑھاتے ہیں اس کو دوران سال بخوبی ختم کرلیتے ہیں ؟ ہاں ( ) نہیں ( )

13- کیا نصابی کتب کے موضوعات طلبہ کی ذہنی صلاحیت کے مطابق ہیں ؟ ہاں ( ) نہیں ( )

14- کیا ذریعہ تعلیم قومی زبان ہونا چاہیے ؟ ہاں ( ) نہیں ( )

15- کیا آپ نصاب ساز اداروں کے کام سے مطمئن ہیں ؟ ہاں ( ) نہیں ( )

16- کیا موجودہ نصاب سے جذبہ حب وطن پیدا ہوتا ہے ؟ ہاں ( ) نہیں ( )

17- کیا ہمارا نصاب تعلیم کردار سازی میں مددگار ثابت ہوتا ہے ؟ ہاں ( ) نہیں ( )

18- کیا نصاب تعلیم سے ہمہ گیر نشو و نما ہوتی ہے ؟ ہاں ( ) نہیں ( )

19- کیا اسکول میں نصاب تعلیم کی تکمیل کے لیے ضروری سہولتیں ہیں ؟ ہاں ( ) نہیں ( )

20- اگر نصاب تعلیم کو آپ کی مرضی سے مرتب کیا جائے تو آپ کون سے مقاصد کو اولیت دیں گے۔ (صرف تین مقاصد کو ترتیب وار تحریر کیجیے) ہاں ( ) نہیں ( )

(الف)
(ب)
(ت)

عالمی معاشرے کا تصوّر اور ہمارا نصابِ تعلیم

جناب ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری

زندگی کے آغاز کے بارے میں دنیا خواہ کسی مذہب و فلسفہ پر اعتقاد رکھے، لیکن صدیوں کی گردش اور ارتقا کی منزلوں سے گزرنے کے بعد کاروان حیات بیسویں صدی کے ربع آخر میں ارتقا کے جس مقام تک پہنچا ہے اور معاشرتی نظم و انضباط کے سانچوں میں ڈھل کر اس نے جو خاص شکل اختیار کر لی ہے، اس کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں، اور آئندہ خواہ زندگی کے بارے میں ہمارا تصور کتنا ہی بدل جائے، لیکن معاشرتی زندگی کی اس تقسیم منازل و دوائر میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی ۔

ہم اپنی معاشرتی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ ہمیں مختلف دائروں میں بٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ انہیں معاشرتی زندگی کے ارتقائی مراحل بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان میں سے زندگی کا ہر مرحلہ اور ہر دائرہ اپنی مستقل حیثیت اور دائمی اہمیت رکھتا ہے۔ انسان اپنی زندگی کے سفر میں خواہ کتنا ہی آگے بڑھ جائے وہ ان معاشرتی دیروں سے نہ رشتہ توڑ سکتا ہے نہ ان کے تقاضوں کو نظر انداز کر سکتا ہے ۔

ایک بچّہ جب زندگی میں پہلا قدم رکھتا ہے اور آنکھیں کھولتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ ایک سراپا رحمت وجود اسے اپنے سینے سے چمٹائے ہوئے ہے، وہ نظریں اٹھاتا ہے تو ایک نئے چہرے کو اپنے اوپر جھکا ہوا پاتا ہے جو اسے محبت اور شفقت کی نظروں سے دیکھ رہا ہوتا ہے اور جب وہ نظروں کو ادھر ادھر گھماتا ہے تو اسے کئی اور معصوم، مسکراتے، اپنی محبتوں کو نچھاور کرتے اور میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتے ہوئے چہرے نظر آتے ہیں ۔ یہ معاشرتی زندگی کا پہلا دائرہ اور اس کے سراپا محبت ارکان ہیں ۔ جب وہ ذرا بڑا ہوتا ہے تو انہیں ماں، باپ، بہن، بھائی کے عرف سے پہچانتا ہے۔ عمرانیات کی اصطلاح میں معاشرتی زندگی کی اس منزل کو " خاندان " کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

خاندان کا ہر فرد اپنی جداگانہ حیثیت رکھتا ہے، لیکن خاندان کی شکل میں وہ صرف ایک اکائی ہوتا ہے جو انسان کی معاشرتی زندگی کے

ایک بڑے دائرے کی تشکیل میں عامل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ دائرہ خاندان کی سطح سے اوپر کنبے یا برادری کی منزل ہوتی ہے۔ یہ گویا معاشرتی زندگی کا دوسرا دائرہ ہوتا ہے۔ اسی طرح کنبےاور برادری کے مختلف معاشرتی دائروں کے اجتماع و تالیف سے ایک شہر یا وسیع انسانی آبادی کی سطح پر معاشرتی زندگی کا نقش ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یہ گویا کہ ایک صوبے یا علاقے کے دائرے میں معاشرتی زندگی کی ایک خاص وضع و شکل ہوتی ہے جس کی تشکیل میں علاقے کے جغرافیائی حالات، آب و ہوا، نسل و خون کے خصائص، زبان اور کلچر اور تاریخ و تہذیب کی بہترین روایات کا حصہ ہوتا ہے۔اس کے بعد سوسائٹی کی ایک اور سطح نمودار ہوتی ہے جس کے قیام میں مختلف علاقوں اور وسیع انسانی آبادیوں کی تہذیبی اقدار، روایات اور معاشرتی زندگی اور رہن سہن کے طور طریقوں کی کارفرمائی صاف دیکھی جا سکتی ہے۔اس سطح کی زندگی کو کسی قوم کی تہذیبی روایتی زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس سے اس قوم کی تاریخی، تہذیبی روایات، زندگی کے بارے میں اس کے نظریات، انداز فکر، اس کے ذہنی و فکری رجحانات اور انسانیت کے بارے میں اس کے رویّے کا اظہار ہوتا ہے۔

انسانی معاشرتی زندگی میں جو دائرے نظر آتے ہیں ہم انھیں خاندان، کنبہ یا برادری، علاقہ یا صوبائیت اور اس کے بعد ملکی دائرے میں ایک قوم کی تہذیب و معاشرت کے نام سے پکارتے ہیں۔جب تک ہر سطح اور ہر دائرے کی زندگی کی تعمیر اعلا اقدار اور تہذیبی روایات پر نہ ہو، قومی زندگی کے خصائص کا نقش اجاگر نہیں ہو سکتا۔لیکن قومی تعمیر کےاس کام میں سب سے زیادہ اہمیت خاندان کے ننھے رکن یعنی بچّے کی تعلیم و تربیت کی ہوتی ہے۔اس اوّلین دائرۂ معاشرت میں خاندان کے نظام میں معمولی سا عدم توازن، ماں باپ کی نظروں کا اختلاف، افراد خاندان میں تعاون و احترام کی کمی، بچّے کی فکر و سیرت کی تعمیر میں ایسی ٹیڑھ پیدا کر دیتا ہے کہ پھر اسے بنیاد بدلے بغیر سیدھا نہیں کیا جا سکتا، اور اس کا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ تعمیر سیرت کی خرابی کا جو بیج یہاں بویا جاتا ہے اس کی فصل زندگی بھر خواہی نہ خواہی معاشرے کو کاٹنی پڑتی ہے، اس کے نتائج پوری قوم کو بھگتنے پڑتے ہیں اور ان کی سمیّت قومی زندگی کو اس کے خصائص سے اس طرح کھوکھلا کر دیتی ہے جس طرح گھن گیہوں کو اور دیمک لکڑی کو۔

سوسائٹی کے ارتقا کا وہ عمل جو ایک خاندان کے ننھے فرد کی تعلیم و تربیت سے شروع ہوتا ہے، وہ اگر خاندان، کنبے برادری، فرقے یا معاشرتی زندگی کی ادنا سطح سے لے کر صوبے اور علاقے کی سطح تک

کسی جگہ رک جائے تو اعلا دماغ اور صحیح الفکر افراد اسے اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے۔ اسے ایک معاشرتی گناہ اور انسانی اقدار کے خلاف معصیت تصور کیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر ایک شخص اپنی ذہنی سطح اور حصول عیش و لذت کا دائرہ اپنی ذات یا خاندان سے زیادہ وسیع نہ کر سکے تو اسے خود غرض اور نفس پرست کہا جاتا ہے۔ اگر اس کی ذہنی و فکری سطح اپنی ذات اور خاندان کی سطح سے تو بلند ہو، لیکن کنبیے، برادری یا فرقے کے مفادات سے زیادہ بلند نہ ہو سکے تو اسے فرقہ پرست کا مذموم نام دیا جائے گا۔ اگر کسی کی بلند پروازیاں صرف صوبے اور علاقے کی زمین و آسمان کی حدوں کو چھو لینے تک ہوں تو اسے متعصب اور صوبہ پرست کے ناپسندیدہ خطاب سے نوازا جاتا ہے اور اسے ایک قومی گناہ سمجھا جاتا ہے۔ ایسے شخص یا افراد کو قوم کا قابل نفرت عنصر خیال کیا جاتا ہے۔ ایسا اس لیے کیا جاتا ہے کہ اس کے قوم پرستی کے جذبے اور قومی خدمت کے عزائم سے توقع تھی کہ وہ ملک اور قوم کے مفادات کو اپنی ذات، برادری، فرقے، علاقے کی مفادات پر ترجیح دے گا، لیکن وہ قومی تعمیر و ترقی میں اپنی ذمہ داری کو بھول کر اپنی ذات، خاندان، قبیلے یا علاقے کے سود و زیاں میں الجھ کر رہ گیا۔

عام طور پر کسی شخص کے لیے سب سے بڑا اعزاز یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ صوبہ پرستی کی لعنت سے تو ضرور پاک ہو، لیکن ملکی تعصب سے اس کی شخصیت کا خمیر اٹھا ہو اور قوم پرستی کا جوہر اس کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہو، یہاں تک کہ ملکی و قومی عصبیّت اور ذوق پرستش اس کی فطرت ثانیہ بن گیا ہو۔ اگر ایسا ہے تو اسے دنیا کے سب سے بڑے اعزاز کا مستحق سمجھا جائے گا اور اس کا درجہ قومی ہیرو کا قرار پائے گا۔

دنیا کی قوموں کی زندگی کا بلند سے بلند نصب العین بلا شبہ یہی ہے کہ وہ اپنے لیے جیتی ہیں، اپنے مفادات کی نگہداشت کرتی ہیں اور اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے جنگ کرتی ہیں۔ بلا شبہ قومی زندگی اور مفادات کے تحفظ کی راہ میں ایثار و قربانی کا یہ جذبہ ایک خوبی ہے جس کی تعریف کی جانی چاہیے۔ اگر یہ عصبیت نہ ہو تو قومی زندگی کی تہذیبی و فکری اقدار، جغرافیائی حدود اور قومی مفاد کسی وقت بھی خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ لیکن اگر انسانی زندگی کے حدود کسی ایک ملک اور قوم کی سطح پر آ کر رک نہیں جاتے تو کسی شخص یا قوم کے ذہن و فکر کے ارتقا کے عمل کا ایک قومی اور ملکی سطح پر آ کر رک جانا کیوں کر پسندیدہ فعل ہو سکتا ہے؟

ابھی میں نے عرض کیا تھا کہ خود غرضی ،فرقہ پرستی بُری چیز ہے اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ صوبہ پرستی بھی بُری چیز ہے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ معاشرتی زندگی کی کسی ادنا سطح کے مفاد کے مقابلے میں اس سے اعلا سطح کے مفادات کو نظر انداز کر دینا ایک معاشرتی گناہ ہے۔اب وہ خواہ اپنی ذات یا خاندان کے مقابلے میں دوسرے کی شخصیت اور خاندان ہو یا ملک کے ایک صوبے کے مقابلے میں دوسرے صوبے اور علاقے کا مفاد ہو۔ بس اگر یہ حقیقت ہے کہ ایک ملک کی سطح کے اوپر ایشیا ، یورپ ، افریقہ وغیرہ براعظموں میں انسان بستے ہیں اور ان کی زندگی اور مفادات کے بھی تقاضے ہیں تو کسی قوم یا ملک کا انہیں نظر انداز کر کے سوچنا اور ایک ایشیائی کے لیے افریقی و یورپی کے بارے میں نہ سوچنا اور اسی طرح پورے کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی انسانیت کی ترقی اور فلاح و بہبود کی جنگ میں حصہ نہ لینا خوبی کی بات کیوں کر ہو سکتی ہے ؟

قومی نقطہ نظر کی تعمیر اور اس کے مطابق تعلیم و تربیت کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں ، توجہ صرف اس طرف دلانا چاہتا ہوں کہ فرد اور پھر خاندان کی سطح سے قومی سطح تک ذہن و فکر کی توسیع کا جو تدریجی عمل تعلیم و تربیت میں کار فرما ہوتا ہے وہ قومی سطح پر آ کر رک جاتا ہے ، حال آں کہ تعلیم و تربیت کی ضرورت تو نوع انسانی کے ہر فرد کے لیے ہوتی ہے خواہ وہ کسی براعظم میں ، دنیا کے کسی خطے اور کسی دور دراز علاقے میں بستا ہو ۔

اگرچہ مسلمانوں کو تعلیم دی گئی تھی کہ وہ جس اللہ پر ایمان لائے ہیں وہ رب العالمین ہے۔جو رسول گرامی ان کی رہنمائی کے لیے مبعوث کیے گئے ہیں ان کی صفت رحمۃ للعالمین ہے۔جو کتاب آخر ان کی ہدایت کے لیے نازل کی گئی ہے وہ ہدی للعالمین ہے اور خود انہیں خیر امت کا لقب دیا گیا ہے اور ان کا ملّی فریضہ یہ بتایا گیا ہے کہ وہ عالم انسانی کو بھلائی کی طرف بلاتے اور برائی سے روکتے ہیں ۔

یہ کتنے تعجب کی بات ہے کہ جن کے اللہ تعالیٰ ، رسول برحق ص ، کتاب ہدایت اور جن کی اپنی یہ صفات بیان کی گئی ہوں ان کے ذہن و فکر کی سب سے بلند پرواز قوم کی سطح سے زیادہ اونچی نہ ہو ، ان کے نظام تعلیم کے مقاصد مخصوص جغرافیائی حدود تک وسیع ہوں ، حتیٰ کہ ان کے قومی نصاب تعلیم میں مختلف گروہی ، جماعتی اور فرقہ وارانہ تعصبات کار فرما ہوں ۔

دنیا کی اقوام کا فرض ہے کہ وہ اپنے قومی نصابات تعلیم کی سطح کو عالمی انسانی تصور تک بلند کریں اور ایک عالمی انسانی معاشرے یعنی انسانی

اقدار اور عالم گیر سچائیوں کی جستجو کے مقاصد پر مبنی عالمی معاشرے کی تعمیر میں حصہ لیں -ان کے لیے یہ فرض دنیاوی و سیاسی ہوگا ، لیکن مسلمانوں کا یہ قومی اور سیاسی ہی نہیں مذہبی اور دینی فریضہ بھی ہے۔ اگر دنیا کی کوئی قوم اس فرض کی ادائ نہیں کرتی اور عالمی انسانی معاشرے کی تعمیر میں حصہ نہیں لیتی تو بلاشبہہ وہ ایک گناہ کرتی ہے - لیکن اس کے لیے یہ صرف ایک دنیاوی ذمہ داری تھی اور دنیاوی گناہ ہوگا ، لیکن اگر مسلمان اس ذمہ داری کو پورا نہیں کرتے تو وہ ایک دنیاوی گناہ ہی کے مرتکب نہیں ہوتے بلکہ وہ ایک الٰہی معصیت میں بھی مبتلا ہوتے ہیں اور ان کے اپنے عقیدۂ آخرت کے مطابق ان سے اس انسانی جرم کی باز پرس بھی ہوگی -

آج ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی اقوام و ملل کا قافلۂ فکر و عمل متحدہ انسانیت کے تصور سے عمل کی طرف رواں ہے۔اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آچکا ہے ، سلامتی کونسل ، عالمی عدالت ، عالمی بنک ، دنیا کو امدادی قرضے دینے والے ادارے کے تصور نے عملی شکل اختیار کر لی ہے- ایک عالمی زبان ، عالمی معاشرے اور عالمی حکومت کا تصور خواہ عمل کی دنیا میں کبھی نقش پذیر نہ ہو سکے،لیکن انسان کے ذہن سے یہ بعید نہیں رہا- کسی ایک قوم یا ملک کے بجائے انسانیت کی خدمت کے لیے تعلیم ، سائنس، تہذیب و ثقافت کے میدان میں یونیسکو کے مقاصد و عزائم نے دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے[1] اگرچہ اسلامی نقطہ نظر سے اس کے مقاصد اور نظام میں خامیاں ہوں،لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فکر انسانی کا رخ درست ہے- کاش مسلمان اس فکر کے رہنما ہوتے کہ دنیا میں صرف ان ہی کے دین نے سچائی کے عالم گیر ہونے کا ، کل انسانیت کی خدمت ، ان کی فلاح و بہبود اور ان کی رہنمائی کا جامع تصور اور مکمل لائحۂ عمل پیش کیا تھا۔

افسوس کہ مسلمان نہ صرف دنیا کی رہنمائی کے منصب سے الگ ہو گئے بلکہ اس تصور سے ان کے ذہن خالی اور فکر ناآشنا ہوگئے۔اگر ہماری ذہنی پسپائی کی یہی حد ہوتی تو غنیمت تھا،لیکن صد افسوس کا مقام یہ ہے کہ ٹھیک اس عہد میں کہ دنیا نے عالمی انسانی تصور کو اپنا لیا ہے اور ایک عالمی انسانی سوسائٹی کی تعمیر میں مصروف ہے،پاکستان کے مسلمانوں نے مسلم قومیت کے ایک تصور سے بھی انکار کر دیا ہے اور فیصلہ کر لیا ہے کہ اسلامی تعلیمات کو اسلام کے دو فرقوں میں تقسیم کر دیا جائے -دونوں فرقوں کے طلبہ کے لیے الگ الگ استاد مقرر کیے جائیں اور عقائد و عبادات کے فلسفے ، اس کے نظام ، عمل صالح کی اہمیت افادیت اور اخلاق و معاملات کی تعلیم کا نصاب الگ الگ مرتب کیا جائے -

تعلیم کے اعلا اداروں میں جہاں تحقیق ہوتی ہے دیگر علوم و فنون کے متخصصین کی طرح مختلف مذاہب و مکاتب فکر کے ماہرین کا انتظام ہوسکتا ہے، لیکن اسلامیات کے ایک شعبے میں، نہ کہ کسی فرقے یا مکاتب فکر کا الگ شعبہ قائم کیا جائے ۔ثانوی تعلیم کے اداروں کے لیے عقائد و عبادات اور اخلاق و معاملات کی تعلیم کا الگ الگ دیا جانا، نصاب کا الگ الگ مرتب ہونا، الگ الگ اساتذہ کا پڑھانا اللہ اور رسول[ص] اور اسلام اور قرآن کا نام لینے والے فرقے یا مکاتب فکر کے لیے جائز نہیں ہو سکتا الّا یہ کہ انہیں اسلام سے الگ مستقل دین، تصور کیا جائے ۔

معلوم نہیں ہمارے ماہرین تعلیم نے اس پر غور کیا یا نہیں کہ جب اسلام، قرآن، توحید، رسالت پر ایمان رکھنے والے کچھ طلبہ ایک پیریڈ میں اسلام ہی کی تعلیم کے لیے الگ ہو جاتے ہیں تو اس کا اثر ان طلبہ اور دیگر طلبہ کی نفسیات پر کیا پڑتا ہے ؟

لیکن میں سوچتا ہوں کہیں ایسا تو نہیں کہ ایک اللہ، ایک دین، ایک رسول[ص]، ایک قرآن، ایک قوم اور امت واحدۂ مسلمہ، ملّتِ بیضا کا ہمارا دعوا ہی جھوٹا ہو اور شعوری اور غیر شعوری طور پر ہم خود کو اور دنیا کو دھوکا دے رہے ہوں ۔ کہیں ہمارا عقیدہ یہ تو نہیں کہ کائنات کی سچائی توحید و رسالت اور اسلام و قرآن کے بجائے فرقوں اور گروہوں میں اور وحدت ملّت کے بجائے افتراقِ امت میں ہو ۔گزشتہ چند برسوں میں قومی زندگی میں بعض ایسے فیصلے کیے گئے ہیں جن کی بنیاد اسلامی علوم، فقہ، اصول، حدیث، تفسیر وغیرہ میں نظر امتیاز و تبحّر کے بجائے شیعہ، سنی، بریلوی، دیوبندی، اہل حدیث مکاتب فکر کی نمائندگی کو قرار دیا گیا ہے ۔اس سے تو یہی شبہ ہوتا ہے، شاید اسی وجہ سے قیام پاکستان کے ۲۵، ۳۰ سال بعد ہمارے اجتماعی، معاشرتی، دینی سفر کا رخ بدل گیا ہے اور گزشتہ دس سال سے ہم نے پاکستان میں اسلام اور اسلامی تعلیمات کی ایک نئی تاریخ بنانی شروع کر دی ہے ۔

ہمارے نصاب تعلیم میں جو مختلف فرقہ ورانہ تعصبات جس طرح کارفرما ہیں، ان میں سے ایک کی طرف یہاں صرف اشارہ کیا گیا ہے ۔ ان کی موجودگی میں نہ تو ملکی اور بین الملکی سطح پر مستحکم ملّتِ واحدہ و امت مسلمہ اور ایک ناقابل شکست مسلمان قوم کا وجود ظہور میں آ سکتا ہے اور نہ عالمی اور بین الاقوامی سطح پر انسانیت کی تعمیر میں حصہ لیا جا سکتا ہے، نہ عیال اللہ کا تصور پیدا ہو سکتا ہے اور نہ اس کی خدمت کا فریضہ انجام دیا جا سکتا ہے ۔

آج ہم جس حالت سے دو چار ہیں وہ غفلت، جہالت، حقیقت ناشناسی اور عاقبت نااندیشی کی حالت ہے - ہمیں اپنے عقیدہ و عمل اور افکار و سیرت میں ایک انقلاب لانا ہے - اگر ہم اس کے لیے تیار نہ ہوئے تو مستقبل کا مورخ لکھے گا کہ ٹھیک اس وقت جب دنیا عالم گیر سچائی کی تلاش میں تھی اور انسان نے اس کے سررشتہ فکر کو پا لیا تھا تو ایک ایسی بدبخت قوم بھی تھی جو انسانیت کی اس جستجو سے یکسر نا آشنا، اس کے ذہنی و فکری سفر سے قطعی غافل اور اپنے گروہی تعصبات میں گرفتار تھی -

---

حوالہ

۱ - یونیسکو اقوام متحدہ کا ذیلی ادارہ ہے - ۲/نومبر ۱۹۴۶ء کو وجود میں آیا - اس کا مقصد اس کے آئین کے مطابق یہ ہے کہ قوموں کے درمیان تعلیم، سائنس اور تہذیب و ثقافت کے میدانوں میں تعاون کو ترقی دے کر امن اور سلامتی کو بڑھایا جائے تاکہ انصاف، قانون کی برتری اور حقوق انسانی اور بنیادی آزادی کا احترام بڑھے - ظاہر ہے کہ یہ مقاصد اسلام کے منافی نہیں - اسلامی خلافت کے قیام کا مقصد ہی انسانی حقوق کا تحفظ اور امن ہے -

نظام تعلیم کی دوئی اور اُس کے اثرات

جناب محمد صلاح الدین

اس مقالے کے عنوان میں لفظ "دوئی" سے جہاں اس حقیقت کی جانب واضح اشارہ ملتا ہے کہ ہمارا مروجہ نظام تعلیم یک رنگ نہیں بلکہ دو مختلف رنگوں اور سانچوں میں ڈھلا ہوا ہے وہاں اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان بھی پایا جاتا ہے کہ فی الواقع یہ نظام دو ہی رنگوں میں پایا جاتا ہے جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ اس کے رنگوں کا شمار ہی مشکل ہے۔ان رنگوں کا تعین بجائے خود ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے۔ہمارے نظام تعلیم کی ایک تقسیم تو دینی اور دنیوی مدارس کی صورت میں ہے اور دوسری بڑی تقسیم انگریزی ذریعہ تعلیم اور اردو ذریعہ تعلیم کے دو قطعی جداگانہ اور متوازی نظام تعلیم کی شکل میں رائج ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو معاملہ دو رنگی کا نہیں سہ رنگی کا بن جاتا ہے۔مزید گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو تقسیم در تقسیم کا یہ عمل اتنا دراز ہو جاتا ہے کہ نظام تعلیم کے رنگوں کا شمار اختر شماری جیسا پیچیدہ اور پریشان کن مسئلہ بن جاتا ہے ۔

معاشرے پر مروجہ نظام تعلیم کے اثرات کا جائزہ لینے سے قبل یہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ہم سے جس حد تک ممکن ہو اس کے مختلف رنگوں سے شناسائی حاصل کریں ۔اس شناسائی اور شناخت و آگہی پر ہی اس امر کا انحصار ہے کہ ہم موجودہ نظام تعلیم کے اثرات و نتائج کا احاطہ کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں۔ ملک کے تعلیمی اداروں کو ہم چھ بڑے گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں :

۱ ۔ حکومت کے زیر انتظام یعنی سرکاری خزانے سے چلنے والے تعلیمی ادارے۔

۲ ۔ مشنری اسکول اور کالجز۔

۳ ۔ مشنری اداروں کی طرز پر قائم کردہ،لیکن مقامی افراد یا تنظیموں کے زیر انتظام چلنے والے ادارے۔

۴ ۔ انگریزی ذریعہ تعلیم کے وہ ادارے جو بڑے شہروں کے رہائشی علاقوں میں حشرات الارض کی طرح ابھر آئے ہیں ۔

۵۔ کمیونٹی اسکول اور کالجز۔

۶۔ دینی مدارس۔

ان گروہوں میں صرف عام تعلیم کے ادارے شامل ہیں، فنی، طبی، زرعی اور دیگر پیشہ ورانہ ادارے اس کے علاوہ ہیں، یہ چونکہ ہمارے اصل موضوع کے دائرہ بحث سے براہ راست کوئی تعلق نہیں رکھتے، اس لیے ہم نے انہیں اس فہرست سے خارج رکھا ہے۔

اب صرف پہلا گروپ لیجیے اور یہ دیکھیے کہ خود حکومت کے زیر انتظام چلنے والے "قومی" اداروں کی رنگارنگی کا کیا حال ہے۔ جدا نصاب، مخصوص ماحول، تعلیمی سہولتوں میں فرق، اساتذہ کے مختلف اسکیل اور طالب علموں کی طبقاتی حیثیت کے لحاظ سے ان اداروں کی نمایاں اقسام یہ ہیں:

۱۔ اردو ذریعہ تعلیم کے عام پرائمری اور ہائی اسکول

۲۔ انگریزی ذریعہ تعلیم کے ماڈل پرائمری اور ہائی اسکول

۳۔ انگریزی ذریعہ تعلیم کے پبلک پرائمری اور ہائی اسکول

۴۔ لارنس کالج (موجودہ پائنر اسکول اور کالج) گھوڑا گلی جیسے خصوصی ادارے۔

۵۔ کیڈٹ اسکول اور کالج مری، پٹارو اور حسن ابدال جیسے خصوصی ادارے۔

۶۔ اردو ذریعہ تعلیم اور انگریزی ذریعہ تعلیم کے جداگانہ کالج

یہ چھے رنگ صرف ایک گروپ کے ہیں، دوسرے گروپ یعنی مشنری اداروں کا رنگ بھی ایک نہیں ہے۔ ان میں بعض اسکول غربا کے لیے ہیں، جہاں دیسی نصاب پڑھایا جاتا ہے اور تعلیم مفت یا فیس کے ساتھ دی جاتی ہے۔ پھر متوسط درجے کے خاندانوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کے اسکول ہیں اور امرا، رؤسا، اعلا سرکاری عہدیداران، جاگیرداروں، سرداروں اور وڈیروں کی اولاد کے لیے اعلا معیار کے اور کیمبرج سے منسلک نصاب تعلیم کے ادارے الگ ہیں۔ ان میں بھی نصاب، فیس، اساتذہ کی اہلیت و مراعات اور طلبہ کے لیے فراہم کردہ سہولتوں کا معاملہ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ کراچی کے سینٹ لارنس، سینٹ پیٹرک، سینٹ جوزف، گرامر، امریکن، لاہور کے ایچی سن، سینٹ میری، سیالکوٹ کے مرے کالج اور اسی نوعیت کے ہزاروں اسکول اور کالج ایک جال کی طرح ملک کے چھوٹے بڑے تمام شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

تیسرے گروپ میں وہ اسکول اور کالج شامل ہیں جو مشن کے زیرانتظام نہیں،لیکن مشن ہی کی طرز پر قائم کیے گئے ہیں اور مخصوص طبقاتی کردار کے حامل ہیں مثلاً بیکن ہاؤس یا حبیب اسکول وغیرہ

چوتھے گروپ میں انگریزی ناموں کے ساتھ اور انگریزی ذریعہ تعلیم پر مبنی وہ اسکول ہیں جو گزشتہ چند سال کے اندر کراچی ، لاہور ، اسلام آباد، راولپنڈی ، پشاور ، کوئٹہ ، حیدر آباد اور دوسرے شہروں کے رہائشی علاقوں میں تجارتی دکانوں کی طرح تیزی سے کھلے ہیں اور تجارت ہی کے اصولوں پر چل رہے ہیں - ان کا اپنا مخصوص اور جداگانہ رنگ ہے - سنگاپور کی چھپی ہوئی کتابیں پڑھانا اور والدین کی جیبوں کا بار ہلکا کرنا ان کا امتیازی وصف ہے -

پانچویں گروپ میں مختلف کمیونٹیز کے مخصوص تعلیمی ادارے شامل ہیں مثلاً آغا خاں کمیونٹی ، بوہرہ کمیونٹی اور ربوہ اور لاہور میں قادیانی کمیونٹی کے اسکول اور کالج -

دنیوی تعلیم کے اداروں کی بوقلمونی کے بعد اب چھٹے گروپ میں شامل دینی مدارس کی رنگارنگی پر ایک نظر ڈالیے - اصطلاحاً جنہیں دینی مدارس کہا جاتا ہے وہ درحقیقت مسلکی مدارس ہیں - ان پر مخصوص مسلک کا رنگ اتنا گہرا اور پختہ ہے کہ اب یہ اسی کے حوالے سے جانے پہچانے جاتے ہیں - ان کی گروپ بندی اس طرح ہے -

۱ - حنفی دیوبندی مدارس

۲ - حنفی بریلوی مدارس

۳ - اہلحدیث مدارس

۴ - فقہ جعفریہ کے شیعہ مدارس

ان مسلکی مدارس میں بھی ہر مسلک کے تعلیمی اداروں کا نصاب ، ماحول اور رنگ مشترک نہیں ، مختلف النوع ہے،لیکن اختصار کی خاطر ہم مزید تفصیل میں نہیں جاتے -

اس صورت حال سے اتنی بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے ملک میں اس وقت کوئی قومی نظام تعلیم نہیں ، پورا نظام تعلیم طبقاتی ، گروہی ، فرقہ وارانہ اور ملکی و غیر ملکی اثرات کی زنجیروں اور حد بندیوں میں جکڑا ہوا ہے -

۵- کمیونٹی اسکول اور کالجز۔

۶- دینی مدارس۔

ان گروہوں میں صرف عام تعلیم کے ادارے شامل ہیں، فنی، طبی، زرعی اور دیگر پیشہ ورانہ ادارے اس کے علاوہ ہیں، یہ چونکہ ہمارے اصل موضوع کے دائرہ بحث سے براہ راست کوئی تعلق نہیں رکھتے، اس لیے ہم نے انہیں اس فہرست سے خارج رکھا ہے۔

اب صرف پہلا گروپ لیجیے اور یہ دیکھیے کہ خود حکومت کے زیر انتظام چلنے والے "قومی" اداروں کی رنگارنگی کا کیا حال ہے۔ جدا نصاب، مخصوص ماحول، تعلیمی سہولتوں میں فرق، اساتذہ کے مختلف اسکیل اور طالب علموں کی طبقاتی حیثیت کے لحاظ سے ان اداروں کی نمایاں اقسام یہ ہیں:

۱- اردو ذریعہ تعلیم کے عام پرائمری اور ہائی اسکول

۲- انگریزی ذریعہ تعلیم کے ماڈل پرائمری اور ہائی اسکول

۳- انگریزی ذریعہ تعلیم کے پبلک پرائمری اور ہائی اسکول

۴- لارنس کالج (موجودہ پائنر اسکول اور کالج) گھوڑا گلی جیسے خصوصی ادارے۔

۵- کیڈٹ اسکول اور کالج مری، پٹارو اور حسن ابدال جیسے خصوصی ادارے۔

۶- اردو ذریعہ تعلیم اور انگریزی ذریعہ تعلیم کے جداگانہ کالج

یہ چھے رنگ صرف ایک گروپ کے ہیں، دوسرے گروپ یعنی مشنری اداروں کا رنگ بھی ایک نہیں ہے۔ ان میں بعض اسکول غربا کے لیے ہیں، جہاں دیسی نصاب پڑھایا جاتا ہے اور تعلیم مفت یا فیس کے ساتھ دی جاتی ہے۔ پھر متوسط درجے کے خاندانوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کے اسکول ہیں اور امرا، رؤسا، اعلا سرکاری عہدیداران، جاگیرداروں، سوداروں اور وڈیروں کی اولاد کے لیے اعلا معیار کے اور کیمبرج سے منسلک نصاب تعلیم کے ادارے الگ ہیں۔ ان میں بھی نصاب، فیس، اساتذہ کی اہلیت و مراعات اور طلبہ کے لیے فراہم کردہ سہولتوں کا معاملہ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ کراچی کے سینٹ لارنس، سینٹ پیٹرک، سینٹ جوزف، گرامر، امریکن، لاہور کے ایچی سن، سینٹ میری، سیالکوٹ کے مرے کالج اور اسی نوعیت کے ہزاروں اسکول اور کالج ایک جال کی طرح ملک کے چھوٹے بڑے تمام شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

تیسرے گروپ میں وہ اسکول اور کالج شامل ہیں جو مشن کے زیرانتظام نہیں،لیکن مشن ہی کی طرز پر قائم کیے گئےہیں اور مخصوص طبقاتی کردار کے حامل ہیں مثلاً بیکن ہاؤس یا حبیب اسکول وغیرہ

چوتھے گروپ میں انگریزی ناموں کے ساتھ۔ اور انگریزی ذریعہ تعلیم پر مبنی وہ اسکول ہیں جو گزشتہ چند سال کے اندر کراچی ، لاہور ، اسلام آباد، راولپنڈی ، پشاور ، کوئٹہ ، حیدرآباد اور دوسرے شہروں کے رہائشی علاقوں میں تجارتی دوکانوں کی طرح تیزی سے کھلے ہیں اور تجارت ہی کے اصولوں پر چل رہے ہیں ۔ ان کا اپنا مخصوص اور جداگانہ رنگ ہے۔سنگاپور کی چھپی ہوئی کتابیں پڑھانا اور والدین کی جیبوں کا بار ہلکا کرنا ان کا امتیازی وصف ہے۔

پانچویں گروپ میں مختلف کمیونٹیز کے مخصوص تعلیمی ادارے شامل ہیں مثلاً آغا خاں کمیونٹی ، بوہرہ کمیونٹی اور ربوہ اور لاہور میں قادیانی کمیونٹی کے اسکول اور کالج ۔

دنیوی تعلیم کے اداروں کی بوقلمونی کے بعد اب چھٹے گروپ میں شامل دینی مدارس کی رنگارنگی پر ایک نظر ڈالیے۔اصطلاحاً جنہیں دینی مدارس کہا جاتا ہے وہ درحقیقت مسلکی مدارس ہیں ۔ ان پر مخصوص مسلک کا رنگ اتنا گہرا اور پختہ ہے کہ اب یہ اس کے حوالے سے جانے پہچانے جاتے ہیں ۔ان کی گروپ بندی اس طرح ہے ۔

۱ ۔ حنفی دیوبندی مدارس

۲۔ حنفی بریلوی مدارس

۳ ۔ اہلحدیث مدارس

۴ ۔ فقہ جعفریہ کے شیعہ مدارس

ان مسلکی مدارس میں بھی ہر مسلک کے تعلیمی اداروں کا نصاب ، ماحول اور رنگ مشترک نہیں ، مختلف النوع ہے،لیکن اختصار کی خاطر ہم مزید تفصیل میں نہیں جاتے ۔

اس صورت حال سے اتنی بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے ملک میں اس وقت کوئی قومی نظام تعلیم نہیں ، پورا نظام تعلیم طبقاتی ، گروہی ، فرقہ وارانہ اور ملکی و غیر ملکی اثرات کی زنجیروں اور حد بندیوں میں جکڑا ہوا ہے ۔

ہم جب نظامِ تعلیم کے موجودہ ڈھانچے کی بات کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں یہ بات واضح طور پر موجود ہونی چاہیے کہ یہ ڈھانچا آزادی سے قبل عہد غلامی میں لارڈ میکالے کی تیار کردہ تعلیمی پالیسی کی بنیادوں پر استوار کیا گیا تھا۔اس کے پانچ بنیادی مقاصد تھے :

۱۔ انتظامی مشینری کے لیے کلرکوں سے لے کر آئی سی ایس افسروں تک تاج برطانیہ کے وفادار اور سستے ملازمین کی کھیپ تیار کرنا۔

۲۔ مغربی تہذیب اور افکار و نظریات کے غلبے کے لیے انگریزی زبان کو وسیلہ بنانا اور اس کے ذریعہ مغرب کے سرچشمہ علم و اقتدار سے قلب و نظر کا رشتہ اس طرح جوڑے رکھنا کہ نو آبادیاتی دور کے خاتمے کے بعد بھی یہ لاسلکی ربط و تعلق اپنی جگہ برقرار رہ سکے۔

۳۔ غیر پیداواری افرادی قوت فراہم کرنا جو ایک طرف انتظامی مشینری کے علاوہ فوج ، زرعی معیشت اور تجارتی سرگرمیوں کی ضروریات پوری کر سکے اور دوسری طرف برطانیہ کی صنعتوں کے لیے صارفین کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرتی چلی جائے ،صارفین کے اس معاشرے CONSUMERS SOCIETY کو تنخواہ کی صورت میں جو رقم ادا کی جائے وہ مصنوعات کی منھ مانگی قیمتوں کی صورت میں واپس وصول کر کے برطانیہ پہنچا دی جائے۔

۴۔ عیسائیت کو فروغ دیا جائے اور مقامی لوگوں کی بڑی سے بڑی تعداد کو اپنا ہم مذہب بنا کر ان کو وطن اور اصل معاشرے سے کاٹ دیا جائے۔ان کا رشتہ وفاداری برطانیہ اور اس کے سرپرست کلیسائے روم سے جوڑ کر سیاسی اثر و رسوخ میں اضافہ کیا جائے اور بعد میں اس گروہ کے ذریعہ اپنے اثرات کا ایک مستقل سلسلہ CHANNEL قائم رکھا جائے۔

۵۔ معاشرتی زندگی کا مربوط ڈھانچہ توڑ کر اس کی متحدہ قوت کو پارہ پارہ کیا جائے اور مختلف طبقات وجود میں لا کر انھیں باہم متصادم کر دیا جائے تاکہ ان کا رخ ایک دوسرے کی طرف رہے، ہماری طرف نہ ہو۔ان مقاصد کے حصول کے لیے تعلیمی نظام کا پورا ڈھانچا تبدیل کر دیا گیا۔ وفادار امرا ، رؤسا ، راجوں ، مہاراجوں اور نوابوں کے لیے علاحدہ نصاب اور اعلا سہولتوں کے تعلیمی ادارے قائم ہوئے۔ انگریزی ذریعہ تعلیم کے مشنری اداروں کا جال پھیلایا گیا تاکہ انگریزی کے ذریعہ یقینی ترقی کی ضمانت ہندوؤں،مسلمانوں

اور دوسرے طبقوں کے ذہین بچوں کو کھینچ کر ان کی گود میں
پہنچا دے اور پھر انہیں دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ تہذیب
مغرب اور عیسائیت کا درس بھی دیا جاسکے۔جو عیسائی نہ بن
سکے اس کا کم سے کم ذہنی بپتسمہ ضرور ہو جائے -

ورنیکلر اسکول کے نام سے غریبوں اور ناداروں کے لیے مقامی زبانوں کے ذریعہ تعلیم پر مشتمل ایسے مدارس کھولے گئے جہاں منشی ، پٹواری اور ڈاکیے وغیرہ تیار ہو سکیں - اور عام گورنمنٹ ہائی اسکولز کا سلسلہ الگ قائم ہوا تاکہ وہاں نسبتاً کم پسماندہ خاندانوں کے بچّے تعلیم پا کر کلرک ، معلّم اور متوسط درجے کے دوسرے ملازمین کی صورت میں ڈھل ڈھل کر نوآبادیاتی دور کی مشینری کے کل پرزے بن سکیں۔ فوج میں کمیشن صرف اعلا خاندانوں کی اولاد کا اعزاز و استحقاق بنا اور ان کے لیے مخصوص تربیتی ادارے قائم ہوئے۔ غرض پوری قوم کو طبقات میں تقسیم کرنے کے لیے ہر بچّے کی تعلیمی زندگی کا نقطۂ آغاز اس کے خاندانی پس منظر اور معاشرتی حیثیت کے مطابق الگ الگ مقرر کر دیا اور اسے قدم بڑھانے کے لیے مخصوص راستے CHANNEL مہیا کر دیے گئے۔ ہر راستے کی سہولتیں اور راحتیں جدا ، زادِ راہ جدا ، مسافت جدا اور منزل جدا ۔تعلیم جنس خریداری بن گئی - اعلا اور ادنا میں تقسیم ہوگئی اور اس تقسیم نے تقسیم در تقسیم کا ایسا چکر چلایا کہ روایتی خاندان منقسم ہو کر نئے معاشی اور معاشرتی خاندان وجود میں آ گئے - نئی تہذیبی اکائیاں وجود میں آ گئیں۔ ایک ہی قوم کے افراد الگ الگ مداروں میں گردش کرنے لگے۔ ان کی بستیاں جدا ہو گئیں ۔ان کے معاشرتی روابط کا دائرہ بدل گیا ۔ان کے بازار ، تفریحی مقامات ،دلچسپیوں کے مراکز، طرز بود و باش ، انداز گفتگو ، لباس و آداب ، کھانے پینے اور اٹھنے بیٹھنے کے طور طریقے ، استعمال کی اشیا حتٰی کہ فکر و نظر کے پیمانے سب جدا ہوگئے۔ ہم آہنگی ،یگانگت اور اشتراک و تعاون کے رشتے مخصوص طبقاتی گروہ کی حدود میں سمٹ کر رہ گئے اور اس کے گرد اختلاف ،تصادم اور عداوت کی کانٹوں بھری باڑھ ابھر آئی۔ ایک ہی پیشے سے وابستہ لوگ اونچے اور نیچے ہوگئے۔ پبلک اسکول کا استاد عام اسکول کے استاد سے علاحدہ مخلوق بن گئی - استاد کی حیثیت اس لحاظ سے متعین ہونے لگی کہ وہ خادم کس کا ہے، امیروں کے بچوں کا یا غریبوں کے بچوں کا ؟ زبان کونسی بولتا ہے؟ پہنتا کیا ہے ، رہتا کس حال میں ہے؟ "علم" کا وزن کہیں قابل شمار نہ رہا۔

اب آزادی کے ۳۷ سال بعد اپنے اردگرد نظر ڈالیے۔کیا ہمارا پورا نظام تعلیم انہی بنیادوں پر کھڑا ہوا نہیں ہے جو انگریز کے دور میں رکھی گئی تھیں؟ کیا ہم اس میں کوئی ادنا سی تبدیلی کر سکے ہیں ؟ کیا ہم نے اس کی طبقاتی بنیادیں تبدیل کر دی ہیں ؟ اس کا نو آبادیاتی کردار بدل

دیا ہے ۔کیا صاحبان اقتدار ، صاحبان دولت و ثروت اور اعلا مناصب پر فائز عہدیداران ذی وقار اس بات پر آمادہ ہو گئے ہیں کہ ان کے بچّے اسی قوم کے پسماندہ طبقوں کے ہم وطن و ہم مذہب بچوں کے ساتھ ایک ہی اسکول کی چھت کے نیچے ، ایک نصاب تعلیم کے تحت اور یکساں سہولتوں کے ساتھ تعلیم حاصل کر سکیں ؟ کیا ان کے طبقاتی مفادات نے اسلام کے اصول مساوات کے ساتھ کوئی مطابقت پیدا کر لی ہے ؟

اسلام نے حصول علم کو تمام مسلمان مردوں اور عورتوں کا فریضہ قرار دے کر اسے ہوا اور پانی کی طرح بلاقیمت اور حسب توفیق و اہلیت رکھا تھا ۔ اسلامی معاشرہ نو آبادیاتی دور سے قبل پوری اسلامی دنیا میں تعلیم کی فیس سے ناآشنا رہا ۔ شہزادوں اور عام لوگوں کے لیے الگ الگ مدارس کے قیام سے بیگانہ رہا ۔ اس نے تو مسجد کی طرح مدرسہ میں بھی کامل مساوات برقرار رکھی ۔ شہزادوں کو تاخیر سے مدرسے آنے پر غریبوں کی جوتیوں کے درمیان بٹھا دیا اور علم کی دنیا سے چھوٹے بڑے کا ہر امتیاز مٹا دیا ۔

اسلام کے معلم آخر و اکمل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی میں صُفہ پر جو مثالی مدرسہ قائم کیا اُس کے چشمۂ فیض سے بے سہارا ، غریب نادار اور کئی کئی وقت کا فاقہ کرنے والے سب سے زیادہ سیراب ہوئے ۔ علم غربا کی میراث بنا ، ہمارے محدثین ، مفسرین ، فقہا ، مورخین ، ریاضی داں ، حکما ، سائنسداں اور مختلف علوم وفنون کے ماہرین سب پسماندہ اور متوسط طبقے سے ابھر کر آسمان علم پر ماہتاب اور آفتاب بن کر چمکے ۔ ذرا انگلیوں پر حساب لگا کر دیکھیے کہ ہمارے اکابرین علم میں شہزادوں اور نوابزادوں کا تناسب کیا ہے ؟ اور یہ بھی دیکھیے کہ جب تعلیم کتابوں ، اسٹیشنری ، خوراک ، رہائش اور دیگر لوازمات کے ساتھ مفت اور بلافیس تھی تو ہم علمی میدان میں کہاں کھڑے تھے اور آج جب ہم نے اسے جیب کے وزن ، سماجی رتبے ، علاقوں اور طبقوں کے استحقاق اور مختلف نصاب ، ذریعہ تعلیم اور سہولتوں پر مشتمل تعلیمی اداروں کی زنجیروں میں جکڑ کر اپنے مفادات کا تابع بنایا ہوا ہے تو اس کے اثرات وثمرات کیا ہیں ۔

میرا پختہ یقین اور ایمان ہے کہ ہم مدرسہ کی مساوات بحال کیے بغیر معاشرے میں کبھی مساوات قائم نہیں کر سکتے ۔ مساوات تو کجا ہم اس کے بغیر ایک متحد و منظم قوم بھی وجود میں نہیں لا سکتے ۔ ایک قوم بننے کے لیے ہم زبان ہونا ، مشترکہ نصب العین اور نقطہ نظر کی آہنگی سے ہمکنار ہونا ، یکساں تاریخی اور ثقافتی شعور کا حامل ہونا ، اشتراک و تعاون کے رشتوں میں منسلک ہونا اور شراکت جذبات و احساسات کا موجود ہونا ضروری ہے ۔ ایک مخصوص نصاب محض معلومات ، طباعت اور کاغذ وغیرہ کے لحاظ ہی

سے مختلف نہیں ہوتا اپنے تاثرات کے لحاظ سے بھی قطعی مختلف ہوتا ہے اور اس کے تحت تعلیم پانے والوں کے ظاہر و باطن میں ایک مخصوص رنگ جھلکنے لگتا ہے - علیگڑھ، ندوۃ العلما لکھنو ، دارالعلوم دیو بند ، جامعہ ملّی دہلی اور جامعہ عثمانیہ کے تمام طلبہ ایک مخصوص تشخص کے حامل ہیں - ان کے لباس کی وضع قطع ،ان کے انداز گفتگو ، ان کی نشست و برخاست ان کی پسند و ناپسند ، ان کے ذہنی رجحانات ،اسلام کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر اور خود انسان کی زندگی کے بارے میں ان کے ذہنی رویّہ کا فرق اتنا نمایاں ہے کہ ہم بیک نظر انہیں دیکھ کر یا ان کی زبان سے دو جملے سن کر آسانی سے اندازہ کر لیتے ہیں کہ ان کا تعلق کس مرکز علم سے ہے۔ان کے تشخص کا یہ فرق ان کے باہمی تعلقات اور معاشرتی روابط پر بھی اثر انداز ہوتا ہے -علیگڑھ کے دو طالب علموں کو باہم مل کر جو خوشی محسوس ہوتی ہے اور جو احساس یگانگت ان کے اندر ابھرتا ہے وہ علیگڑھ اور دارالعلوم کے دو طالب علموں کی ملاقات میں نظر نہیں آتا۔ دونوں ہم وطن ہیں ، ہم مذہب ہیں لیکن ان کے درمیان کوئی وحدت فکر و نظر نہیں - ان کی دلچسپیاں الگ ہیں ، موضوعات گفتگو الگ ہیں ان کے اندر محبت کی بجائے مغائرت کی دیوار کھینچی ہوئی محسوس ہوگی۔آخر ان دونوں کو کس نے ایک دوسرے سے جدا کر دیا ، ایک ہی وطن میں رہتے ہوئے اجنبی بنا دیا ایک ہی قوم سے وابستگی کے باوجود انہیں ایک دوسرے کا حریف بنا دیا۔ یہ کرشمہ ہے علیگڑھ اور دیوبند کے مخصوص اور جداگانہ نظام تعلیم کا -

اس مثال کی روشنی میں اب اپنے نظام تعلیم کا جائزہ لیجیے - کیا ایچی سن کالج اور دیال سنگھ کالج کے طلبہ میں یہ فرق نہیں ہے -کیا لیاری سیکنڈری اسکول اور گرامر اسکول کے بچوں میں یہ ذہنی اور معاشرتی بعد نہیں ہے ؟ کیا ان کا جداگانہ نصاب ، ان کی تعلیمی سہولتوں کا فرق اور ان کے درمیان نقطہ نظر کے وسیع فاصلے انہیں کبھی ایک قوم بننے کا موقع مہیا کر سکیں گے؟ کیا انہیں ترقی کے یکساں مواقع نصیب ہو سکیں گے ؟ کیا انہیں مسابقت کے میدان میں اپنی اپنی خداداد صلاحیتوں کے مطابق آگے بڑھنے کی گنجائش میسر آسکے گی ؟ کیا ایک کی محرومی اور دوسرے کی سرفرازی کا سبب ان کا کوئی ذاتی قصور یا کارنامہ ہوگا یا محض وہ خاندانی پس منظر جس میں ان کا اپنا کوئی حصہ نہیں ؟ کیا یہ ایک دوسرے کے جذبات و احساسات میں کبھی شریک ہو سکیں گے ، کیا ان کے درمیان رفاقت، محبت ، اعتماد اور اشتراک کے رشتے کبھی قائم ہو سکیں گے ؟ اور ان تمام اسباب علاحدگی و مغائرت کے ساتھ۔ کیا یہ نعرے کہ " عوام اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرلیں"۔ "قوم متحد ہو جائے" وغیرہ وغیرہ کبھی شرمندہ معنی ہو سکیں گے ؟ اسلام

کا حوالہ اس کے نظام عدل کے بغیر اپنی کرشمہ سازیاں نہیں دکھا سکتا۔

آج ہم اپنے معاشرے میں رؤسا کی بستیوں کے محلات، ان کی سڑکوں کی کشادگی اور پختگی، اسٹریٹ لائٹ، صفائی کے انتظامات، پانی کی فراہمی اور دیگر سہولتوں کے مقابلہ میں غریبوں کی ویران بستیوں، کچی آبادیوں ان کی تنگ و تاریک اور ٹوٹی پھوٹی سڑکوں، صفائی، بجلی، پانی اور دیگر سہولتوں سے محرومی اور ان کے بچوں کے لیے اصطبل نما اسکولوں کے جو متضاد مناظر دیکھتے ہیں یہ درحقیقت اسی متضاد نظام تعلیم کا ثمرہ ہے۔دولت کا فرق بادشاہوں کے زمانے میں بھی تھا لیکن مسجد، مدرسہ اور عدالت کی مساوات اور گلی کوچوں، سڑکوں اور محلوں کے ساتھ یہ امتیازی سلوک نہ ہونے کی وجہ سے معاشرہ ایسی المناک صورت حال سے دوچار نہ تھا۔

تعلیم کا موجودہ ڈھانچا ایک اور ستم بھی ڈھا رہا ہے۔بدیسی نصاب اپنے ہی وطن میں لوگوں کو پردیسی بنا دیتا ہے۔انگریزی زبان میں بیرون ملک سے درآمد کی جانے والی کتابیں حروف والفاظ ہی لے کر نہیں آتیں اپنا پورا تہذیبی ماحول بھی یہاں منتقل کرتی ہیں۔انہیں پڑھنے والا بچہ رہتا یہاں اور بستا وہاں ہے۔ان کا ذہن لندن، پیرس، نیویارک اور واشنگٹن کے معاشرتی ماحول میں پروان چڑھتا ہے اور وہیں کا اسیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسے اپنے ہاں کے پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ معاشرے کے ماحول سے وحشت ہونے لگتی ہے۔اور پر پرزے نکلتے ہی یہ اولین موقع پا کر پھر سے اڑ جاتا ہے - جو آسودگی اسے وہاں میسر آتی ہے وہ اپنے وطن میں نہیں ملتی جو بیرونی عناصر اس کی مخصوص تعلیم کے یہاں انتظامات کیئے ہوئے ہیں وہی اس کی صلاحیتوں سے استفادہ کرتے ہیں۔اس کی اپنی قوم جو وسائل اس پر صرف کرتی ہے وہ ضائع ہو جاتے ہیں -جو لوگ یہاں اعلا مناصب پر فائز ہونے کا شرف حاصل کر لیں وہ نت نئے بہانوں سے مغربی ملکوں کے سفر کا پروگرام بناتے ہیں، چھٹیاں لیتے ہیں اور پھر اس میں اضافے پر اضافے ہوتے ہیں۔ بیرون ملک تبادلے اور قیام کے لیے کیا جتن کیے جاتے ہیں -اس کا اندازہ واقف حال لوگوں کو بخوبی ہے۔اپنے ملک میں رہنے سے الرجی، بیرون ملک بھاگنے کی بےچینی اور پھر وہیں قیام کی پیہم جدوجہد اس ذہنی تربیت کا نتیجہ ہے جو اپنے وطن سے رشتہ وفاداری کاٹ کر اپنے اصل مرکز علم سے جڑ جانے کا رجحان ابھارتی ہے۔

اس نظام تعلیم میں زبان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔انگریزی ذریعہ تعلیم پر جب بھی اعتراض کیا جاتا ہے وہ مفاد پرست گروہ جس کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی بالادستی انگریزی ہی کے بل پر قائم ہے خم ٹھونک کر میدان میں آ جاتا ہے۔اسے ترقی کی سیڑھی اپنے بچوں کے قدموں سے

پھسلتی ہوئی محسوس ہونے لگتی ہے وہ اپنی مفاد پرستی کو چھپانے کے لیے ملک کی ترقی کی دہائی دینے لگتا ہے حالآنکہ جاپان، چین، جرمنی، فرانس، ہالینڈ اور روس وغیرہ نے انگریزی کے بغیر ترقی کی بلندیوں کو چھوا ہے انگریزی کی بین الاقوامی حیثیت تسلیم لیکن ہمیں اس کی موجودہ ملکی حیثیت پر دو اعتراضات ہیں۔

۱۔ اس کی تعلیم قوم کے ذہین بچوں کی بجائے ایک مخصوص مفاد پرست اور مراعات یافتہ طبقے کے بچوں کے لیے کیوں محدود ہے ؟ اسے علمی استعداد اور خداداد صلاحیت کی بجائے بھاری جیب اور اونچے عہدے سے کیوں منسلک رکھا گیا ہے ؟

۲۔ اسے قومی امور کی انجام دہی کے لیے کیوں سروں پر مسلط رکھا گیا ہے۔اس لیے کہ اعلا مناصب پر ایک مخصوص گروہ کی اولاد نسلاً بعد نسلاً اس انگریزی کے سہارے قبضہ جمائے رکھے۔جسے سیکھنے کے مواقع سے عوام الناس اس کے بچوں کو محروم رکھا گیا ہے۔ یہ ہائر انگلشن اور لوئر انگلشن کورس کیا انگریزوں اور پاکستانیوں کے بچوں کے لیے رکھے گئے ہیں یا یہ فرق اس لیے رکھا گیا ہے کہ ہائر انگلش ہائر کلاس (طبقے) کے مفادات کی محافظ بنی رہے اور لوئر انگلش کبھی لوئر کلاس کو ابھر کر اس کا ہم پلہ نہ ہونے دے۔ڈھانچہ بدلنا ہے تو ان امتیازات اور ناانصافیوں کا خاتمہ کرنا ہوگا اور نیا ڈھانچہ طبقاتی کی جائے قومی بنیادوں پر استوار کرنا ہوگا۔نوآبادیاتی دور کے وہ قلعے مسمار کرنا ہوں گے جو عہد غلامی کی علامت کے طور پر ہمارے درمیان کھڑے ہوئے ایک آزاد خود مختار قوم کا منہ چڑا رہے ہیں اور آرا مشین کی طرح قوم کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے اور اسے آقاؤں اور غلاموں میں تقسیم کرنے کا عمل جاری رکھے ہوئے ہیں۔ان کے خاتمہ کے لیے ان پر بلڈوزر چلانا ضروری نہیں۔ان کی نوآبادیاتی روح کشید کرنے کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ ہم پوری قوم کے بچوں کے لیے یکساں نصاب مقرر کریں اور درس گاہوں کے لیے طلبہ و اساتذہ کی تعداد کے تناسب سے منصفانہ بنیادوں پر فنڈ فراہم کرنے کا اصول تسلیم کر لیں۔ ان دو اصولوں کو نئے تعلیمی نظام کی بنیاد بنا لیا جائے تو داخلوں کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا طبقاتی کشمکش کا کم از کم درسگاہوں کی چار دیواری کے اندر ضرور خاتمہ ہو جائے گا اور پھر درس گاہ کی مساوات چند سال کے اندر اندر معاشرے میں ایک حقیقی انقلاب برپا کر کے اس کی کایا پلٹ دے گی۔

مروجہ نظام تعلیم کی "دوئی" کا دوسرا پہلو دینی اور دنیوی مدارس کی تقسیم کا ہے۔ یہ تقسیم آزادی کے بعد اسی طرح ختم ہو جانی چاہیے تھی جس طرح یہ نو آبادیاتی دور سے قبل معدوم تھی۔ ہم دینی مدارس کو اعلا سطحی تعلیم کے لیے تخصص کی خاطر برقرار رکھ سکتے ہیں لیکن اب مذہبی اور غیر مذہبی کردار کا وہ فرق و امتیاز قائم نہیں رہنا چاہیے جو عہد غلامی میں ابھرا تھا۔ ان دو متوازی نظاموں کو مربوط کرنے کی قابل عمل صورت یہ ہے کہ جدید علوم کو دینی مدارس کے نصاب میں اور دینی نصاب کو عام اسکولوں میں داخل کیا جائے۔ ایک مقررہ مدت کے اندر اس عمل کو تدریج کے ساتھ مکمل کیا جائے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ دین کے اساسی عقائد اور اس کی بنیادی تعلیمات پر زیادہ توجہ دی جائے گی اور اختلافی و نزاعی امور تخصص کے اعلا درجات تک محدود ہو جائیں گے، یوں فرقہ واریت پر قابو پانے میں مدد ملے گی اور جدید علوم دینی مدارس کے طلبہ کو باعزت روزی کے بہت سے مواقع فراہم کو کے انہیں محض محراب و منبر تک محدود رہنے کی محتاجی سے بھی نجات دلادیں گے۔

ہمیں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ تعلیمی نظام کی یک رنگی ہی سے قومی یک رنگی ابھرے گی۔ ہمارے مدارس جتنے رنگوں میں رنگے ہوئے ہوں گے اتنے ہی رنگوں کی قوم وجود میں آئے گی اور یہ مختلف رنگ ظاہر اور باطن دونوں پر چھائے ہوئے ہوں گے۔ ایک متحد و مربوط قوم بننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہمارے تمام تعلیمی اداروں پر ایک ہی رنگ ـــ صبغۃ اللہ چھایا ہوا ہو۔ ہم نے ابتدا میں تعلیمی اداروں کے جن مختلف رنگوں کا ذکر کیا تھا، ان میں سے کسی ایک رنگ کے تعلیمی ادارے کو لیجیے اور اس کا موازنہ دوسرے رنگ کے تعلیمی ادارے سے کیجیے، ان دونوں کا تیار کردہ سیرت و کردار کا ماڈل ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہوگا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے ایک قوم بننے میں سب سے بڑی رکاوٹ تو ہمارا نظام تعلیم ہے۔ جب تک اس کی لسانی دوئی، دینی اور دنیوی دوئی، طبقاتی دوئی، ملکی اور غیر ملکی نصاب کی دوئی ختم نہیں ہوگی، یہ قوم کے اندر اتحاد و یکجہتی کا ذریعہ کیسے بن سکتا ہے؟ تعلیم قیام عدل کا، اخوت و مساوات کے رشتوں کی استواری کا سب سے اہم ذریعہ ہے لیکن یہ خود ہی ظلم پر مبنی ہو اور طبقاتی فرق و امتیاز سے وابستہ ہو تو اس سے عادلانہ معاشرے کے قیام کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے؟

اسلامی جمہوریۂ پاکستان کا نظام تعلیم

جناب ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی

مملکت خداداد پاکستان میں تعلیم کا نظام کیسا ہونا چاہیے اس پر غور کرنے سے قبل یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس وقت کیا حالت ہے۔ دوسرے اسلامی ممالک کی طرح یہاں بھی آبادی تین گروہوں میں تقسیم ہوگئی ہے:-

ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جو مغربی طرز کے مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کررہے ہیں یا فارغ التحصیل ہوچکے ہیں اور محض جدید علوم سے واقف ہیں۔ ان کو اپنی تاریخی اور ثقافتی روایات سے عموماً اور شعائر اسلامی سے خصوصاً کوئی واقفیت نہیں۔

دوسرا گروہ ان اصحاب کا ہے جو درس نظامیہ یا اسی قبیل کے دینی مدارس کے تعلیم یافتہ ہیں اور جو جدید علوم و فنون کی ان غیر معمولی ترقیوں سے قطعی لاعلم ہیں جو گزشتہ چند صدیوں میں طبیعی، حیاتی اور عمرانی علوم اور ٹکنالوجی کے مختلف شعبوں میں رونما ہوئی ہیں اور اسی لیئے وہ موجودہ دور کے تقاضوں اور رحجانات کو نہیں سمجھ سکتے اور نہ تسخیر فطرت میں کسی قسم کا کردار ادا کرسکتے ہیں۔

تیسرا گروہ ان بد قسمت لوگوں کا ہے جنہیں مذکورۂ بالا جدید یا قدیم کسی قسم کی تعلیم نصیب نہیں ہوئی اور جو اپنی جہالت کے باعث غربت، بھوک اور امراض کا شکار ہیں۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ جس امت کے پیغمبر صلی اللّٰہ علیہ وسلم پر جو پہلی وحی الٰہی نازل ہوئی وہ اس حکم پر مبنی تھی کہ پڑھنا، لکھنا اور علم حاصل کرنا انسانوں کا بنیادی فرض ہے، اور جس دین نے تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ عالمگیر تعلیم کا اصول پیش کیا، اس دین کے ماننے والوں کی اکثریت ناخواندہ افراد پر مشتمل ہے۔ امت مسلمہ کو سب سے پہلے اسی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے اور عام خواندگی کے لیے اگر قانون بھی نافذ کرنا پڑے تو قرآن اور حدیث کے صریحی احکام کی روشنی میں ایسے قانون کے نفاذ سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔

اب اس امر پر غور کرنا ہے کہ اسلام میں علم اور تحصیل علم کے متعلق کیا نقطۂ نظر ہے ۔

اسلام ایک ایسا دین فطرت ہے جس میں انسانی زندگی کے روحانی ، ذہنی اور جسمانی کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا گیا بلکہ انسانی فطرت کے صحت مند تقاضوں کو ہر طرح ملحوظ رکھا گیا ہے ۔ انسانی فطرت میں ایک طرف تو جذبات و احساسات اور قلب و نظر کی کیفیتیں ودیعت کی گئی ہیں اور دوسری طرف حواس خمسہ کے ذریعہ سے مشاہدے اور تجربے کی قابلیت اور ذہنی اور فکری قوا کے توسط سے غور و خوض کی صلاحیت بخشی گئی ہے ۔

قرآن کریم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات حمیدہ اور فرائض رسالت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ آپ ؐ " الکتاب " اور " الحکمہ " دونوں کے معلم ہیں ۔ چوں کہ انسان کی ذات اور اس کے اپنے اندرونی تقاضے اس کی رہبری ایک غیر مرئی ہستی کی طرف کرتے ہیں جو اس کائنات کی خالق اور کارخانۂ قدرت کو چلانے والی ہے اس لیے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر کتاب الٰہی نازل کی گئی جس کا علم حاصل کرنا امت کے لیے ضروری قرار پایا ۔

دوسری طرف چوں کہ انسان کے حواس خمسہ اور غور و فکر کی صلاحیت اس کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ نظام عالم کے اسرار و رموز کا انکشاف کرے اور قوانین قدرت کا علم حاصل کرکے ان سے استفادہ کرے ، اس لیے اسی لازوال " الکتاب " میں تحصیل علم و حکمت کے بنیادی اصول بھی بیان کر دیے گئے اور یہ بھی بتا دیا گیا کہ جس کسی کو حکمت اور دانائی عطا کی گئی اس کو یقیناً ایک نعمت عظمیٰ مل گئی :-

" ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیرا " ۔

ان بنیادی اصولوں کی روشنی میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ افراد ملت کے تعلیم یافتہ طبقہ کی جن دو گروہوں میں تقسیم کی طرف ابتدا میں اشارہ کیا گیا ہے وہ ان مختلف تعلیمی نظاموں کا منطقی نتیجہ ہے جو ملک میں رائج ہیں اور جو دین اور دنیا کی اسی تفریق پر مبنی ہیں جو مغربی تہذیب و تمدن کی امتیازی خصوصیت ہے ۔ اسلام میں چونکہ علوم کو اس نقطۂ نظر سے تقسیم نہیں کیا گیا ہے بلکہ کہا گیا ہے کہ " الحکمۃ ضالۃ المومن ، فاخذھا این وجدھا " ۔

یعنی حکمت مومن کی میراث ہے جس کو جہاں سے ملے حاصل کیا جانا چاہیے۔ اسی بنا پر قرون اولی کے مسلمانوں نے قرآن و تفسیر ، حدیث وفقہ کے ساتھ ساتھ ریاضی ، ہئیت، طبیعیات ، کیمیا ، طب اور دوسرے علم و فنون میں ایسے کارھائے نمایاں انجام دیے کہ وہ انسان کی علمی تاریخ کا درخشاں باب بن چکے ہیں ، بلکہ مورخین اب اس حقیقت کا بھی اعتراف کرنے لگے ہیں کہ جدید سائنس جو تجربہ اور نظریہ کے امتزاج پر مبنی ہے ، اس کی بنیاد مسلم علماء ہی نے رکھی تھی ۔ اس لیے قدیم طرز کے مکتبوں میں ان علوم کو مغربی علوم کہہ کر نظر انداز کرنا کسی طرح درست نہیں ہوسکتا جبکہ ان علوم کی بنا پر قوائے فطرت کو مسخر کرنے اور اپنے تصرف میں لانے کی بے انتہا قوت بھی حاصل ہوتی ہے جس کی بشارت قرآن کریم میں دی جاچکی ہے ۔

دوسری طرف جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا قرآن و سنت ، اسلامی احکام و شعائر ، تاریخ و روایات اور اعلا اقدار سے بالکل ناواقف رہنا معاشرے کے لیے تقویت کا نہیں بلکہ کمزوری کا باعث ہے اور اس سے معاشرے میں فساد پیدا ہونے کا خطرہ ہے ۔

اجزائے تعلیم

ان وجوہ کی بنا پر تعلیم کا ایک ایسا جامع اور مربوط نظام مرتب کرنے کی ضرورت ہے جس میں قدیم و جدید کی کوئی تفریق نہ ہو ۔ اس نظام تعلیم میں قومی اور علاقائی زبان کے علاوہ حسب ذیل اجزا کا شامل ہونا ضروری ہے :-

(1) قرآن ۔ حدیث ۔ فقہ ۔ احکام شریعہ

(2) تاریخ اسلام ، تاریخ ہند (بالخصوص دور مسلمانان) ، تحریک پاکستان ، علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے ارتقا میں مسلمانوں کے کارنامے ۔

(3) ریاضیاتی ، طبعی ، حیاتی ، عمرانی علوم کے بنیادی اصول ۔

(4) صنعت و حرفت یا (لڑکیوں کے لیے) امور خانہ داری میں سے کسی ایک پیشہ کی عملی تعلیم و تربیت تاکہ ہر فرد معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے اپنا فرض ادا کرسکے اور اس کے ساتھ اپنا روزگار بھی حاصل کرسکے ۔

اس نظام تعلیم کی تشکیل و ترتیب کے لیے ضروری ہے کہ مندرجہ بالا

اجزا کی متوازن اور متناسب ترکیب کی جائے تاکہ فرد کی شخصیت کے ذہنی اخلاقی اور روحانی پہلو پوری طرح نشو و نما پا سکیں اور کوئی پہلو تشنہ تکمیل نہ رہ جائے ۔

یہ مضامین تعلیم کی ابتدائی ، ثانوی اور اعلا منزلوں میں جاری رہیں گے اگرچہ ان کا معیار ابتدائی منزل کے پہلے درجے سے شروع کرکے اعلا منزل تک بتدریج بلند ہوتا جائے گا اور نصاب بھی اس طرح ترتیب دیا جائے گا کہ طالب علم پر ناقابل برداشت بوجھ نہ پڑنے پائے ۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ مختلف منزلوں اور درجوں میں مختلف مضامین کا تناسب وقت بوقت اساتذہ ، ماہرین تعلیم اور ماہرین فن کے مشورہ سے متعین کیا جائے ۔

ذریعہ تعلیم

ایک اور اہم بنیادی اصول ذریعہ تعلیم کا ہے ۔ قومی ہم آہنگی اور یک جہتی کے لیے ضروری ہے کہ ثانوی اور اعلا مدارج کے لیے قومی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دیا جائے ۔ ظاہر ہے کہ علاقائی زبان ابتدائی منزل پر ذریعہ تعلیم ہوگی اور علاقائی زبانوں کی ترقی کے ذریعہ سے قومی زبان میں بھی ترقی ہوگی اور اس کی ترویج و اشاعت پورے ملک میں وسیع پیمانے پر ہوسکے گی ۔ اس امر کا خاص طور پر خیال رکھا جائے کہ ہر علم کی تدریس کے وقت اس خاص علم میں مسلم علما کے اہم کارناموں کا بھی ذکر کیا جائے تاکہ طلبہ کو اپنے بزرگوں کے کارناموں سے واقفیت ہو ۔ اس طرح ان علوم کی تحصیل میں مزید دلچسپی پیدا ہوگی ۔

اصول تعلیم

ان بنیادی اصولوں کی بنا پر مجوزہ نظام تعلیم کی مختلف منزلوں میں مضامین کی عام ترتیب اس طرح ہوگی :-

ابتدائی تعلیم (پرائمری)

(1) قرآن خوانی : ناظرہ مکمل کیا جائے اور چند چھوٹی سورتوں کو حفظ کرایا جائے تاکہ وہ نماز میں پڑھی جاسکیں ۔

(2) ارکان و احکام اسلام اور اسلامی معاشرہ کے اخلاقی اصول :

(عبادات کے ساتھ معاملات کے پہلو پر بھی زور دیا جائے)

(3) زبان (قومی اور علاقائی زبان) : حصہ نثر میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے حالات کا مطالعہ شامل کیا جاسکتا ہے تاکہ زبان کے ساتھ ساتھ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سوانح حیات سے بھی واقفیت ہوجائے ۔

(4) تاریخ و جغرافیہ : پاکستانی علاقوں کی تاریخ، خصوصاً محمد بن قاسم کی آمد کے بعد سے آج تک ۔ تاریخ اسلام کے اہم واقعات ۔ پاکستان کے جغرافیہ سے متعلق تفصیلی معلومات ۔ برصغیر کے جغرافیہ کا خاکہ ۔ کرۂ ارض کے مختلف علاقوں کا عام جغرافیائی تصور ۔

(5) حساب : اعداد اور گنتی سے شروع کرکے جمع ، تفریق ضرب ، تقسیم ، کسر عام ، کسر اعشاریہ اور کاروباری حساب تک ۔

(6) مطالعۂ فطرت : طبیعی ، نباتی اور حیوانی علوم کی مبادیات مشاہدہ اور ماحول کے مطالعہ کے ذریعہ سے ۔

(7) حفظ صحت کے اصول : ضروریات زندگی ، ان کی فراہمی اور صفائی کے بنیادی اصول ، تعلیمات اسلامی کی روشنی میں ۔

(8) شہریت اور اجتماعی زندگی کے مسائل : تعلیمات اسلامی کی روشنی میں ۔

(9) عملی تربیت اور دستکاری :

ثانوی تعلیم

(1) قرآن کریم مع ترجمہ و مختصر تشریح

(2) سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

(3) احکام فقہ: بالخصوص اجتماعی زندگی سے متعلق۔

(4) زبان: عربی، قومی زبان، انگریزی (جدید آلات اور تدریسی طریقوں کی مدد سے تینوں زبانیں ایک ساتھ سکھائی جا سکتی ھیں)۔

(5) تاریخ و جغرافیہ: تاریخ اسلام - برصغیر اور پاکستان کی تاریخ - جغرافیہ عالم۔

(6) ریاضی و سائنس: حساب، الجبرا، علم ھندسہ (جیومٹری)، طبیعیات، کیمیا، نباتیات اور علم الحیوان کے بنیادی اصول، علم الاقتصاد اور عمرانی علوم کی مبادیات۔

(7) عملی تعلیم و تربیت: کسی ایک پیشے سے متعلق۔ لڑکیوں کے لیے امور خانہ داری کی تربیت۔

اعلا تعلیم

پہلی ڈگری (طیلسان) (بی۔اے، بی۔ایس سی)

(الف) لازمی مضامین

(1) فلسفۂ دین و دانش: اس مضمون کا نصاب امام غزالیؒ کی کتاب "احیاء العلوم"، شاہ ولی اللہؒ کی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" اور علامہ اقبال کے خطبات سے اقتباسات پر مشتمل ھوسکتا ھے۔

(2) زبان: عربی اور انگریزی کی مزید واقفیت۔ لازمی مضمون کی حیثیت سے ان زبانوں کی تدریس میں ادب یا تنقید وغیرہ نہیں بلکہ زبانوں کی اچھی واقفیت پڑھنے، لکھنے، بولنے اور سمجھنے کی حد تک پیدا کرنا مقصود ھے۔

(ب) اختیاری مضامین

(1) قرآن و تفسیر، حدیث و سیرت النبی صلی اللہ علیہ

وسلم اور فقہ و اصول فقہ میں سے ایک مضمون ۔

(2) ریاضی ، سائنس ، عمرانی علوم اور السنہ میں سے ایک مضمون ۔

— سائنس میں طبیعیات ، کیمیا ، نباتیات اور علم الحیوان نفسیات وغیرہ شامل ھیں ۔

— عمرانی علوم میں اقتصادیات ، سیاسیات ، عمرانیات ، تاریخ و جغرافیہ وغیرہ شامل ھیں ۔

— السنہ میں عربی ، اردو ، فارسی ، انگریزی ،فرانسیسی جرمن وغیرہ زبانیں شامل ھیں ۔

(3) ثانوی تعلیم کی منزل پر جو پیشہ منتخب کیا گیا تھا اس میں مزید عملی تعلیم و تربیت ۔

تشریح : زراعت ، انجینیری ، طب اور ٹکنالوجی کی پیشہ ورانہ تعلیم کا نصاب جداگانہ مرتب کیا جائے گا جس میں فلسفۂ دین و دانش بطور لازمی مضمون اور قرآن ، حدیث اور فقہ بطور اختیاری مضمون شامل ھوں گے ۔

مدارج تخصیص (SPECIALIZATION)

بی ۔اے ، بی ۔ایس ۔سی کی پہلی ڈگری کے بعد مدارج تخصیص آتے ھیں جو موجودہ نظام تعلیم میں ام ۔ اے ، ام ۔ایس ۔سی ، ام فل (M Phil) پی ۔ایچ ۔ڈی اور ڈی ۔ایس ۔سی ۔کی ڈگریوں پر مشتمل ھوتے ھیں اور جن میں کسی ایک مضمون میں کافی مہارت حاصل کرنے اور پھر تحقیقی کام کرنے کے بعد مقالات تحریر کرنے کا مرحلہ پیش آتا ھے ۔ ظاھر ھے کہ اس منزل تک پہنچتے پہنچتے یعنی پہلی ڈگری حاصل کرنے تک ایک تعلیم یافتہ شخص کے ذھن میں دینی اور دنیاوی علوم کی وہ دوئی یا تقسیم جو اس وقت پائی جاتی ھے ، کم وبیش ختم ھوجائے گی ۔اس کے بعد وہ تخصیص کے لیے قدیم یا جدید کوئی مضمون اختیار کرے اس میں وہ اس وسعت نظر سے کام لے گا جو ایک حقیقی معنوں میں صحیح اسلامی، مربوط اور جامع نظام تعلیم کے فارغ التحصیل طالب علم کا مابہ الامتیاز ھوسکتا ھے ۔

مجوزہ نظام تعلیم کے نفاذ کے لیے ضروری لوازمات اور عملی اقدامات

مجوزہ نظام تعلیم کا یہ ایک ابتدائی خاکہ ھے جو غور و فکر کے لیے پیش

کیا جارہا ہے ۔ اس نظام تعلیم کے نفاذ میں اگرچہ کوئی ناقابل حل دشواری نظر نہیں آتی، لیکن چونکہ یہ کسی قدر غیر مانوس ضرور ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ اس وقت کسی مرکزی مقام پر ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جس میں ابتدائی ، ثانوی اور اعلا تعلیم کی منزلیں موجود ہوں اور جو بطور نمونہ (ماڈل) کام دے سکے ۔ پانچ چھے سال تک اس ادارہ کی کارکردگی اور نتائج کا جائزہ لیا جائے اور اس کی روشنی میں مجوزہ نظام تعلیم کو عام طور پر دوسرے اداروں میں بھی رائج کیا جا سکتا ہے ۔

مجوزہ نظام تعلیم کے نفاذ کے لیے موزوں اساتذہ کی فراہمی اہم ترین لازمی جزو کی حیثیت رکھتی ہے جس کے بغیر یہ منصوبہ کامیاب نہیں ہوسکتا ۔ اس کے لیے موجودہ اساتذہ کو نئے سرے سے تربیت دینا ضروری ہوگا ۔ سب سے پہلے ایسی تربیت دینے والے چند نہایت تجربہ کار اور اعلا قابلیت رکھنے والے ماہر علما کا انتخاب ضروری ہوگا جو جامع العلوم ہوں اور تعلیم و تدریس کا طویل تجربہ رکھتے ہوں ۔ پھر ان علما کی مدد سے مزید اساتذہ کو منتخب کرکے مناسب تربیت دی جا سکتی ہے۔ یہ اساتذہ ایسے ہونے چاہییں جو اس کام کو محض ذریعہ معاش نہیں بلکہ ایک تبلیغی مشن سمجھ کر انجام دیں ۔

دوسری اہم ضرورت مندرجہ بالا اصول کی روشنی میں تیار کی ہوئی نصابی کتابوں کی فراہمی سے متعلق ہے ۔ ریاضی ، طبیعیات ، حیاتیات اور عمرانی علوم پر جامعہ عثمانیہ ، کراچی یونیورسٹی اور مرکزی اردو بورڈ، لاہور کی شائع کردہ متعدد کتابیں موجود ہیں جن پر موزوں علما کی مدد سے جو مختلف علوم و فنون میں مسلم علما کے کارناموں سے واقف ہوں ، نظر ثانی کی جا سکتی ہے یا وہ نئے سرے تالیف کی جا سکتی ہیں ۔

اس طرح نئے نظام تعلیم کے باقی اجزا یعنی ترجمہ و تشریح قرآن ، انتخاب احادیث ، فقہ وغیرہ میں مختلف مدارج کی کتابیں ، دین و دانش اور احکام و شعائر اسلامی کے مضامین اور تاریخ اسلام وغیرہ پر مختلف درجوں کے لیے نصابی کتابیں مجوزہ فلسفۂ تعلیم کی روشنی میں نئے سرے سے مرتب کرنی پڑیں گی ۔

مجوزہ نظام تعلیم کا یہ ایک مختصر خاکہ ہے جس کی اصولی منظوری کے بعد اساتذہ کی تربیت کے ضروری انتظامات ، نصاب تعلیم کی تفصیلات ، کتابوں کی تالیف ، سازو سامان اور دوسرے تدریسی لوازمات کی تفصیل کو ماہرین کے ذریعہ سے تیار کرنے کے عملی اقدامات کیے جا سکتے ہیں ۔

اخلاقیاتِ نبوی

مرتبہ : حکیم محمد سعید

۱۴۰۲ ہجری میں کراچی میں ہمدرد فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام سیرتِ نبوی پر ایک قومی کانفرنس (مذاکرۂ ملی اخلاقیاتِ نبوی) منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں پورے ملک سے شریک ہونے والے ممتاز علما، ماہرینِ تعلیم، ماہرینِ قانون، ادبا اور اہلِ قلم نے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا کی ہوئی اخلاقیات پر گراں قدر مقالات پڑھے تھے۔ ان مقالات میں پاکستان کے دانش وروں نے تمدن و معاشرت، تعلیم و تربیت، اخلاقی اصلاح، عدل و انصاف، معاش و معاشی نظام، سرمایہ و محنت، امن و جنگ اور زندگی کے مختلف میدانوں میں حضورؐ کی اخلاقی تعلیمات پر اپنے وسیع مطالعے کی روشنی میں موجودہ حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بحث کی ہے۔ ان جامع اور بیش بہا مقالات کو حکیم محمد سعید نے کتابی شکل میں مرتب کر کے سیرتِ نبوی پر ایک نایاب و نادر مجموعے کی حیثیت دے دی ہے۔

صفحات : ۳۵۲ قیمت : ۴۵ رُپے

خودی

مرتبہ : حکیم محمد سعید

ہمدرد فاونڈیشن کے زیرِ اہتمام ۱۴۰۳ ہجری میں منعقد ہونے والی دُوسری قومی سیرت کانفرنس (مذاکرۂ ملی تعلیماتِ نبوی) لاہور میں منعقد ہوئی اور اس میں خودی کو موضوعِ فکر بنایا گیا۔ اس کانفرنس میں پاکستان کے اہلِ علم و دانش، ماہرینِ تعلیم، علما اور ادبا نے عرفانِ نفس اور عرفانِ حق کے حوالے سے سیرتِ نبوی کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ اور مسائلِ ملی کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب کے تمام مقالات ملک کے منتخب اور چیدہ اصحابِ علم و فکر کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ اسے حکیم محمد سعید نے بڑے سلیقے سے مرتب کیا ہے۔

صفحات : ۴۵۶ قیمت : ۶۰ رُپے

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ہمدرد سنٹر ناظم آباد۔ کراچی ۱۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقالات
مذاکرۂ ملی - تعلیماتِ نبوی
(چوتھی ہمدرد سیرت کانفرنس)

۳ر دسمبر ۱۹۸۴ء تا ۷ر دسمبر ۱۹۸۴ء ۹ر ربیع الاول تا ۱۳ر ربیع الاول ۱۴۰۵ ہجری

نظریہ و فلسفۂ تعلیمِ اسلامی

مرتبہ :-
حکیم محمد سعید

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس